خاندانی معاملات

(نکاح و طلاق وغیرہ)

طبع اوّل — اگست ۱۹۸۱ء

طبع دوم — ۲۰۰۲ء

پریس — فضلی اینڈ سنز کراچی

ناشر

ادارۂ فکرِ اسلامی ● کاشانۂ حفیظ ۱۶ ● گارڈن ایسٹ ● ایسٹ اسٹریٹ ● کراچی

نوٹ از ناشر:

فقہ القرآن طبع اول میں پہلی جلد (عبادات) کے ساتھ کتاب النکاح کو شامل کردیا تھا۔ اب قارئین کرام کے اصرار پر اسے وہاں سے نکال کر اس جلد میں شامل کیا جارہا ہے تاکہ نکاح و طلاق کا مضمون ایک ہی جلد میں یکجا ہوجائے اور مطالعہ میں آسانی رہے۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان
(صدر ادارہ فکرِ اسلامی)

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّہٰتُہُمْ

(۳۳/۶)

نبی مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں اور آپ کی ازواج ان کی مائیں ہیں۔

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین کے حضور نذرانۂ اخلاص و عقیدت پیش کرتا ہے آپ کی اور آپ کی ازواج مطہرات کی حیات طیبہ کے خلاف دشمنانِ اسلام کی ہرزہ سرائیوں کی مدافعت کر کے آپ کی اور امہات المومنین کی عظمت اور تقدس کی سربلندی کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق یہ حقیر سا عملی جہاد ہے۔

فَاِنَّ اَبِیْ وَوَالِدَہٗ وَعِرْضِیْ
لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْکُمْ وِقَاءٗ

(حسان ابن ثابت)
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عمر احمد عثمانی
رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۱ھ

باسمہٖ سبحانہٗ

انتساب

میں اس قرآن کی خدمت کو جو میری نسبت سے نہایت حقیر اور قرآن کریم کی نسبت سے انتہائی عظیم المرتبت ہے۔ پھر اپنے جدامجد حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اسماء گرامی اور حضرۃ الاستاذ الشیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی مدظلہ العالی شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ مظاہر العلوم سہارنپور کے اسم گرامی سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جن کی دعاؤں اور توجہات عالیہ نے مجھے قرآن کریم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

پُر تقصیر و ناکارہ

عمر احمد عثمانی

ــــ اب اس دوسرے ایڈیشن کے موقع پر انتقال فرما چکے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔
(ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ ط
(ترمذی)

میں بصمیم قلب کے ساتھ ادارۂ فکر اسلامی کراچی کے تمام اراکین اور خصوصیت سے ادارہ کے چیرمین اور صدر جناب محترم ڈاکٹر حبیب الرحمان خاں صاحب (ایس۔ ایس، ایم ڈی، ایف سی پی پی امریکہ) اور ادارہ کے سکریٹری جنرل مولانا قاری طاہر المکی کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں کہ اوّل الذکر موصوف کی مالی جدّ و جہد اور ثانی الذکر کے علمی تعاون اور زریں مشوروں سے "فقہ القرآن" جلد دوم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

اس کے ساتھ ہی جناب محترم مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی دامت برکاتہم[1] کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کے قیمتی مشوروں کا تعاون مجھے اس جلد کی تالیف میں عموماً اور کتاب الطلاق کی تدوین میں خصوصاً حاصل رہا۔

فجزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء
(آمین)

عمر احمد عثمانی

[1] اب اس طبع دوم کے موقع پر انتقال فرما چکے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ
(ناشر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرس مشمولات

نکاح، طلاق، رجوع، ایلاء، خلع، لعان، عدت، رضاعت، نفقہ، عتاق، ایمان (قسم)

سرنامہ	۳
انتساب	۴
تشکر	۵
تعارف از مولانا طاہر مکی	۱۳
کلمات ترحیب از مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۱۵
[دیگر اہل علم ودانش کے تاثرات]	۱۷
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا	۱۸
مفکر اسلام مولانا محمد اسحٰق سندیلوی	۱۸
مولانا محمد طاسین (مجلس علمی)	۱۹
مولانا جعفر شاہ ندوی پھلواروی	//
مولانا خالد مسعود اصلاحی	۲۰
جسٹس قدیر الدین احمد	۲۱
جسٹس آفتاب حسین	//
جسٹس عبد القدیر چودہری	۲۲
جناب خالد اسحٰق (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ)	//
روزنامہ "ڈان" کراچی	۲۳
// // "پاکستان ٹائمز" لاہور	۲۳
// // جنگ، جسارت" کراچی	۲۴
ہفت روزہ تکبیر کراچی	۲۴
مولانا سعید الرحمٰن علوی اڈیٹر "خدام الدین" لاہور	۲۵
خورشید احمد ندیم (کالم نگار)	۳۸
[دیباچہ] از ناشر	۳۹
از مولانا طاہر مکی	۴۱
کتاب النکاح	۴۳
باہمی رضامندی	۴۴
ایجاب وقبول	۴۵
شہادت	۴۶
اعلان	۵۰
الفاظ نکاح	۵۲
محرمات	۵۳
حرمت مصاہرت	۶۱
اہل کتاب عورتیں	۶۲
مجوسی اور صابی عورتیں	۶۳
باندیوں سے نکاح	۶۴
تعدد ازدواج	//
قانون تخلیق	۶۶
یتامیٰ کی بحث	۷۲
اذا فات الشرط فات المشروط	۸۰
شان نزول	۸۳
شان نزول کی روایت	۸۵
حدیث شان نزول پر بحث	۸۶
بر سبیل تنزل	۸۹
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۹۱
بیوی کو طلاق دے کر نیا نکاح	۹۴
حاملہ عورت سے نکاح	//
نکاح متعہ	//
عدالتی فیصلہ سے نکاح	۹۷
باب الاولیاء	۹۸
کیا ولی جبراً نکاح کر سکتا ہے۔	۱۰۳
نابالغ کا نکاح	۱۰۴
نکاح کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر	۱۰۹
الّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ	۱۱۰
بحث کا علمی تجزیہ	۱۱۲

نابالغ، مجنون اور کافر کی ولایت ۱۱۳

فصل الکفاءۃ ۱۱۴

کفاءت کا مطلب دو بنیادی باتیں ۱۱۵

اول ۱۱۵

دوم ۱۱۶

باب المہر ۱۲۰

مہر لازم ہے۔ ۱۲۱

مہر کی مقدار ۱۲۳

برائے نام مہر ۱۲۴

نصف مہر ۱۲۵

مہر مثل ۱۲۷

مہر متعہ ۱۲۸

نکاح کے بعد مہر مقرر کرنا۔ ۱۲۹

مہر میں اضافہ //

مہر میں کمی ۱۳۰

مجبوب اور عنین کی خلوت //

آنٹا سانٹا مہر نہیں بن سکتا۔ //

خدمت مہر نہیں بن سکتی۔ ۱۳۱

ایک مسئلہ //

مہر غیر معقوم ۱۳۴

نکاح فاسد ۱۳۵

باب القسم ۱۳۶

کتاب الرضاعۃ ۱۳۸

مدت رضاعت ۱۳۹

رضاعت کب معتبر ہے ۱۴۱

دیگر رضاعی رشتے //

دودھ نکال کر پلانا۔ ۱۴۲

کنواری عورت کا دودھ پلانا ۱۴۳

مرد اور جانور کا دودھ //

رضاعت کا ثبوت //

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق پہلا افسانہ ۱۴۵

سیدۂ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نکاح کے وقت عمر ۱۴۶

عرب رسم و رواج ۱۴۹

عربوں میں منگنی کا دستور ۱۵۱

حضرت عائشہؓ حضرت اسماءؓ سے دس سال چھوٹی تھیں۔ ۱۵۹

حضرت فاطمہؓ سے پانچ سال چھوٹی تھیں ۱۶۲

شیعی نقطۂ نظر ۱۶۵

حضرت اسماءؓ سے بڑی تھیں ۱۷۱

ہجرت کے فوراً بعد صدیق اکبرؓ کی تیمارداری ۱۷۲

تضاد بیانی ۱۷۳

ابن ہشام وغیرہ کا بیان ۱۷۵

صحیح بخاری کی دوسری روایت ۱۸۱

آنحضرتؐ کے ساتھ نکاح ہونے سے پہلے حضرت عائشہؓ کی منگنی ہو چکی تھی ۱۸۴

دوسرے مؤرخین کی تائیدات ۱۸۶

صحیح بخاری کی ایک تیسری روایت ۱۸۸

حَتّٰی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۱۸۹

دین کے اصطلاحی الفاظ کے معانی لغت سے متعین ہیں ۱۹۳

لفظ نکاح قرآن میں	۱۹۵	بغیر شاہدوں کے نکاح	۲۴۵
طفلانہ اعتراض	۱۹۸	حضرت زینبؓ کے پاس آنحضرتؐ بغیر اطلاع کے چلے گئے؟	۲۴۷
مِنْهُنَّ کیوں نہیں	۲۰۲		
اَلّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ کے متعلق	۲۰۳	حضرت زینبؓ کا استخارہ	۲۵۰
وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ	۲۱۰	خلاصۂ مبحث	۲۵۱
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق دوسرا افسانہ	۲۱۳	آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق تیسرا اور چوتھا افسانہ	۲۵۴
ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ	۲۱۴	موہوبات اور اَبْنَاءُ ہُنَّ کا معاملہ	۲۵۵
حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ	۲۱۵	موہوبات سے متعلق آیتِ احزاب	۲۵۷
تاریخ وسیر کی افسانہ طرازی	۲۱۶	پس منظر	۲۵۹
حافظ ابن کثیرؒ کا بیان	۲۱۷	شادیوں کی اجازت نہیں	۲۶۱
طبریؒ کی افسانہ طرازی	۲۲۰	ازواج مطہرات کو طلاق دینے کی ممانعت	۲۶۳
حضرت زید ابن حارثہؓ	۲۲۳	آیت کی دوسری تفسیر	۲۶۷
حضرت امّ کلثومؓ	۲۲۸	تحدید ازدواج کا حکم کب نازل ہوا۔	۲۶۸
حضرت زینبؓ	۲۲۹	حضرت غیلان بن سلمہؓ	″
حضرت ام ایمنؓ	۲۳۰	دوسرا واقعہ	۲۷۱
حضرت اسامہ ابن زیدؓ	″	تیسرا واقعہ	۲۷۴
نتائج تصریحات	۲۳۱	موہوبات اور روایت ابن عباسؓ	۲۷۷
آیت کی صحیح تفسیر	۲۳۶	موہوبات دراصل کون ہیں؟	۲۸۰
آیت کی غلط تفسیر	۲۳۹	چار ازواج مطہراتؓ	۲۸۴
حضرت زینبؓ کی زیدؓ سے شادی سلسلہ نبوت میں۔	۲۴۱	اصل زوجۂ محترمہ	۲۸۶
		دوسری بات	۲۸۸
بغیر مہر، بغیر ولی اور بغیر شاہدوں کے نکاح	۲۴۳	اس آیت میں تیسری بات	″

چوتھی بات ۲۸۹
پانچویں بات //
ضروری تنبیہہ ۲۹۰
اِس کے بعد ۲۹۱
۴ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ (باندیاں) ۲۹۳
حضرت ماریہ قبطیہؓ //
حضرت ریحانہ بنت زیدؓ ۲۹۶
کاشانۂ نبوی میں کوئی مِلکِ یمین نہیں تھی ۲۹۸
ازواج مطہراتؓ کے فرائض ۲۹۹

کتاب الطلاق ۳۰۳

طلاق کا طریق کار ۳۰۴
نشوز ۳۰۵
مصالحتی ٹریبونل ۳۱۰
تیسرا مرحلہ ۳۱۴
طلاق کا طریقہ ۳۱۵
طلاق حسن یا طلاق سنت ۳۲۰
طلاق بدعت ۳۲۴
امام احمد ابن حنبلؒ اور دیگر صحابہ و فقہاء //
امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی ایک ایک روایت ۳۲۶
اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ۳۳۰
پہلا سوال ۳۳۴
خبر بمعنی امر ۳۳۸
ایک طلاق کے بعد دوسری اور تیسری طلاق کیسے دی جاتی ہے؟ ۳۴۰
حلال کو حرام کرنا ۳۴۱
ہر طلاق عدت کی ابتداء پر ۳۴۳
نکاح عبادت ہے ۳۴۸
دوسرا سوال ۳۵۰
تیسرا سوال ۳۵۴
حضرت عمرؓ کے اقدام کی وجہ ۳۵۷
حضرت عمرؓ کا رجوع ۳۶۲
فاضل عزیز کی توجیہہ ۳۶۴
علامہ تمنّاؒ کی تفسیر ۳۶۷
طلاق صرف دو مرتبہ ۳۷۱
الف ولام عہد ۳۷۲
آیات خلع ۲۷۴
مِنْ بَعْدُ کا مضاف الیہ ۳۷۹
قاضی ثناء اللہؒ کی تائید ۳۸۶
اصطلاحی حلالہ کوئی چیز نہیں ۳۹۰
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ ۳۹۱
مختلعہ پر عدت نہیں؟ ۳۹۵
بقیہ مسائل طلاق ۳۹۹
نابالغ کی طلاق ۴۰۱
مجنون اور نائم کی طلاق //
جبری طلاق ۴۰۲

مدہوش آدمی کی طلاق	۴۰۲
باب ایقاع الطلاق	//
صریح اور کنایہ	//
باب تفویض الطلاق	۴۰۴
الامر بالید	۴۰۶
طلاق مشروط	//
استثناء	۴۰۸
باب الرجعة	۴۰۹
طلاق مریض	//
باب الرجعة	//
طریق رجوع	۴۱۶
شہادت	//
امساک	۴۱۸
سیدھا سوال	۴۲۰
باب الایلاء	//
بغیر حلف کے یہ عہد کر لینا	۴۲۴
عملاً بیوی کو چھوڑے رہنا	۴۲۵
شادی کر کے دور دراز چلا جانا	۴۲۶
ضبط تولید کی خاطر	۴۲۷
عجیب استدلال	//
افزائش نسل	۴۲۹
باہمی رضامندی سے	۴۳۰
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق پانچواں افسانہ	۴۳۱
آیات تخییر و افسانۂ ایلاء	//
حضورؐ کی زندگی	۴۳۲
حضرت خدیجہؓ سے شادی	۴۳۴
باقی ازواج سے کوئی اولاد نہیں ہوئی	۴۳۵
جنسی آسودگی نہیں	۴۳۶
ازواج مطہرات کا اصل کام	۴۴۱
باب الخلع	۴۴۷
خلع طلاق ہے یا فسخ	۴۴۸
اختلاف کا نتیجہ	۴۵۰
خلع کو فسخ نہیں کہا جا سکتا	۴۵۱
خلع کا معاوضہ	۴۵۳
معاوضہ کی مقدار	۴۵۷
ہماری رائے	//
مزید ایک نکتہ	۴۶۰
باب الظہار	۴۶۱
کفارۂ ظہار	۴۶۳
ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا	۴۶۴
کفارہ کے مسائل	۴۷۱
باب اللعان	۴۷۲
زوجین قابلِ شہادت ہوں	۴۷۶

بچہ کا انکار	۴۷۸
لعان سے انکار	//
کیا لعان تفریق ہے ؟	۴۷۹
لعان طلاق ہے	۴۸۰
بچہ کا نسب	۴۸۱
متعین مرد کے ساتھ تہمت	۴۸۲
عورت کی تہمت شوہر پر	۴۸۳
باب خیار الفسخ	۴۸۷
ناپسندیدگی	۴۸۹
باب العدۃ	۴۹۲
خلع، طلاق اور فسخ کی عدت	//
قروء کی تحقیق	۴۹۴
حاملہ کی عدت	۴۹۵
جسے ماہواری نہ آتی ہو	۴۹۶
جسے شوہر نے ہاتھ ہی نہ لگایا ہو	۴۹۷
ایسی عورتوں کا مہر	۴۹۸
حمل یا حیض کی اطلاع	۵۰۱
رجوع صرف اصلاح کے لئے	۵۰۲
سابق شوہر کے ساتھ نکاح ثانی سے روکنا بھی جائز نہیں	۵۰۳
عدت کی صحیح شمار ضروری ہے	۵۰۴
اگر عورت کو ماہواری نہ ہو	۵۰۶
حبان بن منقذؓ کی روایت	۵۰۷
نفس مسئلہ پر بحث	۵۰۹
نفی حجر	۵۱۰
ایک مثال	۵۱۱
ڈاکٹری تصریحات	۵۱۴
جب حیض کبھی ظاہر نہ ہوا ہو	۵۱۵
حیض کا رُک جانا	۵۲۰
جزوی حیض کی رکاوٹ	۵۲۴
غیر مدخولہ عورت کی عدت نہیں ہوتی	۵۲۹
فقہائے کرام کا عذر	۵۳۷
حمل کا علم	۵۳۸
حمل کی اکثر مدت	۵۳۹
عدتِ وفات	۵۵۰
عدت میں نکاح کا پیغام دینا	۵۵۱
نکاح بیوگان	//
عدت میں زینت وآرائش	۵۵۲
نفقہ اور گھر میں رہنے کا حق	۵۵۳
عدت وفات میں سال بھر تک نفقہ اور سکنیٰ کا حق	۵۵۵
ناسخ ومنسوخ	۵۵۸

اجرت رضاعت ۵۶۲
رضاعت کا پہلا حق ماں کا ہے ۵۶۳
زمانۂ عدت میں عورت گھر سے نہ نکلے ۵۶۴
باب ثبوت النسب ۵۶۶
نسب باپ سے چلتا ہے ۵۶۸
باب حضانۃ الولد ۵۷۰
اگر ماں نہ ہو ۵۷۵
مدتِ حضانت ۵۷۶
باب النفقۃ ۵۷۷
ناشزہ کا نفقہ ۵۸۰
ایک خادمہ کا نفقہ ۵۸۱
اگر شوہر نفقہ نہ دے ۵۸۲
سُکنیٰ کا مطلب ۵۸۵
دوسری پابندیاں ۵۸۶
بچہ کو دودھ پلانا ۵۸۷
چھوٹے بچہ کا نفقہ ۵۹۱
والدین و اجداد کا نفقہ //
ہر ذی رحم محرم کا نفقہ ۵۹۳
لاپتہ اولاد کے مال سے نفقہ //
[کتاب العتاق] ۵۹۴
مکاتبت ۵۹۵
اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً ۵۹۸
حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۶۱۰
لونڈیوں سے جنسی تعلق ۶۱۵
[کتاب الایمان] ۶۱۶
یمین غموس //
یمین لغو ۶۱۹
یمین منعقدہ ۶۲۰
ناجائز قسم ۶۲۳
عملیات اور پرہیز ۶۲۵

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق چھٹا افسانہ تحریم ۶۲۶
حضرت ماریہ قبطیہؓ کی کہانی //
شہد کی کہانی //
حضرت عمرؓ سے ابن عباس کی روایت //
موہوبات اور تحریم //
روایات میں اختلافات کی وجہ سے چند سوالات۔ پہلی روایت کی کہانی ۶۲۸
اب ایک دوسری کہانی سنیئے ۶۳۸
ایک تیسری کہانی سنیئے ۶۴۱
ایک چوتھی کہانی سنیئے ۶۴۴
مظاہرہ کرنے والی کون تھیں؟ ۶۴۷
قصۂ ماریہؓ پر تنقید ۶۵۳
شہد کے قصے پر تنقید ۶۵۹
روایت ابن عباسؓ کی حقیقت ۶۶۳
موہوبات اور تحریم ۶۶۷
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق ساتواں افسانہ ۶۸۸
پیغمبر کا راز //
خلافتِ شیخین کی پیشین گوئی //
مظاہرہ کرنے والے لوگ //
عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ //
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ //
صَغَتْ کے معنے ۶۹۷
مظاہرہ ۷۰۰
کفار و منافقین ۷۰۴
مشرکین مکہ کی طرح ۷۰۹
قسم کس کی ہوتی ہے؟ ۷۲۴
قسم کے الفاظ ۷۲۷
قسم کے ساتھ استثناء ۷۲۸

فقہ القرآن

تشکیل جدید فقہ اسلامی

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے کارنامہ تدوین فقہ کے بعد
ان کے نقش قدم پر چلنے کی ایک منکسرانہ کوشش

تعارف : از **مولانا طاہر مکی** صدر قرآنی مرکز (مشیر اسلامیات خالد اسحاق ایڈوکیٹ)

عرصہ دراز سے قدیم و جدید ہر مکتبہ فکر کی طرف سے یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ جدید دور کے لئے ایک نئے مجموعہ قوانین کی ضرورت ہے جو کتاب اللہ ' سنت رسول اللہ ﷺ اور تمام فقہاء اسلام کی محنتوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہو۔ قدامت پسند حلقوں میں سے مشہور صوفی عالم مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی۔ (ان کی تقریر دیکھئے تہذیب الاخلاق یکم محرم ۱۳۱۳ھ) اور جدید طبقہ کے سرخیل مصور پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ نے بھی اسی آرزو کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ :

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (jurus prudence) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم ہوگا۔ افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے مزاج سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ غرض یہ کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

(اقبال نامہ جلد اول خط نمبر ۱۹' صہ ۴۸)

اسی مکتوب کے شروع میں مولانا خواجہ احمد الدین امرتسریؒ سے فرمائش کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں :

"کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ ﷺ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے ہاں دوسرے ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے غرض کہ مولوی صاحب

موصوف یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔"

(اقبال نامہ جلد اول صہ ۴۸)

ملت اسلامیہ کی اس شدید ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ناتمام فقہ القرآن ہے جس میں مذکورہ اصولوں کی روشنی میں فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کی گئی ہے۔ اس عظیم الشان سلسلہ کی آٹھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور باقی زیر ترتیب ہیں۔

اس کتاب کی ایک اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی قانون کی تفصیل بیان کرنے کے ساتھ اس قانون سے متعلق آنحضرت ﷺ، آپ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ یا آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے بارے میں جو بعض غلط واقعات مشہور ہو گئے ہیں ان پر بھی محققانہ بحث کی گئی ہے۔ مثلاً نکاح کے باب میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عمر بوقت نکاح کے متعلق عام طور پر جو غلط فہمی پائی جاتی ہے اسے مستند حقائق کی روشنی میں دور کیا گیا ہے۔ اور اس طرح حضرت عائشہؓ کے کم عمری میں نکاح کو بلوغت سے قبل شادی کے جواز میں پیش کئے جانے کی بنیاد منہدم کر دی گئی ہے۔ اس کتاب کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بناء پر ہر حلقے میں اس کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ ملک کے چند نامور اخبارات کے تبصروں سے آپ اس کا بخوبی اندازہ فرما سکیں گے۔ لیکن ہماری آرزو تھی کہ اہل علم ہمارے کام کو دیکھیں اور اپنے تاثرات کا اظہار فرمائیں۔ علماء دیوبند کے حلقہ میں فکر ولی اللہی کے ترجمان کی حیثیت سے امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کو ایک خاص مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ فقہ القرآن کے مصنف کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار کی روشنی میں وہ اپنا فکری سفر طے کر رہے ہیں۔ (سندھی صاحب کے وہ شاگرد بھی ہیں) صدر ادارہ کی طرف سے اس بات کا اظہار پہلی جلد کی ابتدا ہی میں کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہم چاہتے تھے کہ فکر ولی اللہی اور مولانا سندھی کے ہمنوا خاص طور پر ہمارے کام کو دیکھیں اور اپنے مخلصانہ مشوروں سے نوازیں۔ پچھلے سال علامہ انور شاہ اور امام سندھی کے مشہور شاگرد' مولانا سعید احمد اکبر آبادی' باب الاسلام (سندھ) کانفرنس میں شرکت کے لئے جب کراچی تشریف لائے تو جنرل محمد ضیاء الحق کے استاد ہونے کی حیثیت سے اگرچہ ان کی معروفیات بہت زیادہ تھیں۔ لیکن جب ہم نے ان سے امام سندھی کے شاگرد اور "مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے اپیل کی تو وہ فوراً ادارۂ فکر اسلامی میں تشریف لانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مولانا کے اعزاز میں ہونے والی اس نشست میں کراچی کی مشہور علمی و دینی شخصیات تشریف فرما تھیں جن میں حضرت مولانا مفتی محمد

اسحاق صدیقی ندوی (سابق شیخ الحدیث و مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور حضرت مولانا محمد طاسین صاحب (اسلامی معاشیات کے ماہر اور ناظم مجلس علمی ناور) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو اس سے پہلے ہم فقہ القرآن جلد اول و دوم اور ہجم والی جلد بھجوا چکے تھے جس کے متعلق مولانا نے فرمایا کہ وہ ان پر اپنے ماہنامہ "برہان" میں تائیدی تبصرہ کریں گے۔ بہر حال اب کے مولانا اپنے علاج کے سلسلہ میں کراچی تشریف لائے تو ہم نے فقہ القرآن کی باقی جلدیں اور مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کی نگرانی میں لکھی گئی کتاب "ہماری مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ" بھی پیش کر دیں۔ مولانا اکبر آبادی نے ان کے مطالعہ کے بعد اپنے جن تاثرات کا اظہار فرمایا وہ اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔ (طاہر مکی)

کلمات ترحیب

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈائریکٹر شیخ الہندؒ اکیڈمی دیوبند مدظلہ العالی
ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی۔ سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں تو ہر منصف مزاج کو مسلمانوں کے بہت سے علمی و فکری معجزات نظر آتے ہیں لیکن اسلامی قانون پر جو عظیم الشان لٹریچر فقہائے کرام کی اجتہادی کاوشوں نے پیدا کیا اس کی تو دنیا میں نظیر ہی نہیں ملتی۔ یہ سب کرشمہ تھا ان کی اجتہادی فکر کا ان کی زندگی و حرارت کا ان کے نام لیواؤں کا یہ فرض ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے زمانہ کے حالات و عرف کے مطابق فقہ اسلامی کی تدوین جدید کریں اور دنیا پر اسلامی قانون کی برتری و سیادت کا پھر سکہ جمادیں۔

فقہ القرآن اسی مقصد کی جانب ایک قدم ہے۔ جس میں قرآن مجید کو مدار و محور بنا کر تمام فقہی ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور علمی انداز سے اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اجتہادی مسائل میں باہم اختلافات کی گنجائش رہتی ہے لیکن اس اختلاف کو وجہ مخالفت بنانا اور غیر شائستہ انداز میں ذاتیات پر اتر آنا نہ علمی مزاج کی نشاندہی کرتا ہے نہ اسلامی اخلاق کے مطابق ہے۔ خصوصاً مذہبی نمائندوں کے لئے تو یہ طرز عمل نہایت نامناسب ہے۔ اسلامی سوسائٹی پر ان کی گرفت کمزور کرنے میں ان کے اس طرز عمل کو بہت حد تک دخل ہے۔

بہر حال ادارۂ فکر اسلامی قابل مبارکباد ہے جس نے اس قدر عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا اور عزیزم

مولانا عمر احمد عثمانی (جنہیں میں دلی کے زمانہ سے جانتا ہوں) مستحق تحسین ہیں کہ وہ اس پل صراط سے نہایت سلامت روی سے گزرے ہیں۔ ان کی تحریر سنجیدہ و عالمانہ ہے۔ بزرگوں سے جہاں کہیں بھی اختلاف کیا ہے شائستگی اور وقار کے ساتھ کیا ہے بلکہ یہ اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔

فقہ القرآن کی جلد اول و دوم میں مولانا طاہر مکی کے قلم سے آل رقیہؓ کے متعلق جو علمی تحقیق پیش کی گئی ہے مجھے بہت پسند آئی۔ اس سے قبل پروفیسر اسلم اس کا مجھ سے ذکر کر چکے تھے لیکن شجروں اور تاریخی حوالوں کے ساتھ یہ تحقیق پہلی مرتبہ فقہ القرآن میں نظر سے گزری۔ اگر سیرت عثمانؓ لکھنے سے قبل یہ تحریر میری نظر سے گزر چکی ہوتی تو میں ان تاریخی حوالوں کے ساتھ آل رقیہؓ کا ذکر بھی اس میں کر دیتا۔ پیر عبدالستار شاہ صاحب کے شائع کردہ یہ شجرات جو مولانا طاہر مکی نے مجھے دکھائے اس میں استاد محترم حضرت علامہ انور شاہ کی تائید دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ جب میری زیر نگرانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حضرت الاستاذ پر مقالہ لکھا جارہا تھا' اس وقت بھی یہ بات سننے میں آئی تھی کہ حضرت الاستاذ کے جد امجد شاہ مسعود مزوری کا مظفر آباد کے بمبہ قبیلے سے تعلق ہے لیکن اس وقت ہمیں اس قبیلے کے متعلق کچھ معلومات نہیں تھیں اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔

اب مولانا طاہر مکی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آل رقیہؓ ہی کو مقامی طور پر بمبہ قبیلے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس موضوع پر حضرت الاستاذ کے حوالے سے بھی کام کی ضرورت ہے۔

عزیزم مولانا عمر احمد عثمانی نے فقہ القرآن کی شہادت و دیت نسواں والی جلد پر مجھ سے دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ دیت سے متعلق حصہ کا کچھ مسودہ میں دیکھ بھی چکا ہوں لیکن اب کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے باریک تحریر پڑھتے ہوئے بہت بوجھ پڑتا ہے۔ بشرط صحت انشاء اللہ پورا مسودہ دیکھ کر یہ فرمائش بھی پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ علمی کام کرنے والوں کو فتووں اور ہنگاموں سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ کیا امام اعظم نے جب علمی کام کیا تھا تو ہنگامے نہیں ہوئے تھے؟ امام بخاری پر ان کی ایک علمی جدت کی وجہ سے امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں جتنی تلخ و ترش تنقید کی ہے کیا وہ کسی صاحب علم سے پوشیدہ ہے؟ لیکن آج سب دیکھ رہے ہیں کہ امام اعظم کے علمی کام اور امام بخاری کی علمی جدت کو سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے اور ان حضرات کے مخالفین کے فتوے اور مخالفتیں سب دھری کی دھری رہ گئیں۔

سعید احمد اکبر آبادی 10/5/85 (بدھ)

''فقہ القرآن'' کے متعلق قدیم و جدید اہل علم کے تأثرات

اور مشہور اردو انگریزی اخبارات کے تبصرے

مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت فقہ القرآن کی دس جلدیں ہیں قارئین جس عنوان سے دلچسپی رکھتے ہوں اسے حاصل کر کے اپنے ذوق کی تسکین فرما سکتے ہیں۔ پوری سیریز خریدنے کی ضرورت نہیں:

۱۔ فقہ القرآن: عبادات (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)
۲۔ فقہ القرآن: خاندانی معاملات (نکاح و طلاق وغیرہ)
۳۔ فقہ القرآن: حقوق نسواں اور باہمی حقوق
۴۔ فقہ القرآن: شہادت و دیت نسواں
۵۔ فقہ القرآن: حدود و تعزیرات اور قصاص
۶ فقہ القرآن: رجم اصل حد ہے یا تعزیر
۷۔ فقہ القرآن: وصیت و وراثت
۸۔ فقہ القرآن: عدلیہ اور اجماع
۹۔ فقہ القرآن: سیرتِ طیبہ کے ازدواجی معاملات
۱۰۔ فقہ القرآن: بغاوت و خارجیت اور قصاصِ عثمانؓ و بیعتِ رضوان

ان عنوانات پر مشتمل فقہ القرآن کی مجلدات پر دانش قدیم و جدید کے تأثرات کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

تبلیغی نصاب کے مؤلف اور مؤطا شریف، بخاری شریف، ترمذی شریف کے شارح، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری مہاجر مدنی کے دعائیہ کلمات

''تم نے جو لکھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے ارشادات سب کے سب قرآن سے ماخوذ ہیں بالکل صحیح لکھا۔ اللہ تعالیٰ تمھاری کوشش کو بارآور کرے۔ اللہ تعالیٰ تمھیں لغزشوں سے محفوظ رکھے، لغزش تو پیارے کس سے نہیں ہوتی؟ اللہ تعالیٰ سب کو معاف کرے، اپنی طرف سے دیدہ و دانستہ نہیں کرنی چاہیے اتنا ہی بہت ہے۔ تمھارے لیے واقعی دل سے دعا نام لے کر بھی اور بغیر نام لیے تو بہت کثرت سے کرتا ہوں، تم تو میرے قدیم لاڈلے ہو، اور استاذی اعلیٰ اللہ تعالیٰ مرقدہٗ☆ کے یادگار ہو۔ اللہ تمھیں ہر لغزش سے محفوظ رکھے۔ تمھاری تصانیف کو قبول فرمائے۔ لوگوں کو ان سے منتفع فرمائے''۔ (تفصیل کے لیے ''فقہ القرآن، شہادت و دیت نسواں'' والی جلد ملاحظہ ہو)۔

مفکر اسلام مولانا محمد اسحٰق صدیقی ندوی سابق شیخ الحدیث و مفتی و مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ صدر شعبۂ دعوت و ارشاد، بنوری ٹاؤن کراچی کے ارشادات

یوں تو ''فقہ القرآن'' کے تمام مباحث علمی اور اعلیٰ پیمانے کے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وعلیٰ ازواجہ و اصحابہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق افسانوں کی جس طرح مدلل وضاحت کی گئی ہے اس کے نتیجے میں آپ اور مولانا طاہر مکی اور ادارہ کے تمام حضرات نے جنت کا سامان مہیا کر لیا ہے اللہ تعالیٰ ان محنتوں کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھائے اور امت کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کے ڈائریکٹر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے صدر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ارشاد

ادارۂ فکر اسلامی قابل مبارک باد ہے جس نے اس قدر عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا

☆ یعنی مولانا عمر احمد عثمانی کے والد شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی جو شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے استاد تھے۔

اور عزیزم مولانا عمر احمد عثمانی (جنھیں میں دلّی کے زمانے سے جانتا ہوں) مستحق تحسین ہیں کہ وہ اس پل صراط سے نہایت سلامت روی سے گزر رہے ہیں۔ ان کی تحریر سنجیدہ و عالمانہ ہے۔ بزرگوں سے جہاں کہیں بھی اختلاف کیا ہے شائستگی اور وقار کے ساتھ کیا ہے بلکہ یہ اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔

علمی کام کرنے والوں کو فتووں اور ہنگاموں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ امام اعظم نے جب علمی کام کیا تھا تو کیا ہنگامے نہیں ہوئے تھے؟ امام بخاری پر ان کی ایک علمی جدت کی وجہ سے امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں جتنی تلخ و ترش تنقید کی ہے کیا وہ کسی صاحب علم سے پوشیدہ ہے؟ لیکن آج سب دیکھ رہے ہیں کہ امام اعظم کے علمی کام اور امام بخاری کی علمی جدت کو سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے اور ان حضرات کے مخالفین کے فتوے اور مخالفتیں سب دھری کی دھری رہ گئیں۔ (''فقہ القرآن، شہادت و دیت نسواں'' والی جلد)

معاشیات اسلامی کے ماہر مولانا محمد طاسین صاحب مہتمم مجلس علمی بنوری ٹاؤن
(مولانا یوسف بنوری کے بڑے داماد)

میں جب اسلامی نظریاتی کونسل کے سلسلے میں اسلام آباد گیا تو اس کے چیئرمین نے ''فقہ القرآن'' کا بڑا تعریفی تذکرہ کیا اور کہا کہ آپ بھی اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ میں نے ان سے ہنستے ہوئے گزارش کی کہ آپ نے تو اس کتاب کا صرف مطالعہ کیا ہے، میں نے نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ مجھے اس کے روح رواں مولانا طاہر مکی اور اس کے مؤلف مولانا عمر احمد عثمانی سے صدیقانہ اور برادرانہ تعلق کی سعادت بھی حاصل ہے۔

''فقہ القرآن'' کی معاشیات سے متعلق جلد پر نظرثانی میں شرکت کے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو ہمت و استقامت عطا کرے اور علمائے سوء کے فتنہ اور شر سے محفوظ رکھے۔ آمین

برصغیر کی مشہور علمی خانقاہ پھلواروی شریف کے سجادہ نشین اور سرسیّد و علامہ اقبال کے ممدوح حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کے صاحبزادے سیّد العلماء
مولانا جعفر شاہ صاحب ندوی پھلواروی کے کلماتِ تقریظ

ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور میں فقہ کی تدوین جدید کی تجویز حضرت

قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنی تقریر میں پیش فرمائی تھی۔ یہ پوری تقریر سرسیّد نے اپنے اخبار ''تہذیب الاخلاق'' (مؤرخہ یکم محرم ۱۳۱۴ھ) میں شائع کی۔ اس میں صرف فقہ ہی نہیں بلکہ تاریخ وتصوف اور دیگر علوم پر بھی نظرثانی پر زور دیا گیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد علامہ اقبال نے کہا کہ

> ''وہ شخص اس دور کا مجدد ہوگا جو قرآن کریم کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے ایک جدید فقہ مرتب کردے''۔ (اقبال نامہ، علامہ اقبال کا خط پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام)

قیام پاکستان کے بعد راقم الحروف نے بھی یہ سوال بار بار اٹھایا، محض زبانی نہیں بلکہ بہت سے معاشرتی، سیاسی، تاریخی، ازدواجی اور دوسرے فقہی مسائل پر بلاخوف لومۃ لائم اپنی آزادانہ رائے شائع کردی جس کے عوض ایک ساتھ دعائیں بھی لیں اور گالیاں بھی۔

مگر آج غلط نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ علامہ اقبال کی آرزو کی تکمیل حضرت علامہ عمر احمد عثمانی ابن شیخ الحدیث علامہ ظفر احمد تھانوی کی شکل میں ابھر رہی ہے اور ان شاء اللہ یہی خواب اقبال کی تعبیر ثابت ہوں گے اور اسلامی قانون سازی کے لیے ان کی یہ کتاب بلاشبہ روشنی کا مینار ثابت ہوگی۔

فراہی مکتب فکر کے امام ثانی مولانا امین احسن اصلاحی کے جانشین مولانا خالد مسعود صاحب کے سہ ماہی ''تدبر'' لاہور (اپریل ۱۹۸۶ء) کے تبصرے کی جھلکیاں

ادارۂ فکر اسلامی کراچی نے ایک نہایت قابل ستائش قدم اٹھایا ہے۔ اس ادارے نے فقہ کی ایسی کتاب تیار کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے جو پوری اسلامی فقہ کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہو۔ کتاب تصنیف کرنے کے لیے ادارے نے مولانا عمر احمد عثمانی سے رجوع کیا جو ملک کے معروف دینی وعلمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ مولانا نے ''فقہ القرآن'' کے نام سے ایک سلسلۂ کتب تیار کردیا ہے جس کی جلد ششم ہمارے پیش نظر ہے۔

ہماری قوم کی یہ بدقسمتی ہے کہ جمود اور تقلید کی جڑیں اس قدر گہری ہوچکی ہیں کہ دین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی اگر کوئی عالم، خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ، عام موقف سے

ہٹ کر کوئی نئی تحقیق پیش کرے تو لوگ اس پر کفر یا کم از کم انکار حدیث کا لیبل چسپاں کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ اگر کچھ لوگ مولانا عثمانی کے متعلق بھی یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں اسے نظرانداز کرنا چاہیے۔

جناب جسٹس قدیرالدین احمد سابق چیف جسٹس مغربی پاکستان و سابق گورنر سندھ

میں نے ''فقہ القرآن'' کی مجلدات کا مطالعہ کیا اور یہ معلوم کر کے دلی خوشی ہوئی کہ ''فقہ القرآن'' کا مقصد ایک عظیم خدمت کی انجام دہی ہے اور ایک ایسے خیال کی تائید ہوئی ہے جو بار بار میرے دل و دماغ پر چھا چکا تھا لیکن میں اپنی کم بضاعتی کے سبب اس طرف توجہ نہیں دے سکا تھا، وہ خیال یہ تھا کہ ہمارے پاس ایک فرقے کی فقہ تو موجود ہے لیکن ایسی فقہ میسر نہیں ہے جو فرقہ وارانہ ترجیحات سے بلند تر ہو، اور خالص اسلامی فقہ کہلائی جا سکے۔

مؤلف وسعت نظری کے قائل ہیں تنگ نظری کے نہیں جو راستہ انھوں نے اپنے لیے مقرر کیا ہے وہ دشوار گزار ہے اور جو منزل متعین کی ہے وہ جدید ہے۔ مگر اس کا امکان کہاں ہے کہ اس فقہ کا نفاذ ہو جو سب فرقوں کے اعتقاد سے گزر کر براہ راست کلام اللہ سے اخذ کی گئی ہو۔

ان حالات میں مولانا عمر احمد عثمانی کی یہ دعوت کہ براہ راست کلام پاک کے احکام کی طرف آؤ ایک مجاہدہ ہے۔ اس کوشش میں ان کی کامیابی دنیائے اسلام کے لیے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے باعث فخر اور سعادت ہوگی۔ (تفصیل کے لیے ''فقہ القرآن، وصیت و وراثت'' والی جلد ملاحظہ ہو)۔

جناب جسٹس آفتاب حسین صاحب چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت

وفاقی شرعی عدالت کا چیف جسٹس ہونے کے بعد میرے سامنے جناب انصار برنی ایڈوکیٹ کی ایک درخواست پیش ہوئی۔ اس دوران ''فقہ القرآن'' کی تیسری جلد، پہلی مرتبہ میری نظر سے گزری اور مولانا عمر احمد عثمانی کے بصیرت افروز خیالات اور عورتوں کے متعلق موضوعات پر ان کے شرعی دلائل پڑھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہمارے علمائے کرام میں ایسے باہمت اور جری لوگ موجود ہیں جو اپنے انقلابی خیالات کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے بالکل نہیں گھبراتے۔ مجھے بارہا ایسے علماء سے سابقہ پڑا ہے جو ان معاملات میں میرے ہم خیال تھے لیکن علماء کی محفل میں ان خیالات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ تحریر کی جرأت سب سے پہلے مولانا عمر احمد عثمانی کو

ہوئی۔ ان کے بعد پروفیسر طاہرالقادری کے مضامین بھی عورت کی نصف دیت کی مخالفت میں شائع ہوئے جناب ریاض الحسن نوری صاحب نے بھی بذریعہ مضمون اور مذاکرہ اسی نقطۂ نظر کی تائید کی۔ مشہور اہلحدیث عالم مولانا محمد حنیف ندوی نے بھی اس کے حق میں بیان دیا۔

آخر میں، میں مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کو ان کتابوں کی تالیف پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ خدا ان کو مسلمانوں کی رہبری کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ (تفصیل ''فقہ القرآن، شہادت و دیت نسواں'' والی جلد میں)

محترم جسٹس عبدالقدیر چودھری چیف جسٹس بلوچستان ہائی کورٹ

جناب علامہ عمر احمد عثمانی جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں ملت اسلامیہ کے مجموعی شعور سے باخبر ہیں۔ اس میدان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ فاضل مصنف نے کتاب وسنت اور فقہ کی مستند کتابوں کی روشنی میں انتہائی اہم بنیادی مسائل جیسے القضاء اور اجماع کا جائزہ لیا ہے۔ ان کی صائب رائے، اہل نظر کے لیے اپنے اندر دعوت فکر کا زبردست سامان رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے گہری تحقیق کی ہے۔ مجھے امید واثق ہے کہ ان کی مخلصانہ محنت کو بنظر استحسان دیکھا جائے گا۔ اور اہل علم حضرات بالعموم اور علماء، قانون ساز اداروں کے اراکین اور وکلا بالخصوص مفید پائیں گے۔

ملک کے نامور ماہر دستور و قانون جناب خالد اسحٰق ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

''فقہ القرآن'' کی مجلدات خصوصاً الرجم اور حقوق نسواں علمی حلقوں میں خاصی شہرت پاچکی ہیں۔ مولانا عمر احمد عثمانی نے (مروجہ فقہ کا) قرآن کی روشنی میں از سرنو جائزہ لیا ہے۔ سالہا سال کیا؟ صدیوں کے تقدس کے غلافوں نے صاحبِ تصنیف کی تنقیدی نگاہ کو نہیں روکا۔ جہاں بھی مولانا نے تاریخی فقہ کو قرآن سے ٹکراتے پایا ہے وہاں اس مسئلے کو بہت ہی محنت کے ساتھ دیکھا اور پرکھا ہے اور جو کچھ صحیح سمجھا ہے اسے کھول کر بیان کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک مستحسن پہلو ''واقعۂ افک'' کے سلسلے میں عثمانی صاحب کی تحقیق ہے۔ علم حدیث کے تمام اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کرب انگیز قصے کی تحقیق کی ہے جو حقیقت میں صاحب کتاب کے لیے توشۂ آخرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم

علم حدیث کے سنہرے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تاریخی ورثے کو از سر نو جانچیں۔ عین ممکن ہے کہ ہمیں ایسی بہت سی روایات سے چھٹکارا مل جائے جو لاتعداد نیک نیت مسلمانوں کے لیے نہ اٹھا سکنے والا بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ کیوں کہ قرآن معیار اوّل ہے اور سنت معیار دوم۔ اور اس کے بعد قدر و منزلت واضح دلیل کی ہے، کسی اونچے نام کی نہیں۔

بہرحال یہ کتاب پڑھنے والوں پر احسان اور مؤلف کے لیے باعث تحسین ہے۔

انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کراچی ۲۷/فروری ۱۹۸۱ء

یہ کتاب ایک تحقیقی کام ہے اور مصنف میں یہ جرأت موجود ہے کہ وہ اپنے پیشروؤں سے اس میدان میں اختلاف کرسکیں۔ جذباتی طور پر نہیں بلکہ علمی استدلال کے ساتھ۔ وہ اسلاف کے اقوال کو نقل ہی نہیں کرتے بلکہ اسلامی فقہ کے چاروں مکاتب فقہ میں پورے علمی انداز سے بغیر کسی قسم کے تعصب کے موازنہ بھی کرتے ہیں۔

مثلاً اس کتاب میں کم سنی کی شادیوں کے تصور پر نہایت مدلل تنقید کی گئی ہے کہ قرآنی آیات سورہ ۴، آیت ۱۹ تا ۲۱ سے واضح ہے کہ کسی بھی آدمی کو کسی بھی عورت سے بغیر اس کی مرضی کے نکاح نہیں کرنا چاہیے اور نساء کا لفظ بالغ عورتوں کے لیے ہی بولا جاتا ہے نابالغ لڑکیوں کو نساء نہیں کہا جاتا۔ نیز ارشاد ہے کہ شادی کے معاملے میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہونی چاہیے سورہ ۴، آیت ۱۹، پھر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نکاح کے وقت عمر پر مفصل و مدلل گفتگو کرکے واضح کردیا ہے کہ ان کی نکاح کے وقت عمر مندرجہ بالا قرآنی آیات کے عین مطابق تھی۔

روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور (انگریزی) ۱۷/اپریل ۱۹۸۱ء

مجموعی طور پر یہ کتاب اسلامی قوانین کی تشکیل جدید کے ضمن میں موجودہ دور کے تقاضوں کی روشنی میں ایک نہایت ہی جرأت مندانہ اقدام ہے۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب ایک مفید رہنما ثابت ہوگی نیز ان لوگوں کے لیے بھی جو ملک میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کا شدید اشتیاق رکھتے ہیں۔

روزنامہ ''جنگ'' کراچی، ۱۰/اپریل ۱۹۸۱ء

یہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے اور ہر طرف اسلامی اقدار کی احیاء کا چرچا ہے۔ اس

ہنگامے میں مسلمانوں کی شدید ضرورت یہ ہے کہ انھیں معلوم ہو کہ اسلام کے بنیادی تقاضے کیا ہیں اور ہمارے لیے کون سے اعمال درجہ اوّل کی اہمیت رکھتے ہیں۔ مؤلف موصوف نے فقہ کی مشہور کتاب ''ہدایہ'' کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ ہماری فقہ میں وہ کون سے مسائل ہیں جو قرآن سے ثابت نہیں لہٰذا ان کی وہ بنیادی اہمیت نہیں ہے جو پہلی قسم کے مسائل کی ہوتی ہے۔

روزنامہ ''جسارت'' کراچی، ۸؍ مارچ ۱۹۸۱ء

مولانا عمر احمد عثمانی نے بڑی قابلیت و محنت سے قرآنی مسائل کا انسائیکلوپیڈیا مدون کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عظیم دعوے کے ساتھ شروع ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے سب کے سب قرآن کریم سے مستنبط اور ماخوذ ہیں۔ یہ دعویٰ جتنا چونکا دینے والا ہے، اس کا ثبوت اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والا ہے۔ چنانچہ بہت سی باتیں، واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پہلی مرتبہ بے نقاب کی ہیں۔

فقہی نقطۂ نظر سے اظہار رائے کا حق تو علمائے کرام اور مفتیان عظام ہی کو حاصل ہے، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ موصوف کو حق تعالیٰ نے علم دیا ہے اور قلم میں طاقت دی ہے کہ وہ اپنے علم کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اپنے قاری کو قرآنی دلائل سے پوری طرح مطمئن کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو اسلام کی مزید خدمت کرنے کا موقعہ عنایت فرمائے اور وہ اپنے مشن کو مکمل کر سکیں۔ آمین۔

ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی، یکم فروری ۱۹۹۰ء

ممتاز عالم دین مولانا عمر احمد عثمانی کی مبسوط کتاب ''فقہ القرآن'' کی آٹھویں جلد میں علامہ شوکانی کی اصول فقہ کی کتاب کے باب الاجماع کا ترجمہ اور مختلف ائمہ کے نزدیک اجماع کی حیثیت کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ ''فقہ القرآن'' پر مبنی یہ محققانہ تالیف علماء اور اہل فکر و نظر میں پسند کی جائے گی اور اسلامی آئین و قوانین پر تحریر کردہ کتب میں ایک بیش بہا اضافہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆

فقہ القرآن

ایک ارمغان علمی کا تعارف

اور جدید عصری مسائل کے سلسلہ میں حضرات اہل علم سے گذارش

از مولانا سعید الرحمٰن علوی (ایڈیٹر خدام الدین لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی قدر مولانا طاہر مکی صاحب۔ وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

آپ کے کئی خطوط پے در پے یاد دہانی کے ملے مگر مختلف اسفار اور مصروفیات کی وجہ سے جواب دینے میں تاخیر ہوئی۔ اب آپ کے ارشاد کے مطابق فقہ القرآن پر تبصرہ پیش خدمت ہے۔ امید ہے پسند آئے گا یہ تبصرہ ماہنامہ اسلامی انقلاب لاہور کے اگست ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے اسے حافظ حقانی میاں کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔

سیاسیات و معاشیات پر بھی آپ حضرات جلد سے جلد اپنی محنتیں منظر عام پر لائیں' آپ جیسے انتھک اور جواں ہمت بھی اگر اس معاملہ میں مصلحتوں کا شکار ہو گئے تو پھر کس سے توقع کی جائے گی؟

محترم مولانا طاسین صاحب سے لاہور کانفرنس میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آپ حضرات کے بہت معترف اور بڑے مداح ہیں۔ خصوصاً آپ سنی کونسل کے پلیٹ فارم سے اہلسنت کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ واقعی قابل تحسین و ستائش ہیں۔

پروفیسر اسلم صاحب بھی اس موقعہ پر موجود تھے وہ بھی اس گفتگو میں شریک رہے۔ میرا تبصرہ بھی پڑھا اور کہا کہ جب آپ خط لکھیں تو امام غائب کو میرا سلام بھی لکھ دیں (یہ ان

کی فرمائش کی تعمیل کردی)

اپنے والد محترم حضرت قاری صاحب کی خدمت میں خصوصی سلام کے بعد اس گفتگو کی یاد دہانی کرادیں جو میں ان کے استاذ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری کے جمعیۃ علماء ہند سے تعلقات کے حوالہ سے کرنا چاہتا ہوں' اس کے متعلق آپ کے والد کے ہم سبق پیر بابا (بنیر 'سوات) کی مسجد کے خطیب مولانا عبدالغفور سے میں انٹرویو لے چکا ہوں۔

امام اہلسنت حضرت مولانا مفتی محمد اسحاق صدیقی اور برادرم مولانا عمر احمد عثمانی اور ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان کی خدمت میں سلام۔

محمد سعید الرحمٰن علوی

3/9/1989

تبصرہ

اسلام ' اللہ تعالیٰ کا آخرین دین ہے جو بنی نوع انسان کے لیے نازل کیا گیا' اس صحیفہ مقدس کی تبیین و وضاحت کا کام حضور اقدس محمد عربی صلوٰۃ اللہ تعالیٰ علیہ وسلامہ کے ذمہ لگایا گیا۔ قرآن ہی میں ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ۔ (النحل : ۸۹)

" ہم نے تجھ پر "الکتاب" نازل کی' (دین کی) تمام باتیں بیان کرنے کے لیے اور اس لیے کہ مسلمانوں کے لیے رہنمائی ہو اور رحمت اور خوش خبری۔"

(ترجمہ : مولانا ابوالکلامؒ)

حضور اقدس علیہ السلام نے زندگی میں اس فرض کو پورا کیا لیکن آپ ﷺ کی نگاہ نبوت وبصیرت اس بات کو دیکھ رہی تھی کہ اس کارگہ حیات میں انسان کو رنگارنگ مسائل اور نوع بنوع مہمات سے پالا پڑے گا اس لیے آپ ﷺ نے صاحب نظر' صاحب بصیرت اور صاحب علم لوگوں کو مجتہدانہ انداز سے ان مسائل سے نمٹنے کی تلقین کی۔ مشہور صحابی

جنہیں حدیث میں "اعلم بالحلال والحرام" کہا گیا ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور معلم و قاضی یمن بنا کر جب آپ ﷺ نے بھیجا تو ان سے یہ سوال کیا کہ :

لوگوں میں فیصلے کس ذریعے سے کرو گے ؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ کے ذریعہ۔ دوسرا سوال تھا کتاب اللہ میں مسئلہ نہ ملے تو؟ عرض کیا آپ ﷺ کے ارشادات عالیہ کا سہارا لوں گا۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ اگر یہاں بھی بات نہ بنی تو پھر ؟۔ اس پر انہوں نے عرض کیا اجتہد برأیی۔ غور و فکر سے کام لے کر اپنی رائے سے معاملہ نمٹاؤں گا۔ اس پر محمد عربی علیہ السلام بے حد مسرور ہوئے اور فرمایا :

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ تعریف و ثنا کی مستحق وہ ذات کبریا ہے جس نے اپنے رسول (محمد عربی) کے نمائندہ (معاذ بن جبل) کو توفیق خیر سے سرفراز فرمایا۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار ارشادات اس بات کے غماز تھے۔ چنانچہ سوچ وبچار، غور و فکر اور مجتہدانہ انداز سے مسائل کے حل کی کاوشیں دور صحابہؓ میں شروع ہو گئیں۔ جس کی تفصیلات اپنی جگہ موجود ہیں اور پھر صحابہؓ کے بعد ایک عرصہ تک یہ انداز فکر مسلمانوں میں قائم رہا۔ ہمارے ائمہ فقہا بالخصوص ائمہ اربعہ سیدنا الامام ابو حنیفہ، سیدنا الامام مالک، سیدنا الامام شافعی اور سیدنا الامام احمد بن حنبل رحمھم اللہ تعالیٰ۔ کا اس سلسلہ میں زبردست رول اور کارنامہ ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی اور اسلامک لاء کے سلسلہ میں نہایت ہی ذمہ دارانہ کام کر کے آنے والی نسلوں کی رہنمائی کی۔ بالخصوص سیدنا الامام ابو حنیفہؒ نے اپنے دور کے متعدد ارباب بصیرت کو ساتھ لے کر سالہا سال کی کاوش سے جو کارنامہ انجام دیا وہ رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا اور اس احسان کو ہر شریف شخص تسلیم کرے گا۔ المیہ یہ ہوا کہ صدیوں کے بعد جب مسلمان قوم عروج سے زوال اور بلندی سے پستی کے غار میں لڑھکی تو اس کے بہت سے کام تعطل کا شکار ہو گئے۔ اس کے علمی سوتے خشک ہو گئے۔ اجتماعی سطح پر مسائل مہمہ پر غور و فکر کی روایت دم توڑ گئی اور نوع بنوع پیش آنے والے چیلنجوں سے حسن و خوبی سے عہدہ بر آ ہونے کی عادت ترک ہو گئی۔

پھر اس کے بعد وقت نے پلٹا کھایا اور گویا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک ابھری (حالانکہ ہمارے خیال ، میں شاید یہ اصطلاح ہی ٹھیک نہیں۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ اس تحریک کو مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کہا جائے اور اس بات سے تعبیر کیا جائے کہ مسلمان انگڑائی لے رہے ہیں۔ خیر) اس موقع پر مسلمان قوم عجیب المیہ کا شکار ہوئی۔ مدعیان علم کے ایک طبقہ نے لکیر کا فقیر بننے کو ترجیح دی اور قدیم سرمایہ فقہی کو کافی قرار دیا اور اس سے آگے ایک قدم بڑھانا درست خیال کیا۔ حالانکہ جدید صنعتی مسائل اور ان جیسے حالات میں ارباب بصیرت سر جوڑ کر کوئی فیصلہ کرتے تو یہ بات امت کے حق میں رحمت ہوتی اور اس سے قدیم سرمایہ فقہی پر مطلق آنچ نہ آتی۔ قدیم سرمایہ علمی کو جو اہمیت حاصل ہے اور اس میں جو اصولی و کلی تعلیم و ہدایات ہیں' کوئی بڑے سے بڑا مدعی اجتہاد اور تقلید سے لبا کرنے والا بھی ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی اپنے کمرہ مطالعہ و لائبریری میں اس سرمایہ کو لے کر بیٹھا عقل و دانش کے گھوڑے دوڑا رہا ہوگا۔ اور اسی بحر علم سے موتی نکالنے میں مصروف۔ دوسری طرف ایک طبقہ نے مطلق آزادی اور بے قید اجتہاد کا نعرہ لگا کر معاشرہ کی چولیں ہلا ڈالنے کی نامسعود سعی کی۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ بخت نے اقتدار و حاکیت کا سہرا اس گروہ کے سر باندھ دیا اور یہ طبقہ کھل کھیلنے لگا۔ اس سلسلے میں مسلم دنیا میں ترکی کو اولیت حاصل ہوئی کہ وہاں مصطفیٰ کمال پاشا نے جدید ترکی کے نام پر عجیب و غریب حرکتیں کیں اور بد قسمتی سے اس کو تعمیر و ترقی کا نام دیا۔

متحدہ ہندوستان کے دینی رہنما اور بیدار مغز عالم مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس روش پر تنقید کی اور لکھا کہ :

"ترکی اور ایران میں قومیت اور وطنیت کے نام پر جو کچھ کیا گیا' اس سے بھی ہمیں متوحش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ان ممالک کی نظر کو سامنے رکھ کر ان کی سو فیصدی تقلید ہرگز نہ کرنی چاہیے' میرا عقیدہ ہے کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال نے جو کچھ اصلاحات مذہب کو نظر انداز کر کے کی ہیں وہ مذہبی اصلاح کے راستے سے بھی لائی جا سکتی تھیں۔ مصطفیٰ کمال اپنی قوم کو جس منزل پر لانا چاہتا تھا۔ اس منزل پر لانے کے لیے مغربی

نظریہ قومیت کی تقلید کرنا ضروری نہ تھا۔

(جامعہ دہلی فروری ۱۹۴۷ء بعنوان "اگر ملک تقسیم نہ ہوتا")

انہوں نے مزید کہا اور بالکل صحیح ہے کہ :

"وطن پرستی کے اس نظریے کی بناپر جو یورپ میں پایا جاتا ہے' ان ممالک میں جو کچھ کیا گیا' وہ ہمارے لیے کسی طرح بھی قابل تقلید نہیں ہمارے لیے یہاں رہ کر وطن اور اسلام دونوں رشتوں کو باقی رکھنا ہے اور یورپ کی قوموں کی طرح ہم ایک لمحے کے لیے بھی اسلام کے اس وسیع رشتے کو جو ہم کو دنیا کے کروڑوں انسانوں سے وابستہ کرتا ہے ہندوستانی قومیت کے اندر فنا نہیں کرنا ہے۔" (حوالہ بالا)

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے "مذاہب کی اصلاح و ترمیم" کے تصور اور اصلاح کو یکسر رد کر دیا اور واضح طور پر کہا کہ عیسائی اور ہندو اگر یہ کام کر رہے ہیں تو سو بار کریں لیکن

"میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو مذہبی احکام میں اس طرح کی ترمیم و اصلاح کی یکسر ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی شریعت کے قوانین جامع و مکمل ہیں ان میں نہ ترمیم کی گنجائش ہے' نہ اصلاح کی۔"

("خطبات جمعہ و عیدین" صہ ۶۶' ۶۷)

اس طرح کی بات وہ شخص کر رہا ہے جس کے ایمان تک کو بعض کور باطنوں نے معرض نقد میں تولا اور اس پر طرح طرح سے بہتان تراشی کی اس نے کہا تو یہ کہ :

"دوسری قوموں کو زندہ رہنے کے لیے اگر اپنے اپنے مذاہب میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی شریعت کو اور مضبوط پکڑیں اور قوانین اسلام کی شدت سے پیروی کریں۔ دوسری قوموں کی فلاح و بہبود اگر اپنے اپنے مذہب سے دوری اختیار کرنے میں ہے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا راز اپنے مذہب سے گرویدگی و اتباع کامل میں مضمر ہے لیکن مسلمان اپنے مذہب سے بعد اختیار کر رہے ہیں اور جو شے ان کی ترقی' بہبود' و فلاح کی ضامن ہے اس سے روگردانی کر رہے ہیں۔

انہوں نے ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں گورنمنٹ کو مشورہ دیا :

"پس گورنمنٹ کی بھی مصلحت یہی ہونی چاہیے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لیے چھوڑ دے کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لیے اور نیز تمام عالم کے لیے یکساں طور پر مفید ہو سکتے ہیں۔"

ہاں وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ فقہی مسائل کی اصلاح یا دوسرے لفظوں میں اس سرمایہ میں یہ شکل بے حد ضروری ہے کہ عصری ضرورتوں کا لحاظ کر کے وقت کے چیلنج کا جواب دیا جائے۔

یہ کام کون کرے؟۔ اصحاب علم وبصیرت اور ارباب فکر و دانش اور ماہرین قانون اسلامیہ کی ایک جماعت جو:

الف: دین کے علوم ضروریہ کی ماہر اور عربی ادب پر کامل عبور رکھتی ہو۔

ب: قرآن کے وہ حصص جو احکام واصول سے متعلق ہیں' وہ بطور خاص ان کی نگاہ میں ہوں نیز وہ اصول تفسیر اور متداول و معروف تفسیری ذخیرہ سے' کماحقہ واقف ہو۔

ج: عصری تقاضوں اور ضروریات پر ان کی نگاہ ہو اور تاریخ اسلام' تاریخ فقہ اسلامی کے تمام ادوار وازمنہ پر بھی ان کی کامل نظر ہو۔ جو قانون اسلام کی ترتیب وانضباط پر ہمیشہ اثر انداز ہوتی رہی۔

گویا مولانا نے بڑے اختصار و جامعیت کے ساتھ وہ تمام باتیں اور شرائط و آداب ذکر کر دیئے جن کا تعلق اجتہاد سے ہے۔ وہ خود اس بات کی طرف توجہ کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ استخلاص وطن کی عظیم الشان تحریک نے انہیں اس کا موقعہ فراہم نہ کیا۔ علامہ اقبالؒ بھی اس سلسلہ میں ایک سوچ رکھتے تھے لیکن ان کی مشکل یہ تھی کہ ان کی خواہش تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ لاہور آجائیں تو مل کر یہ کام کیا جا سکے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

بہر حال مولانا آزاد کا ایک بیان ۴؍جولائی ۱۹۴۵ء کو شملہ سے اس وقت جاری ہوا جب وہ قلعہ احمد نگر کی اسیری سے رہا ہوئے۔ اخبارات نے اس مفصل بیان کو "اصلاح و تجدید فقہ اسلامیہ کی مہم" کے عنوان سے شائع کیا۔

"میں قلعہ احمد نگر میں نظر بند تھا کہ رپورٹر کی شائع کردہ ایک خبر سے میرا دل بہت متاثر ہوا' خبر یہ تھی کہ علماء فلسطین نے فقہاء کی ایک مجلس قائم کی جو اسلامی قانون پر نظر ثانی کرے گی اور اس کو اسلام کے بنیادی اصول کے مطابق از سر نو منظم کرے گی تاکہ یہ قانون عصر حاضر کی ضرورتوں کا کفیل ہو سکے۔ یہ مجلس فقہ حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلی کو جمع کرے گی اور اس مجموعہ کے خاص مسائل کے متعلق موزوں و مناسب ہدایات مرتب کرے گی۔

مجلس فلسطین کا مقصد مسلمانان عالم کی اہم ترین مذہبی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ وہ تمام مسلمان جو اصلاح اور ترقی کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں اس مجلس کا خیر مقدم کریں گے۔

اگر یہ مجلس اپنے مقاصد اور عزائم میں کامیاب ہو گئی تو ان تمام خوابوں کی تعبیر پور ہو جائے گی جو انیسویں صدی عیسوی کے مسلمان مصلحین دیکھا کرتے تھے' یہ لوگ نشاۃ ثانیہ اور تجدید و تجدد کے خواب ہی دیکھتے رہے اپنی زندگی میں دلی مقصود حاصل نہ کر سکے۔

شیخ محمد عبدہٗ مصری ۱۹ ویں صدی کے ممتاز ترین مصلح تھے اعرابی پاشا کی ناکام بغاوت کے بعد شیخ موصوف کو بیروت میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس حالت میں آپ نے شیخ الاسلام قسطنطنیہ سے ایک مکتوب کے ذریعے اسلامی قانون کی اصلاح کے لیے درخواست کی چوں کہ وہ زمانہ سازگار نہ تھا' اسی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ سلطان عبدالحمید خاں کا عہد سلطنت اس قدر رجعت پسند واقع ہوا تھا کہ اصلاح کا نام لینا بھی جرم تھا۔ علماء فلسطین کا یہ اقدام کچھ نیا نہیں اصلاح کی یہ بنیاد آج سے صدیوں پیش تر رکھ دی گئی تھی' لیکن اس زمانے کے علماء کی یہ تجویز رجحانات عصری سے بہت آگے تھی۔ اس وقت کی قدامت پسندی ان علماء کے خیالات کی تاب نہ لا سکی۔

مجلس فلسطین نے جو اصول اصلاح قانون اسلامی کے لیے وضع کیا ہے۔ شیخ احمد ابن تیمیہ اور ان کے پیرو ابن قیم اسی اصول کے مطابق اصلاح چاہتے تھے۔

یمن کے مشہور عالم قاضی محمد شوکانی نے اپنی اصلاح کی بنیاد انہی اصول پر رکھی تھی جو

ان کی مشہور کتاب "نیل الاوطار" میں درج ہیں' یہ کتاب موجود ہے اور اصلاح کی کوشش میں ہماری رہنما ہو گی۔ ہمیں اسی بنیاد پر اصلاح کی ایسی عمارت بنانی ہے جو عصری ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

مصر عہد حاضر میں اسلامی تعلیم کا بڑا مرکز ہے۔ اس قسم کی اصلاح کی تکمیل میں مصر کو پیش پیش ہونا چاہیے۔ سلطان ابن مسعود' ابن تیمیہ اور ابن قیم کے ہم عقیدہ ہیں اور ان سے توقع ہو سکتی ہے کہ تحریک اصلاح کے علم بردار بنیں۔ لیکن نہ مصر نے اصلاح کے میدان میں قدم آگے بڑھایا نہ حجاز نے حق رہنمائی ادا کیا' اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی تو ایک غیر متوقع مقام فلسطین میں' یہ اصلاح اور بھی سزاوار تحسین ہے کہ فلسطین سے کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

ان حالات میں مجلس فلسطین کا قیام ایک بین الاقوامی اہمیت کا واقعہ ہے' افسوس ہے کہ علماء فلسطین کی اس تحریک سے ہندوستان اور دوسرے ممالک نے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ میں نے حالت نظر بندی ہی میں تہیہ کر لیا تھا کہ رہا ہونے کے بعد مسلمانان ہندوستان کی طرف سے اس تحریک کا خیر مقدم کروں گا' آج میں فلسطین کی مجلس کو مخلصانہ تبریک پیش کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے روشن خیال اور ترقی پسند علماء اس محترم مقصد کے حصول میں اس کے ساتھ تعاون کریں گے اور امکانی مدد کریں گے۔"

(زمزم لاہور' مورخہ ۱۹/اپریل ۱۹۴۵ء' شمارہ نمبر ۵۰)

اس بیان کا پس منظر یہ تھا کہ فلسطین جیسی زمین انبیاء کے علماء نے ایک ایسی مجلس کے قیام کا اعلان کیا تھا جو اس کام کو سر انجام دے گی۔

اس کار خیر سے انہیں جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں لیکن افسوس کہ عالمی سامراج کی ریشہ دوانیوں نے اس سرزمین پر جو ڈرامہ یہودی آبادی و مملکت کے قیام کے لیے رچایا۔ اس نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا اور یوں یہ بزم درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

(۲)

ملک کی تقسیم کے بعد ادھر اور ادھر کے مسائل مختلف ہو گئے۔ سب سے زیادہ ذمہ

داری' پاکستان پر تھی کہ وہ اپنے دعاوی کے تحت اس طرف متوجہ ہوتا لیکن افسوس ہمارے یہاں کی دین ناآشنا بلکہ دین بے زار اور منافق صفت قیادت نے کبھی اس طرف سنجیدہ پیش قدمی نہ کی۔ اگر رخ کیا بھی تو اس طرح کہ اقبال کے الفاظ میں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　　ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

مذہب کے نام پر قائم ہونے والی سیاسی تنظیموں اور گروپوں نے اقتدار کی گدی پر براجمان ہونے کی غرض سے اپنی صلاحیتیں داؤں پر لگا دیں اور وہ اب تک در لیلیٰ تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے نجد کے روایتی مجنوں کی طرح ماری ماری پھر رہی ہیں۔ لیکن انہیں توفیق نہ ہوئی تو اس بات کی کہ وہ اس ٹھوس کام کی طرف توجہ کر سکیں۔ تاکہ عصری ضرورتوں کا معاملہ طے ہو سکے اور آج کے مسائل میں گھرا ہوا نوجوان دین کے حوالہ سے مطمئن ہو سکے۔ ملک میں قدیم و جدید کے حوالہ سے ان گنت ادارے اور کلیات و جامعات ہیں' مدارس ہیں لیکن تلاش کیجئے کہ کہیں کوئی اس حوالہ سے مصروف کار ہے؟ اور خاص اسی ضرورت سے قائم کردہ ادارے' جن پر لاکھوں کا صرفہ ہو رہا ہے' ان کا کام کیا ہے؟ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ گویا ہمارے یہاں سارا کام دین فروشی اپنی دکان سیاست واقتدار کے لیے دین کو ایکسپلائٹ کرنے تک محدود ہے' کوئی ٹھوس علمی اور سنجیدہ کام دور دور نظر نہیں آتا۔

اس فساد زدہ دور میں ایک علمی ارمغان ہمارے سامنے آیا تو ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی اور ہم نے اس پس منظر میں یہ سطور لکھ ڈالیں۔ اس ارمغان علمی کے مصنف کون ہیں؟ تو سن لیں کہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی) کے مشہور قصبہ تھانہ بھون میں ایک بزرگ تھے' جن کا نام سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھا' یہ امی شیخ تھے لیکن قدرت نے اصلاح باطن اور جہاد حریت کے لیے اپنے وقت کے عظیم المرتبت اہل علم کو ان سے وابستہ کر دیا تھا' جن میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہما اللہ تعالیٰ سے لے کر (جنہیں حاجی صاحب اپنا دست وبازو قرار دیا کرتے تھے) حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمتہ اللہ تعالیٰ تک جیسے لوگ شامل تھے۔ حاجی صاحب ہجرت کے قصد

سے سرزمین وحی' بلدۂ امین مکہ معظمہ زادھا اللہ تعالیٰ شرفا تشریف لے گئے تو ان کی سونی بزم کو رونق بخشی ان کے عزیز و محبوب خلیفہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ تعالیٰ نے! مولانا تھانوی اس صدی کے ان لوگوں میں سے تھے جنہیں "جامع" کہا جاتا ہے اور جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا بڑا کام لیا' معاشرتی مسائل کے سلسلہ میں ان کی کتاب "الحیلتہ الناجزۃ" اپنے دور کی عظیم مجتہدانہ کاوش ہے' جس نے ستم رسیدہ عورتوں کے مسائل کے حل میں بڑی مدد کی۔ مولانا تھانوی سے علم و معرفت کے حوالہ سے جو لوگ وابستہ تھے' ان میں ایک اہم نام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو ان کے عزیز بھی تھے۔ مولانا ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان ملی و علمی خدمات کے تعارف کا یہ موقعہ نہیں۔ اتنا نوٹ کر لیں کہ سلہٹ کے ریفرنڈم کی کامیابی کا سہرا تحریک پاکستان میں ان کے سر ہے جس کا اعتراف بانی پاکستان نے کیا اور ڈھاکہ میں پرچم کشائی ان سے کرائی لیکن ہمارے نزدیک ان کا اصل کارنامہ "اعلاء السنن" نام کی ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مجلدات پر مشتمل کتاب ہے جو ان کی محدثانہ عظمت' فقہی بصیرت اور گہرے علمی ذوق کا شاہکار ہے۔

ان کے دو صاحبزادوں میں بڑے ہیں "مولانا عمر احمد عثمانی" جن کی شوخی طبع ہر دور میں ان کے لیے بلائے درماں رہی۔ حتیٰ کہ تعصب کے مارے ہوئے حاسدوں' بالخصوص مدعیان نفاذ اسلام نے ان کے ایمان تک کو تولا اور کہاں کہاں تک ان کے رشتے جوڑے۔ فیا حسرتا؟ لیکن اپنے مشاہدہ کی بنا پر یہ عرض کرنا غلط نہ ہو گا کہ وہ شخصی فقر و درویشی کا مرقع اور علم کی دنیا کا مسافر ہے جس کا اوڑھنا بچھونا علم ہے اور بس۔ موصوف مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے سند یافتہ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاص شاگرد' پنجاب یونیورسٹی سے آنرز ان عربک' پرشین اور اردو کے کورس کیے ہوئے۔ ٦ سال چاٹگام کی ایک بڑی درس گاہ کے شیخ الحدیث رہے۔ بیورو نیشنل ری کنسٹرکشن حکومت پاکستان کراچی کے ڈین آف تھیالوجی ۳ برس رہے۔ ناظم آباد کالج کے شعبہ اسلامیات کے سربراہ اور اس کی مسجد کے خطیب رہے۔ ڈاکٹر محمد شفیع صاحب مرحوم کی زیر نگرانی "قلائد الجمان" کو ایڈٹ کیا۔ عضد الدولہ دیلمی کا تذکرہ مرتب کیا اور بہت سی

اہم کتابوں کے تراجم کیے۔ کئی درسی کتابوں کی شروحات لکھیں اور متعدد اہم علمی مقالات لکھے۔ حضرت تھانوی کے بہت منظور نظر اور انہی سے بیعت ہیں اور انہوں نے چاروں سلاسل میں بیعت کی۔ حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث رحمہ اللہ تعالیٰ ان کے استاذ تھے۔ انہوں نے ۲؍اپریل ۱۹۷۸ء کو مدینہ منورہ سے لکھا:

"تمہارا محبت نامہ یکم اپریل کو بہت جلد پہنچا۔ میرا ضعف تو بہت بڑھتا جارہا ہے حتیٰ کہ حرم میں بھی بغیر سہارے کے بیٹھا نہیں جاتا تمہارا تصوف کا مضمون توماشاء اللہ تعالیٰ بہت بلند اور اونچا ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس شراب کا ایک گلاس تمہیں بھی پلا دے۔"

آخر میں لکھتے ہیں:

"اللہ والوں سے جتنی محبت ہو سکے غنیمت سمجھیو اور کسی اللہ والے سے چاہے کتنا ہی اختلاف رائے ہو بغض مت رکھیو۔ میں تمہارے لیے اہتمام سے دعا کرتا ہوں اللہ تمہیں اپنی رضا و محبت عطا فرمائے۔

انہی مولانا عمر احمد عثمانی نے ایک علمی عزیز مولانا طاہرؒ المکی صاحب کی درخواست پر اس ارمغان علمی کو لکھنا شروع کیا جس کا نام "فقہ القرآن" قرار پایا تو مقصد یہ تھا کہ جس طرح آپ کے والد گرامی مولانا ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے احکامی احادیث پر عظیم الشان کتاب اعلاء السنن لکھی اسی طرح قرآن عزیز کے احکامی حصہ کو اس عنوان سے بسط و تفصیل کے ساتھ عام فہم انداز میں لکھا جائے تاکہ اس سے نہ صرف عام لوگ استفادہ کر سکیں بلکہ آج کی عصری ضرورتوں کے تحت فقہی مسائل میں لوگوں کو جو الجھنیں پیش آتی ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔

اس عجیب و غریب علمی کتاب کی چھ جلدیں اب تک سامنے آچکی ہیں۔ فاضل مصنف نے فقہ حنفی کی عظیم الشان درسی کتاب "الہدایہ" کو بنیاد بنا کر اسی انداز سے ابواب وار کتاب کو مرتب کرنا شروع کیا اور فقہی مسائل کو قرآن عزیز کے حوالہ سے مُبرہن کیا اور ساتھ ساتھ ضرورت کے تحت احادیث و آثار کا اضافہ بھی کیا۔

پہلی جلد میں لگ بھگ پچاس صفحات کا عظیم مقدمہ بڑی اصولی قسم کی تحریر ہے جس میں ذخیرہ احادیث پر روایت و روایت کی روشنی میں محققانہ گفتگو کی گئی ہے جس کے بعض حصوں سے شاید کچھ لوگ بد کیں لیکن بہر حال ایک علمی سرمایہ ہے اور بڑے محققانہ انداز میں لکھا گیا ہے' وہ اس قابل ہے کہ اسے مبصّرانہ اور ناقدانہ نگاہوں سے پڑھا جائے۔ اس حصہ میں کتاب الطہارت' کتاب الصلوٰۃ' کتاب الزکوٰۃ' کتاب الصوم' کتاب الحج شامل ہیں جنہیں فاضل مصنف نے بڑے اہتمام سے مدلل و مبرہن کیا ہے۔ دوسری جلد ساری کی ساری اسلام کے عائلی نظام سے متعلق مختلف ابواب و فصول اور جزئیات پر مشتمل ہے۔ اس میں نکاح و طلاق وغیرہ کے ضمن میں بعض تاریخی روایات پر سیر حاصل بحث ہے۔ تیسری جلد حقوق و فرائض بالخصوص حقوق نسواں کے نہایت اہم نازک اور پیچیدہ مباحث پر مشتمل ہے' محسوس یہ ہوتا ہے کہ فاضل مولانا بڑی سلامتی کے ساتھ اس وادی سے گزرے ہیں۔ چوتھی جلد شہادت نسواں اور دیتِ نسواں کے مضامین کے لیے خاص ہے۔ اس جلد میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کا ایک مکتوب ہے جو انہوں نے ۸ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو مدینہ منورہ سے لکھا۔ اس میں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ تمہیں ہر لغزش سے محفوظ رکھے۔ تمہاری تصانیف کو قبول فرمائے۔ لوگوں کو ان سے منتفع فرمائے۔ کاش میری زندگی میں آجاتی تو اس کو دیکھتا۔" الخ

معروف اسکالر اور محقق عالم مولانا سعید احمد اکبر آبادی نور اللہ تعالیٰ مرقدہ لکھتے ہیں۔

"عزیزم مولانا عمر احمد عثمانی مستحق تحسین ہیں کہ وہ اس پل صراط سے نہایت سلامت روی سے گزرے ہیں' ان کی تحریر سنجیدہ اور عالمانہ ہے۔ بزرگوں سے جہاں کہیں بھی اختلاف کیا ہے' شائستگی اور وقار کے ساتھ کیا ہے بلکہ یہ اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔"

(مکتوب دہلی ۱۰ر اپریل ۱۹۸۵ء)

پانچویں جلد حدود سے متعلق وقف ہے جس کا تعارف ہمارے ملک کے معروف قانون دان جناب خالد اسحاق نے لکھا ہے۔ مولانا نے حدود کے سلسلے میں مخالفین کی جہالت اور اپنوں کے احساس کمتری پر خوب کلام کیا۔ اور اسلام میں جرائم کی سزا کے فلسفہ پر بڑی متین

گفتگو کی ہے۔ چھٹی جلد "رجم" جیسے معرکۃ الآرا مسئلہ کی تفصیلات پر مشتمل ہے' جس میں بعض بڑے چونکا دینے والے انکشافات واکتشافات علمی سامنے آئے ہیں۔ ان چھ کی چھ جلدوں میں جہاں فقہی احکامات کو مدلل و مبرہن کیا گیا ہے وہاں ہر جلد میں بعض اہم علمی اور دقیق مسائل پر مقدمات ہیں بعض اہل علم کی آراء ہیں اور مسائل کی نسبت سے کئی ایک مقامات پر بعض اہم تاریخی واقعات پر سنجیدہ اور سیر حاصل گفتگو ہے۔

اس بات کے اظہار میں مطلق کوئی حرج نہیں کہ موصوف کی علمی تحقیقات و انکشافات میں کئی ایسے مقام ہوں گے جہاں اختلاف ممکن ہو گا لیکن اس سے بدکنا اچھی بات نہیں اور نہ ہی اس پر برہمی مناسب ہے۔ بقول مولانا سعید احمد اسلاف و اکابر سے اختلاف کا پل صراط بڑا نازک ہے لیکن عمر صاحب نے اس پل صراط کو حسن و خوبی سے پار کیا ہے تو دوسروں پر بھی لازم ہے کہ وہ علمی وقار' سنجیدگی' متانت اور عالمانہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کتاب کو بالاستیعاب دیکھیں اور پھر رائے قائم کریں بلکہ میری درخواست ہے کہ اہل علم سیاسی جھمیلوں اور لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کی خواہش سے بالاتر ہو کر علمی میدان میں سر جوڑ کر بیٹھیں' اس قسم کے علمی سرمایہ کو سامنے رکھیں' جدید اور عصری تقاضوں پر غور کریں اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی توفیق و علم کے سہارے امت کی کشتی کو پار لگانے کی سعی کریں۔ ان سطور کا راقم مولانا عمر احمد سے چند مقامات پر اختلافات کے باوصف (جس کا ذکر پھر کبھی فرصت میں کروں گا) ان کی درازئ عمر اور صحت و عافیت کے لیے دعا کرتا ہے کہ وہ انہیں اور ہمیں اور پوری امت کو زیغ و ضلال سے ہر طرح اور ہر آن محفوظ رکھے' ٹھوس کاموں کی توفیق دے تاکہ دین و ملت کی مخلصانہ خدمت ہو سکے۔ ان کی اس علمی کاوش کو قبول فرمائے اور ان کے معاونین کو بہترین اجر سے نوازے۔

(ماہنامہ اسلامی انقلاب لاہور اگست ۱۹۸۹ء)

فقہ القرآن کی اہمیت

از خورشید ندیم (جاوید احمد غامدی کے شاگرد)

(روزنامہ جنگ کراچی 17/ جنوری 2002ء)

مذہبی ادارے اصلاً ایک خیر کے لئے وجود میں آئے تھے۔ انہوں نے مشکل حالات میں محض اپنے وسائل سے اس علمی روایت کو زندہ رکھا جو انگریز کی زد میں تھی۔ انگریزوں نے جب اس سرزمین پر قدم جمائے تو انہوں نے مسلمانوں کو ان کی سیاسی معاشرتی اور مذہبی روایات سے لاتعلق بنانا چاہا۔ دوسرے میدانوں میں تو وہ کامیاب رہے لیکن مسلمانوں کو ان کے مذہبی ورثے سے محروم نہ کیا جا سکا۔ یہ سہرا اہل مدرسہ کے سر ہے جنہوں نے مسلمانوں کے علمی کام کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا۔ مسلمانوں کی سیاست تعطل کا شکار ہوئی ان کی معاشرت غیر محفوظ ہو گئی لیکن ان کا علمی تسلسل جامد ضرور ہوا، معطل نہ ہو سکا۔ یہ ایک کارنامہ ہے جس پر اہل مدرسہ جا طور پر تحسین کے مستحق ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد بھی انہوں نے یہ کام جاری رکھا۔ اب جب کہ مسلمانوں کا سیاسی اور معاشرتی تشخص ایک مرتبہ پھر قائم ہوا تو انہیں دین کی بھی زندہ راہنمائی کی ضرورت پیش آئی۔ بد قسمتی سے اہل مدرسہ اس تبدیلی کو محسوس نہ کر سکے، علامہ اقبال جیسے لوگ اس کی ضرورت اجاگر کر رہے تھے اور یوں ان کی فکر کے زیر اثر اس رائے کو تقویت ملی کہ دینی علوم کے میدان میں خیمہ زن جمود سے نجات حاصل کی جائے۔ ایک طرف یہ سلسلہ چل نکلا اور دوسری طرف اہل مذہب نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی مناسب نہ سمجھی جس کے باعث وہ عملی زندگی سے لاتعلق ہونے لگے۔ بات اگر یہاں تک محدود رہتی تو شاید کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن جب اہل مدرسہ میں اپنی اجنبیت کا احساس بڑھا تو انہوں نے متحرک ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریک جائے اس کے کہ علم کی وادیوں میں جلوہ گر ہوتی، اس نے انہیں میدان سیاست میں لا کھڑا کیا۔ سیاست کے اپنے تقاضے ہیں۔

یہ انسان کو ایسی ایسی وادیوں میں لے جاتی ہے جہاں جبہ و دستار کی آبرو باقی نہیں رہتی۔ اس قربانی کے باوجود سیاست کے مطالبے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی تقاضے تھے جنہوں نے اہل مدرسہ کو مجبور کیا کہ وہ کبھی فرقہ واریت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرائیں، کبھی افغانوں کے کہساروں میں علم جہاد بلند کریں اور کبھی کشمیر کے راستے دہلی پہنچ کر لال قلعے پر اپنا جھنڈا لہرانے کا اعلان کریں۔ ان سب دشتوں کی سیاحی کے باوجود ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا، البتہ معاشرے نے اس کی قیمت ضرور ادا کی، اب تو یہ خود نہیں جانتے کہ ؎

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے\
عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں!

گویا معاملہ یہ نہیں ہے کہ ان کے وجود میں خرابی کی کوئی صورت مضمر ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اصل میدان کو چھوڑ کر ایسی وادی میں جا قدم رکھا جو ان کے لیے حیات بخش نہیں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جو کام کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر پائے۔ آج کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ اہل مدرسہ کا وجود مٹا دیا جائے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ مدرسے کے روایتی کردار کا احیاء ہو۔ یہ کام حکومت، اہل مدرسہ اور معاشرے کو مل کر کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں چند اقدامات ناگزیر ہیں۔

1۔ اہل مدرسہ یہ طے کر لیں کہ وہ پھر سے محراب و منبر کو اس طرح آباد کریں گے کہ وہاں سے قال اللہ او قال الرسول ﷺ کے سوا کوئی دوسری آواز بلند نہیں ہوگی۔ سیاست میں قدم رکھنا ویسا ہی جرم سمجھیں جیسے کسی دوسرے کے حرم میں داخل ہونا۔ ان کی توجہ کا مرکز یہ سوالات ہونے چاہئیں کہ معارف القرآن کے بعد تفسیر کا باب کیوں بند ہو گیا؟ مفتی محمد شفیع جیسا شخص پھر علماء میں کیوں پیدا نہیں ہوا؟ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بعد کسی نے مسلم کی شرح کیوں نہ لکھی (مفتی تقی عثمانی صاحب کا دم غنیمت ہے کہ انہوں نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا)۔ مولانا عمر احمد عثمانی جیسا کوئی شخص ان مدارس سے کیوں نہ اٹھا جو "فقہ القرآن" جیسی تصنیف امت کو دیتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

"فقہ القرآن" جلد اوّل کو بازار میں آئے ہوئے ابھی پورے نو ماہ نہیں گذرے کہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج ہم اس عظیم کتاب کی جلد دوم پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ادارۂ فکر اسلامی کا کوئی آرگن نہیں ہے۔ کراچی سے باہر ادارہ کی شاخیں نہیں ہیں۔ ادارہ نے اخبارات و رسائل میں نہ فقہ القرآن کا کوئی اشتہار شائع کیا نہ اس کی تشہیر و اشاعت کے لئے ملک کے دوسرے ذرائع ابلاغ سے کوئی کام لیا۔ ملک کے سربرآوردہ اخبارات و رسائل کو تبصرہ کے لئے کتاب کے نسخے ضرور بھیجے تھے۔ لیکن اخبارات و رسائل نے کافی تاخیر سے تبصرے کئے۔

ہمارا سر تشکر و امتنان سے بارگاہِ ایزدی میں نہایت خلوص کے ساتھ سجدہ ریز ہے کہ باوجود ہماری اپنی کوتاہ سامانیوں کے اس کتاب کو جو مقبولیت اور پسندیدگی حاصل ہوئی وہ ہماری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ یہ کتاب قرآنی قوانین و ہدایات پر مشتمل ہے اور ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ قانون داں طبقہ نے اپنی تحسین و آفریں سے ہماری بڑی ہمت افزائی فرمائی۔ پاکستان سپریم کورٹ۔ کراچی ہائی کورٹ لاہور ہائی کورٹ۔ وفاقی شرعی عدالت کے اکثر جج صاحبان اور چوٹی کے قانون داں حضرات تک ہم نے یہ کتاب پہنچائی اور تمام حضرات نے متفقہ طور پر اس کتاب کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا اور بتایا کہ نہ صرف ان کو بلکہ پورے عالم اسلام کو اس کی شدید ضرورت تھی۔ بعض ذمہ دار اراکین مملکت نے مجھے بتایا کہ ہمارے پاس انڈونیشیا، ملایا، ممالک عربیہ سے برابر فرمائشیں آرہی ہیں

کہ عالمِ اسلام کے موجودہ تقاضوں کے مطابق جدید فقہ پر آپ کے ہاں کوئی کتاب ہو تو ہمیں ارسال کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان ممالک کے لوگ اُردو زبان کی کتاب سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کر سکتے لہٰذا کم از کم عربی اور انگریزی میں اس کتاب کے تراجم ہونے چاہئیں۔

مجھے یہ بتلاتے ہوئے انتہائی مسرت ہے کہ کتاب پر اخبارات و رسائل میں تبصروں کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا لیکن اس قلیل ترین عرصہ میں نصف سے زیادہ کتابیں ختم ہو چکی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے حضرات نے بھی اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ جبکہ کتاب انتہائی ٹھوس علمی مواد پر مشتمل ہے۔ بازاروں میں عریاں ناولوں اور افسانوں کی بھرمار ہے۔ انہی کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ ان حالات میں بغیر کسی پروپیگنڈے کے کتاب کی موجودہ مقبولیت کافی حوصلہ افزا ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ کتابت وطباعت، کاغذ اور جلد بندی ہر لحاظ سے نقشِ ثانی اپنے نقشِ اوّل سے کچھ بہتر ہی ہو۔ ہمیں اُمید ہے کہ ناظرین ہماری اس کاوش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ آخر میں پھر حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ ہماری یہ کوشش اس کی بارگاہ میں شرفِ قبول حاصل کر سکی کیونکہ اس کی مقبولیت کے بغیر عامۃ المسلمین میں اسے یہ قبولِ عام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

بڑی ناسپاس گذاری ہوگی اگر میں اپنے پریس کا شکریہ ادا نہ کروں جس نے اس کتاب پر تحسین آمیز تبصرے کر کے ادارہ اور خود مصنف کی بڑی حد تک ہمت افزائی فرمائی۔ خصوصیت کے ساتھ روزنامہ "ڈان" کراچی۔ روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور۔ روزنامہ "جنگ" کراچی۔ روزنامہ "جسارت" کراچی۔ روزنامہ "حریت" کراچی۔ روزنامہ "اعلان" کراچی۔ ماہنامہ "حکایت ڈائجسٹ"، لاہور۔ ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی۔ ماہنامہ بلاغ القرآن لاہور۔ وغیرہ کے تبصرے قابلِ ذکر ہیں جنکی داد و تحسین کے ہم تہ دل سے شکر گذار ہیں۔

(ڈاکٹر) حبیب الرحمان خاں

چیرمین ادارۂ فکرِ اسلامی، کراچی ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ — از مولانا طاہر مکی
صدر قرآنی مرکز کراچی۔

استاذالکل حضرۃ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔

"ایک جماعت نے ان عالموں سے اہل سنّت کی کتابوں، خصوصاً تفسیروں اور تاریخ میں کہ اکثر علماء اور طلباء کے ہر وقت ہاتھوں میں نہیں تھیں۔ بڑی کوشش کی ہے، نیز بعض کتب احادیث میں جو مشہور نہیں ہیں اور نسخے ان کتابوں کے متعدد نہیں ملتے نہایت جھوٹی باتیں بنا بنا کر جن سے شیعہ مذہب کو مدد ملے اور سنیوں کے مذہب کو باطل کریں، لگائی ہیں جیسے قصۂ ہبۂ فدک کا تفسیر میں داخل کیا ہے اور سیاق اس حدیث کا اس طرح روایت کیا کہ لما نزلت واٰتِ ذاالقربیٰ حقہ دعا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاطمۃؓ واعطاھا فدک (ترجمہ) جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "دے قرابت والے کو حق اس کا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ کو بلایا اور فدک ان کو دیا" لیکن دروغ گو کو حافظہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ یاد نہیں رہا کہ یہ آیت تو مکی ہے اور مکہ میں فدک کہاں تھا۔ اور نیز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو چاہیئے تھا کہ مسکین اور مسافروں کے واسطے بھی کوئی چیز وقف کر دیتے تو پوری آیت پر پورا عمل میسر ہوتا۔ سوا اس کے اعطاھا فدک صریح ہبہ اور ملکیت کو نہیں جتاتا بلکہ اس کی جگہ وھبھا ومنح کرنا چاہیئے تھا۔ اور مثل اس کے تفسیروں، تاریخوں میں، کہیں یہاں، کہیں وہاں ان کی لگائی ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اِس کید میں اکثر غافل علماء، علماء اہل سنّت سے خبط میں پڑتے ہیں اور پریشانی اُٹھاتے ہیں۔

دہلی میں محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں اس فرقہ کے امراء میں دو شخص تھے، مرتضیٰ خاں اور مرید خاں کہ اہل سنّت کی کتابوں مثل صحاح ستہ اور مشکوٰۃ اور بعض تفسیروں کو خوشخط لکھا کر ان کتابوں میں اپنے مطلب کی حدیثیں کتب امامیہ سے نکال کر داخل کرتے تھے اور ان

نسخوں کو مجدول اور مُطلّا اور مُذہّب کرکے سہل قیمت پر راہبوں میں بیچتے تھے اور اصفہان میں آغا ابراہیم ابن علی شاہ کہ ایک امرا رکبار سلاطین صفویہ سے تھا۔ اس طرح پر عمل کرتا تھا"

(تحفہ اثناعشریہ صـ۸۳۔ کیدسی دودم مطبوعہ نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی)

ظاہر ہے کہ اضافات والحاقات کا یہ عمل کھلم کھلا اور علانیہ نہیں ہوتا تھا اور پورے عالم اسلام میں صدیوں سے جاری تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے علم میں اپنے زمانہ کے تین آدمیوں کے یہ کرتوت نہ جانے کس طرح آگئے۔ جو علمار اہل سنت کے علم میں نہ آسکے ہوں گے ان کی تعداد نہ جانے کتنی ہوگی۔ "فقہ القرآن" کا موضوع اس قسم کی الحاقی احادیث پر کلام کرنا نہیں ہے۔ بلکہ صرف قرآن کریم سے مستنبط اور ماخوذ مسائل فقہیہ کو بیان کر دینا ہے۔ لیکن اس جلد میں ان افسانوں کا تذکرہ بھی آگیا ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق گھڑ لیے گئے ہیں اس لئے اس پر متنبہ کر دینا بھی ضروری تھا۔ "فقہ القرآن" کے مقدمہ میں مصنف نے اسی لئے یہ وضاحت ضروری سمجھی تھی کہ صحاح ستہ اور صحیحین میں جو حدیث آگئی ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ صحیح ہی ہو۔ ان میں دسیوں حدیثیں ایسی بھی آگئی ہیں جنکی درایت کے اعتبار سے تحقیق و تنقید نہیں کی جا سکی اور کیا بعید ہے کہ ان میں سے بیشتر حدیثیں الحاقی بھی ہوں اور صحاح ستہ کے مصنفین سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ پرانے زمانہ میں پریس نہیں تھے۔ کتابیں قلمی ہوا کرتی تھیں جن میں اضافے کر دینا اور الحاقات کر دینا کچھ مشکل نہیں تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آج تم لوگوں کو یہ ساری چیزیں نظر آرہی ہیں۔ لیکن تیرہ سو سال سے ہمارے اسلاف کو نہ یہ امکانات نظر آئے اور نہ انہیں ایسا کوئی شبہ ہوا۔ اس کا میں کیا جواب دوں بجز اس کے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل کر دوں کہ۔

"اے خدا تو نے ان چیزوں کو داناؤں اور عقلمندوں سے چھپایا اور اپنے بچوں پر کھول دیا" (متی ۱۱ : ۲۵)

طاہر المکی

(جنرل سکریٹری ادارۂ فکر اسلامی کراچی)

کتاب النکاح

تمام آئمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ نکاح ایک شرعی معاہدہ ہے جو مسنون ہے۔ اُمت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جس کو طبعی طور پر نکاح کی خواہش ہو ورنہ زنا کا اندیشہ ہو اس کے لئے نکاح مطلقاً مستحب ہے بلکہ حج، جہاد، نماز، روزہ اور نوافل سے افضل ہے۔ آئمہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب آدمی کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو اسے عورت کا چہرہ، اور ہاتھ پاؤں دیکھ لینا مسنون ہے۔ آئمہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ غیر کفو میں نکاح کر لینا ناجائز نہیں ہے۔ (المیزان الکبریٰ صفحہ ۱۲۴)

نِکَاحٌ کے معنے ملانے اور جمع کرنے کے ہیں (تاج و راغب) لیکن اس طرح ملانا جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے چنانچہ کہتے ہیں نَکَحَ النُّعَاسُ نیند اس کی آنکھوں میں گھل مل گئی یا جس طرح بارش کے قطرے زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ نَکَحَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ بارش کا پانی زمین میں خوب جذب ہو گیا۔ (تاج العروس)

راغب نے کہا ہے کہ نِکَاحٌ کا لفظ عقد یعنی باہمی معاہدہ کے لئے آتا ہے۔ جنسی اختلاط کے لئے اس کا استعمال بطور استعارہ

کے ہوتا ہے (مفردات) چنانچہ قرآن کریم نے بھی اسے عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲/۲۳۵، ۲/۲۳۷ البقرہ) یعنی نکاح کا بندھن یا نکاح کی گرہ فرمایا ہے نیز دوسرے مقام پر مِیْثَاقًا غَلِیْظًا (۴/۲۱) (سخت عہد اور سخت اقرار) فرمایا ہے۔

اوّل تو نِکَاحٌ کے بنیادی معنے ہی اس امر کے متقاضی ہیں کہ یہ تعلق ایسا ہونا چاہیئے جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جائیں جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ ایسا تعلق اور وہ بھی عمر بھر کے لئے بغیر فکر و نظر کی ہم آہنگی، ذوق و مزاج، تصورات و خیالات اور نظریات و معتقدات کی یک جہتی کے ممکن نہیں ہے ظاہر ہے کہ ایسے تعلق کے لئے باہمی رضا مندی اولین اور بنیادی شرط ہو گی۔

باہمی رضامندی

دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے اسے سخت عہد، بندھن اور گرہ یعنی معاہدہ قرار دیا ہے اور معاہدہ طرفین کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں قرآن کریم نے خود اس کی تصریح بھی فرما دی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! یہ بات
لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا	تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی
النِّسَآءَ كَرْهًا ۔	عورتوں کے والی اور وارث بن
(۴/۱۹)	جاؤ۔

علاوہ ازیں سورۂ بقرہ میں ان عورتوں کے متعلق جنہیں

ان کے شوہروں نے طلاق دے دی ہو اور عدت کے دوران شوہروں نے رجوع بھی نہ کیا ہو اور اب دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو چکے ہوں۔ لیکن عدت گذر جانے کے بعد سابق شوہران سے از سر نو دوبارہ نکاح کرنا چاہتے تھے لیکن عورتوں کے قرابت دار بوجہ غصہ اور ناراضگی کے اس میں حارج ہوتے تھے۔ ان کے متعلق ہدایت فرمائی گئی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ	اور جب تم عورتوں (بیویوں) کو
فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ	طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت بھی
أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ	پوری کر چکی ہوں تو اُنہیں اس بات
إِذَا تَرَاضَوْا	سے نہ روکو کہ وہ اپنے سابقہ شوہروں
بَيْنَهُمْ	سے دوبارہ دستور کے مطابق نکاح کر
بِالْمَعْرُوفِ ط	لیں جب کہ وہ آپس میں اس کے لئے
۲/۲۳۲	رضامند ہوں۔

ان دونوں آیات کریمہ سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں باہمی رضامندی ضروری ہے۔ مرد ہو یا عورت ہو کسی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ دونوں طرف سے رضامندی کا اظہار ہونا، چاہیئے۔

<u>ایجاب و قبول</u>:۔ رضامندی کے اسی اظہار کو ایجاب و قبول کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بغیر ایجاب و قبول کے نکاح نہیں ہو سکتا۔ باہمی رضامندی کا یہ اظہار چند لوگوں کے سامنے ہونا

چاہیئے۔

شہادت ⁝ آیت نمبر (۲/۲۳۲) جو ابھی بیان ہوئی ہے اس میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ بِالْمَعْرُوْفِ (دستور اور عرف کے مطابق) کا لفظ بھی موجود ہے۔ ایجاب و قبول یعنی نکاح کا معاہدہ جب سے انسان نے عقل و شعور سیکھا ہے مجمع کے سامنے ہی ہوتا آیا ہے۔

عورت اور مرد کی باہمی رضامندی عام طور پر زنا میں بھی ہوتی ہے لیکن نہ تو وہ عمر بھر کے لئے باہمی نباہ کا معاہدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا اعلان کیا جاتا ہے بلکہ وہ چھپ چھپا کر کیا جاتا ہے۔ اسے عربی زبان میں نِکَاحٌ نہیں کہتے بلکہ اس کے لئے وِقَاحٌ، سِفَاحٌ یا زنا کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اس کی تصریح بھی فرما دی ہے کہ نکاح کا معاہدہ کیا جائے یا نکاح کے معاہدہ کو فسخ کیا جائے دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ دو معتبر ذی حیثیت آدمیوں کو گواہ ضرور بنا لیا جائے۔ اس کے بغیر نہ نکاح کا معاہدہ معتبر ہو گا اور نہ معاہدۂ نکاح کا فسخ قابل اعتبار ہو گا۔ چنانچہ سورۂ طلاق میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ	اے پیغمبر! جب تم عورتوں کو طلاق
النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ	دو تو ان کی عدت کے شروع میں،
لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا	(حیض سے فارغ ہونے کے بعد شروع
الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ	طہر میں) انہیں طلاق دیا کرو اور عدت
رَبَّكُمْ	کو شمار کرتے رہا کرو۔ اور اللہ، اپنے

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ	پروردگار سے ڈرتے رہو۔-------
فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ	پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو
اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ	چاہے دستور کے مطابق (ان سے ازسر
وَّاَشْهِدُوْا	نو دوبارہ نکاح کرکے) انہیں روک
ذَوَیْ عَدْلٍ	لو یا دستور کے مطابق ان سے جدائیگی
مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا	اختیار کرلو اور (دونوں حالتوں میں)
الشَّهَادَةَ	دو انصاف پسند آدمیوں کو اپنے میں
لِلّٰهِ ط	سے گواہ بنالو اور گواہی کو اللہ کے لئے
(۶۵/۱-۲)	قائم کرو۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بیویوں کو طلاق دے کر ان کی عدت پوری ہوجانے کے بعد شوہر کو دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے یا تو دستور کے مطابق پھر ازسر نو نکاح کرکے اُنہیں روک لیں یا ان سے مستقلاً جدائی اختیار کرلیں اور ان دونوں صورتوں میں دو انصاف پسند آدمیوں کو گواہ بنالینا ضروری قرار دیا گیا ہے یہ آیت کریمہ خصوصیت کے ساتھ ازسر نو دوبارہ نکاح کرنے اور بیوی سے بالکلیہ جدائی اختیار کرنے کے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ[1]

---

[1] عجیب بات ہے کہ ہمارے مفسرین نے عموماً اس آیت کریمہ کا تعلق رجوع کرنے سے جوڑا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد دو باتوں کا اختیار ہے، یا تو طلاق سے رجوع کرکے بیوی کو روک لو یا اس سے جدا ہوجاؤ۔ اور فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ کا مطلب یہ لیا ہے کہ جب ان کی عدت پوری ہونے کے قریب آلگے (معلوم نہیں "قریب آلگے" کس لفظ کا ترجمہ ہے) مجھے افسوس ہے کہ میں اس تفسیر سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

طلاق دینے کے بعد جب عدت پوری ہو چکی ہے تو اب از سر نو دوبارہ نکاح کر کے ہی بیوی کو روکا جا سکتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں وَ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ کا تعلق دونوں باتوں سے ہے جو اس سے پہلے بیان ہوئی ہیں یعنی فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ کے ساتھ بھی اور فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ کے ساتھ بھی اس سے معلوم ہو گیا کہ نکاح کے وقت بھی گواہ بنا لینا ضروری ہے اور بالکلیہ جدائی اختیار کرتے وقت بھی۔

واضح رہے کہ۔

اتفاق نہیں کر سکا۔ کیونکہ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فعل ماضی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ عدت گذر چکی ہے۔ اور عدت گذر چکنے کے بعد رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ سوائے امام مالکؒ اور عطاؒ کے تمام کے تمام ائمہ رجعت کے لئے گواہ بنانے کو قطعاً ضروری قرار نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رجعت کرنا تو شوہر کا حق ہے۔ اس میں گواہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ تمام ائمہ پھر وَ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ کے امر کا کیا جواب دیں گے۔ اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ سوائے امام شافعیؒ کے سب ائمہ فقہاء رجعت کے لئے گواہ بنانا تو ایک طرف زبان سے بھی رجوع کے الفاظ کہنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اگر طلاق دینے والا اپنی بیوی سے رجوع کی نیت سے امام مالکؒ کے نزدیک اور بغیر کسی نیت کے بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جنسی اختلاط کا ارتکاب کرلے تو بھی رجوع صحیح ہو جاتا ہے۔

(المیزان الکبریٰ للشعرانی صفحہ ۱۲۴/۲)

بہر حال میں اس تفسیر سے اتفاق نہیں کر سکا۔

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْکُمْ ۔ اور اپنے میں سے دو انصاف پسند آدمیوں کو گواہ بنالو۔

صیغۂ امر کے ساتھ آیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ گواہ بنانا لازمی ہے۔ گواہ بنائے بغیر نہ نکاح ہو سکتا ہے اور نہ ہی بالکلیہ جدائی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اسی آیت کریمہ میں۔

وَاَقِیْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۔ اور اللہ کے لئے شہادت کو قائم کرو۔

میں بھی صیغۂ امر وارد ہوا ہے جس کا مطلب پھر وہی ہے کہ شہادت کا قائم کرنا لازمی ہے۔ نہ اس کے بغیر نکاح ممکن ہے نہ مفارقت ممکن ہے۔ اس آیت کے تحت امام ابوبکر جصّاص رازیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ اس آیت میں حکّام کے سامنے شہادتیں قائم کرنے کا حکم ہر قسم کے حقوق کے متعلق ہے۔ کیونکہ الشھادۃ یہاں اسم جنس ہے جو تمام حقوق کو حاوی ہے۔ (احکام القرآن صفحہ ۵۶۰/۳)

بہرحال اس آیت سے ثابت ہوگیا کہ نکاح کے لئے شہادت کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ شاہدوں کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا نکاح ابتداءً ہو رہا ہو یا طلاق کے بعد از سر نو ہو رہا ہو نکاح دونوں ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کریم نے صرف نکاح ہی کے لئے نہیں دیگر معاملات کے لئے بھی جو بہرحال نکاح کے عمر بھر کے بندھن سے زیادہ اہم نہیں ہیں گواہ بنا لینے کو ضروری قرار دیا ہے۔ مثلاً کسی سے مقررہ مدت تک کے لئے کچھ قرض لینا ہو تو حکم ہے کہ اسے تحریر میں لے آؤ اور اس کے لئے گواہ بنالیا کرو (البقرہ ۲/۲۸۲)۔ کچھ نقد خرید و فروخت

کر رہے ہو تو حکم ہے کہ گواہ بنا لیا کرو (۲۸۲/۲)۔
یتیموں کے اموال ان کے بالغ ہو جانے کے بعد جب ان کے حوالہ کر رہے ہو تب بھی حکم ہے کہ اس موقعہ پر بھی گواہ بنا لیا کرو۔ (النساء ۶/۴) وغیر ذلک۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام معاملات معاہدۂ نکاح سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔ تو معاہدۂ نکاح کو بغیر گواہ بنائے کس طرح چھوڑا جا سکتا تھا۔

اعلان: امام مالکؒ نے شہادت کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ انہوں نے اعلان کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اعلان بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ آیت نمبر (۲۳۲/۲) میں جو پہلے گذر چکی ہے۔ بِالْمَعْرُوْفِ کا لفظ موجود ہے اور دنیا میں بہر حال دستور یہی ہے کہ نکاح کا اعلان ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا آیات کی رو سے شہادت لازمی ہے۔ اعلان اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

گواہوں کی شرائط: گواہوں کے لئے جو شرائط ہوتی ہیں کہ وہ آزاد ہوں، عاقل ہوں، بالغ ہوں، مسلمان ہوں، کم از کم دو مرد ہوں یا دو عورتیں ہوں، یہ تمام شرطیں نکاح کے گواہوں میں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔ حنفیہ کے ہاں عادل اور ثقہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان کے نزدیک دو فاسقوں کی شہادت سے بھی نکاح صحیح ہو جاتا ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک شاہدوں کا عادل اور ثقہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک دونوں گواہوں کا مرد ہونا ضروری

ہے۔ لیکن حنفیہؒ کے نزدیک اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں بھی کافی ہو سکتی ہیں۔ (المیزان الکبریٰ صفحہ ۱۱۱/۲)

امام شافعیؒ اور احمد ابن حنبلؒ نے غالباً سورۃ الطلاق کی آیت نمبر (۶۵/۲) میں وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ کے الفاظ سے استدلال فرمایا ہے۔ جس سے گواہوں کا عادل اور ثقہ ہونا۔ نیز دونوں کا مرد ہونا لازمی ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ قرآن کریم کا عام اسلوب بیان یہی ہے کہ وہ عورتوں کے لئے مسائل الگ بیان نہیں کرتا۔ بلکہ مذکر کے صیغے استعمال کرتا ہے اور مرد و عورت دونوں مراد ہوتے ہیں۔ لہٰذا گواہوں کا عادل اور ثقہ ہونا تو تسلیم ہے۔ لیکن دونوں کا مرد ہونا اس آیت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا مِنْكُمْ کے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ گواہ مسلمان ہونے چاہئیں کافروں کی شہادت مسلمانوں کے حق میں تسلیم نہیں کی جائے گی وہ تم میں سے یعنی مسلمان ہونے چاہئیں۔ حنفیہؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر دونوں گواہوں پر کسی تہمت کے سلسلہ میں حد قذف لگائی جا چکی ہو تو نکاح پھر بھی صحیح ہو گا۔ البتہ ان کی شہادت عدالت میں قبول نہیں کی جائے گی۔ ہمارے خیال میں یہ فیصلہ قرآن کریم کی روح کے خلاف ہے جس میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ	اور جو لوگ پاک دامن عورتوں کو
ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ	تہمت لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا	نہیں کر پاتے تو ان کے اسّی کوڑے مارو

لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ (۴/۲۴) اور ان کی شہادت کبھی بھی قبول نہ کرو اور دراصل یہی لوگ فاسق ہیں۔

فاسق گواہوں کے سلسلہ میں بھی یہ آیت کریمہ حنفیہ پر حجت ہے، کیونکہ حد قذف کے سزا یافتہ لوگوں کی شہادت رد کرنے کی وجہ قرآن کریم نے یہی بتائی ہے کہ دراصل یہی لوگ فاسق ہیں اگر فاسقوں کی شہادت قابل قبول تسلیم کرلی جائے تو وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ کے کچھ بھی معنے نہیں بنتے۔ حد قذف کے سزا یافتہ لوگوں کے بارے میں یہ توجیہہ قابل قبول نہیں ہے کہ ان کی شہادت سے نکاح تو صحیح ہو جائے گا مگر عدالت میں نکاح ثابت نہیں ہو سکے گا۔ ایسا فرمانا ہمیں تو قرآنی حکم کی روح کے خلاف نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

الفاظ نکاح: نکاح کن الفاظ سے منعقد ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ہمارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ نکاح کے لفظ سے، تزویج کے لفظ سے، ہبہ اور تملیک کے لفظ سے نیز صدقہ اور بیع کے لفظ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے، یعنی یوں کہنا کہ میں نے تم سے نکاح کرلیا، میں نے تم سے شادی کرلی، میں نے خود کو تمہیں ہبہ کردیا، میں نے تمہیں اپنا مالک بنادیا، میں نے تم پر اپنے آپ کو صدقہ کردیا، یا میں نے خود کو تمہارے ہاتھوں فروخت کردیا، ان میں سے کوئی سا لفظ بھی عورت کی طرف سے اصالۃً یا وکالۃً کہہ دیا جائے تو یہ ایجاب ہوگا اور شوہر کی طرف سے یہ کہہ دینا کہ میں نے قبول کرلیا۔ قبول کہلائے گا۔ اس ایجاب و قبول کے بعد نکاح منعقد ہو جائے گا۔ ہمارے نزدیک الفاظ کی کوئی قید نہیں لگائی

جا سکتی۔ ایجاب و قبول اپنی مادری زبان میں سوچ سمجھ کر ہونا چاہیئے۔ ہر زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مختلف الفاظ ہو سکتے ہیں۔

بہرحال الفاظ کا مفہوم یہ ہونا چاہیئے کہ عورت نکاح یا شادی کر رہی ہے۔ عمر بھر کے لئے باہمی نباہ کی خاطر شوہر تسلیم کر رہی ہے اور شوہر کے ساتھ آئندہ زندگی ایک بیوی کی حیثیت سے بسر کرے گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک شرعی معاہدہ ہے اسے طرفین کو سوچ سمجھ کر انجام دینا چاہیئے۔ ہمارے ہاں جو یہ رواج چلا آرہا ہے۔ کہ نکاح خواں حضرات عربی میں نکاح کے الفاظ ادا کرتے اور کراتے ہیں جسے نہ شوہر سمجھتا ہے نہ بیوی سمجھتی ہے۔ محض برکت کے الفاظ سمجھ کر طرفین اُنہیں ادا کر دیتے ہیں یہ طریقہ غلط ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر عورت نے خود اصالتاً یا اس کی طرف سے کسی نے وکالتاً یہ الفاظ کہے ہوں کہ میں نے خود کو اُجرت پر آپ کے حوالہ کر دیا۔ یا میں نے خود کو آپ کے لئے مباح کر دیا۔ یا حلال کر دیا۔ یا میں نے خود کو آپ کو مستعار دے دیا تو نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ ہمارے نزدیک بھی یہ الفاظ واقعی نکاح کے لئے صریح نہیں ہیں ان الفاظ سے نکاح صحیح نہیں ہونا چاہیئے۔

مُحرّمات : قرآن کریم نے ان عورتوں کی فہرست خود ہی دے دی ہے جن سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے

(۱) ان عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے جن سے کسی آدمی کے والد

دادا، نانا، پردادا، پرنانا وغیرہ نے نکاح کیا ہو۔

(۲) نیز اپنی ماؤں سے۔

(۳) اپنی بیٹیوں، پوتیوں، نواسیوں، پڑپوتیوں اور پڑنواسیوں وغیرہ سے بھی نکاح جائز نہیں ہے۔

(۴) اپنی بہنوں سے۔

(۵) اپنی پھوپھیوں سے۔

(۶) اپنی خالاؤں سے۔

(۷) اپنی بھتیجیوں سے۔

(۸) اپنی بھانجیوں سے۔

(۹) نیز اپنی رضاعی ماؤں سے۔

(۱۰) اپنی رضاعی بہنوں سے۔

(۱۱) اپنی خوش دامنوں سے۔

(۱۲) اپنی ربیبہ لڑکیوں سے جن کی ماؤں سے نہ صرف آدمی نے نکاح کرلیا ہو بلکہ ان کے ساتھ ہمبستری بھی کرلی ہو۔ البتہ اگر صرف نکاح کیا ہو اور ہمبستری نہ کی ہو تو اس کو طلاق دے کر اس کی لڑکی یعنی اپنی ربیبہ سے نکاح کیا جاسکتا ہے۔

(۱۳) اپنے صُلبی اولاد کی بیویوں سے بھی نکاح نہیں کیا جاسکتا البتہ محض منہ بولے بیٹے نے اگر اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہو یا وہ بیوہ ہو گئی ہو تو اس سے نکاح جائز ہے۔

(۱۴) نیز یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اپنی بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے شادی کرلی جائے۔ البتہ اگر بیوی کو طلاق دے دی گئی ہو

یا اس کا انتقال ہوگیا ہو تو اپنی سالی سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال بیک وقت دو بہنوں کو ایک ساتھ بیوی بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔

⑮ نیز وہ عورتیں بھی حرام ہیں جو کسی دوسرے آدمی کے نکاح میں ہیں۔ جب تک وہ کسی دوسرے آدمی کے نکاح میں ہیں، ان سے شادی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن کریم نے صراحۃً ان پندرہ عورتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ	اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن
اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ	سے تمہارے آباؤ اجداد نے نکاح کیا
اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط	ہو۔ بجز اس کے جو اس حکم سے پہلے
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً	ہو چکا۔ یقیناً یہ بات بڑی بے حیائی اور
وَّمَقْتًا ط وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝	بڑے غضب کی بات ہے اور بہت ہی
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ	برا طریقہ ہے۔ تم پر تمہاری مائیں۔
وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ	تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں،
وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ	تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں
وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ	بھتیجیاں، بھانجیاں، اور وہ مائیں
الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ	جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور
الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ	دودھ شریک بہنیں، اور تمہاری
اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ	خوشدامنوں سے اور وہ لے پالک لڑکیاں
وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ	جو تمہاری گود میں پلی ہوں اور ان
وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ	عورتوں سے ہوں جن سے تم ہمبستر

حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ
الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز
فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز
وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ
الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ
وَاَنْ تَجْمَعُوْا
بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ
اِلَّا مَا قَدْ
سَلَفَ ط اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ۝ وَّالْمُحْصَنٰتُ
مِنَ النِّسَآءِ
اِلَّا مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ ج كِتٰبَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَاُحِلَّ لَكُمْ
مَّا وَرَآءَ
ذٰلِكُمْ اَنْ
تَبْتَغُوْا

ہو چکے ہو۔ اگر تم ان کی ماؤں سے ہم
بستر نہ ہوئے ہو (تو انہیں طلاق دے
کر یا ان کی ناگہانی موت کے بعد ان
لڑکیوں سے شادی کرنا چاہو) تو کوئی
حرج نہیں ہے۔ نیز تمہارے ان بیٹوں
کی بیویاں بھی تم پر حرام کر دی گئی
ہیں جو تمہاری صُلبوں سے ہوں۔
(منہ بولے بیٹے اس میں داخل نہیں
ہیں) اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں
کو (بیک وقت نکاح میں) جمع کر لو
بجز اس کے جو پہلے گذر چکا۔ یقیناً اللہ
اُس (گذشتہ جرم) کو بخش دینے
والا اور بڑا مہربان ہے۔ نیز شوہر والی
عورتیں بھی حرام ہیں بجز اس کے
جو تمہاری مِلک یمین بن جائیں
(تو باوجود ان کے کافر شوہروں کے
تم ان سے نکاح کر سکتے ہو) یہ تم پر
اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اور ان،
عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے
لئے حلال کر دی گئی ہیں جب کہ تم
اپنے مال (ان کو مہر میں دے کر) ان

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ	سے نکاح کرو۔ بشرطیکہ تم پاکدامنی کے
غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ	ساتھ یہ کچھ کرو محض شہوت رانی کے
(پ۴ ۴۴-۴۲)	لئے نہ کرو۔

واضح رہے کہ اُمَّھَاتُ میں مائیں، نانیاں، دادیاں اوپر تک سب شامل ہیں۔ ایسے ہی بَنٰتُکُمْ میں بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں نیچے تک سب شامل ہیں۔ ایسے ہی بَنٰتُ الْاَخِ اور بَنٰتُ الْاُخْتِ میں بھتیجیاں، بھانجیاں اور ان کی اولادیں نیچے تک سب شامل ہیں۔ نیز اُمَّھٰتُ نِسَآئِکُمْ میں بیوی کی ماں (خوشدامن اور بیوی کی دادی نانی اوپر تک سب شامل ہیں۔

اسی طرح حَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ میں صُلبی بیٹوں کی بیویاں پوتوں اور نواسوں کی بیویاں بھی نیچے تک سب شامل ہیں۔ کیونکہ اُمّ کا لفظ ماں، دادی، نانی سب کو شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح اِبْنٌ اور بِنْتٌ کا لفظ صرف بیٹے اور بیٹی ہی کے لئے نہیں بولا جاتا بلکہ بیٹوں، پوتوں، نواسوں، نیز بیٹیوں، پوتیوں اور نواسیوں سب کے لئے بولا جاتا ہے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے قرآن کریم کی نص صریح نے دو سگی بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے، نیز بیوی کی ماں، دادی، نانی وغیرہ سے شادی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ جس کی علت ظاہر ہے کہ قطع رحمی ہی ہے۔ لہٰذا اس اشتراکِ علت کی بناء پر ہمارے فقہاء نے بیوی کی پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی سے بھی نکاح کرنا جائز قرار دیا ہے۔ جو ہمارے نزدیک بالکل

صحیح ہے۔ کیونکہ قطع رحمی کی علت ان صورتوں میں بھی موجود ہے بلکہ ہمارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ بیوی کی کسی ایسی رشتہ دار عورت سے نکاح جائز نہیں ہے جو اگر مرد ہوتی تو اس کا نکاح اس بیوی سے حرام ہوتا وہ دونوں آپس میں محرم ہوتے۔ کیونکہ وہی علت یعنی قطع رحمی یہاں بھی پائی جاتی ہے جو دو بہنوں یا بیوی اور اس کی ماں اور دادی نانی کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو بہن، ماں، دادی اور نانی کا ہے۔ اشتراکِ علت کی بناء پر یہ فیصلہ قطعاً صحیح ہے۔ شریعت کے بیشتر احکام میں اس کے مطابق فیصلے کئے گئے ہیں۔ ورنہ بھنگ، چرس، گانجا، افیون، ایل ایس ڈی وغیرہ منشیات کو کس بناء پر حرام کہا جائے گا۔ جب کہ یہ چیزیں خمر نہیں ہیں جو قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ خمر زیادہ سے زیادہ شراب کو کہہ سکتے ہیں جب کہ حنفیہ کے نزدیک تو خمر صرف انگور کی شراب کو کہتے ہیں۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ رشتے قرآن کریم کی رو سے حرام نہیں ہیں۔ بناء بر قیاس و اجتہاد کے حرام ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ان رشتوں کی حرمت کا انکار کرے تو اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی اگر کوئی شخص ان رشتہ داریوں میں شادی کر کے زن و شوہر کے تعلقات قائم کرلے تو عدالت سے ان میں تفریق تو کرا دی جائے گی۔ تعزیراً کچھ سزا بھی ضرور دی جائے گی۔ لیکن زنا کی حد نافذ نہیں کی جا سکے گی۔

پندرہ محرمات اوپر بیان کی جاچکی ہیں باقی محرمات یہ ہیں۔
(۱۶) مشرک عورتوں سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ	اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو
حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ	جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور
مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ	یقیناً مومن باندی بھی مشرک عورت
مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ	سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنی ہی
وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ	پسند کیوں نہ آرہی ہو۔ اور مشرک
حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ	مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں
مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ	نہ کراؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں
وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ	اور یقیناً ایک مؤمن غلام بھی ایک
يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ	مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى	کتنا ہی پسند کیوں نہ آئے۔ یہ لوگ
الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ	جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت
وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ	اور مغفرت کی طرف اپنی اجازت سے
لَعَلَّهُمْ	بلاتا ہے اور اپنی آیتیں کھول کھول
يَتَذَكَّرُوْنَ ۝	کر لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے۔ شاید
(۲ / ۲۲۱)	وہ کچھ نصیحت حاصل کرلیں۔

چنانچہ اس آیت کی رو سے مشرک عورتوں سے شادی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

(۱۷) اسی طرح کافر عورتوں سے شادی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

چنانچہ سورۂ ممتحنہ میں ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ	اور کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے
پ۲۸ ع۱	قبضہ میں نہ رکھو۔

یعنی ان سے نکاح کرکے ان کی عصمت اور ناموس کے محافظ نہ بنو۔ لہٰذا مشرک عورتوں کے علاوہ ہر کافر عورت سے بھی شادی جائز نہیں ہے۔

⑱ آوارہ اور بدقماش عورتوں کے ساتھ شادی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً	زنا کار مرد صرف زنا کار عورت یا
اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ	مشرک عورت ہی سے نکاح کر سکتا
لَا یَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ	ہے۔ اور زنا کار عورت سے صرف زنا
وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى	کار مرد یا مشرک مرد ہی شادی
الْمُؤْمِنِیْنَ ۝	کر سکتی ہے۔ اور صاحب ایمان لوگوں
پ۱۸ ع۷	پر یہ بات حرام کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک اصول بیان فرمادیا ہے کہ۔

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ	ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے
الْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ	لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں
لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ	کے لئے ہیں اور پاک عورتیں پاک
اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا	مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک
یَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ	عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ (پاک مرد
وَّرِزْقٌ	اور پاک عورتیں) بری ہیں ان تہمتوں

كَرِيمًا ○ | سے جو (جھوٹے آدمی) کہتے ہیں۔ ان
(۲۴/۲۶) | کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔

⑲ حرمتِ مصاہرت: ہمارے فقہاء حرمتِ مصاہرت کے بھی قائل ہوئے ہیں۔ یعنی اگر کسی شخص نے غلطی سے کسی عورت سے اسے اپنی بیوی سمجھ کر ہم بستری کر لی یا قصداً اس سے زنا کر لیا تو اس عورت کی ماں اور بیٹی اس آدمی پر حرام ہو جائیں گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا یہی مذہب ہے۔ نیز اگر شہوت کے ساتھ کسی عورت کو چھو لیا۔ یا عورت نے کسی مرد کو شہوت سے چھو لیا بلکہ اگر شہوت کے ساتھ ایک دوسرے کے آلاتِ تناسل کو دیکھ لیا تب بھی عورت کی بیٹیاں اور اس کی ماں اس مرد پر حرام ہو جائیں گی۔

لیکن امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس حرمتِ مصاہرت کو تسلیم نہیں کرتے۔ (المیزان الکبریٰ صفحہ ۱۱۳/۲)

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ نے سورۃ فرقان کی اس آیت سے استدلال فرمایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ	اللہ ہی وہ ہے جس نے پانی سے انسان
بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا	کو پیدا کیا پھر اس کو خاندانی اور
وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ○	سسرالی رشتہ دار بنا دیا اور آپ
(۲۵/۵۴)	کا پروردگار بڑا قدرت والا ہے۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ سسرالی رشتہ داریوں کو بھی نسبی رشتہ داریوں کی طرح حق تعالےٰ نے اپنے احسانات میں سے شمار فرمایا ہے لہٰذا یہ قابلِ احترام چیز

ہے اور اس کی وجہ سے نکاح کی صورت میں بیوی کی والدہ اور اس کی لڑکیوں سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔

اس کا جواب امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ زنا کو نکاح پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ حرمتِ مصاہرت ایک نعمت ہے۔ یہ نعمت ایک حرام اور ناجائز ارتکاب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ (ہدایہ صفحہ ۳۰۹/۱)

ہمارے خیال میں امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مذہب زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ زنا، کے طور پر یا غلطی سے اگر ہم بستری کا صدور ہوتا ہے تو اس سے کوئی سسرالی رشتہ داری پیدا نہیں ہوتی نہ کسی معاشرہ میں اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس تعلق کا آیت نمبر (۲۵/۵۴) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اہل کتاب عورتیں:- پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کافر اور مشرک عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے۔ لیکن اہل کتاب یعنی یہودی اور نصرانی عورتوں سے نکاح کر لینا جائز ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ	آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال
وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	کر دی گئیں۔ اور ان لوگوں کا کھانا
حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ	(ذبیحہ وغیرہ) جنہیں کتاب دی گئی ہے
حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ	تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا
مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ	(ذبیحہ وغیرہ) ان کے لئے حلال ہے اور
مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	مسلمان پاکدامن عورتیں اور ان لوگوں
مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ	کی پاک دامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے

أُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنٰتٍ	کتاب دی جا چکی ہے حلال ہیں بشرطیکہ
غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ	تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔ اور
اَخْدَانٍ ط	پاکدامن رہتے ہوئے ان سے نکاح کرو
	شہوت رانی کرنے کے لئے اور یارانہ
(۵-۵)	گانٹھنے کے لئے ان سے تعلق قائم نہ کرو۔

اس آیت کریمہ کے مطابق اہل کتاب عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اہل کتاب مردوں سے مؤمن عورتوں کا نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ آیت میں صرف اہل کتاب عورتوں کے متعلق بتایا گیا ہے۔

مجوسی اور صابی عورتیں: مجوسی یعنی آتش پرست عورتوں کے ساتھ اگر وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں تو نکاح جائز نہیں ہے کیونکہ ان کا اہل کتاب ہونا قرآن کریم سے ثابت نہیں۔ "صابئ مذہب" کے سلسلہ میں ہمارے علماء و مفسرین نے اول تو اسی میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کوئی باقاعدہ منظم مذہب تھا یا نہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں کوئی باقاعدہ منظم مذہب تھا اور وہ کواکب پرستی کا شکار تھا۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی باقاعدہ منظم مذہب نہیں تھا بلکہ یہ مشرکین عرب میں سے کچھ لوگ تھے جو اپنے آبائی مذہب سے بیزار تھے اور اسے غلط سمجھتے تھے۔ اور ساتھ ہی توحید الٰہی اور بعث بعد الموت کے قائل تھے اور جزا و سزا پر یقین رکھتے تھے۔ اسی لئے صابئ مذہب کی عورتوں کے سلسلہ

میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے۔ حتیٰ کہ حنفیہ میں سے امام ابوحنیفہؒ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

تاہم ان کا اہل کتاب ہونا چونکہ قرآن کریم سے ثابت نہیں ہے۔ اور قرآن کریم نے صرف اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں صاحبین کا مسلک صحیح ہے۔

باندیوں سے نکاح: ہمارے فقہاء کرام نے باندیوں کے ساتھ نکاح کے سلسلہ میں بھی متعدد مسائل کا ذکر فرمایا ہے۔ لیکن یہ بحث اپنے مقام پر آئے گی کہ اسلامی معاشرہ لونڈیوں اور غلاموں کے وجود کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ یہ سسٹم جو عہد جاہلیت سے عربوں بلکہ پوری دنیا میں چلا آرہا تھا۔ اسلام نے اسے علیٰ حالہ باقی رکھا ہے یا ختم کر دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج نہ باندیاں پائی جاتی ہیں نہ ان سے نکاح کئے جاتے ہیں لہٰذا ان مسائل سے بحث کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

تعدد ازدواج: تعدد ازدواج کا مسئلہ عرصہ سے موضوع بحث چلا آرہا ہے۔ یعنی بیوی ایک ہونی چاہیئے یا متعدد بیویاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ مسئلہ ذرا تفصیلی بحث کا محتاج ہے۔ شوہر اور بیوی دونوں کو عربی زبان میں زَوْجٌ کہتے ہیں۔ پہلے اس لفظ کو سمجھ لینا چاہیئے۔

دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں (جیسے جوتے کے دونوں پاؤں) یا ایک دوسرے کے مقابل ہوں (جیسے دن اور رات) وہ زَوْجَانِ کہلاتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی زوج ہوتی ہے۔ (تاج العروس ومحیط المحیط)

زَوْجٌ کے اصلی معنے جوڑے کے ہیں فَرْدٌ (اکیلا) کے خلاف لہٰذا زَوْجٌ اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی جوڑ یا ساتھی موجود ہو۔ خواہ اس کے مثل یا اس کے مقابل۔

(ایضاً ولسان العرب وراغب)

اسی زَوْجٌ سے اِزْدِوَاجٌ کا لفظ بنا ہے اِزْدَوَجَ، تَزَاوَجَ وزن یا سجع بندی کے لئے کسی فقرے کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے مشابہ کرنا یا دو قضیوں کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا (لین) زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ) رفیق۔ ایک دوسرے کے ساتھی (ایضاً) زَوْجٌ کے معنے شوہر یا بیوی دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زَوْجٌ ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زَوْجٌ (لطائف اللغۃ)

ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے تَزَوَّجْتُ اِمْرَأَةً کے معنے ہیں۔ "میں نے ایک عورت سے شادی کی" ان تصریحات کو ذہن میں رکھیئے اور دیکھیئے کہ زَوَّجَ اور تَزَوَّجَ کے بنیادی معنوں ہی میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ دو فرد ہوں ایک مرد اور ایک عورت اور وہ دونوں ایک دوسرے کا جوڑ بننے کا معاہدہ کریں یہ نہیں ہے کہ ایک طرف تو صرف ایک فرد ہو اور دوسری طرف چار پانچ یا دس افراد۔

قانونِ تخلیق ⁂ اس کے بعد ہمیں قرآن کریم سے خود قانونِ قدرت کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اسلام بہر حال دینِ فطرت ہے۔ وہ فطرت کے خلاف کوئی قانون نہیں دے سکتا۔ سورۂ روم میں ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ	تو ہر طرف سے منہ موڑ کر دین کے لئے
حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ	اپنا رُخ قائم رکھو۔ جو عین فطرتِ
فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ	الٰہی ہے جس پر اس نے ساری نوع
لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ	انسانی کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق
الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ	میں کوئی رد و بدل نہیں ہے۔ یہی
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝	سیدھا اور اُستوار دین ہے۔ لیکن اکثر
(۳۰/۳۰)	لوگ جانتے نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں کہ قانونِ قدرت بلکہ خدا کا قانونِ تخلیق کیا ہے۔ سورۂ نساء کی بالکل پہلی آیت ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ	اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے اس
الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ	پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا	نفس سے پیدا کیا اور اُسی سے اس کا
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا	جوڑا پیدا کر دیا اور پھر ان دونوں
كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ	(نر اور مادہ) سے بہت سے مرد اور
(۴/۱)	بہت سی عورتیں پھیلا دیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ تخلیقِ انسانی کا سلسلہ نفسِ واحدہ سے شروع ہوا اور اس کا جوڑا اسی نفسِ واحدہ سے پیدا کیا گیا

اور پھر ان دونوں نر اور مادہ سے نسل انسانی کا سلسلہ روز افزوں ہوتا چلا گیا۔ ابتدائً ایک نر اور ایک مادہ تھی۔ ایک نر کے لئے، چند مادائیں پیدا نہیں کی گئی تھیں۔ حالانکہ اضافۂ نسل کے لئے اس وقت اس کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت بھی تھی۔ ہم یہاں نر اور مادہ کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ وہ انسان تھے یا کچھ اور تھے۔

یہ وہ آیت کریمہ ہے جسے نکاح کے خطبوں میں ہمارے تمام علمائے کرام بڑے ذوق و شوق سے تلاوت فرماتے ہیں۔ مگر غور نہیں فرماتے کہ آیت کریمہ سے کیا بات واضح ہو رہی ہے اس کے بعد سورۃ بقرہ میں قصۂ تخلیقِ آدم پر غور فرمائیں۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ	اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا	بیوی اس باغ میں رہو اور وہاں
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۔	بے روک ٹوک جہاں سے تم دونوں کا
(۲/۳۵)	جی چاہے کھاؤ۔

یہ پہلا انسان ہے جسے اس کرۂ ارض پر بھیجا گیا تھا۔ اس کے لئے حق تعالیٰ نے ایک ہی بیوی پیدا کی تھی۔ اور پورے قصہ میں ان دونوں میاں بیوی ہی کو خطاب فرمایا جا رہا ہے۔ یہی مضمون الفاظ کی معمولی تبدیلی سے سورۃ اعراف (۷/۱۹) میں بھی وارد ہوا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ طٰہٰ میں ہے۔

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوٌّ	تو ہم نے کہا، اے آدم! یقیناً یہ (ابلیس)
لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا	تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے سو

مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ (۲۰/۱۱۷)

وہ کہیں تم دونوں کو اس باغ سے نکال نہ دے پھر تم تکلیف اٹھاؤ۔

یہاں بھی آدم اور ان کی ایک ہی بیوی کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ نسلِ آدم کی افزائش کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں سورۃ النجم میں صحفِ موسیٰ اور صحفِ ابراہیم کی تعلیمات کا بیان فرماتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان تعلیمات میں یہ باتیں بھی تھیں۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ (۵۳/۴۴-۴۵)

اور یہ بات بھی تھی کہ وہی مارتا ہے اور وہی زندہ کرتا ہے اور یہ بھی کہ اسی نے جوڑے پیدا کئے ہیں نر اور مادہ۔

یہی مضمون سورۃ القیامہ میں بھی آیا ہے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ (۷۵/۳۶-۳۹)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی شتر بے مہار کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ منی کی ایک بوند نہیں تھا جو ٹپکائی جاتی ہے۔ پھر وہ ایک لوتھڑا بن گیا پھر اللہ نے اسے انسان پیدا کیا اور اسے درست کیا۔ پھر بنا دیا اس کا جوڑا نر اور مادہ۔

سورۃ النجم اور سورۃ القیامہ کی ان دونوں آیاتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ تخلیق کا سلسلہ ایک باقاعدگی اور نظم کے ساتھ کارفرما

ہے۔ وہ جوڑے بنا کر پیدا کر رہا ہے۔ کہ ایک نر ہے تو اس کے مقابلے میں ایک عورت پیدا کی جا رہی ہے۔ زَوْجَیْنِ کے متعلق جو ہم نے عربی لغات کے حوالہ سے پہلے لکھا ہے اُسے ایک مرتبہ پھر دہرا لیں بہرحال سلسلہ تخلیق یوں نہیں ہے کہ ایک مرد پیدا کیا جاتا ہو تو اس کے مقابلہ میں دس عورتیں پیدا کی جاتی ہوں۔ اس حساب میں اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو وہ حضرتِ انسان کی خودکاشتہ گڑبڑ ہوتی ہے بقول ملائکہ کے۔

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ	(اے بار الٰہا!) کیا آپ زمین میں
فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ	اس ہستی کو خلیفہ بنا رہے ہیں جو وہاں
(۲/۳۰)	فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا؟

اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ استثنائی یعنی ہنگامی حالات ہیں۔ اور قرآن کریم نے ہمیں اس کا حل بھی بتا دیا ہے۔ لیکن عام حالات میں ایک مرد کے لئے قانونِ قدرت ایک ہی عورت پیدا کرتا ہے اور اسے ایک عورت پر ہی اکتفاء کرنا ہوگا۔ اگر کہیں ایسی صورتِ حال پیش آجائے کہ کسی نے ایک عورت سے شادی کی لیکن تجربہ سے وہ ناپسندیدہ ثابت ہوگئی تو اس کا حل قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ ایک شادی اور کر لو۔ تمہیں چار تک شادیاں کرنے کی اجازت تو دی ہی جا چکی ہے بلکہ یہ فرمایا کہ۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا	اور تم اُنہیں اس لئے نہ روکے رکھو کہ
بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ	جو کچھ تم اُنہیں (مہر یا تحفہ میں) دے
اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ	چکے تھے اس میں سے کچھ واپس لے لو

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝

(٤/١٩-٢١)

بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں۔ اور ان کے ساتھ دستور کے ساتھ گذارہ کرو۔ پس اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کر رہے ہو مگر اللہ اسی میں بہت زیادہ بھلائی رکھ دے اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا ہی چاہو (کہ پہلی کو طلاق دے کر دوسری کرنا چاہو) اور تم نے ان میں سے اس ایک کو (جسے طلاق دینا چاہتے ہو) سونے کا ایک ڈھیر دے رکھا ہو تو اس میں سے تم کچھ بھی واپس نہیں لے سکتے۔ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کا ارتکاب کر کے واپس لینا چاہتے ہو؟ اور یہ تم کیسے واپس لے سکتے ہو۔ حالانکہ تم ایک دوسرے کی تنہائیوں کے شریک رہ چکے ہو اور انہوں نے تم سے بڑا ہی سخت عہد لیا تھا؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اپنی بیوی اگر آپ کو ناپسند ہے تو

بہتر تو یہی ہے کہ تم خود اپنے آپ کو سمجھاؤ اور اپنی اس ناپسندیدگی پر قابو پا لو۔ کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اللہ نے اسی میں تمہارے لئے کوئی بہتری رکھ دی ہو۔ لہٰذا اپنی اس نفرت کو محبت میں بدلنے کی کوشش کرو۔ ہر آدمی میں کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں تو کچھ اچھے پہلو بھی تو ہوتے ہیں۔ نہ کوئی شخص ہمہ خوبی ہو سکتا ہے۔ اور نہ کوئی شخص ہمہ عیب ہو سکتا ہے۔ اس بیوی میں یقیناً کچھ خوبیاں بھی ہوں گی ان کو دیکھو۔

لیکن اگر تم اپنے اوپر اتنا قابو نہیں پا سکتے تو دوسرا راستہ صرف یہی ہے کہ اسے چھوڑ کر یعنی طلاق دے کر اس کے بدلے میں کوئی دوسری بیوی لے آؤ۔ (غور فرمائیے کہ دوسری بیوی اس کی موجودگی میں نہیں لا سکتے بلکہ اسے چھوڑ کر اس کے بدلے میں لا سکتے ہو) تو یاد رکھو کہ جو کچھ تم اس بیوی کو دے چکے تھے خواہ مہر میں خواہ ویسے ہی تحفہ میں چاہے وہ سونے کا ایک ڈھیر ہی کیوں نہ ہو، اس میں سے ایک پائی بھی واپس نہیں لے سکتے یہ پھر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ اس صورت میں تمہیں کافی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنے اس ارادہ سے باز رہو اور اس بیوی سے جو تمہیں نفرت ہو گئی ہے اس پر قابو پانے کی کوشش کرو اور بیوی کی تبدیلی کا ارادہ نہ کرو۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر بیوی آپ کو ناپسند ہے اور آپ کو اس سے نفرت ہو گئی ہے تو اس کا مداوا قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی موجودگی میں جو عورت تمہیں پسند ہو

اس سے مزید شادی کر لو بلکہ یہ بتایا ہے کہ اگرچہ اس میں تمہارا شدید نقصان ہو گا مگر اسے طلاق دو اور پھر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آؤ مگر جتنا کچھ اسے دے چکے ہو اس میں سے ایک پائی بھی واپس نہیں لے سکتے۔ بہر حال عام حالات میں اسلام کا قانون یہی ہے کہ ایک مرد کو ایک ہی بیوی رکھنی ہو گی۔ ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھی جا سکتیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ تو میں ایسے حالات سے بھی دوچار ہو سکتی ہیں اور رہوتی ہیں کہ فتنہ وفساد، خون ریزی، جنگ وجدال کی وجہ سے معاشرہ میں مرد کثیر تعداد میں مارے جائیں اور یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو ایسے حالات سے دوچار ہونا لازمی امر ہے بشرطیکہ وہ صحیح معنے میں مسلمان ہوں کیونکہ اسلام کے بنیادی پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے۔ ان کی تو زندگی یہ ہے کہ۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۫	یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے اس کے بدلہ میں کہ ان کے لئے جنت ہو گی۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے رہتے ہیں۔ وہ (کفار کو) قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل کئے جاتے ہیں۔

پ ۹ / ۱۱۱

لہٰذا جس قوم کی زندگی ہی حرب و ضرب ہو، جس اُمت کی تقدیر ہی شمشیر و سنان ہو۔ وہ تو ایک لمحہ کے لئے بھی یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے دشوار مسئلہ سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے اس مشکل مسئلہ کا حل بھی دے دیا ہے اور ہمیں اپنے خود ساختہ قانون ساز اداروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ چنانچہ سورۂ نساء کی ابتدائی آیات ہیں۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ	اور یتامیٰ کو ان کے اموال کو دے دیا
وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ	کرو اور حلال اور پاکیزہ چیزوں کے
وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ	بدلے حرام اور ناپاک مال نہ بدل
إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ	لو۔ اور یتامیٰ کے مالوں کو اپنے مالوں
حُوبًا كَبِيرًا ۝ وَإِنْ خِفْتُمْ	کے ساتھ (خلط ملط کر کے) ہڑپ نہ
أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ	کر جاؤ۔ یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ اور
فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم	اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتامیٰ کے ساتھ
مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ	تم انصاف کا سلوک نہ کر سکو گے تو
وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ	ان میں جو پسندیدہ عورتیں ہوں
أَلَّا تَعْدِلُوا	ان سے دو٢ دو٢، تین٣ تین٣، چار٤ چار٤ کی
فَوَاحِدَةً أَوْ مَا	کی تعداد میں تم نکاح کر لیا کرو۔ پھر
مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ	اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں
ذَٰلِكَ	کر سکو گے تو ایک پر کفایت کرو یا جو
أَدْنَىٰ أَلَّا	ملک یمین تمہیں حاصل ہو اس پر
تَعُولُوا ۝	بس کرو۔ یہ بات اس سے زیادہ قریب

(۴/۲-۳) ہے کہ تم ظلم کے مرتکب نہ ہو جاؤ۔

یتامیٰ کی تحقیق

آیاتِ مذکورہ بالا کے ترجمہ میں ہم نے یَتَامیٰ کے لفظ کا ترجمہ ارادۃً نہیں کیا ہے۔ کیونکہ یہی لفظ ان آیات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے اس لفظ کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ تو آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے کہ ان آیات میں سلسلۂ کلام یَتَامیٰ کے متعلق چلا آرہا ہے سب سے پہلے یَتَامیٰ کا مفہوم ہی متعین کرنا ہوگا۔ عربی زبان کی لغت کی تمام کتابیں اس پر متفق ہیں کہ یَتَامیٰ کے معنے صرف یتیم بچوں اور بچیوں کے نہیں ہیں بلکہ بے باپ کی جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے بھی ہیں۔ لیکن ہم یہاں لغت کی کتابوں کا، حوالہ نہیں دیں گے بلکہ فقہ حنفی کے مشہور امام شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص رازی رح کی مشہور کتاب احکام القرآن سے اقتباس نقل کرتے ہیں۔ وہ مستند فقیہہ، مفسر اور امام ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

> "یتیم کا لفظ کبھی اس بچہ پر بولا جاتا ہے جو اپنے باپ، (کے مر جانے) سے تنہا رہ جائے اور اس عورت پر بھی بولا جاتا ہے جو اپنے شوہر (کے مر جانے یا اس سے طلاق ہو جانے) سے تنہا رہ جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یتیم لڑکی سے اس کی شادی کے بارہ میں رائے معلوم کی جائے حالانکہ لڑکیوں سے اسی وقت رائے معلوم کی جا سکتی ہے جب وہ بالغ ہو چکی ہوں۔ (نا بالغ لڑکیوں سے رائے معلوم کرنے کے تو کوئی معنے ہی نہیں) ایک شاعر کا قول بھی ہے ؎

اِنَّ الْقُبُوْرَ تَنْكِحُ الْاَيَامٰى　　　　اَلنِّسْوَةَ الْاَرَامِلَ الْيَتَامٰى

"درحقیقت قبریں ہی بیواؤں یعنی بے سہارا یتیم عورتوں کا نکاح کراتی ہیں۔ کہ ان کے شوہر مرکر قبروں میں چلے جاتے ہیں۔ اور ان کا قبروں میں پہنچ جانا ان عورتوں کے نکاح ثانی کا سبب بن جاتا ہے۔"

اس شعر سے ظاہر ہے کہ یتامیٰ سے مراد بیوہ جوان عورتیں ہیں پھر یہ بھی معلوم ہے کہ مرد جب بوڑھا یا ادھیڑ ہو جاتا ہے تو اُسے یتیم نہیں کہتے۔ خواہ وہ کتنا ہی ضعیف العقل اور ناقص الرائے کیوں نہ ہو۔

لہٰذا مرد کے سلسلہ میں اس کا بچپن کی عمر سے قریب العہد ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن بڑی بوڑھی عورتیں جب کہ وہ اپنے شوہروں سے جدا ہو جائیں برابر یتیمۃ کہلاتی ہیں۔

واضح رہے کہ بوڑھا مرد اس وجہ سے کہ اس کا باپ نہیں رہا کبھی بھی یتیم نہیں کہلاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ صرف چھوٹے نابالغ بچوں کا ولی اور ان کی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ ان کی حفاظت کرتا اور اپنے سایۂ عاطفت میں ان کی پرورش کرتا ہے لہٰذا ان بچوں کا اگر باپ نہ رہے اور وہ تنہا رہ جائیں تو انہیں یتیم کہتے ہیں۔ یہ بچے بالغ ہو جانے کے بعد بھی محض اس وقت تک یتیم کہے جا سکتے ہیں جب تک وہ کمزور اور ناقص الرائے رہیں یعنی جب تک اُنہیں معاملات کے لئے کسی مربی، نگران، محافظ اور کفیل کی ضرورت باقی رہے۔

لیکن عورتوں کو اس بناء پر برابر یتیم کہا جاتا ہے کہ ان کے وہ شوہر باقی نہیں رہے جن کے نکاح اور حفاظت میں وہ تھیں لہٰذا عورتیں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائیں یہ لقب (یتیمۃ) ان کے ساتھ برابر لگا رہتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں ان کیلئے شوہر کا وجود وہی حیثیت رکھتا ہے جو چھوٹے بچوں کے لئے باپ کا وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ عورتوں کے لئے ان کے شوہر ہی معاشی طور پر ان کے ذمہ دار اور وہی ان کے محافظ اور نگراں ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ اپنے شوہروں سے محروم ہو جائیں تو عورتوں کو یتیمۃ کہا جائے گا۔ جیسا کہ اپنے مربی، نگراں، محافظ اور کفیل سے محروم ہو جانے پر چھوٹے بچوں کو یتیم کہا جاتا تھا۔

ملاحظہ فرمائیے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ مرد عورتوں پر قوّام ہیں۔ (یعنی ان کے محافظ، نگراں کفیل اور ذمہ دار ہیں)۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ	اور خدا اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم یتیموں کی نگرانی اور کفالت انصاف کے ساتھ کرو۔

ملاحظہ فرمائیے کہ قرآن کریم نے مرد کو عورت کا اسی طرح قَیِّم قرار دیا ہے جیسا کہ یتیم کے ولی کو اس کا قیّم قرار دیا ہے۔"

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۵۷-۵۸ ج ۲)

شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازیؒ فقہ حنفی کے مسلمہ امام اور تفسیر قرآنی کے بڑے جلیل القدر مقتدا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہیں

سمجھتا ہوں کہ ان کی ان تصریحات کے بعد کسی کو مجالِ انکار نہیں ہونی چاہیئے۔ اور اسی لئے میں نے اس مسئلہ میں آئمہ لغت کے حوالے نہیں دیئے۔

آیت کا صحیح ترجمہ:- ان تصریحات کی روشنی میں آیت نمبر (۴/۳) کا ترجمہ یوں ہوگا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ج فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ط ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ (۴/۳)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ بن باپ کی جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ تم انصاف کا سلوک نہ کر سکو گے تو مذکورہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین چار چار کی تعداد میں تم نکاح کر لو اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک پر ہی اکتفا کر و یا جو ملک یمین تمہیں حاصل ہو اس پر بس کرو۔ یہ بات اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم کے مرتکب نہ ہو جاؤ۔

واضح رہے کہ انصاف کا سلوک کرنے کا حکم تمام یتیموں کے لئے ہے۔ اس میں نابالغ بچے بھی شامل ہیں۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اس میں جوان بن باپ کی لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ اس میں بیوہ عورتیں بھی شامل ہیں جن کے شوہر مر گئے ہیں یا ان کو طلاق ہو گئی ہے۔ ان سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کرنے کا حکم ہے۔ ان کی خبر

گیری، حفاظت اور کفالت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں ہو سکے گا۔ تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو شادی کے قابل عورتیں ہوں یعنی جوان بن باپ کی لڑکیاں ہوں یا بیوہ عورتیں ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کر لیا جائے۔ چونکہ یتامیٰ میں نابالغ لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل تھے اور ان سے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے نکاح کے سلسلہ میں مِنْھُنَّ یا مِنَ الْیَتٰمٰی (ان سے یا یتیموں سے) نہیں فرمایا گیا بلکہ مِنَ النِّسَآءِ کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ نیز چونکہ یہ عورتیں وہی ہیں جو اَلْیَتٰمٰی میں شامل تھیں ان سے الگ عورتیں نہیں ہیں اس لئے مِنَ النِّسَآءِ فرمایا گیا ہے۔ مِنْ نِسَآءٍ نہیں فرمایا گیا۔ النِّسَآء پر الف لام تعریف کا ہے۔ کیونکہ یہ عورتیں متعین ہیں۔ اور اَلْیَتٰمٰی کے ذیل میں ان کا ذکر آچکا ہے۔ اگر یہاں یتامیٰ کے علاوہ کچھ دوسری عورتیں مراد ہوتیں تو مِنْ نِسَآءٍ غَیْرِھِنَّ، مِنْ نِسَآءٍ سِوَاھُنَّ یا مِنْ نِسَآءٍ اُخْرٰی فرمایا جاتا۔ اگر یہ کچھ نہیں فرمایا گیا تھا تو کم از کم بغیر الف لام کے مِنْ نِسَآءٍ تو کہا جاتا اور ان عورتوں کو غیر متعین چھوڑ دیا جاتا لیکن ایسا بھی نہیں کیا گیا بلکہ الف لام لگا کر تصریح کر دی گئی کہ یہ خاص اور متعیّن عورتیں ہیں اور ان کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔

لیکن حیرت ہے کہ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ بالکل ہی اُلٹ کیا جاتا ہے جس سے آیت کا مفہوم ہی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ ترجمے

تو بے شمار ہیں یہاں نمونہ کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ کم و بیش یہی مفہوم دیگر تراجم کا بھی ہے مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

"اور (دیکھو) اگر (تم نکاح کرنا چاہو اور) تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے۔ تو (انہیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ بلکہ) جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو (یعنی دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند آئیں نکاح کرلو۔ ایک وقت میں) دو دو، تین تین، چار چار تک کرسکتے ہو (بشرطیکہ ان میں انصاف کرسکو یعنی سب کے حقوق ادا کرسکو اور سب کے ساتھ ایک ہی طرح کا سلوک کرسکو) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کرسکو گے تو پھر چاہیئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔ یا پھر جو عورتیں (لڑائی کے قیدیوں میں سے) تمہارے ہاتھ آگئی ہیں (انہیں بیوی بنا کر رکھو) بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرین صواب ہے (بمقابلہ اس کے کہ یتیم لڑکیوں کے حقوق کے لئے اللہ کے حضور جوابدہ ہو۔"

(ترجمان القرآن)

مولانا آزاد کے اس ترجمہ میں جو قوسین کے درمیان الفاظ بڑھائے گئے ہیں وہ الفاظ مولانا آزاد کے اپنے ہیں۔ جن کا انہوں نے اپنے خیال میں آیت کی توضیح کے لئے اضافہ فرمایا ہے۔ وہ الفاظ قرآن کریم کے نہیں ہیں۔ مہربانی فرما کر ان الفاظ کو الگ کر دیجئے اور اَلنِّسَاءِ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے صرف "یتیم لڑکیوں

کے معاملہ میں" تحریر فرمایا ہے۔

امام ابو بکر جصاص رازیؒ کی تصریحات کے مطابق اس میں اور "بیوہ عورتوں" کے لفظ کا اضافہ فرمالیجئے۔ اور اَلنِّسَاءِ پر الف لام کی وجہ سے "جو عورتیں" کے بجائے "جو مذکورہ عورتیں" پڑھیئے۔ تو آیت کا ترجمہ خود مولانا آزاد کے الفاظ میں یوں ہوگا۔

"اور (دیکھو) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو جو مذکورہ عورتوں میں سے تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کرلو۔ دو دو، تین تین، چار چار تک کرسکتے ہو۔ اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کرسکو گے تو پھر چاہیئے کہ ایک بیوی سے زیادہ نہ کرو۔ یا جو عورتیں (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آگئی ہیں۔ بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرینِ صواب ہے۔"

ہم نے صرف نمونہ کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ کم و بیش یہی حال دیگر تمام تراجم کا بھی ہے۔ ان پر بھی اسی نہج سے غور فرمالیں۔

ازافات الشرط فات المشروط: یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تعدد ازدواج کی اجازت کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ مسلم معاشرہ میں یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ انصاف کا سلوک نہ ہوسکنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ ان کی خبرگیری، حفاظت اور کفالت نہ ہوسکتی ہو تو تعدد ازدواج کی اجازت ہے۔ اصول کا مشہور قاعدہ ہے۔

إِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ۔	جب شرط ہی نہ پائی جائے تو مشروط بھی نہیں پایا جا سکتا۔

جنس مسلم معاشرہ میں جس وقت بھی یہ پیچیدہ سوال درپیش ہوگا اس وقت تعدد ازدواج کی اجازت ہوگی اور جب یہ سوال درپیش نہیں ہوگا تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ مشروط ہے۔ جو حضرات اس حکم کو غیر مشروط اور عام مانتے ہیں ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیت میں۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ	اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں کر سکو گے۔

کی شرط آخر کیوں لائی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ اسی آیت میں۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً	اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو

بھی آرہا ہے۔ اس شرط کو سب تسلیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایک سے زیادہ شادیاں اسی وقت کر سکتے ہیں جب سب بیویوں کے ساتھ انصاف کا یکساں سلوک کر سکو۔ اگر ایسا نہ کر سکو تو پھر اجازت نہیں ہے اور ایک سطر پہلے وہی لفظ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ آجاتا ہے تو اسے سب گول کر جاتے ہیں اور لغو اور بے اثر قرار دے دیتے ہیں۔ اگر پہلی شرط کو لغو اور بے اثر بنایا جا سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ لوگ اس دوسری شرط کو بھی لغو اور بے اثر قرار نہ دے دیں اور اس سے انکار نہ کر دیں اور کہہ دیں کہ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا کی شرط کا کوئی اعتبار نہیں ہے یہ شرط لغو اور بے اثر ہے۔

اس کے بعد جو کچھ قرآن کریم نے فرمایا ہے وہ تو فَوَاحِدَةً ہے (یعنی ایک ہی بیوی کرو) لہٰذا قرآن کریم کی رو سے صرف ایک بیوی کرنے کی اجازت ہے۔

اِنْ خِفْتُمْ کی شرط کے ساتھ قرآن کریم میں اور بھی بہت سے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ پھر تو ہمیں ہر جگہ سے شرط کو اُڑا دینا چاہیئے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ج (۲/۲۳۸-۲۳۹)	تمام نمازوں کی حفاظت کرو اور خصوصًا درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہوا کرو۔ پھر اگر تمہیں کوئی اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے نماز پڑھ لیا کرو۔

یہاں فرما دیجئے کہ فَاِنْ خِفْتُمْ کی شرط لغو اور بے اثر ہے۔ رکوع اور سجدہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر حال میں کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے اشارہ سے نمازیں پڑھ لینا جائز ہے۔ سورۂ بقرہ میں دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط (۲/۲۲۹)	پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں (اس مال کے لینے دینے میں) جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے۔

یہاں بھی شرط کو لغو اور بے اثر قرار دے کر فرما دیجئے کہ عورت بلا وجہ بھی جب چاہے شوہر سے خلع لے کر نکاح سے آزاد ہو سکتی ہے۔ سورۂ نسأ میں فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا	اور اگر تمہیں میاں بیوی میں کشاکش
فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ	کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث شوہر کے خاندان
وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا	سے اور ایک ثالث بیوی کے خاندان سے
(۴/۳۵)	مقرر کر دو۔

یہاں بھی شرط کو لغو اور بے اثر قرار دے کر فرما دیجئے کہ میاں بیوی کے کشاکش کے اندیشہ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہم اچھے خاصے سلوک اور محبت کے ساتھ رہتے ہوتے میاں بیوی کے درمیان بھی کشمکش بٹھا سکتے ہیں اور نکاح فسخ کرا سکتے ہیں۔

غور تو فرمائیے کہ یہ بات کیا ہوئی کہ قرآن کریم اپنی اجازت کو ایک شرط کے ساتھ مشروط کرتا ہے۔ اور آپ اس شرط کو یوں ہضم کر جاتے ہیں جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو نصف قرآن کو بے اثر بنایا جا سکتا ہے پھر تو نہ کوئی قانون، قانون رہے گا۔ اور نہ کوئی حکم، حکم رہے گا۔

شانِ نزول یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ نساء کی یہ آیت کریمہ بظاہر اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ یہ اجازت ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ لیکن ہمارے تمام علماء، فقہاء اور مفسرین نے آخر اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں اتنی بڑی غلطی کیسے فرمائی۔ یہ ساری باتیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں یا ان کو

معلوم نہیں تھیں۔ یا انہوں نے ان پر غور کیوں نہیں فرمایا؟ جہاں تک ہمارے متقدمین کا تعلق ہے ان کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ انہیں یہ سب باتیں معلوم تھیں اور وہ خوب جانتے تھے کہ یہ حکم ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ عام حکم نہیں ہے۔ لیکن ان کے زمانہ میں یہ شرط موجود تھی۔ ہنگامی حالت برقرار تھی۔ اس لئے یہ حکم بھی برقرار تھا۔ صحابہ کے دور میں برابر جہاد فی سبیل اللہ ہوتا رہا۔ (اس کے بعد فتنوں کا دور شروع ہوگیا خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں۔ بنو امیہ کے خلاف جنگیں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ بنو امیہ کی خلافت کا تختہ الٹا گیا۔ بنو عباس برسر اقتدار آئے۔ ان کے خلاف مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں)۔ بنو امیہ اور بنو عباس بھی کفار کے خلاف جہاد کرتے رہے حتیٰ کہ عباسی خلافت کو زوال شروع ہوا اور طوائف الملوکی شروع ہوگئی۔ آج دیلم برسر اقتدار ہیں تو کل سلجوق برسر اقتدار ہیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو جنگ کر کے ہی زیر کرتا تھا حتیٰ کہ تاتاریوں کے ہاتھوں خلافتِ عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ پھر مسلمانوں میں نئے نئے فرقے ابھرتے رہے اور فرقہ وارانہ فسادات روزمرہ کا معمول بن گئے آپ مسلمانوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں۔

ہمارے اسلاف اور متقدمین کے زمانہ میں اسلامی حکومتوں میں مکمل امن و امان تو کبھی بھی نہیں رہا۔ جنگیں ہوتی رہیں۔ اور مرد برابر مرتے کٹتے رہے۔ اور ہنگامی حالات بدستور قائم رہے۔ لہٰذا شرط موجود تھی اور حکم علیٰ حالہ باقی تھا۔ اسی بناء پر انہیں نہ نظر ثانی کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی اور نہ انہوں نے حکم میں کوئی تبدیلی فرمائی۔

رہ گئے ہمارے متاخرین علمائے کرام تو ان تک نوبت پہنچنے سے صدیوں

پہلے اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ نہ ان میں متقدمین کی فہم و بصیرت تھی نہ ندرتِ فکر اور جدت کردار تھی۔ وہ غریب لکیر کے فقیر بنے رہے اور آج تک بنے ہوتے ہیں۔ ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ جو کچھ صدیوں سے ہوتا چلا آرہا تھا وہ اس پر غور وفکر فرما کر اس پر نظرِ ثانی فرماتے اور اس میں کسی تبدیلی کی سوچتے۔ لہٰذا انہیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اسے کسی نہ کسی طور سے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔

شانِ نزول کی روایت زیرِ بحث مسئلہ میں اُنہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک روایت ہاتھ لگی اُنہوں نے اسی کو غنیمت سمجھا اور اس پر ایک عمارت کھڑی کرنے کی سعی نامشکور فرمائی۔ روایت یہ تھی۔

زہری نے عُروہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حق تعالیٰ کے اس قول کے متعلق دریافت کیا وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى الآیہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، بھانجے! یہ یتیم لڑکی ہوتی تھی جو اپنے ولی کی نگرانی میں ہوتی تھی اسے لڑکی کے مال اور حسن وجمال کی وجہ سے اس کی جانب رغبت ہوتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس کو کم سے کم مہر دے کر خود ہی اس سے نکاح کرلے تو ان کو ان لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا بجز اس صورت کے کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں۔ (اور پورا مہر ادا کریں) اور اُنہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کریں۔ (احکام القرآن لابی بکر الجصاص الرازی ج۲ ص۶۰) یہ روایت بخاری اور دیگر صحاح کی کتابوں میں بھی آگئی ہے۔ اس روایت کے متعلق ہمیں ذرا تفصیل سے بحث کرنی پڑے گی۔

حدیث شان نزول پر بحث | اس شان نزول کا حاصل یہ ہے کہ آیت کے الفاظ دراصل یوں ہونے چاہئیں تھے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَلَا تَنْکِحُوْھُنَّ وَانْکِحُوْا سِوَاھُنَّ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ	اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارہ میں انصاف کا سلوک نہیں کر سکو گے تو ان سے نکاح نہ کرو۔ اور اُن کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کرو۔ دو٢ دو٢، تین٣ تین٣، چار٤ چار٤۔

خود روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ (جن کا ترجمہ ہم نے اُوپر نقل کیا ہے) کہ

ھی الیتیمۃ تکون فی حجر ولیھا فیرغب فی مالھا وجمالھا ویرید ان ینکحھا بادنیٰ من صداقھا فنھوا ان ینکحوھن الا ان یقسطوا لھن وامروا ان ینکحوا سواھن من النساء الخ	وہ یتیم لڑکی ہوتی تھی جو اپنے ولی کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ اسے لڑکی کے مال اور جمال کی وجہ سے اس کی جانب رغبت ہوتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اسے کم سے کم مہر دے کر خود ہی اس سے نکاح کرلے تو ان کو ان لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا بجز اس صورت کے کہ وہ اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کریں (اور پورا پورا مہر ادا کریں) اور اُنہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کریں الخ

اس کا حاصل یہ ہوا کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی جملہ شرطیہ تھا۔ مگر اس کی جزاء قرآن کریم نے بیان نہیں فرمائی۔ اس کی جزاء یہ روایت

بیان کر رہی ہے۔ یعنی فَلَا تَنْكِحُوهُنَّ اس جزا کو روایت نے فَنُهُوا اَنْ يَّنْكِحُوهُنَّ (انہیں منع کر دیا گیا کہ وہ ان سے نکاح کریں) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ شرط اور جزاء مل کر جملہ مکمل ہو گیا اور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ ایک الگ بات ہے۔ یہ دوسرا جملہ ہے۔ یہ شرط کی جزاء نہیں ہے۔ اور فَانْكِحُوا پر "فا" جو جزاء کی علامت ہے، حق تعالیٰ نے غلطی سے لگا دی ہے۔ اصل میں وَانْكِحُوا یا صرف اِنْكِحُوا ہونا چاہیئے تھا۔ اور دوسری چوک حق تعالیٰ سے یہ بھی ہو گئی کہ سِوَاهُنَّ کا لفظ حق تعالیٰ لگانا بھول گئے جس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس بھول چوک کا تدارک بھی اس شان نزول کی روایت نے فرما دیا کہ اب بات واضح ہو گئی۔

یہ سارے پاپڑ تو بیلے گئے مگر وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى کا لفظ پھر بھی قرآن کریم سے محو نہ کر سکے۔ جب یہ دونوں باتیں الگ الگ تھیں۔ تو دونوں باتوں کو الگ الگ بیان کرنا چاہیئے تھا۔ ایک ہی آیت میں ایک بات کی شرط بیان کر دی اور جزاء غائب فرما دی۔ اور دوسری بات کو پہلی بات کی جزاء بنا کر لے آئے معلوم نہیں حق تعالےٰ کو سیدھی طرح بات کر دینے میں کون سا تکلف مانع تھا۔

یہ قرآن کریم کی آیت میں سخت قسم کی تحریف ہے۔ اور حد یہ ہے کہ یہ تحریف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سر تھوپی جا رہی ہے۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس قسم کی تحریف کا تصور بھی فرما سکتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب اس روایت کو شاید اس آیت کے شانِ نزول کی طرف منسوب کیا جا سکے جو سورۂ نساء میں آگے چل

کما آئی ہے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ	اور لوگ آپ سے (اے پیغمبر اسلام!)
قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ	عورتوں کے بارہ میں حکم دریافت کرتے
وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ	ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تمہیں ان کے
فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ	بارہ میں حکم دیتا ہے اور وہ آیت بھی
مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ	حکم دیتی ہے جو یتیم اور بیوہ عورتوں
اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ	کے بارہ میں کتاب اللہ میں تلاوت
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ	کی جاتی ہے جنہیں وہ، وہ مہر نہیں
مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ	دیتے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور
وَاَنْ تَقُوْمُوْا	تم ان سے نکاح کرنے کی رغبت بھی،
لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ	رکھتے ہو اور کمزور و ناتواں بچوں کے
وَمَا تَفْعَلُوْا	بارہ میں بھی حکم دیتا ہے اور یہ بھی حکم
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ	دیتا ہے کہ یتیموں کی کفالت انصاف کے
كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ۝	ساتھ کرو اور جو کچھ تم نیک کام کرتے ہو
(۴/۱۲۷)	تو اللہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

شانِ نزول کی وہ روایت، اگر اس آیت کریمہ کے متعلق بیان کی جاتی تو ایک بات بھی تھی لیکن پچھلی آیت کے متعلق تو یہ دعوی کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قرآن کریم کے الفاظ اس کے متحمل ہی نہیں ہیں جب تک اپنی طرف سے جملے کے جملے نہ بڑھائے جائیں بات ہی نہیں بنتی۔

عجیب بات ہے کہ امام بخاریؒ نے ہی شان نزول کی اس روایت کو اپنی کتاب التفسیر میں آیت نمبر (۴/۱۲۷) کے تحت بھی درج فرما دیا ہے۔ یعنی وہ

اس کے بھی مدعی ہیں کہ آیت نمبر (۴/۱۲۷) کا شانِ نزول بھی یہی ہے۔ نیز تفسیر ابن کثیر میں بھی شانِ نزول کی اس روایت کو آیت نمبر (۴/۱۲۷) کے تحت ہی درج فرمایا گیا ہے۔ اور یہ شانِ نزول اسی آیت کا بتلایا ہے۔

ہم کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتے۔ ہو سکتا ہے کہ نادانستہ طور پر کسی سے یہ چوک ہو گئی ہو کہ ایک ہی روایت کو آیت نمبر (۴/۱۲۷) کے ساتھ ساتھ غلطی سے کسی نے آیت نمبر (۴/۳) کے ساتھ بھی چسپاں کر دیا ہوا اور پھر مفسرین نے بے سوچے سمجھے دونوں آیتوں کا شانِ نزول ایک ہی قرار دیتے ہوئے اس روایت کو دونوں جگہ نقل کر دیا ہو۔ واللہ اعلم۔

بہر حال آیت نمبر (۴/۳) کا یہ شانِ نزول نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ اس کا قطعاً ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلطی کسی راوی سے نادانستہ طور پر صادر ہوئی ہے۔ یا دانستہ طور پر کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ تہمت دھرنے کی جسارت کی ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔ ویسے اس روایت کے بنیادی راوی حدیث کے مشہور امام محمد ابن شہاب زہری ہیں جن پر ہمارے بعض آئمہ حدیث نے تشیع کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ میں اس ناخوشگوار بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کا ترجمہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

بر سبیل تنزل تاہم بر سبیل تنزل اس روایت کو تھوڑی دیر کے لئے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہم چند باتیں مزید عرض کرنا چاہیں گے۔

① پہلی بات تو یہ ہے کہ شانِ نزول کی روایتوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ علمائے اصول کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ۔

اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ ــــ اعتبار الفاظ کی عمومیت کا ہوتا ہے

لا لِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ۔ شانِ نزول کی خصوصیت کا نہیں ہوتا۔
کسی آیت کا شانِ نزول کیا بیان کیا گیا ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ آیت کے الفاظ کو دیکھا جائے گا۔ جو مطلب آیت کے الفاظ سے نکلتا ہو اسے تسلیم کرنا ہو گا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو کچھ بیان فرمایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے جس کا حکم بھی اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے۔ ایک آیت کے متعدد شانِ نزول بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا کہ آیت کسی خاص واقعے کے متعلق ہی نازل ہوئی تھی۔ ہر فقیہہ صحابی اپنے اپنے علم کے مطابق اس واقعہ کو بیان کر دیتا ہے جس کا حکم اس آیت سے معلوم اور مستنبط ہوتا ہو۔ اصول تفسیر کی کتابوں میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس روایت میں حضرت عائشہ رضؓ نے ان واقعات کا حوالہ دے دیا ہے جو اس آیت کے ذیل میں آتے ہیں اور ان کا حکم اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہ رضؓ نے یہ قطعاً نہیں فرمایا ہے کہ تعددِ ازدواج کی اجازت غیر مشروط اور عام تھی۔ ان کے بیان سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ یہ حکم مشروط تھا۔ کیونکہ وہ خود بتا رہی ہیں کہ یتیم اور بیوہ لڑکیوں کا مسئلہ موجود تھا۔ اور ان کے سلسلہ میں ان کے اولیاء کی طرف سے ناانصافیاں ہوا کرتی تھیں جس پر ان کے اولیاء کو تنبیہ کی گئی تھی اور فرمایا گیا تھا کہ اگر یہ ناانصافیاں کرتی ہیں تو تم ان یتیم اور بیوہ لڑکیوں سے شادی نہیں کر سکتے جو تمہاری نگرانی میں ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور یتیم اور بیوہ لڑکی سے شادی کرو۔ اس وقت کے اسلامی معاشرہ میں

یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ کیا ضروری تھا کہ ہر آدمی اسی لڑکی سے شادی کرے جو اس کی نگرانی میں ہو، اور بھی تو بیوہ عورتیں اور یتیم لڑکیاں موجود ہیں۔ تم کہیں اور شادی کر لو اور ان کی شادی ایسے لوگوں سے ہونے دو جو ان کی حق تلفی نہ کر سکیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ہمارے علماء کرام کے حلقوں میں ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ آیت مذکورہ بالا نے ہنگامی حالات میں تعدّد ازدواج کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ تعدد ازدواج کی تحدید فرمائی ہے۔ تعدد ازدواج کی اجازت تو بغیر کسی تحدید کے پہلے سے موجود تھی۔ چنانچہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام کے گھروں میں دس دس بیس بیس بیویاں موجود تھیں۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابۂ کرام کو چار سے زیادہ بیویاں چھوڑنی پڑی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عربوں میں قدیم الایام سے تعدّد ازدواج کا رواج چلا آرہا تھا۔ اور یہ بات ان کے معاشرتی حالات کے عین مطابق تھی۔ قبائلی عصبیّت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ لوٹ مار اور خانہ جنگی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ یہ خانہ جنگیاں سو سو سال تک مسلسل چلتی رہتی تھیں اور ان کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ لہٰذا عورتوں کی بہتات اور مردوں کی قلّت ان حالات کا ایک فطری نتیجہ تھا۔ اور تعدّد ازدواج ہی اس کا ایک فطری حل تھا۔

اس لوٹ مار اور غارت گری کے نتیجہ میں عورتوں اور بچّوں کو گرفتار کر کے لونڈیاں اور غلام بنا لیا جاتا تھا۔ جن سے نکاح کے بغیر ہی تمتّع کی اجازت تھی۔ ان لونڈیوں کی بھی کوئی تعداد مقرّر نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو جتنا

بڑا سورما اور بہادر تھا اس کے حرم میں عورتوں کی اتنی ہی بڑی تعداد تھی۔ قبائلی سرداروں کے حرم میں دس دس، بیس بیس بیویاں اور چالیس چالیس، پچاس پچاس لونڈیاں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو بیوی کے نام کو بھی ترستے تھے۔ عورتوں کی بہتات کتنی ہی سہی مگر لازماً اتنی تو نہیں ہو سکتی تھی کہ اُنہیں بھیڑ بکریوں کی طرح گھروں میں بھر لیا جائے۔ لہٰذا قدرتی طور پر اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلنا تھا کہ غریب لوگوں کی بڑی تعداد محرومی کی زندگی بسر کرے۔

اِسلام آیا تو اس نے عرب کی تمام بُرائیوں کو بیک جنبش قلم موقوف نہیں کر دیا بلکہ تدریجی طور پر اس نے آہستہ آہستہ اِصلاحات نافذ فرمائیں ہر نیا دین تدریجی اصلاح ہی کے طریقہ کو اپناتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے بعد بھی طویل عرصہ تک مسلمان گھرانوں میں یہی کیفیّت باقی رہی۔

اس سے ظاہر ہے کہ عربوں کا معاشرہ جہاں ایک طرف عورتوں کی کثرت اور مردوں کی قلّت کی وجہ سے تعدّد ازدواج کے جواز کا متقاضی تھا وہیں دوسری طرف اس میں ضروری تحدید کا بھی متقاضی تھا۔ تعدّد ازدواج کا رواج جو عربوں میں صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ اسے موقوف بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ معاشرتی حالات برابر باقی تھے جن کی بناء پر عربوں میں تعدّد ازدواج کا رواج ہوا تھا۔ بلکہ ان حالات میں اور شدّت آچکی تھی جنگیں اب بھی ہو رہی تھیں اور ہوتی رہتی تھیں۔ مسلمان عورتوں کی شادی غیر مُسلم گھرانوں میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اُنہیں بہر حال اپنے ہی معاشرہ میں کھپانا تھا۔ ہنگامی صورتِ حال شدید صُورت میں موجود تھی۔ قدرت الٰہیہ نے جب محسوس کیا کہ اب اس کی اصلاح کا وقت آگیا ہے۔ کیونکہ اسلام صرف

عربوں ہی کے لئے نہیں آیا وہ پوری دنیا کے لئے آیا تھا۔ اور ضروری نہیں تھا کہ ساری دنیا میں وہی حالات ہوں جو جزیرہ نمائے عرب میں تھے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے سورۂ نساء کی محولہ بالا آیت نازل فرمادی جس سے معاشرہ کی سہ گونہ اصلاح مقصود تھی۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے چند الفاظ کے ذریعہ تین عظیم الشان اصلاحات کا اعلان فرمادیا۔

(۱) تعدّد ازدواج کو جواز کی سند عطا فرمائی گئی تاکہ عورتوں کی اس کثرت کا مناسب بندوبست ہو سکے جو اس وقت معاشرہ میں موجود تھی۔ (واضح رہے کہ تعدّد ازدواج کے جواز کے لئے قرآن کریم میں اس آیت کے سوا اس سے پہلے کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تھی۔)

(۲) اس تعدّد ازدواج کی تحدید کر دی گئی تاکہ مالدار اور سردار لوگ اپنے گھروں میں لاتعداد بیویاں نہ ڈال سکیں اور اسی طرح ان محروم لوگوں کو بھی بیویاں میسّر آسکیں جو اپنی غربت و فلاکت اور کمزوری کی وجہ سے ایک بیوی حاصل کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

(۳) تعدّد ازدواج کی اس اجازت کو ہنگامی صورتِ حالات کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تاکہ یہ حقیقت ہر وقت پیشِ نظر رہے کہ یہ اجازت کن حالات میں قابلِ عمل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اسلام نہ کسی خاص قوم کے لئے ہے نہ کسی خاص وقت کے لئے۔ وہ پوری دنیا کے لئے ہے۔ اور ہر زمانہ کے لئے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی معاشرہ میں جو حالات آج موجود ہیں وہ ہر معاشرہ میں پائے جائیں اور ہر زمانہ میں پائے جائیں۔

قرآن کریم میری یا کسی دوسرے انسان کی کتاب نہیں ہے وہ تو خدائے

علیم و بصیر کی کتاب ہے جسے خوب معلوم ہے کہ مُسلم معاشروں کو کن کن حالات سے گذرنا ہوگا۔ اور کیا کیا صُورتیں اُنہیں پیش آنی ہیں۔

بیوی کو طلاق دیکر نیا نکاح اگر کسی کے چار بیویاں تھیں اور اس نے ایک بیوی کو طلاق دیدی ہے تو جب تک اِس مطلقہ بیوی کی عدّت نہ گذر جائے وہ کسی اور عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عدّت میں نکاح کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ طلاق بائنہ دی گئی ہو۔ ہمارے نزدیک بائنہ اور غیر بائنہ کی تفریق صحیح نہیں ہے۔ اس کی بحث کتاب الطلاق میں آئے گی۔

حاملہ عورت سے نکاح اگر کسی نے حاملہ عورت سے نکاح کر لیا ہے تو جب تک وضع حمل نہ ہو جائے نکاح باطل ہے۔ اگر حمل ناجائز ہے یعنی زنا سے حمل قرار پایا ہے تب بھی نکاح باطل ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا مذہب یہی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ نے نکاح کو صحیح قرار دیا ہے مگر اس سے ہمبستری کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک امام ابو یوسفؒ کا مذہب زیادہ صحیح ہے۔

نکاحِ متعہ نکاح کا مقصد قرآن کریم کی رو سے خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل نہیں ہے۔ بلکہ تحفّظ عصمت و عفت اور افزائش نسل ہے۔ یہ مقصد نکاح متعہ سے حاصل نہیں ہوتا نہ اس کا یہ مقصد ہوتا ہے۔ کیونکہ نکاح متعہ کہتے ہی اس نکاح کو ہیں جو مختصر مدّت کے لئے کیا جائے۔ سفر وغیرہ میں لوگوں کو اس کی ضرورت نفسانی خواہشات کی آسودگی کے لئے پیش آتی تھی اور اسلام سے پہلے عربوں میں اس کا عام رواج تھا۔ اسلام کے ابتدائی دَور میں مسلمان بھی اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک روایات سے معلوم

ہوتا ہے غزوۂ خیبر میں آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلّم نے اس سے شدّت کے ساتھ منع فرما دیا تھا۔ بہرحال قرآن کریم اس قسم کے نکاح کی حمایت نہیں کرتا۔ سورۂ بقرہ میں روزہ کے احکام کے سلسلہ میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد موجود ہے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ	روزہ کی شب میں تمہارے لئے اپنی بیویو
الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ	کے ساتھ جنسی باتیں حلال کردی گئ
لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ	ہیں۔ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور
لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ	تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ خوب جانتا
تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ	ہے کہ تم (اس معاملہ میں) اپنے نفسوں
عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ	سے خیانت کرتے رہے ہو۔ اللہ نے
فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا	تم پر نظرعنایت فرمائی اور تمہیں معاف
مَا كَتَبَ	کر دیا۔ تو اب تم ان سے ہمبستری کرسکتے
اللّٰهُ	ہو اور اس طرح جو کچھ خدا نے تمہارے
لَكُمْ ص	لئے مقدر کر دیا ہے (یعنی اولاد)۔
(۲/۱۸۷)	اسے طلب کرو۔

اس سے ظاہر ہے کہ نکاح اور اس کے نتیجہ میں جنسی اختلاط کا ایک بڑا مقصد افزائش نسل ہے۔ جہاں یہ مقصد نہ ہو بلکہ محض شہوت رانی ہو اسے نکاح کہنا ہی غلط ہے۔ اس کی مزید وضاحت سورۂ نساء میں فرما دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ	اور جو تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا
طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ	ہو کہ وہ آزاد پاکدامن مؤمن عورتوں

الْمُؤْمِنٰتِ فَمِمَّا مَلَكَتْ	سے نکاح کر سکے تو ان لونڈیوں سے
اَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيٰتِكُمُ	کرے جو مؤمنہ جوان لڑکیوں میں سے
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ	تمہاری مِلکِ یمین میں آ گئی ہوں ۔
بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِنْ	اور اللہ تمہارے ایمان کے متعلق بہتر
بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ	جانتا ہے تم سب ایک دوسرے کے ہم
اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ	جنس ہی ہو ، تو ان کے مالکوں کی اجازت
بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ	سے تم ان سے نکاح کر لیا کرو اور دستور
مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ	کے مطابق ان کے مہر انہیں ادا کرو ، مگر
اَخْدَانٍ ۚ	وہ پاکدامن ہوں ، شہوت رانیاں کرنے
(۴/۲۵)	والی اور یارانے گانٹھنے والیاں نہ ہوں ۔

یہی بات مردوں کے لئے بھی ضروری ہے چنانچہ سورۃ مائدہ میں ہے ۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ	آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کر
وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا (ذبیحہ
حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ	وغیرہ) بھی جنہیں کتاب دی گئی ہے ۔
لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ	اور تمہارا کھانا (ذبیحہ وغیرہ) ان کے
الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ	لئے حلال ہے اور مؤمن پاکدامن عورتیں
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ	اور ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں بھی
قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ	حلال ہیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی
مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ	جا چکی ہے ۔ بشرطیکہ تم ان کے مہر انہیں
وَلَا مُتَّخِذِيْٓ	ادا کرو اور پاکدامنی کے ساتھ ان سے
اَخْدَانٍ ؕ	نکاح کرو ، شہوت رانی اور یارانے

(۵/۵) گا نٹھنے والے نہ ہوں۔

ان تمام آیاتِ کریمہ سے واضح ہے کہ نکاح کا مقصد صرف جنسی پیاس بجھانا نہیں ہے بلکہ تحفظ عِفت وعصمت اور افزائش نسل ہے اور یہ عمر بھر ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا معاہدہ ہے ظاہر ہے کہ مختصر مدّت کے لئے جو نکاح کیا جائے وہاں یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا بلکہ محض جنسی تشنگی کی سیری اور شہوت رانی ہوتا ہے۔ چنانچہ سوائے اثنا عشری شیعوں کے باقی شیعوں نے بھی بالاتفاق اس قسم کے نکاح کو باطل کہا ہے اور زیدی و اسماعیلی شیعوں کے ہاں بھی یہ حرام ہے۔

عدالتی فیصلہ سے نکاح کسی شخص نے ایک عورت سے نِکاح نہیں کیا، یا کِسی عورت نے کِسی مرد سے نکاح نہیں کیا۔ لیکن مرد یا عورت نے عدالت میں جھوٹے گواہ پیش کر کے یہ فیصلہ حاصل کر لیا کہ نکاح ہو چکا ہے ایسی صورت میں اس مرد اور عورت کے لئے زن و شوہر کے تعلّقات قائم کرنا جائز ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زن و شوہر کے تعلّقات قائم کرنا جائز ہے۔ لیکن امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ نکاح دیانتہً نافذ نہیں ہے اور مرد اور عورت اگر زن و شوہر کے تعلّقات قائم کرتے ہیں تو گنہگار ہوں گے۔ لیکن انتظاماً یہ صحیح نکاح تسلیم کیا جائے گا۔ چنانچہ جو اولاد پیدا ہو گی اس کا نسب ثابت ہو گا اور ترکہ میں سے اس کو وراثت کے قانون کے مطابق حِصّہ ملے گا۔ نیز شوہر کو بھی اور بیوی کو بھی۔

(باب الاولیاء)

اسلام نے حقوق و واجبات کے سلسلہ میں عورت اور مرد میں کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ تصرفات کا حق جیسے مرد کو دیا ہے ایسے ہی عورت کو بھی دیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ (۲/۲۲۹)

اور عورتوں کے بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے دستور کے مطابق ان کے ذمہ (مردوں کے) حقوق ہیں۔ اور مردوں کے لئے ان پر ایک گونہ برتری ہے

یہاں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ عورتوں کے حقوق اور واجبات یکساں ہیں۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔ اس ایک گونہ برتری کی وضاحت بھی سورۃ نساء میں فرمادی گئی ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ (۴/۳۴)

شوہر اپنی بیویوں پر منتظم اور معاشی طور پر ان کے کفیل ہیں کیونکہ اللہ نے بعض کو بعض پر برتری بخشی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔

اکتساب رزق کی طاقت عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کو زیادہ بخشی گئی ہے۔ مرد ہی عورت کا محافظ اور کفیل ہوتا ہے۔ وہ دن بھر محنت و مشقت کرکے کماتا ہے اور بیوی بچوں کی کفالت کا بار اٹھاتا ہے۔ اس لئے اسے عورتوں پر ایک گونہ برتری بیشک حاصل ہے۔ لیکن وہ اپنے معاملات طے کرنے میں

خود مختار ہے۔ اکتساب رزق کی قوت عورت کے مقابلہ میں مرد کے اندر زیادہ ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس صلاحیت سے بالکلیہ محروم ہے۔ جو کچھ وہ کماتی ہے وہ اسی کا ہے اور اُسے اس میں ہر تصرف کا حق حاصل ہے۔ سورۂ نساء ہی میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا	مردوں کا حق اس میں ہے جو وہ کمائیں
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ	اور عورتوں کا حق اس میں ہے جو وہ کمائیں۔
(۴/۳۲)	

وہ خرید و فروخت کر سکتی ہے، وہ معاہدات کر سکتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے متعلق تمام معاملات طے کر سکتی ہے۔ قرآن کریم نے عورتوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی مرضی سے خود اپنا نکاح بھی کر سکتی ہے۔ یا نہیں۔ قرآن کریم نے نکاح پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ	اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو
أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن	اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں
يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا	اپنے شوہروں کے ساتھ دوبارہ نکاح
بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ	کرنے سے روکو نہیں جبکہ وہ دستور کے مطابق باہم راضی ہوں۔
(۲/۲۳۲)	

اس آیت کریمہ میں نکاح کی نسبت خود عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ اور ان کے اولیاء کو ممانعت کرنے سے روکا گیا ہے۔ يَنكِحْنَ یعنی وہ عورتیں خود نکاح کر لیں۔ سورۂ بقرہ ہی میں ہے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ	اور تم میں جو لوگ وفات پا جائیں اور

وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا	بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے نفسوں
يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ	کے ساتھ چار مہینے دس دن تک انتظار
اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ	کریں۔ پھر جب وہ اپنی عِدّت پوری
اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ	کرلیں تو دستور کے مطابق جو کچھ وہ
فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ	اپنے نفسوں کے بارے میں عملی طور پر
بِالْمَعْرُوْفِ ط	کر گذریں (کرنے دو) اس بارہ میں تم
(۲/۲۳۴)	پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وہ اپنے نفسوں کے بارہ میں بجز اس کے اور کیا عمل کریں گی کہ وہ کہیں نکاح ثانی کرلیں۔ متوفی کے ورثاء کو اس پر اعتراض ہو سکتا تھا۔ اُنہیں اعتراض کرنے سے روکا جارہا ہے۔ یہاں فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ (جو کچھ وہ اپنے نفسوں کے بارہ میں عمل کرلیں) کی نسبت بھی عورتوں ہی کی طرف کی جارہی ہے۔ جو کچھ عمل درآمد کر رہی ہیں، وہ خود ہی کر رہی ہیں۔ تقریبًا یہی الفاظ اس سے ذرا آگے آتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ	اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ	اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں اُنہیں اپنی
وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ	بیویوں کے حق میں یہ وصیّت کر دینی
مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ	چاہیئے کہ سال بھر تک ان کے اخراجات
اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ	برداشت کئے جائیں اور کوئی اُنہیں
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا	گھر سے نہ نکالے۔ پھر اگر وہ خود نکل
فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ	جائیں جو کچھ وہ دستور کے مطابق اپنے
مَّعْرُوْفٍ ط	نفسوں کے بارے میں عملی طور پر کر

وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ۝	گذریں اس بارہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اور اللہ بڑا غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

(۲ / ۲۴۰)

اس آیت کریمہ میں بھی ظاہر ہے کہ شوہروں کو یہ حکم دیا جارہا ہے۔ کہ وہ اپنی بیویوں کے سلسلہ میں یہ وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک ان کا خرچہ اُٹھایا جائے اور اُنہیں گھر سے نہ نکالا جائے لیکن اگر وہ ازخود نکل جائیں اور اپنے نفسوں کے بارہ میں کچھ عملی اقدام کر گذریں یعنی دوسری شادی کر لیں اور نئے شوہر کے گھر چلی جائیں تو متوفی کے ورثاء پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہاں بھی فَعَلۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ کی نسبت خود ان عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ جو کچھ بھی کر رہی ہیں وہ خود ہی کر رہی ہیں۔ ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی شادی اور اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ کسی کی محتاج نہیں ہے۔

لیکن اسلامی معاشرہ میں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ دنیا کے تمام شریف گھرانوں میں نکاح کے معاہدے عورتیں براہِ راست خود انجام نہیں دیتیں بلکہ اپنے اولیاء کے ذریعہ سے ہی انجام دلواتی ہیں۔ یہ اولیاء اگرچہ خود عورتوں کی مرضی معلوم کر کے ان کی مرضی کے مطابق ہی معاہدے کرتے ہیں۔ لیکن عورتوں کا براہِ راست خود اپنے ہاتھوں معاہدات کرنا غیر شریفانہ فعل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ چونکہ شرم و حیا ہی کا ایک حصہ ہے جو عورتوں کے لئے قیمتی زیور تسلیم کیا گیا ہے اس لئے قرآن کریم نے اس کی مخالفت نہیں فرمائی۔ بلکہ اس کی تائید و توثیق فرمائی ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ ہی میں ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ	اور اگر تم نے انہیں ان کو ہاتھ لگانے
قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ	سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے اور تم ان
فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً	کے لئے مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو جتنا
فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ	مہر مقرر کیا تھا اس کا آدھا انہیں
يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ	ادا کرو بجز اس صورت کے کہ وہ
بِيَدِهٖ عُقْدَةُ	خود ہی معاف کر دیں یا وہ (ولی) معاف
النِّكَاحِ ؕ	کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن
(۲ / ۲۳۷)	باندھنا تھا۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں ولی کی حیثیت بھی یہ ہوتی ہے کہ نکاح کا بندھن باندھنا اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی آیت کریمہ نے ولی کے معاف کرنے کو عورتوں کے خود معاف کر دینے کے بعد بیان فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ معاف کرنے کا پہلا حق خود عورت ہی کا ہے۔ کیونکہ مہر اسی کا حق ہے اور وہی اس کی مالک ہے۔ دوسرے درجہ میں اس کی اجازت سے نیابتاً ولی بھی معاف کر سکتا ہے۔ لیکن ولی اس معاملہ میں اصل نہیں ہے۔ وہ لڑکی کا ایجنٹ اور اس کا نمائندہ ہے۔

بہرحال آزاد عاقل بالغ لڑکی خواہ وہ کنواری ہو یا بیوہ ہو اپنا نکاح براہِ راست خود کر سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کا مسلک یہی ہے۔ امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ عورتوں کا نکاح بغیر ولی کے نہیں ہو سکتا۔ البتہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ نکاح ولی کی اجازت پر موقوف رہے گا۔ اگر ولی اجازت دیدے تو نکاح صحیح ہو جائے گا

ورنہ نہیں۔ لیکن امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مطلقاً صحیح نہیں ہوگا ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مسلک قرآن کریم سے قریب تر ہے اور صحیح ہے۔

کیا ولی جبراً نکاح کر سکتا ہے؟ باپ یا کسی دوسرے ولی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اپنی عاقل و بالغ لڑکی کا بغیر اس کی مرضی کے جبراً نکاح کر دے۔ البتہ اگر باپ نے اپنی کنواری لڑکی سے اجازت طلب کی اور وہ خاموش رہی یا مسکرا دی یا ہنسدی تو اسے اجازت مانا جائے گا۔ کیونکہ کنواری لڑکیاں باپ کے سامنے شرم کی وجہ سے عام طور پر زبان نہیں کھولتیں لیکن باپ کے علاوہ کسی دوسرے ولی کے سامنے خاموشی یا مسکراہٹ اور ہنسنے کو رضامندی نہیں مانا جائے گا۔ جب تک وہ زبان سے صراحتہً اجازت نہ دیدیں۔ اگر باپ کے اجازت طلب کرنے پر لڑکی آواز کے ساتھ رو دی یا استہزائً ہنسدی یا خاموش رہی لیکن غصتہ اور ناگواری کی وجہ سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تو اِسے انکار سمجھا جائے گا۔ حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔

البتہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عاقل و بالغ کنواری لڑکی کا نکاح اس کا ولی جبراً بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ لڑکیاں ناتجربہ کار ہوتی ہیں۔ وہ اپنے بھلے بُرے کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ان کا ولی ہی بہتر طور پر ان کے بھلے بُرے کو سمجھ سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کی یہ دلیل قابلِ قبول نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک حنفیہ کا مسلک قرآن کریم سے قریب تر اور صحیح ہے۔

اجازت لیتے وقت ولی کو لڑکے کا نام وضاحت کے ساتھ لینا چاہیئے تاکہ لڑکی سمجھ سکے کہ اس کی شادی کس مرد کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ البتہ مہر کی رقم کی مقدار بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ تاہم اگر مہر کی رقم بھی بتا دی

جائے تو بہتر ہے تاکہ لڑکی کو پوری بات معلوم ہو جائے۔

بیوہ لڑکی کا نکاح بغیر اس کی صریح اجازت کے نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کنواری لڑکی کے نکاح میں صریح اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اجازت وہاں بھی ضروری ہے۔ البتہ اشارۃً اجازت کو بھی کافی سمجھا گیا ہے۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ نابالغ کا نکاح والدین کر سکتے ہیں مگر قرآن کریم نے نکاح کی عمر بلوغ بتائی ہے۔

نابالغ کا نکاح لہٰذا نابالغ لڑکے یا لڑکی کے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سورۃ نساء میں جہاں یتیموں کو ان کے اموال حوالہ کر دینے کا حکم دیا گیا ہے وہاں فرمایا گیا ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ	اور یتیموں کی حالت پر نظر رکھ کر انہیں آزماتے رہو (کہ ان کی سمجھ بوجھ کا کیا حال ہے) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں صلاحیت پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔
(۴/۶)	(ترجمان القرآن)

یہ ترجمہ ہم نے خود نہیں کیا ہے بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ نقل کر دیا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں۔

"اور یتیموں کو آزما لیا کرو، یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو تو ان کے اموال ان کے حوالہ کر دو۔"

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے یتیموں کو ان کے اموال حوالہ کرنے کے لئے جو حد مقرر فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں یعنی بالغ ہو جائیں تو دیکھ لو کہ ان میں سمجھ بوجھ یا ایک گونہ تمیز آگئی ہو تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دو۔ اس آیت سے جہاں یتیموں کو ان کے اموال حوالہ کرنے کا وقت معلوم ہو گیا۔ وہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ قرآن کریم کے نزدیک نکاح کی ایک عمر مقرر ہے اور وہ بلوغ ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء اسلام میں سے دو عظیم فقہاء۔ قاضی ابن شبرمہؒ اور ابو بکر الاصمؒ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے نابالغوں کے نکاح کو ناجائز قرار دیا ہے۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے نابالغوں کے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن فقہائے حنفیہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ نابالغ لڑکے اور لڑکی کا نکاح اس کا ولی کر سکتا ہے اگر ولی باپ یا دادا تھا تو لڑکی کو بالغ ہونے کے بعد اس نکاح کو فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور اگر باپ دادا کے علاوہ کوئی دوسرا ولی تھا تو بالغ ہونے کے بعد لڑکے اور لڑکی کو اختیار ہے خواہ وہ اس نکاح کو قائم رکھیں خواہ فسخ کر دیں امام مالکؒ صرف باپ کی حد تک اجازت دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ باپ کے علاوہ کوئی دوسرا ولی نابالغوں کا نکاح نہیں کر سکتا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ باپ اور دادا کے علاوہ اور کوئی دوسرا ولی نابالغوں کا نکاح نہیں کر سکتا۔ نیز اس نابالغ لڑکی کا نکاح بھی نہیں کیا جا سکتا جو کنواری نہ رہی ہو۔

امام مالکؒ کے ارشاد کی وجہ یہ ہے کہ آزاد عورت پر ولایت کا حق بنا بر

ضرورت تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن نابالغ لڑکی اور نابالغ لڑکے میں وہ ضرورت موجود ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ انہیں شادی کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ لہٰذا ولایت کا حق تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ البتہ باپ کے سلسلہ میں ولایت کا حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ نص سے ثابت ہو گیا ہے۔ (ہدایہ صفحہ ۳۱۶ ج ۱) اس پر حاشیہ میں عنایہ سے نقل کیا گیا ہے۔ کہ

"کیونکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کر دیا تھا جب وہ چھ سال کی تھیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کو صحیح قرار دیا تھا" (ایضاً ہدایہ صفحہ ۳۱۶ ج ۱)

مذکورہ بالا آیت کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۚ (۱۹/۴)	اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم عورتوں کے (بغیر ان کی رضامندی کے) زبردستی وارث و مالک بن جاؤ۔

ظاہر ہے کہ ایک نابالغ لڑکی سے نکاح کر لینا زبردستی اس کا وارث و مالک بن جانا ہے۔ کیونکہ اس میں اس کی رضامندی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اس سے پہلے سورۂ نساء ہی میں ہے۔

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۳/۴)	تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں۔

عربی زبان میں اَلنِّسَآءُ (عورتیں) بالغ عورتوں کو کہتے ہیں نابالغ بچیوں کو نہیں کہتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نکاح کی اجازت عورتوں سے دی جا رہی ہے۔ بچیوں سے نہیں۔

پھر اسی سورۂ نساء میں ہے۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ (۴/۲۱)	اور (عورتوں کو جو مال تم دے چکے ہو، طلاق دیتے وقت) اسے تم کیسے واپس لے سکتے ہو حالانکہ تم دونوں تنہائیوں کے ایک دوسرے کے شریک رہ چکے ہو اور وہ تم سے سخت عہد لے چکی ہیں۔

بیوی کے متعلق بتایا گیا ہے۔ کہ وہ تنہائی کی شریک رہ چکی ہے اور وہ سخت پختہ عہد تم سے لے چکی ہے اسے جو مال تم دے چکے ہو اسے کیسے واپس لے رہے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیوی وہی ہو سکتی ہے جو تنہائیوں کی شریک رہ سکے اور مردوں سے سخت عہد و پیمان لے سکے۔ ظاہر ہے کہ نابالغ لڑکیوں میں دونوں صلاحیتیں نہیں ہوتیں اس لئے ان کو بیوی نہیں بنایا جا سکتا۔

سورۂ بقرہ میں عام بیویوں کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (۲/۱۸۷)	بیویاں تمہارا لباس ہوتی ہیں اور تم ان کا لباس ہوتے ہو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لباس ہوتے ہیں۔ لہٰذا بیوی تو وہی ہو سکتی ہے جو کسی کا لباس بن سکے۔ ایک نابالغ بچی نہ کسی کے لئے لباس بن سکتی ہے اور نہ اسے بیوی بنایا جا سکتا ہے۔

قاضی ابن شبرمہؒ جو امام ابوحنیفہؒ کے ہم عصر اور عظیم ترین شخصیت ہیں۔ طبقۂ فقہاء میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کی عمر ۱۸ سال اور ۱۶ سال مقرر فرمائی تھی۔ آج سے چند سال پہلے علمائے مصر نے ان کے فتویٰ کو جدید شرعی قوانین میں مدوّن کرایا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے القضاء فی الاسلام صـ۶۷ بحوالہ امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی صـ۴۰ ۔ قاضی ابن شبرمہؒ نے اسی مذکورہ بالا آیت وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ہی سے استدلال فرمایا تھا۔ چنانچہ علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ اپنی مشہور کتاب مبسوط میں لکھتے ہیں کہ۔

" یقول ابن شبرمة و ابو بکر الاصم انه لایتزوج الصغیر و الصغیرة حتی یبلغا لقوله تعالیٰ حتی اذا بلغوا النکاح فلو جاز التزویج قبل البلوغ لم یکن لهذا فائدة۔ (کتاب المبسوط ج۴ صـ۱۹۳ مطبوعہ مصر)

یعنی اگر بلوغت سے پہلے نابالغ لڑکی اور نابالغ لڑکے کا نکاح جائز ہوتا تو قرآن کریم میں حتی اذا بلغوا النکاح کے لفظ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں سے قاضی ابن شبرمہؒ اور ابوبکر الاصمؒ جیسے فقہاء گذر چکے ہیں جو نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اور چونکہ فقہاء کے طبقہ میں یہ دونوں حضرات حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان حضرات تک حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا روایت نہیں پہنچی تھی۔ کیونکہ اس عصر کے تمام فقہاء تک یہ حدیث پہنچ چکی تھی اور اسی حدیث کی بناء پر ان حضرات نے نابالغوں کے نکاح کی اجازت دی ہے۔ یہ اس بات

کی دلیل ہے کہ قاضی ابن شبرمہؒ اور ابو بکر الاصم نے اس حدیث عائشہؓ کو تسلیم نہیں فرمایا اور وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔

شیخ الاسلام امام احمد ابن علی رازی جصاص نے جو فقہائے حنفیہ میں سے ہیں۔ اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں قاضی ابن شبرمہؒ اور ابوبکر الاصمؒ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"عن ابن شبرمۃ ان تزویج الاباء علی الصغار لایجوز و هو مذهب الاصم" (احکام القرآن ج۲ ص۵۶)

"یعنی ابن شبرمہؒ سے نقل ہے کہ نابالغوں کا نکاح اگر ان کے آبا کر دیں تو وہ جائز نہیں ہوتا۔ اور ابو بکر الاصمؒ کا مذہب بھی یہی ہے"

ہمیں خوشی ہے کہ ہمیں اس مسئلہ میں علمائے سلف میں سے دو بڑے فقہاء کی تائید حاصل ہے اور وہ اسی آیت سے استدلال فرما رہے ہیں جس سے ہم نے استدلال کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ اس نام نہاد حدیث عائشہؓ کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

یہ مسئلہ چونکہ کافی اہمیت اختیار کر چکا ہے اس لئے ہم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے جو آئندہ جلد میں آرہی ہے۔ جس میں ہم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق سات اہم مسائل سے بحث کی ہے۔ یہ دوسری جلد بھی بہت جلد ہدیۂ ناظرین کی جائے گی۔

نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر

آپ کو حیرت ہوگی کہ حضرت عائشہؓ کے بارہ میں یہ روایت کہ ان کا نکاح ہوا تو وہ چھ سال کی تھیں اور ان کی رخصتی ہوئی تو وہ نو سال کی تھیں۔ بخاری میں آگئی ہے۔ لیکن اسی بخاری میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ سورۂ القمر نازل ہوئی تو حضرت عائشہؓ بچی تھیں اور وہ کھیلتی

پھرتی تھیں اور اُنہیں اس کی آیتیں یاد ہوگئی تھیں اور وہ انہیں دہراتی پھرتی تھیں۔ (ملاحظہ ہو بخاری صفحہ ۷۲۰/۲) سورۃ القمر نبوت کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد مکہ مکرمہ میں تیرہ یا پندرہ سال رہے تو اگر سورۃ القمر کے نازل ہونے کے وقت حضرت عائشہ رض کی عمر کم سے کم چھ سال بھی مانی جائے تو ہجرت کے وقت ان کی عمر سولہ ۱۶ سترہ ۱۷ سال اور رخصتی کے وقت اٹھارہ ۱۸ انیس ۱۹ سال ہونی چاہیئے۔ ورنہ نکاح کی روایت کے مطابق تو (جسکی رو سے سنہ ۱۲ نبوت یا سنہ ۱۴ نبوت میں وہ چھ سال کی تھیں) اُنہیں سنہ ۵ نبوت میں جب کہ سورۃ القمر نازل ہوئی تھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صلب میں ہونا چاہیئے تھا بہرحال دونوں روایتیں بخاری کی ہیں۔ جس روایت کی آپ چاہیں تغلیط فرمادیں۔ ہم امام بخاری رح پر پورا پورا حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ ان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہی سمجھتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں پریس تو تھے نہیں۔ کتابیں ہاتھوں سے ہی لکھی جاتی تھی۔ کسی خبیث اور شریر شخص نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذاتِ گرامی کو اضحوکہ روزگار بنانے کے لئے ست عشرہ (سولہ سال) اور تسع عشرہ (انیس سال) سے دونوں جگہ عشرہ کا لفظ مٹا دیا یا کھرچ دیا۔ اور یہ روایت چل پڑی۔ اس کے بعد کسی اللہ کے بندہ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس کی چھان بین اور تحقیق وتنقید کرتا۔

وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ نابالغ لڑکیوں کے نکاح کے سلسلہ میں ہمارے بعض علمائے کرام نے ایک عجیب وغریب استدلال قرآنِ کریم سے بھی فرمایا ہے۔ وہ سورۃ الطلاق کی اس آیت سے استدلال فرماتے ہیں۔

وَالّٰئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ   اور تمہاری بیویوں میں سے جو حیض

مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ط وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ط (۶۵ / ۴)

سے مایوس ہو چکی ہیں۔ اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان کی بھی جنہیں حیض نہیں آسکا۔ اور حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا وضع حمل کر لیں۔

ان حضرات نے وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (اور جن عورتوں کو حیض نہیں آسکا) کے لفظ سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اس سے مراد نابالغ لڑکیاں ہیں کیونکہ قرآن کریم ان عورتوں کی بھی عدت بتا رہا ہے جنہیں حیض نہیں آسکا اور عدت کا سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ اس طرح قرآنِ کریم نے صریح طور پر اس لڑکی سے نکاح کو جائز قرار دیا ہے جس کو حیض نہ آسکا ہو اور وہ نابالغ ہو۔

ان حضرات نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اگر بیوی کو ہمبستری سے پہلے طلاق دے دی جائے تو بیوی پر طلاق کے بعد عدت واجب نہیں ہوتی۔ یہ قرآن کریم کا منصوص حکم ہے اور فقہائے اُمت کا متفقہ فیصلہ ہے۔ تو اگر سورۂ طلاق کی اس آیت میں لَمْ یَحِضْنَ سے مُرادِ نابالغ لڑکیاں ہیں تو ان حضرات کو ساتھ ہی یہ فتویٰ بھی صادر فرمانا چاہیئے کہ کمسن اور نابالغ لڑکیوں کے ساتھ جنسی کھیل کھیلنا بھی جائز ہے اور قرآن کریم نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔ کیونکہ عدت تو تب ہی واقع ہو گی جب نابالغ اور کمسن لڑکیوں کا نکاح ہو سکتا ہو اور ان سے جنسی تسکین بھی جائز قرار دی جائے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا کی کسی تہذیب نے آج تک اس وحشیانہ اور ظالمانہ بوالہوسی کو جائز قرار نہیں دیا۔ تو قرآن اِسے کس طرح جائز قرار

دے سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے نکاح کی عمر بالغ ہونا قرار دی ہے کمسنی اور نابالغی کی شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آیت مذکورہ میں ان عورتوں کی عدّت بتائی گئی ہے جنہیں کبر سنی کی بنا، پر ماہواری ایام آنے بند ہو چکے ہوں یا جنہیں کسی بیماری اور عذر کی وجہ سے باوجود بالغ ہونے کے ایام نہ آرہے ہوں۔ (ماں اگر اپنے بچہّ کو دُودھ پلا رہی ہے تو اسے بھی ماہواری ایام نہیں آتے) بہر حال یہ دونوں قسم کی عورتیں اپنی عدت کا حساب مہینوں کے اعتبار سے کریں گی۔ یعنی تین مہینے پورے کر کے عدّت سے باہر ہو جائیں گی۔

بحث کا علمی تجزیہ واضح رہے کہ عربی زبان میں صرف سادہ نفی کے لئے " ما " اور " لا "کے الفاظ آتے ہیں۔ اور " لَمْ "کا لفظ نفی جحد کے لئے آتا ہے۔ یعنی ایسی نفی کے لئے جو انکار ادعائے وجود پر مشتمل ہو۔ یعنی " لَمْ " کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مقابلہ میں واقعی طور پر یا اقتضائے حال کے طور پر مخالف اِدّعا پایا جاتا ہو۔ جس کا انکار مقصود ہو۔ مَاحِضْنَ اور لَمْ یَحِضْنَ میں فرق ہی یہ ہے کہ مَاحِضْنَ کے معنے ہیں کہ۔ اُنہیں حیض نہیں آیا۔ جہاں کہیں حیض آنے کی نفی کرنی ہو وہاں آپ مَاحِضْنَ کہہ سکتے ہو۔ لیکن لَمْ یَحِضْنَ اس وقت کہہ سکتے ہیں جب آپ کا مخاطب یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ حیض آچکا ہے۔ یا اقتضائے حال کا واقعی تقاضا ہو کہ حیض آچکا ہے لیکن آیا نہیں ہے۔ اسے انکار وجود کی نفی کہتے ہیں۔ مَاحِضْنَ میں وہ شدّت نہیں ہے جو لَمْ یَحِضْنَ میں ہے۔ جو لڑکیاں بالغ ہو چکی ہیں وہاں اقتضائے حال کا یہ تقاضا بلکہ ادّعا ہوتا ہے کہ اُنہیں ماہواری ایام ہوتے

ہیں۔ اس ادّعا کی تردید ماحضن کے لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے انکار وجود کے لئے لَمْ یَحِضْنَ کہنا ضروری ہوگا اس کے برعکس جو لڑکیاں کمسن اور نابالغ ہیں۔ ان کے سلسلے میں نہ کوئی دعویٰ موجود ہے کہ اُنہیں ماہواری ایام آتے ہیں اور نہ ہی اقتضائے حال کا یہ تقاضا اور ادّعا ہے۔ لہٰذا ان کے لئے لَمْ یَحِضْنَ کہنا اصولی طور پر غلط اور فصاحت کے خلاف ہے وہاں مَاحِضْنَ ہی کہنا ہوگا۔ وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ کو کمسن اور نابالغ لڑکیوں پر چسپاں کرنا اصولِ فصاحت کے لحاظ سے بھی غلط ہے۔ جو کلام کا بڑا ہی شدید نقص ہے۔ لہٰذا اس آیت سے وہی عورتیں مراد ہوں گی جو بالغ اور جوان ہو چکی ہوں مقتضائے حال اور عمر کا یہ تقاضا بلکہ ادّعا ہو کہ اُنہیں ماہواری ایام ہونے چاہئیں مگر کسی بیماری یا کسی عذر مثلاً بچہّ کو دُودھ پلانے کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔ عورتوں میں اس قسم کے عوارض اور شکایات عام طور سے پائی جاتی ہیں۔ اور قرآن کریم کو ایسی عامۃ الورود صُورتوں کا حکم بھی بتانا چاہیئے۔

نابالغ، مجنون اور کافر کی ولایت | نابالغ لڑکا، مجنون آدمی کسی عورت کا ولی اور نمائندہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُنہیں اپنی ذات کے متعلّق بھی تصرّفات کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ کسی دوسرے کے حق میں کِس طرح کوئی تصرّف کر سکتے ہیں۔ اِسی طرح کسی مُسلمان عورت کا ولی کوئی کافر نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ کا اِرشاد ہے۔

وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکَافِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًاہ (۴/۱۴۱)	اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں پر ہر گز کوئی (غلبہ وتسلّط کی) راہ نہیں دے گا۔

(فصل فی الکفاءۃ)

کفارت یعنی شوہر اور بیوی کا ایک دوسرے کا کفو اور ہمسر ہونا۔ ہمارے فقہاء کے نزدیک معتبر ہے۔ اس بارہ میں اختلاف ہے کہ کن باتوں میں کفو ہونا معتبر ہے۔

امام شافعیؒ نے پانچ چیزوں میں کفارت کو معتبر مانا ہے۔ (۱) دینداری (۲) نسب (۳) پیشہ (۴) آزادی (۵) عیوب سے پاک ہونا۔ فقہائے شافعیہ میں سے بعض حضرات نے چھٹی چیز (۶) عمروں کے تناسب کا بھی اعتبار کیا ہے۔ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ صرف دین داری میں کفارت معتبر ہے۔ اور کسی چیز میں معتبر نہیں ہے۔ ابن ابی لیلیٰؒ کا مسلک یہ ہے کہ دینداری، نسب اور مال میں کفارت معتبر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے پیشہ میں بھی کفارت کو معتبر مانا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ایک روایت میں پیشہ میں کفارت کا انکار فرمایا ہے۔ اور دوسری روایت میں اُنہوں نے اسے تسلیم فرمایا ہے۔ امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ صرف دینداری اور پیشہ میں کفارت معتبر ہے باقی چیزوں میں معتبر نہیں ہے۔

کفاءت کا مطلب | کفارت کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی نے غیر کفو میں اپنی مرضی سے نکاح کر لیا ہے تو اس کے اولیاء کو اس پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور وہ عدالت سے رجوع کر کے نکاح کو فسخ کرا سکتے ہیں۔ لیکن اگر لڑکی اور لڑکی کے اولیاء سب کی مرضی سے غیر کفو میں نکاح ہوا ہے۔ تو امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ بالاتفاق ایسے

نکاح کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ البتہ امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ نکاح باطل ہے۔ ایسا نکاح صحیح نہیں ہو سکتا۔ (المیزان الکبریٰ للشعرانی ج۲ ص۱۱۰ و ہدایہ ج۱ ص۳۲۰)

قرآن کریم کی رو سے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے پہلے دو بنیادی باتوں کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

اول یہ کہ نکاح کا مقصد قرآن کریم کی رو سے شوہر اور بیوی دونوں کو ایک دوسرے سے سکون و اطمینان کا حصول ہے۔ تاکہ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت و یگانگت اور مہربانی اور رحمت کا سلوک حاصل ہو سکے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بن سکیں۔ چنانچہ سورۃ الروم میں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ	اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بات
مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا	ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تمہاری
لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ	جنس سے تمہارے جوڑے پیدا کر دیئے
بَیْنَکُمْ	ہیں تاکہ تمہیں ان کی طرف سکون و
مَّوَدَّۃً وَّ	اطمینان اور آرام حاصل ہو سکے اور
رَحْمَۃً	اس نے تمہارے درمیان محبت اور
(۳۰/۲۱)	مہربانی کے جذبات رکھ دیئے ہیں۔

یہ ہے شادی اور نکاح کا بڑا مقصد کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ سکھ اور چین، سکون و اطمینان اور آرام و آسودگی حاصل ہو سکے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت کریں اور رحمت اور مہربانی کا سلوک کر سکیں۔ نیز سورۃ الفرقان میں جہاں اللہ کے سچے بندوں کے

اور اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں، یہ بھی فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ○ (۲۵ / ۷۴)	اور وہ یہ دُعا مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیویوں سے اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔ اور ہمیں تقویٰ شعار لوگوں کا پیشوا بنادے۔

آیتِ کریمہ میں مِنْ اَزْوَاجِنَا کا لفظ آیا ہے۔ اَزْوَاجٌ کا ترجمہ بیویاں بھی ہو سکتا ہے اور شوہر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ دُعا جہاں مؤمن مرد مانگ سکتے ہیں۔ وہیں مؤمن عورتیں بھی مانگ سکتی ہیں۔ اللہ کے سچّے بندوں میں جہاں مرد شامل ہیں وہیں عورتیں بھی شامل ہیں۔ بہرحال اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا چاہیئے۔ قرآن کریم کی رو سے شادی بیاہ، یعنی نکاح وازدواج کے یہی مقاصد ہوتے ہیں۔

دوم دوسری بنیادی بات جو سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سارے انسان یکساں نہیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے اُن میں فرق رکھا ہے۔ صُورت، شکل، صلاحیّت، قوّت، رنگ، زبان کے اختلافات موجود ہیں۔ اور عالمِ انسانیّت کی زینت ہی اس گونا گونی اور اختلاف سے ہے۔ دولت و ثروت کے لحاظ سے بھی سب انسان برابر نہیں، علم اور فن کے اعتبار سے بھی سارے آدمی یکساں نہیں ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

اُنْظُرْ کَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	غور کیجئے، ہم نے کس طرح بعض لوگوں

عَلٰی بَعْضٍ ط (۲۱/۱۷) | کو بعض لوگوں پر برتری دے رکھی ہے۔

سورۃ النساء میں ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط (۳۲/۴)	اور اللہ نے جو تم میں سے بعض کو بعض پر ایک گونہ برتری بخشی ہے اس کی تمنائیں نہ کیا کرو۔

سورۃ النحل میں ہے۔

وَ اللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ط (۷۱/۱۶)	اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں بھی برتری بخش رکھی ہے۔

سورۃ الحجرات میں ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ٥ (۱۳/۴۹)	اے افراد نسل انسانی! ہم نے تم سب کو نر و مادہ ہی سے پیدا کیا ہے۔ اور تمہیں مختلف شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً تم میں سب سے زیادہ عزت کا مستحق وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہو۔ بلاشبہ اللہ خوب جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

مندرجہ بالا تمام آیات کریمہ سے یہ بات واضح ہے کہ تمام انسان مساوی نہیں ہیں۔ کسی کو کوئی برتری حاصل ہے تو کسی کو دوسری کوئی برتری حاصل ہے۔ دولت و ثروت بھی سب کو یکساں حاصل نہیں ہوتی حسنِ عمل اور دینداری کے اعتبار سے بھی سب آدمی یکساں نہیں ہوتے

یہاں رنگ رنگ کے انسان ہیں اور طرح طرح کے آدمی ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شادی بیاہ اور نکاح و ازدواج کا مقصد مرد و عورت کے درمیان کامل امن و سکون اور اطمینان اور آرام کا حصول ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں اور شفقت و رحمت کا سلوک کریں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث بنیں ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک میاں بیوی کے درمیان فکر و نظر کی کامل ہم آہنگی اور جذبات و خیالات کی پوری یک جہتی موجود نہ ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں کے بود و باش کے طریقے، رسم و رواج، عادات و اخلاق، سماجی اور معاشی و معاشرتی، حالات ملتے جلتے ہوں۔ دونوں کا سماجی، معاشرتی اور عرفی درجہ اور مرتبہ (STATUS) ایک جیسا ہو۔ اس کے بغیر ان میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا ہونا عموماً مشکل ہوا کرتا ہے۔ جس کے بغیر امن و سکون اور شفقت و محبت کا وہ ماحول پیدا ہونا جو ازدواجی زندگی سے قرآن کریم کا مطمح نظر ہے بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کے نزدیک عزت و عظمت کا معیار نہ نسب ہے، نہ دولت ہے، نہ پیشہ ہے۔ نہ کوئی نسب اشرف ہے نہ ارذل ہے۔ نہ دولت مندی شرافت کی دلیل ہے۔ اور نہ غریبی و مفلسی رذالت کو مستلزم۔ کوئی پیشہ ذلیل نہیں ہے۔ ہر پیشہ لائق تحسین ہے۔ عزت و شرف کا معیار آدمی کا حسن عمل اور خوبیٔ کردار ہے جسے اسلام نے تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہٰذا کفاءت کے مسئلہ کو شرعی حیثیت نہیں دی جا سکتی البتہ مصلحت کا یہ تقاضا ضرور ہونا چاہیئے کہ حتی الامکان شوہر اور بیوی

کے مرتبہ اور درجہ یعنی (STATUS) کا لحاظ رکھا جائے۔ عہد رسالت مآب میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جہاں شادیوں میں کفارت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ حتیٰ کہ آزاد شدہ غلاموں (موالی) کی شادیاں اعلیٰ خاندانوں میں کی گئیں۔ وہ شادیاں کامیاب بھی ہوئیں اور ناکام بھی ہوئیں۔ خود حضرت زید ابن حارثہؓ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کے انجام کو قرآن کریم نے اپنے دفتین میں قیامت تک کے لئے محفوظ فرمادیا ہے۔

لہٰذا اس سلسلہ میں کوئی حتمی قانون بنا دینا مشکل ہے۔ حالات وکوائف کو دیکھتے ہوئے مصلحت کے ماتحت کفارت پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ اور حالات وکوائف کو دیکھتے ہوئے اسے ترک بھی کیا جاسکتا ہے۔ جن روایات سے کفارت کا اعتبار ثابت ہوتا ہے وہ ہمارے نزدیک اسی مصلحت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اصل بنیادی چیز شوہر اور بیوی کے درمیان موانست، مودّت ومحبّت کی فضا قائم کرنا ہے۔ اگر یہ کفارت کا لحاظ کئے بغیر قائم ہوسکتی ہے تو فبہا ورنہ اس کا لحاظ کیا جائے گا۔

بعض فقہاء شافعیہ کا یہ قول اسی مصلحت شناسی پر مبنی ہے۔ کہ عورت اور مرد کی عمروں میں زیادہ تفاوت نہیں ہونا چاہیئے۔ بوڑھے بوڑھے لوگ جو نوعمر لڑکیوں سے شادیاں رچالیتے ہیں وہ بھی مصلحت کفارت کے خلاف ہیں۔ اور ہم اس کے حق میں ہیں کہ اس قسم کی شادیوں پر قدغن لگنی چاہیئے۔ البتہ یہ یقین ہوجائے کہ دونوں میں اس کے باوجود ہم آہنگی پیدا ہوسکے گی وہاں اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(باب المھر)

مہر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔ قرآن کریم نے اس کے لئے، صَدُقَاتٌ اور اُجُوْرٌ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ صَدُقَةٌ کے متعلق ہم کتاب الزکوٰۃ میں (صدقات کے ماتحت) لکھ چکے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ۔ اَلصَّدَقَةُ، اَلصَّدُقَةُ، اَلصَّدْقَةُ، اَلصُّدْقَةُ۔ کے معنے اس عطیہ کے ہوتے ہیں۔ جو محض ثواب کی نیّت سے کِسی کو دیا جائے۔ اس سے اپنی عظمت اور مکرمت کا اظہار مقصود نہ ہو۔ شادی کے سِلسلہ میں عورتوں کو جو مہر دیا جاتا ہے۔ اسے بھی کہتے ہیں۔ (المنجد)

کیونکہ وہ بھی عطیہ اور تحفہ ہوتا ہے جو ثواب کی خاطر حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں دیا جاتا ہے۔ کِسی امر کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس کا مقصد اپنی عظمت و مکرمت کا اظہار ہوتا ہے۔ مہر کے لئے قرآن کریم نے دوسرا لفظ اُجُوْرَهُنَّ استعمال فرمایا ہے۔ اُجُوْرٌ، اَجْرٌ کی جمع ہے

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے ہیں۔ مزدور کی اُجرت کو بھی اسی لئے اَجْرٌ کہتے ہیں۔ کہ اس سے اس کی مشقت کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں، اس کی چٹخ جانے والی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں۔ شادی کے وقت جو عورت کو تحفہ یا مہر دیا جاتا ہے اسے بھی اَجْرٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ عورت اپنے ماں باپ اور ان کے گھر سے جُدا ہو کر ایک نئی زندگی میں قدم رکھتی ہے اس کا طبعی رنج اور قلق ہر عورت کو ہوتا ہے اور نئی زندگی کے آغاز پر ایک دھڑکا لگا ہوا ہوتا ہے کہ خدا جانے یہ زندگی کیسی گذرے گی۔ اس قلق و اضطراب کو

دور کرنے کے لئے اسے تحفہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ نئی زندگی سے مانوس ہو سکے۔ قرآن کریم نے سورۃ نساء میں۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (۴/۴) — اور عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ بلا بدل دے دو۔

فرما کر مہر کی حقیقت واضح فرما دی ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلنِّحْلَةُ اور اَلنُّحْلَةُ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے دیا جائے۔ (مفردات) اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہر وہ عطیہ ہے جو مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفۃً دیا جاتا ہے۔ (تاج العروس) اَلْعَطَاءُ بِلَا عِوَضٍ (لطائف اللغۃ) یعنی بغیر کسی معاوضہ کے عطیہ۔

تاج العروس اور ابن فارس نے اَلنُّحْلُ کے یہی معنے لکھے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلنِّحْلَةُ، نَحْلٌ ہی سے مشتق ہے۔ یعنی جس طرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید اور شیریں چیز عطا کر دیتی ہے اسی طرح نِحْلَةً وہ شیریں تحفہ ہے جو عورت کو بطیب خاطر بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ہے۔ یہ ہے مہر کی حقیقت۔ یعنی یہ کوئی معاوضہ کی رقم نہیں بلکہ تحفہ ہے جو مودّت اور محبّت کے اظہار کے لئے دیا جاتا ہے۔ مقصود اس سے عورت کا وزن اور اہمیّت بڑھانا اور اس کے وقار میں اضافہ کرنا ہے۔ اس کی مقدار کوئی متعیّن رقم نہیں ہے بلکہ وہی ہوگی جس پر دونوں فریق رضامند ہو جائیں۔

مہر لازم ہے ہر نکاح کے لئے مہر لازم ہے۔ حتیٰ کہ اگر مہر کا ذکر نہ کیا جائے تب بھی مہر ادا کرنا ہوگا۔ نیز اگر اس شرط کے ساتھ نکاح

کیا جائے کہ شوہر کے ذمہ مہر نہیں ہوگا تو امام مالکؒ کے نزدیک نکاح ہی صحیح نہیں ہوگا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک نکاح تو ہو جائے گا۔ لیکن مہر لازم ہوگا۔ قرآن کریم نے صیغۂ امر کے ساتھ مہر کی ادائیگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (۴/۴)	اور عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ بلا بدل دیدو۔

نیز ذرا اس سے آگے آیا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ (۴/۲۴)	اور مذکورہ بالا عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں کہ انہیں اپنے مال خرچ کر کے (مہر ادا کر کے) حاصل کرو پاکدامنی حاصل کرنے کے لئے، شہوت رانی کے لئے نہیں پھر جن عورتوں سے تم متمتع ہو چکے ہو اُنہیں ان کے مہر بطور فریضہ کے ادا کردو۔

اگر باندیوں کے ساتھ نکاح کیا گیا ہو تو ان کے متعلق بھی۔

وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (۴/۲۵)	اور ان کنیزوں کو بھی ان کے مہر دستور کے مطابق ادا کر دو۔

کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے جہاں اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی ہے، وہاں بھی یہ شرط لگا دی ہے۔

اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (۵/۵)	بشرطیکہ تم اُنہیں ان کے مہر ادا کر دو۔

دارالکفر سے اگر کچھ عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر کے چلی آئیں تو ان کی آزمائش کر لینے کے بعد ان سے نکاح کر لینے کی اجازت ہے لیکن وہاں بھی یہی شرط عائد فرمائی گئی ہے۔

اِذَا اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ	بشرطیکہ تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو۔

(۶۰ : ۱۰)

ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ مہر کی ادائیگی اور اس کا تقرر ضروری ہے۔ بہر حال یہ بات لازمی ہے کہ مہر مقرر کیا جائے۔ مقرر نہ بھی کیا جائے تو مہر دیا ضرور جائے۔ ایسی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔

مہر کی مقدار | مہر کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ مہر کتنا ہونا چاہیئے اس کی شریعت نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ ہر آدمی اپنی وسعت اور مقدرت کے مطابق مہر مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن اتنی مقدار یقیناً نہیں ہونی چاہیئے جو آدمی کی استطاعت سے باہر ہو، کیونکہ جیسا کہ اوپر آچکا ہے مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اتنا ہی ہونا چاہیئے جتنا کوئی ادا کر سکے۔ سورۂ نساء میں ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا ؕ	اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ اسے بدل کر دوسری بیوی لانا چاہو اور تم نے ان میں سے ایک عورت کو پورا سونے کا ڈھیر دیدیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

(۴ : ۲۰)

اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد متعین نہیں ہے مہر میں سونے کا ایک ڈھیر بھی دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کم سے کم کا تعلق

ہے قرآن کریم نے اس کی بھی تعیین نہیں فرمائی۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ	اور مذکورہ بالا (محرمات) کے علاوہ
اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ	باقی عورتیں تمہارے لئے حلال کردی
مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ	گئی ہیں بشرطیکہ اپنے مال دے کر طلب
مُسٰفِحِيْنَ ؕ	کرو پاکدامنی حاصل کرنے کے لئے
(۴/۲۴)	شہوت رانی کے لئے نہیں۔

لہٰذا اتنی مقدار ضروری ہونی چاہیئے جسے مال کہا جاسکے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک عہد میں کم سے کم دس درہم (بقدر اڑھائی تولہ چاندی) کو اس کا مصداق قرار دیا تھا۔ فقہائے حنفیہ نے اسی مقدار کو ضروری قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر وہ مقدار جو کسی چیز کی قیمت بن سکتی ہو مہر بھی بن سکتی ہے۔

ہمارے خیال میں آج کل کے زمانہ میں دس درہم کی مقدار بہت کم ہے۔ اسے آج کل عُرفِ عام میں مال نہیں کہا جاسکتا۔ امام شافعیؒ کا ارشاد ہمارے لئے اور بھی ناقابلِ فہم ہے۔ دس پیسے اور بیس پیسے بھی کسی چیز کی قیمت بن سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ اتنی مقدار ضرور ہونی چاہیئے جس کی کوئی اہمیّت ہو سکتی ہو، جو بطورِ تحفہ اور عطیہ کے کسی کو دی جا سکتی ہو۔ یہ ہر زمانہ میں حالات کے مطابق، تبدیل ہوتی رہتی ہے اس لئے اسے متعین کر دینا مشکل ہے۔

برائے نام مہر | اگر کسی نے مہر میں بہت ہی معمولی رقم مقرر کی ہو یعنی حنفیہ کے نزدیک کم از کم دس درہم ہونا چاہئیں

تھے۔ لیکن مہر اس سے کم مقرر کیا گیا اور ہمارے خیال کے مطابق اتنا مہر مقرر کیا گیا جسے عرف عام میں نہ مال کہا جا سکتا ہے۔ نہ بطور تحفہ اور عطیہ کے کسی کو دیا جا سکتا ہے۔ تو اسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ حنفیہ فرماتے ہیں کہ کم سے کم دس درہم تو دینا ہی ہوں گے۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اتنا مہر مقرر کرنا جسے مہر نہ کہا جا سکے مہر مقرر نہ کرنے کے برابر ہے۔ لہٰذا شوہر کو وہ مہر دینا ہوگا جو بیوی کے خاندان میں عام طور پر دوسری عورتوں کا ہوا کرتا ہے۔ اسے مہر مثل کہا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک امام زفرؒ کا یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

نصف مہر | اگر بیوی کو اس سے پہلے ہی طلاق دیدی جائے کہ شوہر اس کے پاس گیا ہو تو جتنا مہر مقرر کیا گیا تھا اس کا نصف ادا کرنا ہوگا۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ط (۲/۲۳۷)	اور اگر تم نے بیویوں کو اس سے پہلے ہی طلاق دیدی ہو کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو اور تم ان کے لئے مہر مقرر کر چکے ہو تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا نصف ان کا حق ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پورا مہر اسی وقت واجب ہو سکتا ہے جبکہ شوہر اپنی بیوی سے واقعی اختلاط کر چکا ہو۔ اگر اختلاط نہ کیا ہو اور طلاق دیدی ہو تو نصف مہر واجب ہوگا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اختلاط ضروری نہیں ہے۔ دیر تک تنہائی میں اس کے ساتھ رہنا کافی ہے۔ اگر دیر تک تنہا اس کے ساتھ

رہا ہے تو پورا مہر واجب ہوگا۔ اور اگر تنہائی میں دیر تک ساتھ نہیں رہا تو نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ دیر تک ساتھ رہنا ضروری نہیں۔ شوہر کا بیوی کے ساتھ تنہائی میں مطلقاً رہنا کافی ہے۔ اگر خلوت بھی میسر نہیں ہوئی تو نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

(المیزان الکبریٰ للشعرانی ص ۱۱۸ ج ۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ (اس سے قبل کہ تم نے اُنہیں ہاتھ لگایا ہو) فرمایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہاتھ لگانے سے مراد اختلاط ہی ہو۔ لہٰذا امام شافعیؒ کا ارشاد قرآن کریم کے مفہوم سے قریب تر ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الفاظ اختلاط کے لئے صریح نہیں ہیں۔ اُنہیں کنایۃً ہی کہا جا سکتا ہے لہٰذا ان الفاظ کو بنیاد بنانا مشکل ہے۔

علاوہ ازیں شوہر اور بیوی کے اختلاف کی صورت میں حقیقتِ واقعہ کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہے۔ اموال کے بارہ میں ایسے اختلافات عام ہیں اور یہاں شہادت مہیا کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تنہائی میں کیا پیش آیا تھا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ خلوتِ صحیحہ کو اختلاط کا قائم مقام تصور کیا جائے اور اسی پر فیصلہ کیا جا سکے۔ لہٰذا امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور بڑی حد تک امام مالکؒ کے اقوال زیادہ قرینِ مصلحت ہیں۔ لیکن اگر شوہر اور بیوی میں سے کوئی ایک بیمار تھا۔ اور اختلاط کا امکان نہیں تھا یا کوئی ایک

حج یا عمرہ کا احرام کئے ہوئے تھا اور اس نے خلوت صحیحہ کے بعد بیوی کو طلاق دے دی تو اس خلوتِ صحیحہ کو اختلاط کا قائم مقام نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اختلاط سے مانع موجود تھا۔ اگر کسی نے فرض یا نفل روزہ رکھا ہوا تھا اور اس حالت میں خلوتِ صحیحہ ہوئی ہے تو یہ خلوت معتبر ہوگی۔ کیونکہ روزہ کا افطار کر دینا ممکن ہے۔

مہرِ مثل اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں کیا گیا یا نکاح اس شرط کے ساتھ کیا گیا تھا کہ شوہر کے ذمہ مہر نہیں ہوگا تو وہ مہر ادا کرنا ہوگا۔ جو بیوی کے خاندان یعنی بہنوں، پھوپھیوں اور چچیری بہنوں میں عام طور پر رائج ہو۔ اسے مہر مثل کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی وہ آیات کریمہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ جن سے مہر کی ادائیگی کا لازم ہونا ثابت ہے۔ لہٰذا مہر ہر حال میں ادا کرنا ہوگا۔ چونکہ مہر مقرر نہیں کیا گیا یا یہ شرط کر لی گئی تھی کہ شوہر مہر ادا نہیں کرے گا ایسی صورت میں مہر کی مقدار کیا ہونی چاہئیے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ قرآن کریم کی رو سے مہر کی مقدار متعین نہیں ہے نہ زیادہ سے زیادہ نہ کم سے کم اس لئے اس کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ لڑکی کے خاندان میں دوسری عورتوں کا مہر دیکھا جائے۔ جتنا مہر اس کے خاندان میں ہوتا ہو وہی لڑکی کا مہر تصور کیا جائے گا۔ اگر لڑکی کے خاندان میں کوئی ایک مہر مقرر نہیں ہے۔ مختلف لڑکیوں کا مختلف مہر ہے تو عدالت شوہر اور بیوی کے رتبہ اور مالی حالات کو دیکھتے ہوئے مقرر کر سکتی ہے۔ واضح رہے کہ لڑکی کا خاندان باپ کی طرف سے معتبر ہوگا۔ ماں کی طرف سے نہیں کیونکہ اسلام میں نسب باپ سے چلتا ہے۔ ماں سے نہیں لہٰذا

باپ کا خاندان ہی لڑکی کا خاندان کہلا سکتا ہے۔

مہر متعہ اگر لڑکی کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا اور شوہر نے اس سے پہلے کہ اس کے ساتھ تنہائی میں کچھ دیر رہتا۔ بیوی کو طلاق دے دی تو ایسی صورت میں شوہر کے ذمہ واجب ہے کہ بیوی کو کچھ نہ کچھ ادا کرے۔ اس کی تعیین شوہر کی مالی حالت کے مطابق کی جائے گی۔ اگر وہ تنگدست ہے تو اس کے مطابق اور اگر خوش حال ہے تو اس کے مطابق جو کچھ وہ ادا کر سکتا ہے ادا کر دے۔ اسے فقہاء کی اصطلاح میں مہر متعہ کہتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مہر متعہ کم سے کم تین کپڑے ہونے چاہئیں یعنی کرتہ، اوڑھنی اور چادر بشرطیکہ اس کی قیمت مہر مثل کے نصف سے زیادہ نہ ہو۔

امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اس کا فیصلہ حاکم وقت اپنے اجتہاد سے کرے۔ لیکن یہ تیس درہم (½۷ تولہ چاندی کی قیمت) سے زیادہ نہ ہو۔ امام شافعیؒ کا دوسرا قول یہ بھی ہے کہ مہر متعہ کم اور زیادہ ہر وہ مقدار ہو سکتی ہے جسے مہر کہا جا سکے۔ امام احمد ابن حنبلؒ کی دوسری روایت یہ بھی ہے کہ اتنے کپڑے مہر متعہ کے بن سکتے ہیں جن کو پہن کر عورت نماز ادا کر سکتی ہو۔ (المیزان الکبریٰ للشعرانی ص ۱۱۷ ج ۲)

ہمارے نزدیک اس کی کوئی مقدار متعین نہیں کی جا سکتی۔ اس کا مدار شوہر کے مالی حالات پر ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ — اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم بیویوں کو طلاق دے دو جب کہ تم نے انہیں

أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ	ہاتھ لگایا ہے نہ ان کے لئے کوئی مہر مقرر
وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ	کیا ہے۔ اور اُنہیں کچھ سامان دے دیا
قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ	کرو وسعت والے آدمی پر اس کے
مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ	مطابق اور تنگدست آدمی پر اس کی
حَقًّا عَلَى	حالت کے مطابق۔ دستور کے مطابق
الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾	کچھ سامان دینا ہے نیکو کار لوگوں پر
(۲/۲۳۶)	یہ (بیویوں کا) حق ہے۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے مَتِّعُوهُنَّ (اُنہیں کچھ سامان دیدو) اور مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ (دستور کے مطابق کچھ سامان) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اور پھر صراحت فرمادی ہے کہ یہ سامان شوہر کی مالی حالت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لہٰذا ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کی کوئی مقدار متعین کر دیں۔ بلاشبہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تین کپڑوں کی روایت نقل کی گئی ہے۔ (ہدایہ صہ ۳۲۵/ج۱)

لیکن ہو سکتا ہے کہ اُنھوں نے کچھ لوگوں کے مالی حالات کے پیش نظر ایسا فیصلہ فرمایا ہو۔ اسے مستقل قانون نہیں بنایا جا سکتا۔

نکاح کے بعد مہر مقرر کرنا اگر نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا لیکن بعد میں میاں بیوی نے باہمی رضامندی سے کچھ مہر مقرر کر لیا ہے تو یہ صحیح ہے۔

مہر میں اضافہ نکاح کے وقت جو مہر مقرر کیا گیا تھا اگر وہ کم تھا اور بعد میں میاں بیوی باہمی رضامندی سے اس میں اضافہ کر لیتے

ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مہر میں کمی | نکاح کے وقت جو مہر مقرر کیا گیا تھا اگر وہ زیادہ تھا اور بیوی اس میں اپنی مرضی سے کمی کر دیتی ہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ مہر بیوی کا حق ہے۔ وہ اپنے معاملات میں با اختیار ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اس میں کمی کر سکتی ہے۔

مجبوب اور عنّین کی خلوت | اگر کسی شخص کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہے یا وہ عنّین یعنی نامرد ہے اور اس کا امکان ہی نہیں کہ اس نے اختلاط کیا ہو، ایسا شخص اگر اپنی بیوی کو خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق دے دے تو اسے پورا مہر ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ (اس سے پہلے کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو) کے الفاظ اختلاط کے لئے صریح نہیں ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ کنایہ کہے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے چونکہ مہر کے سلسلہ میں ہاتھ لگانے پر مدار رکھا ہے۔ صراحتاً اختلاط کو ضروری قرار نہیں دیا اس لئے ہم اس کنایہ سے صرف اختلاط مراد نہیں لے سکتے۔ لہٰذا محض خلوت کی بناء پر پورا مہر واجب قرار دینا ضروری ہے۔

بلا شبہ مجبوب اور عنّین مخصوص جنسی عمل کے اہل نہیں ہیں لیکن اس کے علاوہ اور تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً بوس و کنار، چمٹنا، چمٹانا وغیرہ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ چیزیں تَمَسُّوْهُنَّ (انہیں ہاتھ لگایا ہو) کا مصداق نہیں بن سکتیں۔ واللہ اعلم

آنٹا سانٹا مہر نہیں بن سکتا | اگر کسی شخص نے آنٹے سانٹے کی شادی کی۔ یعنی اس نے جس عورت سے شادی کی ہے۔ اس کے بھائی نے

اِس کے شوہر کی بہن سے شادی کرلی اور یہ طے کیا کہ مہر نہ اِس لڑکی کا ہوگا نہ اُس لڑکی کا۔ آپس میں اس طرح شادی کر لینا ہی مہر سمجھا جائے گا۔ تو دونوں نکاح صحیح ہیں۔ لیکن دونوں شوہروں کو اپنی اپنی بیویوں کے مہر مثل ادا کرنے ہوں گے۔ قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (۴/۲۴)	اور مذکورہ بالا محرمات کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں کہ تم اُنہیں اپنے مالوں کے ساتھ حاصل کرو۔

لہٰذا مہر کا مال ہونا ضروری ہے۔ اپنی بہن یا کسی دوسری عزیزہ کی شادی بیوی کے بھائی یا اس کے کسی دوسرے عزیز کر دینا مال نہیں ہے لہٰذا یہ مہر نہیں بن سکتا۔

خدمت مہر نہیں بن سکتی | اگر کسی نے ایک عورت سے اس طرح نکاح کیا کہ میں تمہاری اتنے عرصہ تک خدمت کروں گا یا میں تمہیں قرآن کریم کی یا کسی اور فن کی تعلیم دوں گا۔ اور میری یہ خدمت ہی مہر متصور ہوگی تو نکاح صحیح ہے مگر یہ مہر صحیح نہیں ہے۔ شوہر کو مہر مثل ادا کرنا ہوگا۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ مہر کا مال ہونا ضروری ہے۔ خدمت اور تعلیم وغیرہ مال نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ مہر نہیں بن سکتے۔ آیت نمبر (۴/۲۴) سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مہر بہرحال مال ہونا چاہیئے۔

مسئلہ | اگر کسی شخص نے ایک عورت سے شادی کی اور ایک ہزار روپیہ مہر مقرر ہوا۔ شوہر نے ایک ہزار روپئے نکاح کے ساتھ ہی ادا کر

دیئے۔ اور بیوی نے یہ ایک ہزار روپئے لے کر شوہر کو ہبہ کر دیئے اور اسے دیدیئے۔ لیکن شوہر نے خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی بیوی کو طلاق دے دی تو کہا جاتا ہے کہ شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی سے پانچ سو روپے یعنی نصف مہر طلب کرے اور بیوی کو پانچ سو روپے ادا کرنے ہوں گے کیونکہ شوہر نے پورا مہر اسے ادا کر دیا تھا۔ اور خلوتِ صحیحہ سے پہلے ہی شوہر نے اسے طلاق دیدی ہے لہٰذا اسے نصف مہر واپس لینے کا حق ہے۔ جیسا کہ قرآن کا حکم پہلے گذر چکا ہے کہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی اگر طلاق دے دی جائے تو وہ صرف نصف مہر کی مستحق ہوتی ہے۔ دیکھیئے آیت نمبر (۲/۲۳۷) حنفیہ کا مسلک صاحب ہدایہ نے یہی نقل کیا ہے (ج۱/۳۲۸) رہ گئی یہ بات کہ بیوی نے مہر کی رقم لے کر پھر شوہر کو ہبہ کر دی تھی اور اسے واپس کر دی تھی تو یہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔ نیز نقد رقم متعین نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بیوی نے بعینہٖ وہی رقم واپس کی ہے جو شوہر نے اسے دی تھی۔ یہ دلیل شاید منطقی طور پر صحیح ہو۔ لیکن اخلاقی طور پر اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ آیت نمبر (۲/۲۳۷) جس میں نصف مہر کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اس حکم کے ساتھ یہ بھی ہے۔

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَ	(آدھا مہر دینا ہو گا) مگر یہ کہ بیویاں
الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ	مہر معاف کر دیں یا وہ شخص معاف
وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ	کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاہدہ
لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ	کرنا ہے۔ اور یہ بات کہ تم یعنی مرد عفو
بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا	سے کام لو تقویٰ سے قریب تر ہے اور
تَعْمَلُوْنَ	اپنے آپس میں حسن سلوک کو نہ بھول

بَصِيْرٌ ○ — جاؤ۔ یقیناً تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے

(۲/۲۳۷) — دیکھ رہا ہے۔

اس آیت کریمہ میں وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کا جملہ قابلِ غور ہے مہر عورت کا حق ہوتا ہے۔ عورت یا اس کا ولی اور نمائندہ اپنا حق چھوڑ دے تو اسے معاف کرنا کہا جا سکتا ہے کہ عورت نے اپنا مہر معاف کر دیا لیکن وَاَنْ تَعْفُوْٓا مردوں یعنی شوہروں کو خطاب ہے جن کے ذمہ مہر کی ادائیگی ہے۔ لہٰذا یہاں معاف کرنے کے معنے نہیں ہو سکتے۔ اُنہیں بیویوں سے کچھ لینا نہیں ہے جسے وہ معاف کر دیں بلکہ ان کو تو دینا ہے۔ لہٰذا یہاں تَعْفُوْٓا کے معنے معاف کرنے کے نہیں ہونے چاہئیں۔ عَفْوٌ کے معنے بڑھنے اور زیادہ کرنے کے بھی آتے ہیں چنانچہ عَفَا شَعْرُ الْبَعِيْرِ کے معنے ہیں اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہو گئے۔ عَفَا عَلَيْهِ فِي الْعِلْمِ کے معنے ہیں وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا اور اس کی معلومات پر اضافہ کیا۔ عَفَا الصُّوْفَ کے معنے ہیں اُون کو زیادہ بڑھا کر کاٹا۔ (تاج العروس) خود قرآن کریم میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ — اور لے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے
قُلِ الْعَفْوَ ؕ — پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرما
(۲/۲۱۹) — دیجئے کہ جو کچھ زیادہ ہو۔

اس آیت میں اَلْعَفْوَ کے معنے زیادتی کے ہیں یعنی جو کچھ بنیادی ضروریات سے زیادہ ہو۔

لہٰذا وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کے معنے یہ ہوں گے کہ "اور یہ بات کہ تم

مرد کچھ بڑھاکر دیدو تقویٰ سے قریب تر ہے" یعنی واجب تو نصف مہر ہے لیکن تقویٰ سے قریب تر یہ ہے کہ تم مرد صرف آدھا مہر ہی نہ دو بلکہ کچھ زیادہ دیدو۔ اس کے بعد وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (اور تم آپس میں حُسنِ سلوک اور احسان کو نہ بھول جاؤ) سے مزید تاکید فرمادی گئی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور فضل و احسان کرنے کو نہ بھولو۔ بیوی کی طرف سے حسن سلوک اور فضل و احسان یہ ہے کہ وہ مہر معاف کر دے اور شوہر کی طرف سے حُسن سلوک اور فضل واحسان یہ ہے کہ وہ جتنا بیوی کا واجب حق (نصف مہر) تھا اس سے کچھ زیادہ اسے دیدے۔

اس تعلیم اور ہدایتِ ربانی کی روشنی میں آپ مذکورہ بالا مسئلہ کا جائزہ لیں کہ شوہر نے نکاح کے ساتھ ہی ایک ہزار روپئے جو بیوی کا مہر تھا اسے ادا کر دیا۔ بیوی نے یہ رقم لے کر شوہر کو ہبہ کر دی (یہ مہر کو معاف کر دینے ہی کی شکل ہے) شوہر اس سے پہلے ہی کہ وہ بیوی کے پاس جائے اسے طلاق دیدیتا ہے اور مزید پانچ سو روپئے کا اس سے مطالبہ کر رہا ہے کہ میں نے تمہیں پورا مہر دیدیا تھا۔ لیکن تمہارا آدھا مہر بنتا ہے۔ لہٰذا آدھا مہر مجھے واپس کر دو۔ مجھے تو یہ مطالبہ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ کے صریحی خلاف معلوم ہوتا ہے۔

مہر غیر متقوّم اگر کسی شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا مگر مہر میں کوئی ایسی چیز مقرر کی جس کی شرعاً قیمت ہی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً شراب کی چند بوتلیں یا خنزیر مہر میں دینا طے کیا ہے یا کسی لڑکے یا لڑکی یا ملازم کو دینا طے کیا کہ یہ تمہاری خدمت کریں گے تب بھی شوہر

کو عورت کا مہرِ مثل ادا کرنا ہو گا۔ کیونکہ شریعت کی رو سے شراب، خنزیر آزاد لڑکا، لڑکی یا ملازم قابلِ قیمت مال نہیں ہیں۔ (واضح رہے کہ غلام آجکل نہیں ہوتے لہٰذا وہ خارج از بحث ہیں۔)

نکاح فاسد اگر کسی نے کوئی فاسد نکاح کر لیا۔ یعنی ایسا نکاح کر لیا جو شرعاً صحیح نہیں تھا۔ مثلاً عورت عدت میں تھی اور عدت کے دوران ہی اس سے نکاح کر لیا گیا۔ یا بغیر قانونی جواز کے دوسری شادی کر لی۔ یا تعدد ازدواج کے حالات موجود تھے اور چوتھی بیوی کو طلاق دے کر جبکہ اس کی عدت پوری نہیں ہوئی پانچویں عورت سے شادی کر لی یا مدت متعینہ تک کے لئے شادی کر لی (نکاح متعہ) یا بغیر گواہوں کے شادی کر لی اور ابھی مرد ایسی شادی شدہ عورت کے پاس نہیں گیا تھا کہ عدالت نے اس نکاح کو ناجائز قرار دے کر دونوں میں تفریق کرا دی تو شوہر کے ذمہ نصف مہر واجب نہیں ہو گا۔ کیونکہ ایسا نکاح حقیقت میں نکاح ہی نہیں تھا۔ لہٰذا مہر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر شوہر ایسی بیوی کے پاس جا چکا تھا اور عدالت نے بعد میں تفریق کرائی ہے تو شوہر کو مہرِ مثل ادا کرنا ہو گا اور عورت کو عدت گذارنی ہو گی۔ بشرطیکہ یہ نکاح کسی شبہ یا لاعلمی کی بناء پر ہوا ہو۔ لیکن اگر اس کا ارتکاب عمداً کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں مہر واجب نہیں ہو گا۔ البتہ عدت ضروری ہو گی تاکہ نسب میں کوئی اختلاط نہ ہو سکے۔

اگر عورت کو حمل رہ گیا تو بچہ کا نسب بھی اپنے باپ سے ثابت ہو گا۔ لیکن شوہر اور بیوی دونوں سزا کے مستحق ہوں گے۔ البتہ حد جاری

نہیں کی جا سکے گی کیونکہ شبہ کا شائبہ موجود ہے اور حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔

(باب القسم)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اگرچہ عام حالات میں ایک مرد کو ایک ہی بیوی کرنی چاہیئے لیکن بعض ہنگامی حالات ایسے بھی پیش آ سکتے ہیں جن میں لوگوں کو تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے۔ اگر ایسے حالات رونما ہو جائیں جیسا کہ عہد رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ایسے حالات موجود تھے اور مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ تعدد ازدواج کو جائز قرار دے دے تو جس شخص کے ایک سے زیادہ بیویاں ہوں جو بہر حال چار سے زیادہ نہیں ہو سکتیں تو شوہر پر لازم ہے کہ سب بیویوں کے درمیان مساویانہ سلوک کرے اور عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ سورۂ نساکی جس آیت کریمہ میں ہنگامی حالات میں چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ فرمادیا گیا ہے کہ۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا	پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ (ایک سے
فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ	زیادہ شادیاں کر کے) تم انصاف
اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ	نہیں کر سکو گے تو ایک ہی عورت
اَدْنٰى	سے شادی کر دیا کنیز پر اکتفا کرو۔
اَلَّا	جو تمہاری ملکیت میں ہو۔ یہ بات
تَعُوْلُوْا ط	اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم وزیادتی

(۴/۳) نہ کرو۔

اس آیتِ کریمہ میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کو عدل وانصاف کے ساتھ مشروط فرمادیا گیا ہے اور عدل وانصاف نہ کرنے کو ظلم وزیادتی سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کرنا قرآن کی رو سے ضروری ہے۔ اس میں بیوہ کنواری، نئی اور پرانی کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اگر دو بیویاں ہوں تو دونوں کو مساوی نان ونفقہ دینا، دونوں کے ہاں مساوی شب باشی کرنا۔ دونوں کے ہاں مساوی طور پر کھانا کھانا۔ تمام معاشرتی معاملات میں دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا۔ اصطلاحِ فقہ میں قَسْم کہلاتا ہے اور یہ ضروری ہے۔ البتہ قلبی رجحان اور محبت انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کے لئے مساوات نہ آسان ہے اور نہ ضروری ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء ہی میں آگے چل کر ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْھَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ	اور تم پورا پورا عدل عورتوں کے درمیان ہرگز نہیں کر سکوگے اگرچہ تمہیں اس کی کتنی ہی حرص کیوں نہ ہو تو تم (ایک ہی کی طرف) پوری طرح پر جھک نہ جاؤ کہ دوسری غریب کو ادھر میں لٹکا ہوا چھوڑ دو۔

(۴/۱۲۹)

ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں عدل نہ کرسکنے کا مصداق وہی قلبی میلان اور رجحان ہے جو انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ورنہ معاشی اور معاشرتی طور پر عدل کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی

یہ بھی نہ کر سکے تو اسے پچھلی آیت کے بموجب ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

(کتاب الرضاع)

کتاب النکاح میں جہاں محرمات کا بیان کیا گیا تھا وہاں قرآن کریم سے بتایا جا چکا ہے کہ رضاعی ماؤں اور رضاعی بہنوں سے بھی نکاح جائز نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ	اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں
وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ	دودھ پلایا ہو اور تمہاری رضاعی
(۴/۲۳)	بہنیں بھی تم پر حرام ہیں۔

اس سلسلہ میں مزید چند مسائل غور طلب ہیں۔ مثلاً یہ کہ۔

(۱) **رضاعت کی مقدار** دودھ پینا کس حد تک معتبر ہوگا چنانچہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک عورت سے پانچ گھونٹ پی لئے ہیں تو رضاعت ثابت ہوگی ورنہ نہیں۔ امام احمدؒ نے ایک دوسری روایت میں فرمایا ہے کہ تین گھونٹ پی لینے سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس سے کم میں نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک گھونٹ بھی پی لیا ہو تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ اس میں کم اور زیادہ کی کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی کیونکہ قرآن کریم کے الفاظ اَرْضَعْنَکُمْ (تمہیں دودھ پلایا ہو) اور اَلرَّضَاعَةَ (دودھ پلانا) اگر پانچ گھونٹ دودھ پلانے پر صادق آتا ہے تو وہ ایک گھونٹ دودھ پلانے پر بھی صادق آتا ہے۔ لہٰذا جہاں بھی دودھ پلانا

ثابت ہوگا۔ وہاں حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مسلک قرآن سے قریب تر ہے۔

② **مدتِ رضاعت** | مدتِ رضاعت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اڑھائی سال ہے اور امام محمدؒ بن الحسن، امام ابویوسفؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک دو سال ہے۔ یہی جمہور فقہاء کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال فرماتے ہیں۔ جو سورۃ احقاف میں وارد ہوئی ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ (۲۶ / ۱۵)	اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے اُسے (پیٹ میں) بڑی تکلیف کے ساتھ اُٹھائے رکھا ہے اور تکلیف کے ساتھ ہی وضع حمل کیا اور اس کا حمل اور دُودھ چھڑانا پورے تیس مہینوں تک رہا۔

اس آیت کریمہ میں دو باتوں یعنی حمل اور دُودھ چھڑانے کی مُدت الگ الگ تیس مہینے بیان کی گئی ہے۔ یعنی حمل کی زیادہ سے زیادہ مُدت اڑھائی سال اور دُودھ پلانے کی بھی زیادہ سے زیادہ مدت اڑھائی سال بتائی گئی ہے۔ لیکن جمہور فقہاء اس استدلال کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ سورۃ لقمان میں اسی انداز سے یہی بات یوں بیان فرمائی گئی ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو اس کے والدین

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیْكَ ؕ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ۝ (۳۱/۱۴)

کے بارہ میں تاکید کی ہے ۔ اس کی ماں نے اُسے ضعف پر ضعف برداشت کرکے (پیٹ میں) اُٹھائے رکھا اور دو سال میں اس کا دُودھ چھڑایا (دو سال تک دُودھ پلاتی رہی) کہ میرے اور اپنے والدین کے شکر گذار بنے رہو ۔ اور میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت کریمہ میں تیس مہینے حمل اور دُودھ پلانے کی مجموعی مُدّت بیان فرمائی گئی تھی۔ الگ الگ نہیں۔ لہٰذا حمل کی کم از کم مدّت چھ ماہ اور دُودھ پلانے کی مدّت دو سال ہوگی۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ (۲/۲۳۳)

اور مائیں اپنے بچّوں کو پورے دو سال دُودھ پلائیں۔ یہ حکم اس کے لئے ہے جو دُودھ پلانے کی مدّت کو پورا کرنا، چاہے۔

اس آیت کریمہ میں ماؤں کو دو سال تک بچّوں کو دُودھ پلانے کی اجازت دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ رضاعت کی پوری مُدّت ہے ۔ اس کے بعد رضاعت نہیں ہوگی ۔

ان تمام آیات کو سامنے رکھتے ہوئے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدّت دو سال ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ پونے دو سال میں دُودھ چھڑا دیا جائے ۔ دو سال انتہائی مدّت ہے جو سورۂ بقرہ کی

آیت نمبر (۲/۲۳۳) سے ثابت ہے۔ لیکن سورۂ احقاف کی آیت (۴۵/۱۵) کے ماتحت حمل اور رضاعت کی مجموعی مدّت تیس ماہ سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے نو ماہ حمل کے اور اکیس ماہ رضاعت کے یہ عام قانون ہے۔ لیکن اگر بچّہ کمزور ہو تو زیادہ سے زیادہ دو سال تک دُودھ پلایا جاسکتا ہے۔

رضاعت کب معتبر ہے؟ حرمتِ رضاعت اسی وقت ثابت ہوگی۔ جب کسی نے دُودھ پلانے کی مدّت میں کسی عورت کا دُودھ پیا ہو۔ اگر کسی عورت نے دو سال سے بڑے بچّہ کو دُودھ پلا دیا ہے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ قرآن کریم کی رو سے وہ رضاعت نہیں ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ اگر بڑے ہوکر بھی کسی آدمی نے کسی عورت کا دُودھ پی لیا ہے تو اس سے بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ لیکن فقہاء میں سے کسی نے بھی اِسے تسلیم نہیں کیا۔ صرف امام داؤد ظاہریؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

دیگر رضاعی رشتے جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہی رشتے رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں۔ چنانچہ رضاعی باپ کی بیوی سے نیز رضاعی بیٹے کی بیوی سے۔ رضاعی پھوپھی سے، رضاعی خالہ سے، بھتیجی اور بھانجی سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اگر دُودھ پینے والی لڑکی تھی تو وہ اپنے رضاعی باپ، دادا، چچا، ماموں، رضاعی بھانجے بھتیجے، رضاعی ماں کی اولاد میں سے نیچے تک کسی سے نکاح نہیں کرسکتی اس پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ کسی سے کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔ البتہ رضاعی بہن کی کسی دوسری رضاعی ماں سے، نیز اس کی نسبی ماں سے نکاح جائز

ہے۔ ایسے ہی رضاعی بیٹے کی بہن سے بھی نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ تمام مسائل ہم نے سنت سے لئے ہیں۔ قرآن کریم نے صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہنوں سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ ط (۴/۲۳)	اور تمہاری وہ مائیں (تم پر حرام کر دی گئی ہیں) جنہوں نے تمہیں دُودھ پلایا ہے اور دُودھ شریک بہنیں۔

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے صرف یہی دو رشتے حرام ہیں۔ باقی رشتوں کی حُرمت سُنّت سے ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص باقی رشتوں کی حُرمت کا انکار کرے تو اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ نیز اگر کوئی شخص ان رشتوں میں شادی کرلے تو عدالت سے تفریق تو کرا دی جائے گی لیکن ایسا کرنے والوں پر حد جاری نہیں ہو سکے گی۔ واللہ اعلم۔

دُودھ نکال کر پلانا حرمتِ رضاعت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ بچّہ نے کسی عورت کی چھاتیوں ہی سے دودھ پیا ہو۔ اگر کسی عورت نے اپنا دُودھ نکال کر چمچہ سے یا شیشی سے بچّہ کو دُودھ پلا دیا ہے۔ تب بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ اَرْضَعْنَكُمْ کا لفظ اگرچہ اس صُورت کو شامل نہیں ہے۔ لیکن یہ دُودھ بھی بچّہ کی غذا بنتا ہے اور اس سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے جو حرمتِ رضاعت کی علّت ہے۔ لہٰذا دُودھ پلانے کا انداز بدل جانے سے حکم بدلنا نہیں چاہیئے ویسے رَضَاعَةٌ لغت کے اعتبار سے عورت کی چھاتیوں کو چوس کر دُودھ پینے ہی کو کہتے ہیں (تاج العروس، مفردات راغب، المنجد)

غالباً اسی بنا پر امام احمد ابن حنبلؒ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے کہ حرمتِ رضاعت کے لئے عورت کی چھاتیوں سے چوس کر دودھ پینا ضروری ہے (المیزان الکبریٰ للشعرانی صفحہ ۱۳۸ ج ۲)
بہر حال امام احمد ابن حنبلؒ کی اس روایت کو قرآن کریم کے خلاف نہیں کہا جا سکتا جمہور فقہاء کا مسلک اجتہاد پر مبنی ہے۔ قرآن کریم کے صریح الفاظ پر مبنی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا انکار ممکن ہے لیکن جمہور فقہاء کا مسلک احتیاط پر مبنی ہے اور محرمات کے بارہ میں احتیاط ہی بہتر ہے۔

کنواری عورت کا دودھ پلانا اگر کسی کنواری لڑکی کے دودھ اُتر آیا ہو اور اس نے کسی بچہ کو دودھ پلا دیا ہو تو جمہور فقہاء کے نزدیک حرمتِ رضاعت ثابت ہو جائے گی۔
امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک اس کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ رضاعت وہی معتبر ہے کہ حمل کی بنا پر عورت کے دودھ اُتر آئے اور وہ اسے کسی بچہ کو پلا دے۔ کنواری لڑکی کے اگر دودھ اُتر آیا ہے تو یہ حقیقۃً دودھ نہیں ہے اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔
ہم سمجھتے ہیں کہ اَرْضَعْنَكُمْ کا لفظ اس صورت پر بھی صادق آتا ہے۔ اس صورت میں حرمتِ رضاعت ثابت ہونی چاہیئے۔ لہٰذا جمہور فقہاء کا مسلک زیادہ صحیح ہے۔ البتہ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ ایسا دودھ حقیقی دودھ نہیں ہوتا اور اس سے بچہ کی نشو ونما نہیں ہوتی تو اس پر غور کیا جانا چاہیئے۔

مرد اور جانور کا دودھ اگر کسی مرد کے دودھ اُتر آیا ہے اور اس نے کسی بچہ کو دودھ پلا دیا ہے تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ قرآن کریم نے اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ فرمایا ہے (اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے) اور ظاہر ہے کہ ماں عورت ہی ہوتی ہے مرد نہیں ہوتا لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ اس پر صادق نہیں آتے نیز اگر کسی لڑکے اور لڑکی نے ایک ہی گائے یا ایک ہی بکری یا کسی جانور کا دودھ پیا ہے تو ان کے درمیان حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ جانور بھی اُمَّهٰتُكُمْ کا مصداق نہیں بن سکتے۔

رضاعت کا ثبوت رضاعت کے ثبوت کے لئے حنفیہ کے ہاں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے اس کے بغیر رضاعت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی عورت نے شہادت دی کہ میں نے فلاں لڑکے اور فلاں لڑکی کو دودھ پلایا ہے۔ تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں صرف عورتوں کی شہادت کافی ہے۔ لیکن امام مالکؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے جبکہ امام شافعیؒ چار عورتوں کی شہادت ضروری سمجھتے ہیں۔ امام مالکؒ سے دوسری روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ اگر پڑوس میں یہ بات مشہور ہو تو صرف ایک عورت کی گواہی بھی کافی

ہے۔ امام احمدؒ ابن حنبل کا مسلک یہ ہے کہ اس معاملہ میں تنہا عورتوں کی گواہی کافی ہے۔ بلکہ ایک عورت کی گواہی بھی کافی ہے۔ (المیزان الکبریٰ للشعرانی صفحہ ۱۹۸/۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہادت کے لئے قرآن کریم کا عام حکم یہی ہے کہ۔

وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۶۵/۲) — اور اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنالو

اور قرض وغیرہ کے مالی معاملات ہیں۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ ٥ (۲۸۲/۲) — اور اپنے مردوں میں سے دو گواہوں کو گواہ بنالو، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو۔

لیکن بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کا علم عام طور سے مردوں کو نہیں ہوتا وہ عورتوں ہی کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کا علم عورتوں میں بھی متعدد عورتوں کو نہیں ہوتا۔ ایسے معاملات میں خود حنفیہ نے بھی ایک عورت کی شہادت کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً بچہ پیدا ہو کر اگر فوراً مر جائے اور یہ معلوم نہ ہو سکے کہ بچہ مردہ ہی پیدا ہوا تھا یا پیدا ہو کر مر گیا تھا۔ تو حنفیہ نے تنہا ایک عورت کی شہادت کو تسلیم کیا ہے۔ مثلاً دایہ جس نے ولادت کرائی ہے اگر وہ شہادت دے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد رویا تھا۔ اور اس کے بعد مر گیا۔ تو حنفیہ فرماتے ہیں کہ بچہ کو غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ البتہ اس شہادت سے وراثت ثابت نہیں ہو گی۔ کیونکہ غسل اور صلوٰۃ جنازہ حق شرع ہے اور وراثت حق العباد ہے۔ حق شرع ایک عورت کی گواہی سے ثابت ہو جائے گا لیکن حق العباد ثابت نہیں ہو گا۔ (ایضاً المیزان الکبریٰ صفحہ ۱۹۸/۲) چونکہ رضاعت کا ثبوت بھی حق العباد نہیں ہے۔ بلکہ حق شرع ہے۔ لہٰذا امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا قول قابل ترجیح ہے۔ اور حنفیہ کے اصول کے مطابق بھی اسی کو ترجیح ہونی چاہیئے۔

نوٹ:۔ شہادت کے سلسلے میں ہم نے فقہ القرآن جلد چہارم میں تفصیلی بحث کی ہے۔ ان مسائل کے لئے جلد چہارم ملاحظہ فرمائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق پہلا افسانہ

سیدۂ کائنات اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نکاح کے وقت عمر

کتابُ النکاح میں یہ فقہی مسئلہ گذر چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نابالغ بچوں کا نکاح جائز نہیں۔ لیکن بخاری وغیرہ کی بعض روایات میں یہ بات آگئی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس وقت نکاح فرمایا تھا۔ جبکہ ان کی عمر صرف چھ سال تھی اور انہیں رخصت کرا کے کاشانۂ نبوی میں اس وقت لے آئے تھے جبکہ ان کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس حدیث کو بنیاد بنا کر ہمارے فقہا نابالغہ لڑکی سے نکاح اور مراہقہ یعنی قریب البلوغ لڑکی سے خلوت کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسی روایت کی بناء پر مخالفین اور معاندین اسلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس و اعظم کے خلاف جو کچھ ہرزہ سرائیاں کرتے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی جائے اور اس غلط افسانہ کا پردہ چاک کر دیا جائے چونکہ "فقہ القرآن" کے کتاب النکاح سے اس مسئلہ کا تعلق ہے۔ اس لئے اس افسانہ پر تنقید کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بخاری وغیرہ کی روایت

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں۔ حدثنا محمد ابن یوسف قال حدثنا سفیان عن هشام عن ابیه عن عائشةؓ کی سند سے یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے چھ سال کی عمر میں نکاح فرمایا تھا اور نو سال کی عمر میں رخصتی کرا کے حجلۂ عروسی میں لے آئے تھے اور وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو سال تک رہیں۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح ، باب نکاح الرجل ولده الصغار صفحہ ۷۷۱ ج ۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)۔ یہ روایت صحیح بخاری کے دوسرے ابواب میں بھی مختلف سندوں سے مروی ہے۔ بخاری کے علاوہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں بھی اسی مضمون کی روایات ملتی ہیں۔ اور ان روایات کی بنیاد پر ہی ہمارے فقہاء نے نابالغ بچوں کا نکاح جائز قرار دے دیا ہے۔ ستم یہ کہ نکاح کرنے والا اگر بچہ کا باپ یا دادا ہے تو بچوں کو بالغ ہونے کے بعد نکاح کو فسخ کرنے کا بھی اختیار نہیں۔

ہمارے فقہاءِ کرام کو سارے عہدِ رسالت مآب میں صرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے سلسلہ میں ایک یہی صحیح روایت

مل سکی ہے جس سے وہ کمسنی کی شادیوں کا جواز ثابت کر سکیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ صحابۂ کرام کے گھروں میں لاتعداد لڑکیاں تھیں۔ لیکن ڈھونڈے سے بھی کہیں کوئی واقعہ صغر سنی کی شادی کا نہیں ملتا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سلسلہ میں جو روایت بیان کی جاتی ہے تو وہ بھی درحقیقت دانستہ یا نادانستہ شرارت کی مثال ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نکاح سولہ یا سترہ سال کی عمر میں ہوا تھا اور آپ کی رخصتی انیس ۱۹ یا بیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ کیونکہ مختلف روایات میں حضرت عائشہؓ کی عمر کے متعلق جو بیانات آئے ہیں، ان سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس مشہور عام روایت میں دہائی کا لفظ (عشرۃ) حذف کر کے سولہ کا چھ اور انیس کا نو بنا دیا گیا ہے[1]۔

چونکہ یہ مسئلہ ہمارے دور میں مستشرقین اور مغربی مصنفین کی، ہرزہ سرائیوں کی وجہ سے بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لئے اس پر مستقل بحث کی ضرورت ہے۔ مستشرقین اور مغربی مصنفین تو الگ رہے، آپ کو حیرت ہو گی کہ ہمارے علمائے کرام کو بھی اسی بات پر اصرار ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں کہ بخاری شریف کی روایت میں کسی قسم کے غلطی کے امکان کو تسلیم کیا جائے۔

عرب رسم و رواج

سب سے پہلے تو ہمیں عربوں کے رسم و رواج کا جائزہ لینا چاہیئے کہ ان میں کم سنی کی شادیوں کا کوئی رواج تھا بھی یا نہیں۔ اگر عربوں میں صغر سنی کی شادیوں کا رواج ہی نہیں تھا۔ تو یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ خصوصی طور پہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہستی ہی کو مطعون کرنے کا سامان مہیا کیا جائے جو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس واعظم پر خردہ گیری کا سبب بن جائے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ روایاتِ صحیحہ اور تاریخی بیانات میں کہیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی نے اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کر دیا ہو۔ اس کے برعکس بکثرت روایات میں نکاح کے متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ملتے ہیں کہ نکاح کے لئے لڑکی کی رضامندی ضروری ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ۔

قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الثیب احق بنفسھا من ولیھا والبکر تستاذن فی نفسھا واذنھا صماتھا۔

(رواہ الجماعۃ الا البخاری)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ لڑکی کو اپنے نفس کا

ولی سے زیادہ اختیار ہے۔ اور کنواری لڑکی سے اس کے نفس کے بارے میں اجازت لینی ضروری ہے۔ اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت سمجھی جائے گی۔ سوائے بخاری کے تمام محدثین نے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ احمد، مسلم، ابوداؤد اور نسائی کے یہی الفاظ ہیں کہ کنواری لڑکی سے اس کا باپ اجازت حاصل کرے اور احمد اور نسائی کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ۔

"یتیمہ سے اس کے نفس کے بارے میں اجازت لینی ضروری ہے۔"

اور ابوداؤد اور نسائی کی تیسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ۔

"ولی کو بیوہ لڑکی پر کوئی اختیار نہیں اور یتیمہ سے اس کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔ اور اس کی خاموشی ہی اس کا اقرار ہے۔"

(نیل الاوطار للشوکانی صـــ ۱۰۳/۶ ج)

اس قسم کی روایات بے شمار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح بیوہ کا ہو یا کنواری لڑکی کا ہر دو صورتوں میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے لڑکی کی اپنی اجازت کو ضروری قرار دیا ہے۔ نابالغ لڑکی کی اجازت کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا لڑکی کی اجازت ضروری ہونے کے معنی یہی ہوں گے۔ کہ لڑکی کو بالغ ہونا چاہیئے۔

روایات کے تمام ذخیرہ میں ہمیں اس تیسری صورت کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ نابالغ لڑکی کا نکاح کیا جا رہا ہو تو اس کا ولی اس کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ اگر اس تیسری صورت کا بھی رواج ہوتا یا جواز ہوتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم لامحالہ اس کا حکم بھی ضرور بیان فرماتے۔ موضعِ بیان میں کسی امر سے سکوت اس کے غیر موجود اور غیر اہم ہونے کا

ثبوت ہے۔ اس کے برعکس خود روایات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ لڑکیاں عام طور پر اپنا نکاح اپنی مرضی سے بغیر ولی کے خود ہی کر لیا کرتی تھیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمانا پڑی کہ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ (کوئی نکاح ولی کے بغیر نہیں ہونا چاہیئے) یہ ممانعت اس بات کا ثبوت ہے کہ عربوں میں یہ دستور عام تھا کہ عورتیں اپنا نکاح خود ہی کرتی تھیں اور یہ رواج اس بات کی دلیل ہے کہ لڑکیاں بالغ ہو کر ہی نکاح کرتی تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو عورتوں میں شرم وحیا اور مطلوب حجاب کے خلاف پایا اور اس کی اصلاح فرمائی۔

عربوں میں منگنی کا دستور

علامہ عینی شرح بخاری میں اور صاحب نہایہ اپنی کتاب میں عربوں میں منگنی کے دستور پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"شادی کا عقد منگنی اور مہر کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ جہاں تک منگنی کا تعلق ہے تو مرد کا ولی (ولی الرجل کا لفظ استعمال ہوا ہے اور الرجل جوان مرد کو کہتے ہیں۔ نابالغ بچہ کو نہیں کہتے) عزیزوں میں سے قریب ترین رشتہ دار یا کسی دوست کو جوان لڑکی (اَلْفَتَاۃُ) کے والد، چچا، بھائی یا کسی دوسرے رشتہ دار کے پاس بھیجتا تھا جو اس کا ولی ہوتا تھا۔ (یہاں اَلْفَتَاۃُ یعنی جوان لڑکی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ صَبِيَّةٌ یا طِفْلَةٌ کا لفظ استعمال نہیں ہوا) تاکہ وہ لڑکی کے گھر والوں سے اپنے مؤکل یا مؤکلوں کی طرف سے گفتگو کریں۔ اگر پیغام لے کر جانے والے کئی آدمی ہوتے تو وہ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد اوّل آپس میں دعا و سلام کرتے۔ پھر وکیل یا وفد کا سربراہ گفتگو کا آغاز کرتا۔ وہ اول جوان لڑکی (اَلْفَتَاۃُ) کے گھرانے کی تعریف کرتا اور مؤکل کی

اس خواہش کا اظہار کرتا کہ وہ ان کے ساتھ مصاہرت (سسرالی رشتہ) کا خواہشمند ہے۔ پھر وہ یہ بتاتے تھے کہ ہم جس کے نمائندے ہیں وہ لڑکی کا کفو ہے اور ایسے گھرانے کا فرد ہے جو لڑکی کے خاندان کا کفو ہے۔ وہ آپ کے ہاں پیغام دینا چاہتا ہے، تو لڑکی کا ولی یا جو شخص لڑکی کی طرف سے گفتگو کرتا تھا وہ بھی اپنی گفتگو کا آغاز نوجوان لڑکی (اَلفَتَاۃ) کے محاسن اور خوبیوں کے بیان سے کرتا اور لڑکی کے خاندان کے محاسن گنواتا۔ پھر لڑکے (اَلفتیٰ جوان) کی طرف آتا، اس کی تعریف کرتا اور بتاتا کہ وہ جوان لڑکے اور اس کے خاندان کے کفو ہونے کی بناء پر لڑکی کا رشتہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا۔ مہر کی مقدار کا تعین پہلے ہی ہو چکتا تھا۔ لڑکی کا ولی اس کا تذکرہ بھی کر دیتا۔ کیونکہ جوان لڑکے (اَلفتیٰ) کی طرف سے عورتیں پہلے ہی دلہن کی گھر والیوں کے ساتھ مہر وغیرہ کے متعلق تمام باتیں طے کر لیا کرتی تھیں پیغام دینے کیلئے یہ وکیل اور نمائندے ان باتوں کے طے ہو جانے کے بعد ہی جایا کرتے تھے۔"

(النہایہ صفحہ ۳۳ جلد ۱، اور عمدۃ القاری صفحہ ۱۳۴ جلد ۲۰ کتاب النکاح باب الخِطبہ)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ دونوں حضرات منگنی کے سلسلہ میں جانے والے نمائندوں کی گفتگو کی تفصیلات میں اَلفتیٰ اور الفتاۃ (جوان لڑکا اور جوان لڑکی) کے الفاظ استعمال فرما رہے ہیں۔ جس سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ نکاح تو کیا عربوں میں منگنی کی بات بھی نابالغ بچوں کے لئے کرنے کا کوئی رواج قطعاً نہیں تھا۔

اس کے علاوہ "بلوغ الادب" اور تاریخ العرب قبل الاسلام" میں ہے کہ۔

"اکثر ایک ایسی عورت کو پہلے بھیجا جاتا تھا جو عورتوں کے معاملات سے خوب واقفیت رکھتی تھی اور تجربہ کار ہوتی تھی۔ جب کوئی آدمی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تو یہ عورت لڑکی کے تمام اوصاف سے واقفیت حاصل کر کے آتی، وہ لڑکی کو دیکھتی، اس سے باتیں کرتی، اس کا امتحان لیتی اور پھر پوری معلومات لے کر آتی اور پیغام دینے والے مرد کو ساری باتیں آکر بتاتی۔"

(بلوغ الارب صفحہ ۱۵ جلد ۲ اور تاریخ العرب قبل الاسلام صفحہ ۲۶ جلد ۵)

ظاہر ہے کہ جو عورت پہلے لڑکی کو دیکھنے جاتی، وہ اس سے باتیں کرتی اس کے عقل و شعور اور سلیقہ کا امتحان لیتی اور پھر رشتہ دینے والے کو تمام کوائف سے آگاہ کرتی تو وہ کسی کمسن بچی کا امتحان تو نہیں لیتی تھی۔ کسی صغیر سن بچی سے تو باتیں نہیں کرتی تھی۔ یہ سب باتیں وضاحت سے بتا رہی ہیں کہ نکاح تو نکاح منگنی اور رشتہ دینے کی باتیں بھی جوان لڑکوں اور جوان لڑکیوں کے درمیان ہی ہوا کرتی تھیں۔ نابالغ کمسن بچیوں کو دیکھنا، ان سے باتیں کرنا، ان کا امتحان لینا اور ان باتوں کے لئے کسی تجربہ کار خاتون کو بھیجنا کوئی معنے ہی نہیں رکھتا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عربوں میں کم سنی کی شادیوں کا کوئی رواج نہیں تھا۔

لہٰذا جب عربوں میں کم سنی کی شادیوں کا کوئی رواج ہی نہیں تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ خصوصی طور پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ذات کو اس انوکھی اور غیر مروّج قباحت کے لئے منتخب کر کے انہیں اضحوکۂ روزگار بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات کو مطعون کیا جا سکے کہ آپ بچپن سال کی عمر میں ایک

گڑیوں سے کھیلنے والی اٹھ نو سال کی کم سن بچی کو اپنے حبالۂ عقد میں لاکر دادِ عیش دے رہے تھے۔ معاذاللہ ثم معاذاللہ۔

ہمارے ایک عزیز فاضل نے ہمارے اس دعوے کی تغلیط کے لئے جستجوئے بسیار کے بعد احکام القرآن (للجصاص الرازیؒ) سے ایک روایت نقل فرمائی ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ عزیز موصوف نے دیانتداری کا کوئی بہتر نمونہ پیش نہیں کیا۔ روایت یہ ہے۔

سلمہؓ کا نکاح علامہ ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں محمد ابن اسحٰق کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت اُم سلمہؓ کے صاحبزادے سلمہؓ کا نکاح خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت چھوٹی عمر میں حضرت حمزہؓ کی چھوٹی بچی سے کر دیا تھا۔

فزوّجه رسولُ اللهِ صلے اللهُ علیه وسلم بنتَ حمزةَ وهما صبیان صغیران فلم یجتمعا حتّٰی ماتا الخ (احکام القرآن ص۶۲ ج۲)

ترجمہ: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سلمہ کا نکاح حضرت حمزہؓ کی بیٹی سے کرا دیا، اس وقت یہ دونوں بچے تھے، پھر وہ دونوں جمع نہیں ہوئے یہاں تک کہ دونوں کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا۔

اس روایت میں آپ نے دیکھا کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سلمہؓ اور بنتِ حمزہؓ کا نکاح نابالغی کی حالت میں ہی کرا دیا۔

(ہمارے عائلی مسائل ص۲۱ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

عزیز موصوف نے آگے چل کر خود اس بات کا اعتراف فرمایا ہے کہ۔

"علامہ واقدیؒ تاریخِ اسلام کے نہایت مستند مؤرخ سمجھے جاتے ہیں جو روایت ان کی بیان کردہ نہو تی مگر اسے تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل

ہوتی ہے۔ مگر یہی علامہ واقدیؒ جب حدیث میں پہنچتے ہیں تو محدثین حضرات ان کو "ضعیف" قرار دیتے ہیں اور اس پر جرح کرتے ہیں۔ جو واقدی سے مروی ہو۔ اسی طرح محمد ابن اسحٰقؒ سیر و مغازی کے مستند ترین مؤرخ ہیں لیکن یہی محمد ابن اسحٰقؒ جب حدیث میں پہنچتے ہیں تو حضرات محدثین انہیں خصوصیت سے احکام کی روایت میں ناقابلِ اعتبار قرار دے دیتے ہیں یہی حال ابن لہیعہ کا ہے۔" (ہمارے عائلی مسائل صفحہ ۲۳۶)

عزیز موصوف کو محمد ابن اسحٰق کے متعلق ان اعترافات کے باوجود ان کی روایت کردہ حدیث اس مسئلہ میں پیش فرمانے سے احتراز فرمانا چاہئے تھا۔ محمد ابن اسحٰق صاحب کے متعلق امام مالکؒ کا یہ قول تو انہیں بھی یاد ہوگا کہ۔

ھو دجال من الدجاجلة۔

ترجمہ:۔ وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہیں۔

بہرحال محمد ابن اسحٰق کی روایت سے جبکہ خود عزیز موصوف کی تصریح کے مطابق۔

"محدثین انہیں خصوصیت سے احکام کی روایت میں ناقابلِ اعتبار قرار دیتے ہیں۔"

ایک ایسے مسئلہ میں استدلال فرمانا جو نہ صرف احکام سے متعلق ہے بلکہ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر قدح کا باعث بن سکے کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ اول تو روایات اسی باب میں مضطرب ہیں کہ حضرت ام سلمہؓ کا نکاح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت سلمہ ابن ابی سلمہ نے کرایا تھا یا حضرت عمر ابن ابی سلمہ نے کرایا تھا۔

چنانچہ نسائی کی روایت میں سلمہؓ کے بجائے عمر ابن ابی سلمہ کا نام لیا گیا ہے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سلمہؓ ہی نے حضرت ام سلمہ کا نکاح کرایا تھا تب بھی حسبِ تصریح حافظ ابن حجرؒ حضرت سلمہؓ ۵ھ بعثتِ نبوی کے وقت حضرت ام سلمہؓ کی گود میں تھے۔ حافظ ابنِ حجر خود محمد ابن اسحٰق ہی کی روایت سے لکھتے ہیں کہ۔

"اور سلمہؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے رَبیب تھے۔ ابن اسحٰق نے مغازی میں ام سلمہؓ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ جب ابو سلمہؓ نے ہجرت کا طے کر لیا تو اُنہوں نے ایک اونٹ میرے سامنے کیا اور مجھے اس پر سوار کیا اور میری گود میں سلمہؓ کو بھی سوار کیا۔ پھر اونٹ کو لے کر چل دیئے۔"

(اصابہ صـ ۶۴/۲ مطبوعہ ۱۳۵۸ھ مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر)

حضرت ابو سلمہ ابن عبد الاسد مخزومی نے حضرت ام سلمہؓ کے ساتھ ۵ھ بعثتِ نبوی میں حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے زرقانی، فتح الباری، ابن سعد، ابن سید الناس کے حوالوں سے ۵ھ بعثت میں حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے تمام نام گنا دیئے ہیں۔ ان میں حضرت ابو سلمہؓ کا چھٹا نمبر ہے۔ (ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ جلد اول صـ ۲۳۶-۲۳۷ مطبوعہ ناشرانِ قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور)

۵ھ نبوت میں حضرت سلمہؓ ماں کی گود میں تھے۔ مان لیجئے کہ وہ صرف ایک ہی سال کے ہوں گے تو ۱ھ ہجری میں وہ نو سال کے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ سے آنحضرت کا نکاح ۴ھ کے شوال میں ہوا ہے۔ (نیز ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ جلد اول صـ ۴۰۲)

لہٰذا حضرت ام سلمہؓ کے نکاح کے وقت حضرت سلمہؓ تیرہ سال کے

تھے۔ حضرت اُمامہ بنت حمزہ ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہا ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے وقت جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو وہ اے چچا! اے چچا! پکارتی ہوئی آئی تھیں۔ (دیکھیئے صحیح بخاری الکتاب المغازی باب عمرۃ القضاء عن براءؓ صفحہ ۱۱/۲ مطبوعہ مجتبائی دہلی)

لہٰذا ۶ھ میں حضرت سلمہؓ پندرہ سال کے تھے۔ پندرہ سال کے لڑکے کے متعلق ہمارے عزیز موصوف کا یہ کہنا کہ وہ نابالغ اور کمسن بلکہ خود ان کے بقول "یہ دونوں چھوٹے سے بچے تھے" حیرتناک دعویٰ ہے۔ اب حضرت اُمامہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہا کی عمر کا اندازہ اس سے فرمالیجیئے کہ خود صحیح بخاری ہی کی مذکورہ بالا روایت کے آخر میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ کہ

قَالَ عَلِیٌّ الا تتزوج ابنۃ حمزۃ قال انہا ابنۃ اخی من الرضاعۃ۔

ترجمہ: حضرت علیؓ نے کہا کہ آپ حمزہ کی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ (میں اس سے شادی کس طرح کر سکتا ہوں)۔

یعنی حضرت اُمامہؓ شادی کے قابل ہو چکی تھیں جب ہی تو حضرت علیؓ نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ بہرحال "ان دونوں چھوٹے سے بچوں" کی یہ کیفیت تھی۔

عزیز موصوف نے لکھا ہے کہ۔

"پھر وہ دونوں جمع نہیں ہوئے یہاں تک کہ دونوں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔"

اس کے بارہ میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ۔

"واقدی نے بیان کیا ہے اور حاتم نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے کہ سلمہؓ عبد الملک ابن مروان کی خلافت تک زندہ رہے اور جو کچھ اس سے پہلے بیان

ہوا ہے کہ وہ دونوں جمع نہیں ہوئے حتیٰ کہ دونوں کا انتقال ہو گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمامہؓ کا انتقال اس سے پہلے ہو گیا کہ ان کی رخصتی ہوتی اور سلمہؓ کا انتقال ان کے بعد ہوا تھا۔ لیکن کلبی نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ سلمہؓ کا انتقال اُمامہؓ سے ملنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا"

(اصابہ ج۴ ص۲۴۲ مطبوعہ ۱۳۵۸ھ مطبعہ مصطفیٰ محمد مصر)

یعنی انتقال کے متعلق بھی عزیز موصوف نے کمزور روایات پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی۔ کاش عزیز موصوف یہ ناقابلِ اعتبار روایت اپنے استدلال میں پیش کرنے سے پہلے ان تمام تفاصیل کا جائزہ لے لیتے اور سنین کا حساب کر لیتے تو اس روایت کو پیش فرمانے کی جرأت ہی نہ کرتے۔ یہ ساری باتیں خود محدثین کی تصریحات سے ثابت ہو رہی ہیں۔

اگر عزیز موصوف کو عربیت کے ذوق اور اسالیبِ بیان کے نازک امتیازات سے قدرت نے کچھ بھی حصہ عطا فرمایا ہو تو یقیناً وہ مجھ سے اتفاق فرمائیں گے کہ اونٹوں کے ذریعہ سفر میں جب ساربان اپنی بیوی اور بچہ کو اونٹ پر سوار کر کے خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر چل رہا ہو (تخرج یقود بعیرہٗ) تو اگر بچہ آٹھ دس سال یا اس سے بڑی عمر کا ہو تو بچہ کو سواری کے پیچھے بٹھاتا ہے جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختلف موقعوں پر حضرت اسامہؓ، حضرت فضل ابن عباسؓ اور حضرت علی ابن ابی العاص (زینبیؓ) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے ردیف بن کر سوار ہوئے ہیں اور اگر بچہ سال ڈیڑھ سال کا دودھ پیتا بچہ ہو تو اس میں چونکہ اونٹ پر سوار ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی تو سوار ہونے کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اونٹ پر اس کی ماں کو سوار کرایا اور بچہ اس کی گود

میں تھا۔ لیکن اگر بچہ چار پانچ سال کا ہو تو اسے ماں کے آگے (اس کی گود میں) بٹھایا جاتا ہے اور یہ کہا جائے گا۔ کہ بچہ کو بھی اونٹ پر سوار کرا دیا اور وہ ماں کی گود میں بیٹھا تاکہ ماں اس کو پکڑ لے اور وہ گر نہ جائے۔ محمد ابن اسحق کی اس روایت میں حضرت ام سلمہؓ فرما رہی ہیں۔

فرحل بعیرا لی وحملنی علیہ وحمل ابنی سلمۃ فی حجری ثم خرج یقود بعیرہٗ۔

ترجمہ :- تو انہوں نے ایک اونٹ پر کاٹھی یا کجاوہ کسا اور مجھے اس پر سوار کیا اور میرے ساتھ سلمہؓ کو سوار کیا، میری گود میں پھر اونٹ کی نکیل تھام کر نکلے۔

یہ اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ سلمہؓ اس وقت چار پانچ سال کے ہو چکے تھے اور اونٹ پر سوار ہونے کے قابل تھے۔ لیکن کمسن تھے۔ لہٰذا اُنہیں ماں کی گود میں دے کر سوار کیا گیا۔ اگر وہ ۵ھ بعثت میں چار پانچ سال کے تھے تو ۶ھ میں انیس یا بیس سال کے کڑیل جوان ہوں گے۔ روایت اگرچہ عزیز موصوف کے اعتراف کے مطابق ناقابلِ اعتبار ہے۔ لیکن پھر بھی وہ عزیز موصوف کے مدعا کو کسی طرح بھی ثابت نہیں کرتی۔

اس کے بعد ہم ان بیانات کو پیش کرتے ہیں جو حضرت عائشہؓ کی عمر کے بارے میں بخاری شریف کی روایت کی تکذیب کر رہے ہیں۔ علامہ حافظ ابن کثیر اور علامہ ولی الدین محمد ابن عبداللہ الخطیب حضرت عائشہؓ کی عمر کے متعلق تصریح فرماتے ہیں کہ۔

حضرت عائشہؓ حضرت اسماءؓ سے دس سال چھوٹی تھیں۔

حضرت عائشہؓ اپنی بڑی بہن حضرت اسماءؓ سے دس سال چھوٹی تھیں۔ حضرت اسماءؓ کا انتقال

۷۳ھ میں ہوا تو ان کی عمر ایک سو سال تھی۔ یعنی ہجرت کے وقت حضرت اسماءؓ کی عمر ستائیس یا اٹھائیس سال اور حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال تھی۔ حضرت عائشہؓ کی رخصتی شوال ۲ھ میں ہوئی یعنی جبکہ ان کی عمر انیس یا بیس سال تھی۔ (ملاحظہ ہو اکمال فی اسماء الرجال للخطیب اور البدایہ والنہایہ لابن کثیر صفحہ ۳۴۶ ج ۸)

حافظ ابن کثیرؒ نے اسی بات کو ذرا تفصیل سے قلم بند فرمایا ہے۔ ہم ان کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب البدایہ والنہایہ میں رقم طراز ہیں کہ۔

"ان کی (اسماءؓ کی) بہن حضرت عائشہؓ ہیں۔ ان کے والد ابو بکرؓ صدیق ہیں۔ ان کے دادا ابو عتیقؓ ہیں۔ ان کے بیٹے عبداللہؓ ہیں۔ ان کے شوہر حضرت زبیرؓ ہیں اور یہ سب کے سب صحابی ہیں رضی اللہ عنہم۔ حضرت اسماءؓ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ معرکۂ یرموک میں شریک تھیں یہ اپنی بہن حضرت عائشہ سے دس سال بڑی تھیں.......... اس سال (۷۳ھ میں) جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے انہیں اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کے قتل کا سانحہ دیکھنا پڑا۔ اس واقعہ کے پانچ دن بعد، اور بقولِ دیگر دس دن بعد اور بقولِ دیگر بیس دن بعد اور بقولِ چہارم کچھ اوپر بیس دن بعد اور بقولِ پنجم سو دن بعد اور یہی مشہور ہے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر سو سال تھی۔ نہ ان کا کوئی دانت ٹوٹا تھا اور نہ عقل میں کوئی فتور آیا تھا۔ (البدایہ والنہایہ صفحہ ۳۴۶ ج ۸)

حضرت اسماءؓ ۷۳ھ میں سو سال کی تھیں تو بوقتِ ہجرت ستائیس سال کی ہوئیں۔ حضرت عائشہؓ جو اُن سے دس سال چھوٹی تھیں اس بیان کے مطابق

بوقتِ ہجرت سترہ سال کی اور سلہ شوال میں انیس سال کی ہوئیں۔ اور یہی حقیقت ہے۔ اِکمال و ابن کثیرؒ کی تائید علامہ ذہبی کی تحقیق سے بھی ہوتی ہے وہ اپنی کتاب سیر اَعلام النبلاء للذہبی الجزء الثانی مطبوعہ دارالمعارف مصر ۱۹۵۶ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"اسماءؓ بنت ابی بکر ..... حضرت عائشہؓ سے دس سال سے کچھ اُوپر بڑی تھیں ص ۲۰۸، عبدالرحمٰن ابن الزناد نے کہا ہے کہ اسماءؓ حضرت عائشہؓ سے دس سال ہی بڑی تھیں ص ۲۰۹، عُروہ نے کہا ہے کہ اسماءؓ کا انتقال سو سال کی عمر میں ہوا ص ۲۱۳، ابن سعد نے کہا ہے کہ اپنے بیٹے کے چند دن بعد ان کا انتقال ہوا۔ عبداللہ ابن زبیرؓ کے قتل کا واقعہ ۱۷ جمادی الاولیٰ سہ شنبہ ۷۳ھ کو پیش آیا تھا۔ ص ۲۱۴"

اب طبری کا اعتراف بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اور اس بات کو ذہن میں رکھیئے کہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ موصوف شیعہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"زمانۂ جاہلیت میں ابوبکرؓ کے نکاح میں دو عورتیں تھیں۔ قتیلہؓ جن کے بطن سے عبداللہؓ اور اسماءؓ پیدا ہوئے۔ اور دوسری امّ رومانؓ جن کے بطن سے عبدالرحمٰنؓ اور عائشہؓ پیدا ہوئے۔"

فکل ہؤلاء الاربعۃ من اولادہٖ ولدوا من زوجتیہ اللتین سمّیتُھما فی الجاھلیۃ۔

ترجمہ: اور یہ چاروں بہن بھائی ان دونوں بیویوں سے جن کے نام میں نے لئے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں پیدا ہو چکے تھے۔ (تاریخ طبری ص ۵۰ ج ۴)

طبری باوجود شیعہ ہونے کے حضرت عائشہؓ کی پیدائش بعثت سے پہلے زمانۂ جاہلیت کی بتا رہے ہیں۔ اور ابنِ ہشام کا بیان آگے آ رہا ہے کہ حضرت

عائشہ اوّلین اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کو بعثت کے وقت پانچ چھ سال یا زیادہ کا ہونا چاہیئے۔

حضرت فاطمہؓ سے پانچ سال چھوٹی تھیں

اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کی عمروں کے درمیان تفاوت کو ملاحظہ فرمائیے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ۔

"سیدہ فاطمہؓ سیدہ عائشہؓ سے تقریبًا پانچ سال بڑی تھیں"

(اِصابہ صفحہ ۳۷۷ ج ۴)

اُسدالغابہ کا بیان ہے کہ۔

"حضرت فاطمہؓ کی پیدائش اس سال ہوئی جس میں کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اس وقت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس ۳۵ سال تھی"

(اُسدالغابہ صفحہ ۲۷۷ ج ۴)

پھر اُسدالغابہ ہی میں دوسری روایت میں ہے کہ۔

"حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کے ہاں گئے تو سیدہ فاطمہؓ حضرت علیؓ سے کہہ رہی تھیں کہ میری عمر تم سے زیادہ ہے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ نہیں، فاطمہؓ اس زمانہ میں پیدا ہوئی تھیں جب قریش خانۂ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے اور علیؓ اس سے چند سال پہلے پیدا ہو چکے تھے" (اُسدالغابہ صفحہ ۲۸ ج ۴)

یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے آپ کو حضرت علیؓ سے بڑا بتا رہی ہیں۔ جس کی رو سے ان کی پیدائش تعمیرِ کعبہ کے موقعہ سے بھی قبل کی ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ حضرت عباسؓ ان کی تردید فرما رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر آدمی اپنی عمر کے متعلق کچھ زیادہ ہی

جانتا ہے لہٰذا حضرت فاطمہؓ کا قول اپنے متعلق زیادہ معتبر ہونا چاہیئے
المرءُ اَعرفُ بنفسہٖ من غیرہٖ۔

اس کے بعد یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھیئے کہ ایک بچہ ۱۳۹۸ھ میں ذوالحج کی تیس تاریخ کو پیدا ہوتا ہے اور دوسرا یکم محرم الحرام ۱۳۹۹ھ میں. بظاہر سنین کے لحاظ سے دونوں کی عمر میں ایک سال کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت دونوں کی عمروں میں صرف ایک دن کا فرق ہے۔ اسی طرح ایک بچہ یکم محرم الحرام ۱۳۹۸ھ کو پیدا ہوتا ہے اور دوسرا تیس ذوالحج ۱۳۹۹ھ کو پیدا ہوتا ہے۔ تو سنین کے لحاظ سے بظاہر وہی فرق معلوم ہوتا ہے جو پہلے دو بچوں کی عمروں میں نظر آتا تھا۔ مگر حقیقت میں یہاں دو سال کا فرق ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ عربوں میں کیلنڈر کا رواج نہیں تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کے عہد تک کوئی کیلنڈر رائج نہیں تھا۔ ہجری کیلنڈر کا آغاز حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں فرمایا ہے۔ ہمیں روایات میں تمام بیانات اس انداز سے ملتے ہیں کہ یہ واقعہ عام الفیل سے اتنے سال پہلے یا اتنے سال بعد ہوا تھا خانۂ کعبہ کی تعمیرِ جدید سے اتنا عرصہ بعد ہوا تھا۔ حربِ فجار سے اتنے سال پہلے یا اتنے سال بعد ہوا تھا۔ حلف الفضول سے اتنے عرصہ بعد ہوا تھا۔ لیکن ان حسابات کو بالکل صحیح (ACCURATE) نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس طرح حساب کرنے میں ایک دو سال کا فرق پڑ جانا یقینی ہے۔

جو روایات حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کی عمروں کے تفاوت سے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں۔ ان کے مطابق اگر حضرت فاطمہؓ کی پیدائش

تعمیر کعبہ کے وقت کی بھی مان لی جائے تب بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سالِ ولادت، نبوت کا پہلا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کے مطابق ہجرتِ نبوی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر تیرہ یا پندرہ سال اور رخصتی کے وقت پندرہ یا سترہ سال قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر سالوں کے درمیان جو کسر رہ جاتی ہے اس کو بھی شمار کر لیا جائے تو شوال ۲ھ میں رخصتی کے وقت سترہ یا انیس سال قرار پاتی ہے۔ لیکن ابنِ ہشام وغیرہ کی تصریحات کے مطابق جو آگے آ رہی ہیں کہ حضرت عائشہؓ اولین اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ اور ان کا نمبر انیسواں ۱۹ ہے۔ انہیں بعثت کے وقت یقیناً پانچ سال کا ہونا چاہیئے۔ ایک دو سال کی بچی کے اسلام لانے کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ اسی کی تائید حضرت اسماءؓ کی عمر والی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ طبقاتِ ابنِ سعد صفحہ ۱۱ جلد ۸ اور صفحہ ۱۷ جلد ۸ پر اُسد الغابہ کی مذکورہ ہر دو روایات کی تائید موجود ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔ استیعاب میں ہے کہ عبداللہ ابن الحسنؓ امیر المؤمنین ہشام ابن عبدالملک کے دربار میں تھے۔ وہاں اس وقت کلبی بھی موجود تھا۔ ہشام نے عبداللہ ابن الحسنؓ سے پوچھا کہ فاطمہؓ بنت رسول اللہ کی کل عمر کتنی ہوئی تو عبداللہ نے کہا۔

"تیس ۳۰ سال"

پھر اس نے کلبی سے پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ۔

"پینتیس ۳۵ سال"

اس پر ہشام نے عبداللہ سے کہا، "سنیئے کلبی کیا کہہ رہا ہے۔" تو عبداللہ

نے جواب دیا۔

"اے امیر المؤمنین! مجھ سے میری ماں کے متعلق پوچھئے اور کلبی سے اس کی ماں کے متعلق۔" (استیعاب صفحہ ۷۵۲/۲)

اس روایت میں عبداللہ ابن الحسن کا بیان حضرت عباسؓ کے ارشاد کے مطابق ہے۔ اور کلبی کا قول خود حضرت فاطمہؓ کے نقطۂ نظر کا ترجمان ہے۔ روایت اوپر نقل کی جا چکی ہے۔

اس روایت کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی عمر ۲ھ میں بائیس سال اور حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ سال ہوتی ہے۔ یعنی عبداللہ ابن الحسن کے قول کے مطابق۔ لیکن اگر کلبی کا قول تسلیم کیا جائے تو حضرت فاطمہؓ کی عمر ستائیس سال اور حضرت عائشہؓ کی عمر بائیس سال بنتی ہے۔ نیز حضرت عبداللہ ابن الحسنؒ کے قول پر بھی اگر دونوں طرف کی کسر کو شامل کر لیا جائے تو وہی انیس سال حضرت عائشہؓ کی عمر بنتی ہے۔

شیعی نقطۂ نظر

شیعہ اِمامیہ اس کے قائل ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی کل عمر تیس ۳۰ یا پینتیس ۳۵ سال کے بجائے کل عمر ساڑھے تئیس ۲۳ یا ساڑھے چوبیس ۲۴ سال ہوئی تھی۔ ہمارے فاضل عزیز نے انہی روایات کو ترجیح دیتے ہوئے صحیحین کی زیر تنقید روایت کو بچانے کے لئے بڑا زورِ قلم صرف فرمایا ہے۔ اس ایک روایت کو بچانے کے لئے صحیحین کی کتنی روایتوں کا خون ان کی گردن پر ہے وہ ہم آگے بتائیں گے فی الحال آپ ان کی تصریحات دیکھیئے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اس میں یہ بات تو واقعی صحیح ہے کہ حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ سے پانچ سال چھوٹی تھیں۔ لیکن اسے تسلیم کر لینے کے بعد

اس دلیل کا سارا دارومدار اس بات پر رہ جاتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر کل تیس سال ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ بات ایک تاریخی روایت سے ثابت ہے۔ لیکن حضرت فاطمہؓ کی عمر کے بارے میں اور بھی کئی روایتیں ہیں۔ اور یہ تیس ۳۰ یا پینتیس ۳۵ کی روایت دوسری صحیح اور صریح روایتوں کی بنا پر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ اس بات پر تو تمام ہی مؤرخین متفق ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی پیدائش بعثت سے کچھ پہلے ہوئی ہے۔ (اصابہ ص ۳۶۵ و ۳۶۸ ج ۴) بلکہ ابن السراج کی ایک روایت یہ ہے کہ بعثت سے ایک سال بعد ہوئی۔ (استیعاب ص ۳۶)

دوسری طرف تاریخِ وفات میں بھی مؤرخین کا تقریباً اتفاق ہے۔ کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد وفات ہوئی ہے (خود یہ حضرات بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔)

اب آپ غور فرمائیے کہ اگر احتیاطاً بعثت سے ایک سال پہلے بھی حضرت فاطمہؓ کی پیدائش مان لی جائے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر چوبیس سال ہوگی (کیونکہ کل مدتِ رسالت تیئس سال ہے) چھ ماہ بعد حضرت فاطمہؓ کی بھی وفات ہوگئی تو کل عمر ساڑھے چوبیس سال بنتی ہے اور ابن السراج کی روایت لی جائے تو ساڑھے تیئس سال۔

لہٰذا ہجرت کے وقت ان کی عمر تیرہ یا چودہ سال اور حضرت عائشہؓ کی آٹھ یا نو سال بنتی ہے۔ ہجرت سے دو سال پہلے حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا تو اس وقت ان کی عمر چھ یا سات سال ہوگی۔ اور یہی تمام دوسری

روایاتِ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت فاطمہؓ کے نکاح کے بارے میں تصریح ہے کہ ان کا نکاح ہوا تو ان کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔

(استیعاب ص۳۶۲ و تہذیب التہذیب ص۴۴۱ ج۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے چند مہینوں بعد ہوا ہے۔ (اصابہ، استیعاب، تہذیب التہذیب بحوالہ بالا) تو حضرت عائشہؓ کی عمر ان کی رخصتی کے وقت نو سال ہی بنتی ہے اور نکاح کے وقت سات سال۔ یہی دوسری روایتوں سے بھی ثابت ہے۔"

(ہمارے عائلی مسائل ص۲۳۳-۲۳۵)

ہمارے عزیز موصوف نے مؤرخین کے متفقہ بیانات اور صحیحین کی روایات کے علی الرغم حضرت فاطمہؓ کی پیدائش بعثت سے ایک سال پہلے یا ایک سال بعد ثابت فرمائی ہے۔ جو بہ وجوہ غلط ہے۔ تمام محدثین، مفسرین، اور اصحابِ سیر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد تین سال تک رازداری کے ساتھ خاموش تبلیغ فرماتے رہے اور تین سال کے بعد آپ کو عَلانیہ تبلیغ فرمانے کا حکم دیا گیا تھا۔ علامہ شبلیؒ اپنی، سیرت النبیؐ میں لکھتے ہیں کہ۔

"تین برس تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت رازداری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا کیا۔ لیکن آفتابِ رسالت بلند ہو چکا تھا۔ صاف حکم آیا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ۔ (حجر)

ترجمہ: اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کر دے۔

اور نیز حکم آیا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ (الشعراء-۱۱)

ترجمہ:- اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو ڈرا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارا یامعشر قریش!
لوگ جمع ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ "پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا "ہاں۔ کیونکہ تم کو ہمیشہ سے سچ بولتے دیکھا ہے۔" آپ نے فرمایا۔

"تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذابِ شدید نازل ہو گا۔"

یہ سُن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا سخت برہم ہو کر چلے گئے۔ (صحیح بخاری صـ۷۰۲ ج ۲) (سیرت النبیؐ صـ۲۱۳ ج ۱)

یہ واقعہ چونکہ اتنا مشہور ہے کہ مسلمانوں میں بچہ بچہ کو معلوم ہے اس لئے ہم نے کسی عربی تاریخ و سیر کی کتاب کے حوالہ کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبیؐ کے حوالہ پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اس کے بعد صحیح بخاری کتاب التفسیر (سورۃ الشعراء) عن ابن عباس وابی ہریرہ وسورۃ السبا وسورۃ تبت یدا وکتاب احادیث الانبیاء باب من انتسب الی آبائہ عن ابی ہریرۃؓ وصحیح مسلم کتاب الایمان باب انذر عشیرتک الاقربین میں مندرجہ ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

حَدَّثَنَا ابوالیمان قال اَخْبَرَنَا شعیب عن الزھری قال اخبرنی سعید ابن المسیب وابوسلمۃ بن عبد الرحمٰن کی سند سے امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابوہریرہؓ نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

کی آیت نازل فرمائی تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور آپ نے فرمایا۔ یا معشر قریش ! یا اس جیسا کوئی اور لفظ۔

" اپنے نفسوں کو خدا کے عذاب سے بچالو، میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ اے بنی عبد مناف ! میں خدا کے عذاب سے تمہیں بالکل نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبد المطلب ! میں اللہ کے عذاب سے تجھے قطعاً نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ! مَیں تجھے اللہ کے عذاب سے بالکل نہیں بچا سکتا۔ اے فاطمہ بنت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ! میرے مال سے جو کچھ تجھے مانگنا ہو مانگ لے میں تجھے اللہ کے عذاب سے بالکل نہیں بچا سکتا۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اصبغ نے بھی عن ابن وہب عن یونس عن ابن شہاب یہی الفاظ نقل کئے ہیں۔

(صحیح بخاری صہ ۲/۷۰۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

فاضل موصوف سے بڑے احترام کے ساتھ یہ سوال ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو سال کی ایک دودھ پیتی بچی کو یا چار سال کی معصوم بچی کو خدا کے عذاب سے یوں ڈرا رہے تھے ؟ اور اگر ڈرا رہے تھے تو کیا بقائمی ہوش وحواس یہ فریضہ انجام دے رہے تھے ؟ اس حدیث کو نقل فرمانے کے بعد مشہور اہلحدیث محقق مسعود احمد صاحب بی ایس سی امیر جماعت المسلمین اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ۔

"اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول کے وقت حضرت فاطمہؓ سنِ شعور کو پہنچ چکی تھیں "۔ (صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین صہ ۶۴۲)

اس کے بعد صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الدعاء علی المشرکین اور کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئًا و کتاب الوضوء باب

اذا القی عن ظہر المصلّی قذرًا وکتاب احادیث الانبیاء، باب مالقی النبی صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ من المشرکین وصحیح مسلم کتاب الجہاد باب مالقی النبی صلے اللہ علیہ وسلم من اذی المنافقین پر یہ حدیث بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سایہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ سجدہ میں گئے تو کافروں نے آپ کی پشت پر اونٹ کی اوجھڑی رکھدی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بڑی دیر تک سجدہ میں پڑے رہے۔ کفّار یہ منظر دیکھ کر ہنستے رہے۔ اتنے میں ایک شخص نے جاکر حضرت فاطمہؓ کو خبر دی۔ وہ ابھی لڑکی ہی تھیں۔ دوڑتی ہوئی آئیں اور آپ کی پیٹھ پر سے اوجھڑی کو ہٹا دیا اور کافروں کو برا بھلا کہا۔

(بحوالہ صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین ص۶۴۲)

یہ واقعہ ابتداءِ اسلام ہی کا ہے۔ آپ کی پشتِ مبارک پر اونٹ کی اوجھڑی رکھی جاتی ہے جو اتنی وزنی ہے کہ آپ اس کو خود گراکر کھڑے نہیں ہوسکے اور دیر تک اسی حال میں سجدہ کی کیفیت میں رہے۔ تاآنکہ کسی شخص نے حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی۔ وہ تشریف لاکر اس وزنی اوجھڑی کو (جو اونٹ کی اوجھڑی تھی) آپ کی پشتِ مبارک سے ہٹاتی ہیں اور کفارِ قریش کو بُرا بھلا کہتی ہیں۔ ذرا انصاف سے غور فرمائیں کہ کیا یہ ایسی بچی ہوسکتی ہے جس کی پیدائش بعثت سے صرف ایک سال پہلے یا ایک سال بعد ہوئی ہو۔ یہ اوجھڑی ظاہر ہے کہ کم وزنی نہیں تھی۔ اگر وہ پھولوں کی گٹھڑی ہوتی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اسے خود ہی گراکر کھڑے ہوجاتے۔

مذکورہ بالا روایتیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہی کی ہیں جن سے اُن روایات کا خلافِ واقعہ ہونا ثابت ہوجاتا ہے جو ہمارے فاضل عزیز

نے پیش فرمائی ہیں۔ اسی لئے ہم نے قصداً ان غلط روایات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

حضرت اسامہؓ سے بڑی بھتیں

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ۔

عثر اسامة بعتبة الباب۔ فشج فی وجهه فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم امیطی عنہ الاذی فتقذرته ۔ (اسامہ دروازہ کی چوکھٹ پر پھسل گئے اور ان کے چہرہ پر زخم آگیا۔ آنحضرتؐ نے (مجھے) فرمایا کہ اسامہ سے گندگی پونچھ دو تو مجھے گھن آئی) فجعل یمص الدم ویمجه عن وجهه ۔ (تو اسامہ خون کو چاٹنے لگے اور اسے اپنے چہرہ سے ہٹانے لگے)۔ (کنز العمال صفحہ ۵ جلد ۷ بحوالہ جامع عبدالرزاق وابن عساکر نیز صفحہ ۴۲ جلد ۵ پر بحوالہ ابن ابی شیبہ وابن سعد) اسی سے ملتی جلتی روایت ابن ماجہ میں بھی ہے اور بجائے خون کے ناک صاف کرنے کے متعلق ہے۔ اسی سے ملتی جلتی حدیث ترمذی میں بھی ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت اُسامہؓ کی عمر بیس سال تھی۔ (دیکھیے اِکمال فی اَسماءِ الرجال اور تمام سیرت کی کتابیں)۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری وقت میں جو لشکر ترتیب دیا تھا۔ اور جسے آپ نے شام پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا تاکہ جنگِ مُوتہ کا انتقام لیا جائے (جس میں اسامہؓ کے والد حضرت زید ابن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ شہید ہو گئے تھے)۔ اس لشکر کی کمان آپؐ نے حضرت اسامہؓ ہی کو سونپی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ چنانچہ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت اسامہؓ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد کر کے فتحیاب اور کامران لوٹے تھے۔

بہرحال یہ بات ثابت ہے کہ حضرت اسامہؓ کی پیدائش ۳ نبوت کی ہے اور یہ واقعہ کہ وہ گھر کی دہلیز سے گر کر لہولہان ہو جائیں یا ان کی ناک بہہ رہی ہو اور حضرت عائشہؓ کو کہا جائے کہ چہرہ پر سے خون پونچھ دو یا ان کی ناک صاف کر دو، حضرت اسامہ کے بچپن ہی کا ہو سکتا ہے۔ جب ان کی عمر تین چار سال کی ہو۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کو کم از کم دس بارہ، سال کا ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ بچہ کا خون پونچھ سکیں یا ناک صاف کر سکیں ہم عمر لڑکی کو تو ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا۔

ظاہر ہے یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہو گا جب پردہ کا حکم نہیں ہوا تھا۔ اور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم صدیق اکبر کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے، ایسے ہی کسی موقعہ پر اسامہ بھی حضورؐ کے ساتھ ہولئے اور یہ صورتِ حال پیش آئی۔ غرض یہ کہ اس روایت کی رو سے بھی حضرت عائشہؓ کی پیدائش چار چھ سال قبل نبوت ہوئی۔ اگر چار سال قبل نبوّت بھی تسلیم کی جائے تو ہجرت کے وقت سترہ سال اور ۲ھ میں انیس سال عمر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہ انتہائی بعید بات ہے کہ حضرت اسامہؓ سے صرف ایک دو سال بڑی لڑکی سے کہا جائے کہ وہ بچہ کا خون یا اس کی ناک صاف کر دے۔ اصولاً انہیں حضرت اسامہؓ سے چار پانچ سال تو بڑا ہونا چاہیئے۔

ہجرت کے فوراً بعد صدیقِ اکبرؓ کی تیمارداری

طبقاتِ ابنِ سعد کی ایک روایت ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کی آب وہوا چونکہ مہاجرین کو موافق نہیں آئی تھی اس لئے اکثر مہاجر صحابہ بیمار ہو گئے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ بھی اس بلا سے

نہ بچ سکے۔ انہیں بھی شدت کے ساتھ بخار آیا تو حضرت عائشہؓ نے ان کی تیمارداری فرمائی۔ (طبقات صہ ۴۲/۲)

گھر میں حضرت اسماءؓ اور حضرت ام رومانؓ موجود تھیں۔ بڑی عورتوں کی موجودگی میں چھ اور نو سال کے درمیان عمر کی لڑکی پر باپ کی تیمارداری کا بار ڈال دینا ممکن نہیں تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سولہ ۱۶ سترہ ۱۷ سال ضرور ہوگی۔

تضاد بیانی

ہمیں خوشی ہے کہ اب بادل آہستہ آہستہ چھٹ رہے ہیں اور ہمارے عہد کے مصنفین بخاری کی اس روایت کے خلاف دوسری روایات کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ محترم مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم اپنی سیرتِ عائشہ میں اوّلاً بخاری کی اسی روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا لینے کے بعد آئندہ صفحات میں حق بات کے اعتراف پر مجبور ہوگئے۔ چنانچہ اوّلاً صفحہ ۱۲ پر حاشیہ میں تو یہ لکھتے ہیں کہ۔

"بعض بے احتیاط لوگوں نے اس خیال سے کہ کم سنی کی یہ شادی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے موزوں نہیں، اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ ۶ برس کے بجائے سولہ ۱۶ برس کی تھی۔ لیکن ان کی یہ کوشش تمام تر بے سود اور ان کا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔"

لیکن آگے چل کر صفحہ ایک سو گیارہ ۱۱۱ پر فرماتے ہیں۔

"حضرت عائشہؓ اب بیوہ تھیں۔ اور اسی عالم میں انہوں نے عمر کے چالیس مرحلے طے کئے۔ جب تک زندہ رہیں اسی مزارِ اقدس کی مجاور رہیں۔"

پھر صفحہ ۱۵۵-۱۵۶ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"امیر معاویہؓ کی خلافت کا آخری حصہ حضرت عائشہؓ کی زندگی کا اخیر زمانہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سرسٹھ ۶۷ برس تھی ۵۸ھ میں رمضان کے مہینہ میں بیمار پڑیں .... اور رمضان کی سترہ تاریخ مطابق ۱۳ر جون ۶۷۸ء تھی کہ نماز وتر کے بعد شب کے وقت وفات پائی۔"

(سیرتِ عائشہؓ طبع چہارم مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۸۸ھ / ۱۹۶۸ء)

اگر حضرت مولانا مرحوم تاریخِ وفات، وفات کے وقت عمر، مدتِ بیوگی کا ذرا حساب فرما لیتے تو اس تضاد بیانی کا شکار نہ ہوتے۔ مگر اس کا تو ہمارے ہاں قدیم سے کوئی رواج ہی نہیں رہا۔ چنانچہ عجیب و غریب نمونے آپ کو جگہ جگہ ملیں گے۔

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصریح کے مطابق حضرت عائشہؓ نے سرسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور چالیس سال کا عرصہ بیوگی کے عالم میں گذرا۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ ستائیس سال کی تھیں اور اس سے آٹھ سال پہلے یعنی شوال ۲ھ میں رخصتی کے وقت انیس سال کی ہوئیں۔

علامہ ندویؒ نے یہ بات طبقاتِ ابنِ سعد سے نقل فرمائی ہے چنانچہ ابنِ سعد کہتے ہیں کہ۔

"محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ کا انتقال منگل کی رات کو رمضان کی سترہ تاریخ کو ہوا ۵۸ھ ہجری تھا۔ اسی رات وتر کی نماز کے بعد دفن کر دی گئیں اور وہ اس وقت چھیاسٹھ سال کی تھیں۔"

(دیکھئے طبقات ابن سعد ص ۵۴ ج ۸ مطبوعہ لیڈن۔ نیز طبقات ابن سعد کا

اُردو ترجمہ ص ۱۵۸ مطبوعہ نفیس اکیڈیمی کراچی)

ابنِ ہشام وغیرہ کا بیان

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں کا تذکرہ۔

"السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ"

کے عنوان سے کیا ہے۔ امّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ سے ابتداء کرتے ہوئے سب مردوں، خواتین، غلاموں اور بچوں کا تذکرہ ترتیب وار ایک ہی فہرست میں کیا گیا ہے۔

چنانچہ ابنِ ہشام لکھتے ہیں۔

فاسلم بدعائه رای ابی بکر الصدیق) عثمان بن عفان و الزبیر ابن العوام وعبدالرحمٰن ابن عوف وسعد ابن ابی وقاص و طلحة بن عبیدالله فهؤلاء النفر الثمانیة رعلی وزید وابوبکر ومن اسلم علیٰ یدیه) الذین سبقوا۔ ثم اسلم ابوعبیدة ابن الجراح وابوسلمة بن عبدالاسد والارقم ابن ابی الارقم روفی دارہ کان رسول الله صلی الله علیه وسلم مختفیا من قریش مکة یدعو الناس فیها الی الاسلام وکانت دارہ علی الصفا حتی تکمل المسلمون اربعین رجلاً باسلام عمر۔ فلما تکملوا اربعین رجلاً خرجوا) وعثمان بن مظعون واخواہ قدامة وعبدالله وعبیدة ابن الحارث وسعید ابن زید ابن عمرو وامرأته فاطمة اخت عمر ابن الخطاب او اسماء بنت ابی بکر وعائشه بنت ابی بکر وھی یومئذ صغیرة وخباب ابن الارت۔

(سیرت ابن هشام ص ۲۵۔۲۶ ج ۱ مطبوعه مکتبه ربیع حلب)

ترجمہ: (حضرت خدیجہ کے بعد) پھر ابو بکر صدیق کی دعوت پر عثمان[۲] ابن عفانؓ اسلام لائے اور زبیر[۳] ابن العوام اور عبد الرحمٰن[۴] ابن عوف اور سعد[۵] ابن ابی وقاص اور طلحہ[۶] ابن عبید اللہ۔ تو یہ آٹھ آدمیوں کی جماعت (بہ شمول علی[۷]، زید[۸] وابو بکر[۹] اور جو ابو بکر کے ہاتھوں پر اسلام لائے) وہ ہیں جنہوں نے اسلام کی طرف سبقت فرمائی۔ پھر ابو عبیدہ[۱۰] ابن الجراح اسلام لائے اور ابو سلمہ[۱۱] بن عبد الاسد اور الارقم[۱۲] بن ابی الارقم (اور انہی کے مکان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریشِ مکہ سے چھپے ہوئے تھے۔ آپ لوگوں کو خفیہ اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ان کا مکان صَفا پہاڑی پر واقع تھا حتیٰ کہ مسلمانوں کی تعداد حضرت عمر کے اسلام لانے پر پوری چالیس ہو گئی۔ تو جب مسلمان پورے چالیس ہو گئے تو یہ لوگ باہر نکل آئے) اور عثمان[۱۳] بن مظعون اور ان کے دونوں بھائی قدامہ[۱۴] اور عبد اللہ[۱۵] اور عبیدہ[۱۶] ابن الحارث اور سعید[۱۷] ابن زید بن عمرو اور ان کی بیوی فاطمہ[۱۸] یعنی عمر ابن الخطاب کی بہن۔ اور اسماء[۱۹] بنت ابی بکر اور عائشہ[۲۰] بنت ابی بکر اور وہ ان دنوں چھوٹی تھیں۔ اور خباب ابن الارت۔

(ملاحظہ فرمائیے اُردو ترجمہ سیرتِ ابنِ ہشام صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

بہر حال ابن ہشام کی تصریح کے مطابق السابقون الاوّلون میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو شامل کر لینے کے بعد حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کا انیسواں نمبر ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نمبر بیسواں ہے۔

نیز امام ابو الفداء اسماعیل ابن کثیر اپنی مشہور کتاب "السیرۃ النبویہ" میں لکھتے ہیں۔

وقد سرد ابنُ اسحٰقَ اَسماءَ مَن اسلم قدیماً من الصحابۃِ رضی اللہ

عنهم۔ قال ثم اسلم ابو عبيدة [10] وابو سلمة [11] والارقم [12] ابن ابی الارقم و عثمان [13] مظعون وعبيدة [14] ابن الحارث وسعيد [15] ابن زيد وامرأته فاطمة [16] بنت الخطاب واسماء [17] بنت ابی بکر وعائشه [18] بنت ابی بکر وهی صغیرۃ۔

(صفحہ ۲۵۳ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ عیسی البابی الحلبی القاہرہ)

ترجمہ: اور ابن اسحٰق نے ترتیب وار ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام گنائے ہیں جو شروع ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ ابن اسحٰق نے کہا کہ (شروع کے نو لوگوں کے بعد) پھر ابو عبیدہ [10] اسلام لائے اور ابو سلمہ [11] اور ارقم [12] بن ابی الارقم اور عثمان [13] بن مظعون اور عبیدہ [14] ابن الحارث اور سعید [15] ابن زید اور ان کی بیوی فاطمہ [16] بنت الخطاب اور اسمار [17] بنت ابی بکر اور عائشہ [18] بنت ابی بکر اور وہ چھوٹی تھیں۔

یہاں ابن اسحٰق نے حضرت عثمان بن مظعون کے دونوں بھائیوں حضرت قدامہ رض اور حضرت عبداللہ رض کے نام چھوڑ دیئے ہیں ورنہ اسی ترتیب سے تمام نام بیان ہوئے ہیں۔

بعینہ یہی تفصیل امام محدث عبدالرحمٰن سہیلی نے اپنی مشہور و مستند کتاب "الروض الانف" میں بھی دی ہے۔

(دیکھیئے صفحہ ۲۳ ج ۲ مطبوعہ دارالکتب الحدیثہ لصاحبہا توفیق عفیفی)

اس فہرست میں جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا حضرت اسمار رضی اللہ عنہا کا نمبر انیس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نمبر بیس ہے۔ اور حضرت عائشہ کے بعد حضرت خباب ابن الارت رضی اللہ عنہ کا نمبر اکیس ہے۔ اب آپ دیکھیئے کہ حضرت عائشہ رض کے بعد حضرت خباب رضی اللہ عنہ کے متعلق محدثین کیا فرماتے ہیں۔

حافظ ابن حجر اپنی مشہور کتاب الاصابہ میں لکھتے ہیں کہ۔

"وہ شروع میں اسلام لے آئے تھے اور وہ مستضعفین میں سے ہیں باوردی نے بیان کیا ہے کہ وہ اسلام لائے تو چھ کے چھٹے آدمی تھے اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے اسلام لانے کو ظاہر کر دیا۔ اور اس کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کئے گئے۔ (اصابہ صفحہ ۴۱۶ ج ۱)

نیز اسد الغابہ میں ہے۔

"خباب ابن الارت سابقین اولین میں سے ہیں جو اسلام لائے اور ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اللہ کے بارہ میں سخت عذاب دیا گیا اور وہ اسلام میں چھ میں سے چھٹے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے جن لوگوں نے سب سے پہلے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا وہ یہ ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ اور خباب اور صہیب اور بلال اور عمار اور سمیہ یعنی عمار کی والدہ۔

(اسد الغابہ صفحہ ۹۸ ج ۲)

واضح رہے کہ ابن ہشام وغیرہ اور صاحب اسد الغابہ اور صاحب اصابہ کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ابن ہشام وغیرہ نے حضرت خباب ابن الارت کا نمبر اکیسواں بتایا ہے۔ اور حافظ ابن حجر اور صاحب اسد الغابہ نے حضرت خباب کا نمبر چھٹا بتایا ہے۔ لوگوں کے اسلام لانے کی صورت یہ نہیں تھی کہ لوگ ترتیب وار ایک کے بعد ایک اسلام لاتے ہوں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے مکان میں فروکش تھے اور اسلام کی تبلیغ خفیہ طور پر کی جا رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خفیہ طور پر لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچاتے اور انہیں اسلام کے لئے آمادہ کر کے آنحضرت کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ پانچ سات آدمی ایک مرتبہ پیش ہوتے۔ دو چار آدمی دوسری مرتبہ پیش ہوئے اور اسلام لے آئے ان لوگوں کے نام ترتیب سے بیان کر دیئے گئے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ دسویں نمبر پر جس کا نام بیان کیا گیا ہے اس سے پہلے نو آدمی مسلمان ہو چکے تھے۔

چنانچہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ، چاروں آدمی بیک وقت ایک ساتھ اسلام لائے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام لایا تھا۔ علماء نے اس میں تطبیق اسی طرح دی ہے کہ سب ایک ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ لہٰذا مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ لڑکوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت زیدؓ کو اولین اسلام لانے والا سمجھنا چاہیئے۔
اسی طرح حضرت خبابؓ جس جماعت کے ساتھ اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئے وہ چھٹے نمبر پر تھی۔ لیکن ان سے پہلے بیس آدمی اسلام لا چکے تھے۔ لہٰذا اسلام لانے والوں میں وہ اکیسویں آدمی ہیں لیکن ان کا نمبر چھٹا ہے۔ پانچ جماعتیں ان سے پیشتر مشرف باسلام ہو چکی تھیں۔

بہر حال اس پوری تفصیل سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ انیسویں اور بیسویں نمبر پر اسلام لائی ہیں اور قدیم الاسلام صحابیات میں سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دوؔ سال کی دودھ پیتی بچی کے اسلام لانے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ لازماً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جس وقت اسلام لائی ہیں تو اگرچہ وہ چھوٹی تھیں (جیسا کہ ابن ہشام، ابوالفداء، ابن کثیر اور امام سہیلی نے تصریح کی ہے) لیکن پانچ چھ سال کی اتنی سمجھدار بچی تھیں کہ وہ اسلام اور ایمان کو سمجھ سکیں۔

واضح رہے کہ یہ تمام حضرات جن کے نام السابقون الاولون میں ابن ہشام، ابن کثیر، اور سہیلی نے گنائے ہیں وہ بالکل ابتداءِ اسلام میں ایمان لے آئے تھے۔

محدثین اور اصحابِ سیر کی تصریح کے مطابق ۳ھ بعثت میں جب مسلمانوں کی تعداد چالیس ہوگئی (حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کا نمبر چالیسواں ہے) تو آپ کو علانیہ تبلیغِ اسلام کا حکم دے دیا گیا تھا چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ۔

"اب مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت تیار ہوگئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے حرم کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی اس لیئے دفعتہً ایک ہنگامہ برپا ہوگیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارث ابن ابی ہالہ گھر میں تھے۔ ان کو خبر ہوئی دوڑتے ہوئے آئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا۔ لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہوگئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔ (سیرت النبیؐ صفحہ ۲۱۴ ج ۱ مطبوعہ ناشرانِ قرآن لمیٹڈ اُردو بازار لاہور)

لہٰذا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن کا نمبر انیسواں یا بیسواں ہے بالکل ہی ابتدائِ اسلام میں ایمان لاچکی تھیں۔ اگر بعثتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سالِ اوّل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس قابل ہوچکی تھیں کہ اسلام لانے والوں میں ان کا شمار کیا جاسکے تو لامحالہ ان کی پیدائش بعثتِ نبوی سے پانچ چھ سال پہلے ہونی چاہیئے۔

اسی سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے متعلق ہشام ابن عبدالملک کے دربار میں کلبی نے جو بیان دیا تھا (اور جو بجائے حضرت عباسؓ کے خود حضرت فاطمہؓ کے نقطۂ نظر کے مطابق

تھا) کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں ہوا وہی صحیح ہے۔ کیونکہ تمام اصحابِ سیر اس پر متفق ہیں کہ حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ سے پانچ سال چھوٹی تھیں۔ ورنہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ دونوں ہم سِن تھیں اور دونوں میں کوئی چھوٹ بڑائی نہیں تھی۔ واللہ اعلم۔

صحیح بخاری ہی کی دوسری روایت

اسی کی تصدیق صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے دوسرے سیرت نگاروں کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی اپنی کتاب "سیرتِ عائشہ" میں ذکر فرمایا ہے۔ ہم سید صاحب کے الفاظ نقل کرتے ہیں۔

"صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا کاشانہ وہ برجِ سعادت تھا جہاں خورشیدِ اسلام کی شعاعیں سب سے پہلے پرتَو افگن ہوئیں۔ اس بنا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسلام کے ان برگزیدہ لوگوں میں ہیں جن کے کانوں نے کبھی شرک وکفر کی آواز نہیں سُنی۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے اپنے والدین کو پہچانا ان کو مسلمان پایا۔

(سیرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا ص ۸)

بخاری کی اس روایت سے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے یہ بات ثابت کرنی چاہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والدین اسلام لاچکے تھے۔ حالانکہ روایت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بخاری کی یہ روایت عروۃ بن الزبیر سے مروی ہے اور امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح کے پندرھویں پارہ کتاب الہجرت باب نکاح عائشہؓ کے زیرِ عنوان اپنی پوری طوالت کے

ساتھ نقل فرمائی ہے۔ روایت بہت طویل ہے تاہم اس کا ابتدائی حصّہ یہ ہے کہ۔

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اپنے والدین کو دینِ اسلام سے مزین پایا اور کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم روزانہ صُبح و شام ہمارے ہاں نہ آتے ہوں۔ پھر جب مسلمانوں کو ستایا جانے لگا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے ارادہ سے سرزمینِ حبشہ کی طرف چل دیئے حتّٰی کہ مقام برک الغماد تک پہنچے تو قبیلۂ قارہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا" اے ابو بکرؓ کدھر کے ارادے ہیں، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا،" مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے۔ اب زمین کی سیاحت کرنے کا ارادہ ہے تاکہ اپنے رب کی عبادت کرسکوں" ابن الدغنہ نے کہا؛" تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے۔ تم محتاجوں کی مدد کرتے ہو، رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہو، بیکسوں کی کفالت کرتے ہو، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہو اور دوسروں کے لئے حق کی راہ میں مصیبتیں اُٹھاتے ہو۔ میں تمہیں اپنی حمایت اور پناہ میں لیتا ہوں۔ چلو، واپس چلو اور اپنے گھر میں رہ کر اپنے رب کی عبادت کرو۔ چنانچہ ابو بکر صدیق ابن الدغنہ کے ساتھ واپس آگئے"..... الخ

اس روایت سے بجائے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہمارے قول کی تائید ہو رہی ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہؓ فرما رہی ہیں کہ۔

" جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اپنے والدین کو دینِ اسلام سے مزین پایا؛"

اور یہ حقیقت ہے کہ حضرت صدیقؓ سب سے پہلے اسلام لانے والوں

میں سے ہیں۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ اور ان کی بیوی حضرت ام رومانؓ جب اسلام لائے تو حضرت عائشہؓ ہوش سنبھال چکی تھیں۔ بچہ پانچ چھ سال ہی میں کچھ ہوش سنبھالتا ہے۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کی پیدائش نبوت سے پانچ چھ سال بیشتر ہو چکی تھی۔ اور اس وقت وہ اتنی ہوش مند ہو چکی تھیں کہ کفر و اسلام کے فرق کو سمجھ سکیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا روزانہ صبح و شام اپنے گھر آنا یاد رکھ سکیں۔

شاہ معین الدین ندویؒ صاحب نے اپنی مشہور کتاب "خلفائے راشدین" میں ابن سعد کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت جس میں حضرت صدیق اکبرؓ بھی شامل تھے ۵ھ نبوی کا واقعہ ہے۔ اس صورت میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا محوّلہ بالا حدیث میں اپنے شعور اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی روزانہ آمد کا جو تذکرہ فرما رہی ہیں وہ ۵ھ نبوی سے پہلے کے واقعات ہیں۔ لیکن علامہ سید سلیمان ندویؒ مرحوم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ولادت ہی ۵ھ نبوی میں قرار دی ہے۔ حیرت ہے کہ ولادت کے سال ہی صدیقِ اکبرؓ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا ہے اور علامہ نے اس حدیث کا ایک ٹکڑا اپنے موقف کی دلیل کے طور پر اپنی کتاب میں درج فرما دیا۔ بقول ان کے ایک ناقد کے یہ تو بدگمانی ہوگی اگر یہ خیال کیا جائے کہ علامہ موصوف نے پوری حدیث نہیں دیکھی اور یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ علامہ موصوف نے حدیث کا صرف ایک ٹکڑا جو انہیں اپنے مطلب کا نظر آیا لے لیا اور بقیہ کو صاف اُڑا گئے۔ اصل بات وہی ہے کہ تاریخوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مِلا کر پرکھنے کا رواج ہمارے ہاں قدیم زمانہ سے نہیں ہے۔ لہٰذا عجیب و غریب تضاد

بیانیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔

اس کے بعد طبقات ابن سعد کی اس روایت پر بھی غور فرمائیے کہ۔

آنحضرت صلعم کے ساتھ نکاح ہونے سے پہلے حضرت عائشہ رض کی منگنی ہو چکی تھی۔

"ہمیں ہشام ابن محمد ابن السائب کلبی نے اپنے والد سے خبر دی، انہوں نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رض کو عائشہ رض کا پیغام دیا تو ابو بکر رض نے کہا کہ اے رسول اللہ میں عائشہ کے متعلق مطعم بن عدی بن نوفل ابن مناف سے اس کے بیٹے جبیر کے لئے وعدہ یا تذکرہ کر چکا ہوں۔ مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں عائشہ رض کو ان سے لے لوں چنانچہ آپ نے مہلت دے دی پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کر لیا اور وہ کنواری تھیں۔ (طبقات ابن سعد ص $\frac{۳۹}{۸۲}$)

مؤرخ طبری نے اس بات کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قریش کی ایذاء رسانیوں کے بعد صدیق اکبر رض کے اس ارادہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ عائشہ رض کو ان کی سسرال کے حوالہ کر کے وہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ کہتے ہیں۔

ابو بکر مطعم کے پاس گئے۔ ان کی بیوی بھی وہاں موجود تھی جس کے بیٹے (جبیر ابن مطعم) کے لئے عائشہ کو مانگا گیا تھا۔ اس بڑھیا نے ابو بکر رض سے کہا کہ اگر ہم اپنے بیٹے کی شادی تمہاری لڑکی سے کر لیں تو تم غالباً اسے بھی صابی (مسلمان) بنا لوگے اور جس مذہب کو تم نے اختیار کیا ہے اس میں اسے

بھی شامل کر لوگے۔ ابو بکرؓ نے مطعم سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں؟" مطعم نے کہا۔ "وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ بیشک ہمیں بھی یہ اندیشہ ہے۔" یہ سن کر ابو بکرؓ ان کے یہاں سے نکل آئے۔ (طبری صفحہ ۴۹۳ ج ۱)

اس طرح یہ برسوں پرانی منگنی ٹوٹ گئی اور پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہؓ کا نکاح ہو سکا۔ واضح رہے کہ یہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی ہجرتِ حبشہ سے پہلے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہجرتِ حبشہ کے لئے ابو بکر صدیقؓ کے نکلنے سے پہلے حضرت عائشہ کی منگنی جبیر ابن مطعم سے ہو کر ٹوٹ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ منگنی ہجرتِ حبشہ کے لئے روانہ ہونے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اور منگنی بہر حال سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد ہی ہوئی ہوگی۔

عربوں میں منگنی کے دستور کے متعلق ہم علامہ بدر الدین عینیؒ کی شرح بخاری اور بلوغ الارب نیز تاریخ العرب قبل الاسلام کے حوالہ سے پہلے بتا چکے ہیں کہ عرب میں منگنیاں جوان لڑکوں اور جوان لڑکیوں کی ہوا کرتی تھیں۔ یہی وہاں کا دستور تھا۔ ابو بکر صدیقؓ حبشہ کی طرف ہجرت کے ارادہ سے ۵ھ نبوی میں روانہ ہوئے ہیں۔ یعنی ۵ھ نبوی میں حضرت عائشہؓ اس قابل ہو چکی تھیں کہ باپ یہ ارادہ کرے کہ لڑکی کو سسرال رخصت کر کے میں خود حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤں۔

حالانکہ مولانا سید سلیمان ندوی حضرت عائشہؓ کی پیدائش ہی ۵ھ نبوی کی بتا رہے ہیں۔ لہٰذا حضرت مولانا ندوی مرحوم غالباً اس کے قائل ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی یہ منگنی ان کی پیدائش سے پہلے ہی یا فوراً بعد ہو گئی تھی۔ اور سالِ پیدائش ہی میں حضرت ابو بکرؓ ان کی رخصتی کے لئے بھی

تیار تھے یاللعجب!

دوسرے مؤرخین کی تائیدات

انہی حقائق کی بنا پر مشہور مصری مؤرخ عباس محمود العقاد نے اپنی تالیف "سیرتِ عائشہؓ" میں حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت کم از کم چودہ پندرہ سال لکھی ہے۔ اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے مولانا رازق الخیری دہلوی نے بھی ازواجِ مطہرات کے سوانح پر مشتمل کتاب "مسلمانوں کی مائیں" (شائع کردہ عصمت بکڈپو کراچی) میں سیدہ صدیقہؓ کی عمر بوقتِ نکاح پندرہ سولہ سال بیان کی ہے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی اپنی تاریخِ اسلام (حصہ اول طبع پنجم معارف پریس اعظم گڑھ) میں لکھتے ہیں کہ۔

انہوں نے (حضرت عائشہؓ نے) نو سال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں گزارے۔ آپ کی وفات کے بعد پنتالیس ۴۵ سال زندہ رہیں اور ۵۷ھ میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی (ص ۱۲۲ سطر ۷ تا ۹) اس بیان کے مطابق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ کی عمر اکیس سال تھی اور نو سال کاشانۂ نبوی میں رہیں۔ تو ثابت ہوا کہ رخصتی کے وقت آپ کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ اگرچہ شاہ معین الدین صاحب کا بیان ہماری بیان کردہ عمر کی تائید میں نہیں ہے۔ لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ وہ بھی حضرت عائشہ کے متعلق بخاری کی اس حدیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جس میں رخصتی کے وقت حضرت عائشہؓ کی

عمر نو سال بتائی گئی ہے ۔ وہوالمراد۔

آخر میں نسائی کی ایک روایت کا حوالہ بھی دے دیا جائے تو شاید کچھ سود مند ہو۔ نسائی میں ہے کہ حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی خواستگاری کی تھی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تمہاری اور فاطمہؓ کی عمروں میں بڑا تفاوت ہے۔ واضح رہے کہ سیدہ فاطمہ کی عمر اس وقت ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے پچیس سال کی عمر کی بیٹی باون یا چالیس سال کی عمر کے اصحاب کے نکاح میں دینے سے انکار فرمایا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ تمہاری اور فاطمہؓ کی عمر میں بڑا تفاوت ہے۔ اس کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ دوسری طرف یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بچپن سال کی عمر میں نو سال کی ایک لڑکی کو کاشانۂ نبوت میں لے آئے۔

گو ہمارے نزدیک نسائی کی یہ روایت بھی غلط ہے، اور صحیح بات جو سنی شیعہ دونوں کتب سے ثابت ہے (اس کی تفصیل کے لئے دیکھیئے مولانا نافع صاحب کی کتاب رحماء بینہم جلد اوّل) یہ ہے کہ حضرات شیخینؓ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو تحریک کر کے اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے فاطمہؓ کے لئے خواستگاری کریں کیونکہ انہیں یہ بات عرض کرنے کی خود ہمت نہیں ہو رہی تھی اور وہ اپنی حالت سے خوب واقف تھے وہ جانتے تھے کہ میرے مالی حالات ایسے نہیں ہیں اور میں فاطمہؓ سے خواستگاری کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ لہٰذا حضرات شیخینؓ نے اپنے لئے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے لئے خواستگاری فرمائی تھی۔

صحیح بخاری کی ایک تیسری روایت

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ یہ روایت کہ حضرت عائشہؓ کا جب نکاح ہوا تو وہ چھ سال کی تھیں اور ان کی رخصتی ہوئی تو وہ نو سال کی تھیں۔ صحیح بخاری میں آگئی ہے۔ لیکن اسی بخاری میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں جب (سورۃ القمر کی آیات) بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔ نازل ہوئیں تو میں بچی تھی اور کھیلتی پھرتی تھی۔

(ملاحظہ ہو بخاری صـ۷۲۲ ج۲)

سورۃ القمر واقعۂ شق القمر کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی اور شق القمر کا واقعہ قریب پانچ سال ہجرت سے قبل کا ہے۔ علامہ قسطلانی شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ۔

"بخاری کی ان پانچوں حدیثوں کا مدار، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ اور انسؓ پر ہے۔ جہاں تک ابن مسعودؓ کی حدیث کا تعلق ہے تو ان سے اس کی تصریح موجود ہے کہ وہ اس واقعہ میں حاضر تھے۔ کیونکہ انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے اور آپ نے فرمایا تھا کہ "گواہ رہو۔ گواہ رہو"۔ لیکن انسؓ اس واقعہ میں موجود نہیں تھے کیونکہ وہ چار پانچ سال کے ہوں گے۔ انشقاقِ قمر کا واقعہ مکہ میں ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے ہوا تھا۔ لیکن ابن عباسؓ تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے صحابہ کی جماعت سے یہ روایت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو بخاری کا حاشیہ صـ۷۲۲ ج۲)

تقریباً تمام محدثین و مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ شق القمر کا واقعہ پانچ سال قبل ہجرت کا ہے۔ اگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ۲ھ میں نو سال کی تھیں تو انہیں ہجرت سے پانچ سال پہلے صرف دو سال کی بچی ہونا چاہیئے۔ دو سال کی بچی میں نہ یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی کو سمجھ سکے اور یاد رکھ سکے اور نہ وہ ایسی بچی ہو سکتی ہے کہ کھیلتی پھرتی ہو لامحالہ انہیں چھ سات سال کی بچی ہونی چاہیئے۔ تو اگر وہ شادی سے سات سال پہلے چھ سال کی تھیں تو شادی کے وقت انہیں لامحالہ تیرہ یا چودہ سال کی ہونا چاہیئے۔ یہ دونوں روایتیں بخاری شریف ہی کی ہیں۔ ان میں سے آپ جس روایت کو چاہیں قبول فرمالیں اور جسے چاہیں رد فرما دیں۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ

فقہ القرآن جلد اول میں "نابالغ کا نکاح" کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے میں نے سورۂ نساء کی یہ آیت پیش کی تھی۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (۴/۶)

ترجمہ:- اور یتیموں کی حالت پر نظر رکھتے ہوئے انہیں آزماتے رہو (کہ ان کی سمجھ بوجھ کا کیا حال ہے) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر ان میں صلاحیت پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔

(ترجمان القرآن از مولانا آزاد)

نیز وہاں میں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بھی پیش کر دیا تھا۔ جو یہ ہے:-

"اور یتیموں کو آزما لیا کرو۔ یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر

ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو تو ان کے اموال ان کے حوالہ کر دو۔

(فقہ القرآن صہ ۵۲۶/۱۲)

اس کے بعد میں نے قاضی ابن شبرمہ اور مشہور فقیہہ ابو بکر الاصم کے فتاوی بھی نقل کر دیئے تھے۔ چنانچہ میں نے لکھا تھا کہ۔

قاضی ابن شبرمہؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے ہم عصر ہیں اور عظیم ترین شخصیت ہیں۔ کبار فقہاء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کی عمر ۱۸ سال اور ۱۶ سال مقرر فرمائی تھی۔ آج سے چند سال پہلے علمائے مصر نے ان کے فتوی کو جدید شرعی قوانین میں مدوّن کرایا تھا۔ (تفصیل کے لئے دیکھیئے القضا فی الاسلام صہ ۷۶ بحوالہ امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی)

قاضی ابن شبرمہؒ نے اسی مذکورہ بالا آیت۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ۔

سے استدلال فرمایا تھا۔ چنانچہ علامہ شمس الائمہ سرخسیؒ اپنی مشہور کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں۔

یقول ابن شبرمۃ وابو بکر الاصم انہ لا یتزوج الصغیر والصغیرۃ حتی یبلغا لقولہ تعالیٰ حتی اذا بلغوا النکاح فلو جاز التزویج قبل البلوغ لم یکن لھذا فائدۃ۔ (کتاب المبسوط صہ ۱۹۳/۴ مطبوعہ مصر)

یعنی اگر بلوغت سے پہلے نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کا نکاح جائز ہوتا تو قرآن کریم میں حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کے لفظ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلف میں سے قاضی ابن شبرمہؒ اور ابو بکر الاصم جیسے اکابر فقہاء گذر چکے ہیں جو نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کے

نکاح کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اور چونکہ فقہاء کے طبقہ میں یہ دونوں حضرات، حضرت امام ابو حنیفہؒ کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان حضرات تک حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت نہیں پہنچی تھی۔ کیونکہ اس عصر کے تمام فقہاء تک یہ حدیث پہنچ چکی تھی اور اسی حدیث کی بنا پر ان حضرات نے نابالغوں کے نکاح کی اجازت دی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قاضی ابن شبرمہؒ اور ابو بکر الاصم نے اس حدیثِ عائشہؓ کو تسلیم نہیں فرمایا اور وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

شیخ الاسلام امام احمد بن علی رازی جصاصؒ نے جو فقہائے حنفیہ میں سے ہیں اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں قاضی ابن شبرمہؒ اور ابو بکر الاصم کا یہی قول نقل کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

عن ابن شبرمۃ ان تزویج الآباء علی الصغار لایجوز وھو مذھب الاصم۔ (احکام القرآن ص۴۶ ج۲)

ترجمہ: یعنی ابن شبرمہ سے نقل ہے کہ نابالغوں کا نکاح اگر ان کے آبا کر دیں تو وہ جائز نہیں ہوتا۔ اور ابو بکر الاصم کا مذہب بھی یہی ہے۔

(فقہ القرآن ص۵۲۰-۵۲۱ ج۱)

فقہ القرآن میں دی گئی یہ تمام تفصیلات اس سے قبل بھی میرے بعض مضامین میں بیان ہو چکی تھیں۔ جس کے معارضے میں ایک فاضل

رقمطراز ہیں کہ :-

"مگر یہ استدلال مندرجہ ذیل دلائل کی وجہ سے بہت کمزور ہے۔ اس لئے کہ آیت میں "نکاح" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے لغت اور اہل عرب کے روزمرہ میں دو معنے آتے ہیں۔ اس کے اصل معنے "مباشرت" کے ہیں۔ اور بعد میں "عقد نکاح" (بیاہ) کو بھی کہا جانے لگا ہے۔ عربی لغت کے مشہور، مستند اور مسلم امام علامہ اَزہریؒ فرماتے ہیں۔

"عربی زبان میں نکاح کے اصلی معنی جماع کے ہیں اور بیاہ کو نکاح اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ وہ جائز مباشرت کا سبب ہوتا ہے۔" (لسان العرب)

اور لغت کے دوسرے بڑے اور مشہور عالم جوہریؒ فرماتے ہیں۔

"نکاح جماع کو کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ لفظ عقد نکاح کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (لسان العرب ص۶۲۵ ج۲)

قرآن کریم میں بھی یہ لفظ اس معنے میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ (نساء)

ترجمہ:- تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادے مباشرت کر چکے ہوں۔

اس آیت میں "نکح" سے مراد باتفاق مباشرت کرنا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ "اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ" اس آیت میں بھی بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد مباشرت ہے۔ (لسان العرب) اگر ان آیات کی طرح مذکورہ آیت میں حتی اذا بلغوا النکاح میں بھی "نکاح" سے مراد

مباشرت لی جائے تو آیت کے معنے یہ ہو جائیں گے۔کہ یہاں تک کہ وہ لڑکے مباشرت کی قابلیت کو پہنچ جائیں۔ اور ان میں کچھ سوجھ بوجھ بھی پیدا ہو جائے تو انہیں ان کے مال سپرد کر دو۔ اس صورت میں اس آیت سے اس بات پر کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا کہ بلوغ نکاح کی عمر ہے۔زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ اس آیت میں "النکاح" سے مراد مباشرت ہے بیاہ نہیں۔...............

ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ بقول امام اَزہری وجوہری نکاح کے اصلی معنے تو "مباشرت" ہی ہیں اس لئے اس اصلی معنیٰ کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک کہ دوسرے معنے (بیاہ) مراد لینے پر کوئی مجبوری نہ ہو۔ یہاں نہ صرف یہ کہ دوسرے معنے لینے پر کوئی مجبوری نہیں بلکہ دوسرے معنے سے ایسی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے جو قرآن کا منشا نہیں اور قرآن وحدیث کی دوسری تصریحات اس کی تردید کرتی ہیں۔اس لئے بھی اس آیت میں "نکاح" سے مراد مباشرت ہی ہونا چاہیئے۔ان ناقابلِ انکار وجوہ سے ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد مباشرت ہی ہے۔

(ہمارے عائلی مسائل ص۲۱۹-۲۲۳ شائع کردہ: دارالاشاعت کراچی)

دین کے اصطلاحی الفاظ کے معانی لغت سے متعین کرنا۔

میں "فقہ القرآن" جلد اول میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ دینی اصطلاحات کے معانی لغت سے متعین کرنا انتہائی جہالت ہے۔ میں نے وہاں لکھا تھا کہ

"واضح رہے کہ ہر فن کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں اور اس فن میں ہر لفظ کے اپنے اصطلاحی معنیٰ ہی مراد ہوتے ہیں۔کسی فن کی عبارت کو لغت کے

بنیادی معنوں سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی فن کی بنیادی اصطلاحات کے معانی لغت سے متعین کئے جانے لگیں تو فن کا بیڑا ہی غرق ہو جائے گا۔ ہر مذہب، مسلک اور دین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مخصوص مفاہیم کے لئے کچھ بنیادی اصطلاحات وضع کرے۔ ان اصطلاحات کے مفہوم وہی ہوں گے جو اس دین یا مسلک و مذہب نے متعین کر دیئے ہیں۔ وہاں لغت کو ٹھونسنے کی کوشش کرنا جہالت ہی نہیں بلکہ بہت بڑی حماقت بھی ہے۔ علم حدیث، علم فقہ، اصول حدیث، اصول فقہ، تفسیر وغیرہ علوم کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں۔ اور ہر علم میں اس کی اصطلاحات کے معانی وہی ہوں گے جو اس علم کے علماء نے متعین کر دیئے ہیں۔ یہی حال دنیوی علوم کا بھی ہے۔ کیمسٹری، فزکس، بایولوجی، بوٹنی وغیرہ علوم کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں۔ اور ان اصطلاحات کے معانی وہی ہو سکتے ہیں جو اس فن کے علمائے نے وضع کر دیئے ہیں۔ انہیں لغت سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال اسلام کا بھی ہے۔ اسلام کی بھی اپنی اصطلاحات ہیں اور جب وہ اصطلاحات بولی جائیں گی تو ان کے وہی معانی و مفاہیم ہوں گے جو خود اسلام نے متعین کر دیئے ہیں۔ انہیں ہم لغت کے بنیادی معنوں سے متعین نہیں کر سکتے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صوم، نکاح طلاق کے وہی معانی اور مفہوم ہوں گے جو اسلام نے ان کے لئے متعین کئے ہیں۔ اس کے لئے ہم لغت کی موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ ہماری کھلی ہوئی جہالت ہوگی۔" (رفعۃ القرآن صفحہ ۱۴۳-۱۴۴ ج ۱)

"نکاح" بھی دین اسلام کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کے ہر جگہ وہی معنے ہوں گے۔ جو اسلام نے اس کے لئے متعین کئے ہیں۔ اسے لغت کی رو سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دینی اصطلاحات کے مفہوم لغت سے متعین

کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔ "صلوٰۃ" کے معنے لغت میں کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ "ذکوٰۃ" کے معنے نشوونما دینے کے ہیں۔ "صوم" کے معنے رکنے اور باز رہنے کے ہیں۔ "حج" کے معنے ارادہ کرنے کے ہیں۔ ان الفاظ کے مفہوم لغت سے متعین کیجئے اور پورے اسلام کا بیڑا غرق کر دیجئے۔

لفظ نکاح قرآن میں

نکاح کا لفظ اور اس سے مشتقات قرآن کریم میں بائیس جگہ آئے ہیں۔ اس کے معنے ہر جگہ عقد نکاح کے ہیں۔ مجامعت یا وطی کے معنے ایک جگہ بھی نہیں ہیں۔

① جن عورتوں سے تمہارے آباؤ اجداد نے نکاح کر لیا ہو تم ان سے نکاح نہ کرو۔ (۴/۲۲)

② جب تم مؤمن عورتوں سے نکاح کر لو پھر انہیں ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدو تو ان پر تمہارے لئے کوئی عدت نہیں۔ (۳۳/۴۹)

③ پھر اگر اس نے تیسری مرتبہ طلاق دے دی تو وہ اس کے بعد حلال نہیں ہوگی جب تک وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے۔ (۲/۲۳۰)

④ اور مشرک عورتوں سے جبتک وہ ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو۔ (۲/۲۲۱)

⑤ تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا دو اور اس کی بیویوں سے اس کے بعد کبھی نکاح نہ کرو۔ (۳۳/۵۳)

⑥ ان یتیم عورتوں کے بارے میں جنہیں تم مقررہ مہر نہیں دیتے اور ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو کتاب اللہ کا حکم یہ ہے۔ (۴/۱۲۷)

⑦ تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ہجرت کرکے آنے والی عورتوں سے مہر دے کر نکاح کرلو۔ (۶۰/۱۰)

⑧ جسے پاکدامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو وہ کنیز سے نکاح کرلے۔ (۴/۲۵)

⑨ زناکار مرد سوائے زناکار عورت یا مشرک عورت کے کسی سے نکاح نہیں کرسکتا۔ (۲۴/۳)

⑩ تم انہیں اپنے پرانے شوہروں سے دوبارہ نکاح کرنے سے منع نہ کرو جب وہ حسب دستور باہم راضی ہوں۔ (۲/۲۳۲)

⑪ بدکار عورت سے بجز زناکار مرد اور مشرک کے کوئی نکاح نہ کرے۔ (۲۴/۳)

⑫ بیوہ اور یتیم عورتوں میں سے جو تمہارے لئے حلال ہوں ان سے دو دو تین تین چار چار کی تعداد میں نکاح کرلو۔ (۴/۳)

⑬ کنیزوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو۔ (۴/۲۵)

⑭ میں چاہتا ہوں کہ دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا تم سے نکاح کردوں۔ (۲۸/۲۷)

⑮ مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اپنی عورتوں کا نکاح نہ کراؤ۔ (۲/۲۲۱)

⑯ اور اپنے میں سے بیوہ عورتوں اور رنڈوے مردوں کا نکاح کرادو۔ (۲۴/۳۲)

⑰ کوئی مومن عورت اگر اپنا نفس نبی کو ہبہ کرنا چاہے اور نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ (۳۳/۵۰)

⑱ جبتک عدت کی مدت پوری نہ ہوجائے تم عقد نکاح کا ارادہ نہ کرو۔ (۲/۲۳۵)

⑲ بجز اس کے کہ بیویاں خود معاف کردیں یا وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن ہو۔ (۲/۲۳۷)

(۲۰) اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو حتیٰ کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ (۴/۶)

(۲۱) جو نکاح کی استطاعت نہ رکھیں وہ عفت شعاری کی زندگی بسر کریں تاآنکہ انہیں خدا اپنے فضل سے غنی کر دے۔ (۲۴/۳۳)

(۲۲) اور خانہ نشین عورتیں جو نکاح کی توقع نہیں رکھتیں ان پر کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ زیب و زینت کا اظہار نہ کرتے ہوئے اپنے اوپر کے کپڑے (برقعہ یا چادر) اتار دیں۔ (۲۴/۶۰)

آیت نمبر (۲۴/۲۲) میں نکاح کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔ اس طرح کل تیئیس مرتبہ قرآن کریم میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کے معنے عقد نکاح کے ہیں۔ مجامعت کے معنے کہیں بھی نہیں ہیں۔ اگر نِکَاحٌ کے معنے مجامعت اور وطی کے ہیں اور یہی اس کے اصل معنے ہیں تو اسلام کے سارے اخلاقی ضوابط اور جنسی پابندیاں ختم ہو کر رہ جائیں گی اور اسلامی معاشرہ اس اباحیت اور فوضویت سے دوچار ہو جائے گا کہ مغرب کی عیش پرستیاں اور آوارگیاں بھی ان کے سامنے ماند پڑ جائیں گی۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں جگہ "نکاح" کے معنے مجامعت کے ہیں اور فلاں جگہ عقد نکاح کے جبکہ آپ تسلیم فرما چکے ہیں کہ نِکَاحٌ کے حقیقی معنے مجامعت کے ہیں اور اس اصلی معنی کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک کہ دوسرے معنے دیا(ہ) مراد لینے پر کوئی مجبوری نہ ہو۔ اس طرح تو آپ لوگوں کو حرام کاری کی کھلی چھٹی دے دیں گے۔ لوگ کہیں گے کہ قرآن کریم نے تو اجازت دی ہے کہ اگر تمہارے معاشرہ میں یتیم اور بیوہ عورتوں کے مسائل درپیش ہوں اور ان کے ساتھ (جنسی معاملات میں) عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ ہونے

کا اندیشہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ تم دو دو تین تین چار چار عورتوں سے منہہ کالا کر لیا کرو۔ (۴/۳)

بیوی کو تین مرتبہ طلاق دیدی ہو تو وہ کسی غیر مرد کا پہلو گرم کر کے آجائے تو اسے پھر گھر میں ڈال لو۔ (۲/۲۳۰)

جن بیوہ عورتوں کو تم مہر دینا نہیں چاہتے اور تمہیں ان سے مقاربت کرنے کی خواہش ہے۔ ان کے بارہ میں اور کمزور بچوں کے بارہ میں خدا کی کتاب تمہیں فتویٰ دیتی ہے کہ یتیموں کے ساتھ تمہیں (تمام معاملات میں خواہ وہ جنسی ہوں یا غیر جنسی) انصاف کا سلوک ہی کرنا چاہئیے۔ (۴/۱۲۷)

ہجرت کر کے آنے والی عورتوں سے مقاربت کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں جبکہ تم نے انہیں اس کی کچھ اُجرت دے دی ہو۔ (۶۰/۱۰) وغیر ذالک۔

غور تو فرمائیے کہ اس طرح آپ عفت باختگی اور عصمت فروشی کی تعلیم دے کر مسلمان معاشرہ کو کہاں لیجانا چاہتے ہیں؟

طفلانہ اعتراض

لفظ نکاح ہی کے سلسلہ میں تعدد ازدواج کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔

"واضح رہے کہ انصاف کا سلوک کرنے کا حکم تمام یتیموں کے لئے ہے۔ اس میں نابالغ بچے بھی شامل ہیں۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اس میں جوان بن باپ کی لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ اس میں بیوہ عورتیں بھی شامل ہیں جن کے شوہر مر گئے ہیں یا ان کو طلاق ہو گئی ہے۔ ان سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کرنے کا حکم ہے۔ ان کی خبر گیری، حفاظت، کفالت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں ہو سکے گا تو اس کا حل یہ تجویز فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جو شادی کے قابل عورتیں ہوں یعنی

جوان بن باپ کی لڑکیاں ہوں یا بیوہ عورتیں ہوں، ان سے دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کر لیا جائے۔ (ماؤں کے ساتھ بچوں کی پرورش بھی ہو جائے گی) چونکہ یتامیٰ میں نابالغ لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل تھیں اور ان سے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے نکاح کے سلسلہ میں مِنھُنَّ یا مِنَ الیَتَامیٰ (ان سے یا یتیموں سے) نہیں فرمایا گیا بلکہ مِنَ النِّسَاءِ کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ نیز چونکہ یہ عورتیں وہی ہیں جو الیتٰمیٰ میں شامل تھیں۔ ان سے الگ عورتیں نہیں ہیں اس لئے مِنَ النِّسَاءِ فرمایا گیا ہے۔ مِنْ نِسَاءٍ نہیں فرمایا گیا۔ النساء پر الف لام تعریف کا ہے۔ کیونکہ یہ عورتیں متعین ہیں اور الیتمیٰ کے ذیل میں ان کا ذکر آچکا ہے۔ اگر یہاں یتامیٰ کے علاوہ کچھ دوسری عورتیں مراد ہوتیں تو مِنْ نِسَاءٍ غیرھن، مِنْ نِسَاءٍ سواھن یا مِنْ نساءٍ اُخریٰ فرمایا جاتا۔ اگر یہ کچھ نہیں فرمایا گیا تھا تو کم از کم بغیر الف لام کے مِنْ نِسَاءٍ تو کہا جاتا اور ان عورتوں کو غیر متعین چھوڑ دیا جاتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کیا گیا بلکہ الف لام لگا کر تصریح کر دی گئی کہ یہ خاص اور متعین عورتیں ہیں اور ان کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔"

(فقہ القرآن ص ۴۹۹-۵۰۰ ج 1)

یہی ساری بحث تفصیل کے ساتھ میں ماہنامہ "فکر و نظر" اسلام آباد میں اس سے پہلے بھی عرصہ ہوا لکھ چکا ہوں۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس پوری تشریح میں کوئی ابہام یا اغلاق نہیں تھا۔ مگر ہمارے ایک فاضل عزیز نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

" مذکورہ ترجمہ ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تفسیر کے مطابق

کیا ہے۔ یہ حضرات آیت کا مطلب اس کے بالکل برخلاف وہ بیان کرتے ہیں جو نہ عقل کے لحاظ سے درست ہے نہ کوئی شخص جسے عربی صَرف و نحو اور اصولِ بلاغت سے مناسبت ہو ایسا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ مطلب تمام صحابہ، تابعین، علمائے اُمت کی تفسیروں کے بھی بالکل خلاف ہے اجتہادات اس تفسیر کے خلاف اس قدر ہیں کہ ان کا شمار بھی شاید مشکل ہو۔ چنانچہ آیت کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں۔

"اور اگر تمہیں اس بات کا احتمال ہو کہ تم جوان یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو مذکورہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں نکاح کرلو، دو دو عورتوں سے، تین تین سے اور چار چار سے۔"

اس ترجمہ میں اوّل تو قرآن کریم کے لفظ "اَلْیَتَامیٰ" کے ساتھ یہ ظلم فرمایا کہ اس سے صرف "جوان یتیم لڑکیاں" اور "بیوہ عورتیں" مراد لیں پھر دوسرا ستم یہ کہ آگے "اَلنِّسَآءِ" سے مراد وہی "مذکورہ عورتیں" لیں یعنی یتیم اور بیوہ عورتیں۔

پھر ذرا آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

"لیکن اوّل تو اپنی اس "دماغی اُپج" کا دار و مدار انہوں نے اس بات پر رکھا ہے کہ آیت میں "اَلْیَتَامیٰ" اور "اَلنِّسَآءَ" سے مراد ایک ہی عورتیں ہیں۔ حالانکہ یہ قرآن کریم پر ایسا صریح اتّہام ہے جسے اگر درست مان لیا جائے تو معاذ اللہ یہ لازم آئے گا کہ قرآن کریم کی آیت فصاحت و بلاغت کے معیار سے گر گئی ہے۔ کیونکہ اگر "النساء" سے مراد وہی "یتامیٰ" عورتیں ہیں تو یقیناً یوں کہا جاتا کہ۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِنْهُنَّ۔

ترجمہ :۔ اگر تمہیں یتیم عورتوں کی حق تلفی کا خوف ہو تو ان میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو۔

یعنی "النسآء" کا لفظ ذکر کرنے کی بجائے "یتَامیٰ" کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی۔ اگر ان کی بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو جب ان عورتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے تو اب یہاں صراحۃً ان کا ذکر نہ ہونا چاہیئے تھا بلکہ یہ ضمیر کا مقام تھا اور بلاغت کا مسلّمہ اصول ہے کہ ضمیر کی جگہ اسمِ ظاہر ذکر کرنا خلافِ فصاحت ہے۔" (ہمارے عائلی مسائل ص۱۲۶-۱۲۸)

فاضل موصوف نے اپنے عقل و شعور اور عربی صَرف و نحو اور اصولِ بلاغت سے مناسبت کے ادّعا کے ساتھ جو مغالطہ دینے کی کوشش فرمائی ہے ـــــــــــــــــــــــــ میں اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجا است

میں نے پوری تفصیل کے ساتھ جو بحث کی تھی فاضل موصوف اسے تو اُڑا گئے اور آخری جملوں کو نقل فرما کر اس پر اپنے اعتراض کی عمارت اُٹھانی شروع کر دی۔ فاضل موصوف کو لفظ "یتَامیٰ" کے معنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے جو میں نے شیخ الاسلام امام ابو بکر جصاص رازی سے نقل کئے تھے۔ اِذا فات الشرط فات المشروط کے اصول پر اعتراض نہیں ہے۔ کہ ان دونوں باتوں کا وہ انکار نہیں کر سکتے۔ مگر ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ۔

" اس میں نابالغ بچے بھی شامل ہیں۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی ان میں

جوان بن باپ کی لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ اس میں بیوہ عورتیں بھی شامل ہیں جن کے شوہر مرگئے ہوں یا جن کو طلاق ہوگئی ہو۔ ان سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کرنے کا حکم ہے۔"........

آگے چل کر پھر دوبارہ کہہ دیا تھا کہ۔

"یَتَامٰی کے مفہوم میں نابالغ لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل ہیں اور ان سے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لئے نکاح کے سلسلہ میں مِنْھُنَّ یا مِنَ الْیَتَامٰی (ان سے یا یتیموں سے) نہیں فرمایا گیا بلکہ مِنَ النِّسَآءِ کا لفظ استعمال فرمایا گیا۔ نیز چونکہ یہ عورتیں وہی ہیں جو "الیتمیٰ" میں شامل تھیں ان سے الگ عورتیں نہیں ہیں۔ اِس لئے "مِنَ النِّسَآءِ" فرمایا گیا "مِنْ نِسَاءٍ" نہیں کہا گیا۔ "النِّسَاءِ" پر الف ولام تعریف کا ہے۔ کیونکہ یہ عورتیں متعین ہیں۔ اور "الیتمیٰ" کے ذیل میں ان کا ذکر آچکا ہے"۔ الخ

یہ ساری باتیں چونکہ ناقابلِ تردید تھیں اس لئے فاضل موصوف ان سب کو ہضم فرما گئے۔

مِنْھُنَّ کیوں نہیں

مجھے عرض کرنے دیجئے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں النساء کی تصریح اس لئے ضروری سمجھی اور مِنْھُنَّ کا استعمال نہیں فرمایا کہ وہ عالم الغیب والشہادہ ہے اسے معلوم تھا کہ ایسے ایسے فضلاء بھی پیدا ہوں گے جو مِنْھُنَّ کی صورت میں اس سے صغر سنی کی شادیوں کا جواز نکالتے اور نکاح کے معنے مقاربت کے کرکے لواطت جیسے شنیع فعل کا جواز بھی قرآن سے نکال لیں گے۔ کیونکہ منھن کی ضمیر یتامیٰ کی طرف لوٹتی اور اس میں کمسن لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل ہوتیں اور کمسن لڑکوں کے ساتھ مقاربت (لواطت) کا جواز اس سے نکال لیا جاتا۔ نیز کمسن

لڑکیوں کے ساتھ بھی مقاربت کو جائز کر لیا جاتا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ،
مِنْهُنَّ کے بجائے مِنَ النِّسَآءِ فرما دیا کہ نکاح یا مقاربت صرف ان سے کی جا سکتی
ہے جو عورتوں (النساء) کا مصداق ہو سکیں۔ ہر نابالغ لڑکی اور نابالغ
لڑکے کے ساتھ لوگ اپنا منہ کالا نہ کرنے لگیں۔ اس پر اگر کج ذہن
لوگوں کو ناگواری ہوتی ہے تو بڑی حد تک قابلِ فہم ہے۔

اَلّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ کے متعلق

فقہ القرآن ص ۵۳۲-۵۳۵ میں آیت نمبر (۶۵/۴) پر میں تفصیل
سے بحث کر چکا ہوں، اسے دوبارہ ملاحظہ فرما لیں۔ نیز کتاب الطلاق،
باب العدت میں مزید بحث آ رہی ہے اسے بھی دیکھ لیں۔ ہماری یہی بحث
جب ایک رسالہ میں شائع ہوئی تھی تو اس کے معارضہ میں بھی ہمارے
فاضل عزیز نے گوہر افشانی ضروری سمجھی تھی، اسی کا جائزہ اس وقت ہم
لے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"پھر ستم بالائے ستم یہ کہ انہیں اپنی عربی دانی پر اس قدر ناز ہے کہ
مذکورہ آیت میں تحریف کرتے ہوئے بغیر جھجک فرماتے ہیں کہ۔
لَمْ یَحِضْنَ میں شدت زیادہ ہے۔ یہ لفظ اس وقت استعمال
ہو گا جب مقابلہ میں کوئی شخص اس کا دعویٰ کر رہا ہو کہ حیض
آگیا ہے یا کم از کم اقتضائے حال کا یہ تقاضا ہو کہ انہیں حیض
آگیا ہو۔ اس دعوے کے مقابلہ میں لَمْ یَحِضْنَ (انکار وجحود)
بولا جائے گا۔ جو لڑکیاں بالغ ہو چکی ہیں وہاں اقتضائے حال کا
تقاضا بلکہ ادّعا یہ ہوتا ہے کہ انہیں ماہواری آتی ہے۔ اس
اِدّعا کی تردید مَا حِضْنَ کے لفظ سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے

انکار وجحود کے لئے لَمۡ یَحِضۡنَ کہنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس جو لڑکیاں کمسن اور نابالغ ہیں۔ ان کے سلسلہ میں نہ یہ دعویٰ موجود ہے کہ انہیں ماہواری آتی ہے اور نہ ہی اقتضائے حال کا تقاضا یا ادّعاء ہے۔ لہٰذا وہاں لَمۡ یَحِضۡنَ کہنا اصولی طور پر غلط اور خلافِ فصاحت ہے۔"

(ہمارے عائلی مسائل ص۲۴۷)

فاضل موصوف کو اس کے انکار کی جرأت نہیں ہو سکی کہ لم کے ساتھ جو نفی ہوتی ہے اسے جحود وانکار کی نفی کہا جاتا ہے اور اس میں ما اور لا کے مقابلہ میں زیادہ شدّت ہوتی ہے۔ انکار وجحود ظاہر ہے کہ کسی دعوے یا اقتضائے حال کے خلاف ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو کچھ اصولی بات کہی گئی تھی اس سے تو انکار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ایک میزان الصرف پڑھنے والا مبتدی بھی جانتا ہے کہ "نفیِ جحدِ بلم" کسے کہتے ہیں۔ لہٰذا بداہت کا انکار تو اپنی جہالت اور ناواقفیت کا ثبوت بہم پہنچانا ہونا۔ اس لئے اُصول اور قاعدہ کو تو وہ ہضم کر گئے۔ البتہ فرماتے ہیں کہ۔

"ہم بصد ادب پوچھیں گے کہ اگر آپ ہر جگہ یہ اقتضائے حال کی منطق چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ۔

اَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ٥

ترجمہ:- کیا اللہ نے تمہیں یتیم نہیں پایا تھا پھر تمہارا ٹھکانا بنا دیا۔

اس میں بھی اقتضائے حال کا یہ تقاضا یا ادعا ثابت کرنا پڑے گا

کہ حضور یتیم نہ تھے۔ یا کسی شخص کا انکار وجود ثابت کرنا پڑے گا کہ کوئی شخص آپ کے یتیم ہونے سے انکار کر رہا تھا اس لئے اس کے جواب میں لَمْ لایا گیا ہے۔ کیا اس "اقتضائے حال" یا "انکار وجود" کو ثابت کرنے کی کسی میں ہمت ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آخر یہاں لَمْ کا لفظ لا کر (معاذاللہ) خلافِ فصاحت کا ارتکاب کیوں کیا گیا؟

قرآن کریم ہی میں ہے کہ کافر اپنے جہنمی ہونے کا سبب بیان کریں گے۔

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○

ترجمہ:۔ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

یہاں کون ان کے مقابلہ میں ان کے نماز پڑھنے کا دعویٰ کر رہا تھا جس کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لئے لَمْ کا لفظ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

قرآن کریم ہی میں معتبر گواہوں کی تعداد بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے۔

وَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ۔

ترجمہ:۔ اور اگر وہ (گواہ) دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہی سہی۔

یہاں کون اس بات پر بضد تھا کہ دو مرد گواہ ہر وقت مل سکتے ہیں جس کے جواب میں لَمْ لایا گیا۔ (ہمارے عائلی مسائل ص ۲۴۸-۲۴۹)

ہمارے فاضل عزیز نے تین آیاتِ قرآنی معارضہ میں پیش فرمائی ہیں تعجب اور حیرت ہے کہ فاضل موصوف کو ان آیات کریمہ میں اقتضائے حال کی کوئی منطق نظر نہیں آئی حالانکہ بات بالکل ظاہر تھی ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم پر جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں آپ خوش حالی کی زندگی بسر فرما رہے تھے۔ اور مکہ کے اچھے خاصے متمول لوگوں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ اس وقت بے آسرا اور تنہا نہیں تھے آپ کا تجارتی کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا۔ اپنے چچا حضرت زبیر ابن عبد المطلب کے ساتھ جو قریش کے متمول کاروباری آدمی تھے۔ بارہا تجارتی سفر کر چکے تھے۔ آپ کے متبنیٰ حضرت زید ابن حارثہ اور آپ کے ربیب حضرت حارث ابن ابی ہالہ اور حضرت ہند ابن ابی ہالہ آپ کا ہاتھ بٹانے کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے۔ شام، بُصریٰ، جعاشۃ، جرش، یمن حتیٰ کہ مصر وغیرہ مقامات پر تجارتی کارروانوں کے ساتھ آپ کا جانا ثابت ہے۔ نبوت سے بہت پہلے مختلف قریشی تاجروں سے آپ کے تجارتی معاملات کا ثبوت مختلف تاریخ وسیر کی کتابوں میں ملتا ہے۔ حتیٰ کہ مکہ کے تجارتی حلقوں میں آپ الصادق الامین کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے آپ نے نکاح کیا تو پانچ سو طلائی درہم مہر میں آپ نے ادا فرمائے اس زمانہ میں پانچ سو طلائی درہم کچھ معمولی رقم نہیں تھی۔ اس سے آپ کے تمول اور خوش حالی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد چونکہ انسانی فطرت یہی رہی ہے اور آج بھی ہے کہ جب کوئی آدمی خوش حال اور متمول ہو جاتا ہے تو وہ اپنے ابتدائی عُسرت

وتنگی کے حالات کو یکسر فراموش کر دیتا ہے اور وہ اپنے اعمال واقوال سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میں تو ہمیشہ سے ایسا ہی متمول اور خوش حال رہا ہوں۔ میں تو منہ میں سونے کا چمچہ لئے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ میں تو بچپن سے طلائی گہواروں میں جھولتا رہا ہوں۔ یہ عام انسانی فطرت ہے۔ اس لئے اقتضائے حال کا عین تقاضا تھا کہ واضح کر دیا جائے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ سے ایسے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک بے سہارا اور یتیم بھی رہے ہیں۔ سورۂ والضحیٰ کی یہ آیات اگرچہ بظاہر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی آیات کے مخاطب درحقیقت عام مسلمان ہوتے ہیں۔ قرآن کریم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے نام سے اُمت محمدیہ کو خطاب کرتا ہے اور انسان کے فطری تقاضوں کے مطابق ہی خطاب کرتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور انتہائی غلط ہے کہ آپ نبوت سے پہلے بالکل ہی یتیم ویسیر، فاقہ کش، بے آسرا اور بے سہارا عسرت اور ناداری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یا آپ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت وثروت سے خوش حالی کی زندگی میسر آئی تھی۔ اور آپ بیوی کے مال پر گذر بسر کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہونے سے پہلے ہی تجارتی حلقوں میں خوب متعارف اور سربرآوردہ تاجر بن چکے تھے۔ آپ کی تجارتی سوجھ بوجھ اور تمول کا غلغلہ سن کر ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آپ کی طرف رغبت پیدا ہوئی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبیؐ جلد اوّل میں صفحہ ۱۸۶ سے لے کر صفحہ ۱۹۲ تک آپ کی تجارتی سرگرمیوں کا مختصر حال قلم بند کیا ہے

اسے ملاحظہ فرمالیا جائے۔

فاضل موصوف نے دوسری آیت سورۂ المدثر کی پیش فرمائی ہے۔

لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ٥

یعنی اہلِ جہنم ملائکہ کے جواب میں یہ کہیں گے کہ۔

"ہم نمازیں نہیں پڑھتے تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلایا کرتے تھے"۔

مجھے افسوس ہے کہ فاضل موصوف کو یہاں بھی اقتضائے حال کی کوئی منطق نظر نہیں آئی۔ انسانی فطرت ہے کہ مجرم، کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو وہ اپنے جرم کا اعتراف و اقرار کبھی نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اگر جرم ثابت بھی ہو جائے تو طرح طرح کی تاویلیں کر کے اسے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ اس سے پہلے قرآن کریم نے ان مشرکین کی کیفیت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ آیت نمبر (۱۱) سے لے کر آیت نمبر (۲۵) تک چلا گیا ہے۔ جس میں ان کے غرور و تکبر، حقیقت نا آشنائی، استہزاء و استخفاف، کفر و عناد انکار و جحود کی مکمل منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جہنم میں پہنچ کر ان کی یہ ساری اکڑ فوں ختم ہو جائے گی۔ اور دنیوی غرور و تکبر، کفر و عناد، انکار و جحود، استہزاء و استخفاف اور حقیقت نا آشنائی سب ختم ہو جائیں گی۔ حالانکہ دنیوی زندگی میں ان کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ وہاں تو یہ کیفیت تھی کہ۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ٥ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ٥ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ٥ ثُمَّ نَظَرَ ٥ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ٥ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ٥ فَقَالَ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ٥ إِنْ هٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ٥ (۷۴ / ۱۸—۲۵)

ترجمہ:- اس نے سوچا اور اندازہ لگایا۔ اس پر خدا کی پھٹکار، کیسا اندازہ

لگایا۔ اس پر پھر خدا کی مار، کیسا اندازہ لگایا۔ پھر اس نے غور کیا۔ پھر تیوری چڑھالی اور منہ بسور لیا۔ پھر پشت پھیر کر چل دیا اور تکبر کا مظاہرہ کیا پھر کہنے لگا۔ یہ جادو ہی تو ہے جو نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ انسان ہی کا تو کلام ہے۔

دنیوی زندگی میں جن مشرکین کی یہ کیفیت تھی ان سے آخرت میں بھی یہی توقع کی جانی چاہیئے کہ وہ وہاں بھی کم از کم اپنے جرم کا اقرار تو نہیں کریں گے۔ اور اگر جرم ثابت بھی ہو جائے تو تاویلیں کر کے اسے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن قرآن بتارہا ہے کہ اقتضائے حال کا یہ تقاضا وہاں قطعًا باقی نہیں رہے گا۔ اور وہ وہاں اپنے جرم کا برملا اقرار کرلیں گے اور شدت کے ساتھ اقرار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم دنیا میں نہ نمازیں پڑھا کرتے تھے نہ مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے اس لئے ہمارا یہ حال ہوا۔

فاضل موصوف نے معارضہ میں تیسری آیت سورۂ بقرہ کی پیش فرمائی ہے کہ۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ۔ (۲/۲۸۲)

ترجمہ: اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنا لیا کرو۔ پھر اگر دو مرد گواہ نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی۔

موصوف فرماتے ہیں کہ یہاں کون اس بات پر بضد تھا کہ دو مرد گواہ ہر وقت مل سکتے ہیں جس کے جواب میں لَمْ لایا گیا۔ جوابًا عرض ہے کہ ہر شخص عام حالات میں بضد ہو گا کیونکہ دو مرد گواہوں کا ملنا عام حالات میں کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ لیکن حق تعالیٰ جانتے تھے کہ ہر وقت دو مرد گواہ نہیں

مل سکتے۔ ایسے بھی حالات ہو سکتے ہیں، گو قلیل الوقوع سہی، کہ دو مرد گواہ نہ مل سکیں لہٰذا اس کے جواب میں لَمْ لایا گیا ہے۔ اقتضائے حال کے یہ معنے نہیں ہیں کہ کوئی شخص واقعی اس کا دعویٰ کرے ہی، اقتضائے حال کے معنے یہی ہیں کہ عام حالات کو دیکھتے ہوئے اس کے برخلاف تقاضا پایا جائے۔

وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ فاضل عزیز کو اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ایک اہم نکتہ اور بتا تا چلوں اور وہ یہ کہ مسئلہ زیرِ بحث میں صورتِ حال یہ ہے کہ نابالغ لڑکیوں کو موجودہ وقت میں حیض نہیں آرہا، لیکن بالغ ہو جانے کے بعد حیض لامحالہ آنا ہے۔ تو اس صورت میں نفی موجودہ وقت کے لئے ہوگی۔ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اس نفی کے لئے عربی زبان میں ایک خاص لفظ مقرر ہے۔ وہ نہ لَمْ ہے نہ لَا اور مَا ہے بلکہ لَمَّا ہے۔ اگر آیتِ مذکورہ بالا نابالغ لڑکیوں کے سلسلہ میں ہوتی تو لَمَّا يَحِضْنَ ہوتا۔ یعنی انہیں ابھی تک حیض نہیں آیا۔ (بالغ ہو جانے کے بعد آئے گا) جیسا کہ سورۂ صٓ میں ہے۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ (۳۸/۸)

ترجمہ: بلکہ وہ میرے ذکر سے شک میں مبتلا ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ انہوں نے ابھی میرا عذاب چکھا ہی نہیں۔

یعنی یہ تمام شکوک و شبہات اس لئے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزہ ابھی چکھا نہیں۔ وہ بہت جلد میرے عذاب کا مزہ چکھ لیں گے تو ان کے سب شبہات دور ہو جائیں گے۔

سورۂ حجرات میں ہے۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! آپ ان اعراب سے کہہ دیجئے کہ تم مؤمن نہیں ہوئے لیکن یوں کہو کہ ہم مطیع و فرمانبردار ہو گئے ہیں اور ابھی تمہارے دلوں میں ایمان رچا بسا نہیں۔

یعنی ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نے اچھی طرح گھر نہیں کیا۔ لہٰذا اپنے آپ کو مؤمن نہ کہو۔ جب دلوں میں ایمان اچھی طرح رچ، بس جائے تو ایمان کے دعوے کرنا۔ انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد ایمان تمہارے دلوں میں گھر کر جائے گا۔

سورۂ جمعہ میں ہے۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۶۲/۳)

ترجمہ:۔ (اور ہمارا رسول) ان میں سے دوسرے لوگوں کو بھی (کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا) جو ابھی ان کے ساتھ ملے نہیں (بعد میں ملیں گے) اور خدا بڑا غلبہ اور حکمت والا ہے۔

یعنی رسول تمام لوگوں کے تعلیم اور تزکیہ کے لئے آیا ہے۔ ان کی بھی جو اس وقت موجود ہیں۔ اور ان کی بھی جو ابھی مسلمانوں سے نہیں ملے چند دنوں کے بعد وہ بھی آملیں گے۔

سورۂ عبس میں ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝ (۸۰/۲۳)

ترجمہ:۔ ہرگز نہیں، ابھی تو انسان نے اس کی تعمیل ہی نہیں کی جس کا خدا نے اسے حکم دیا تھا۔

بات کو سمجھنے کے لئے غالباً یہ چار مثالیں کافی ہوں گی۔ لہٰذا ایسی نفی کے لئے جو صرف موجودہ وقت کے لئے کی جائے اور آئندہ کسی وقت اس کے

وجود پذیر ہونے یا نہ ہونے کا امکان ہو تو لَمَّا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے نابالغ لڑکیوں کے لئے نفی صرف اس بات کی کی جا سکتی ہے کہ ابھی تک انہیں حیض نہیں آیا کیونکہ وہ بلوغت کی حد کو نہیں پہنچیں۔ جب بلوغت کا وقت آئے گا تو اپنے وقت پر انہیں حیض آجائے گا۔ لہٰذا اگر یہ آیت نابالغ لڑکیوں کے سلسلہ میں ہوتی جیسا کہ ہمارے عزیز موصوف کا اصرار ہے تو قرآن کریم وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ نہ فرماتا بلکہ وَالّٰئِیْ لَمَّا یَحِضْنَ فرماتا۔ یعنی وہ عورتیں جنہیں ابھی تک حیض نہیں آیا البتہ اپنے وقت پر آجائے گا۔ وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ سے صرف وہ عورتیں ہی مراد ہو سکتی ہیں جنکی عمر کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں حیض آنا چاہیئے۔ لیکن کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آتا۔ (جن کی تفصیل ڈاکٹری کتابوں میں دے دی گئی ہے اور وہ ایک دو بیماری نہیں بلکہ متعدّد بیماریاں ہیں) یا کسی واقعی عذر کی وجہ سے حیض نہ آئے جیسا کہ عام مشاہدہ ہے کہ عورت اگر بچہ کو دودھ پلا رہی ہو تو اسے ماہواری ایّام نہیں ہوتے۔ نیز اکثر ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے بھی عورتوں کے ایّام بند ہو جاتے ہیں تو ایسی صورتوں میں وہ اپنی عدّت کا حساب ماہواری ایّام کے بجائے مہینوں کے حساب سے کریں گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق دوسرا افسانہ

کہا جاتا ہے کہ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جو حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں تھیں خود شادی فرمانا چاہتے تھے۔ حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے منہ بولے بیٹے (متبنّیٰ) رہ چکے تھے اس لئے اس ڈر سے کہ لوگ طعن و تشنیع کریں گے جب زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو آپ زیدؓ کو قلبی منشاً کے خلاف طلاق دینے سے منع کرتے رہے اور مشورہ دیتے رہے کہ زینبؓ کو طلاق نہ دو بلکہ اپنے پاس ہی رکھو۔ لیکن جب زیدؓ نے طلاق دیدی تو آپ یہ کہہ کر کہ زینبؓ سے میرا نکاح حق تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر کر دیا ہے۔ بغیر نکاح، بغیر مہر، بغیر اطلاع اور بغیر اجازت حضرت زینبؓ کے پاس شبِ عروسی منانے کے لئے تشریف لے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُمّ المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کتاب النکاح باب الکفارۃ (فقہ القرآن جلد اول) میں ہم نے عرض کیا تھا کہ۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کے نزدیک عزت وعظمت کا معیار نہ نسب ہے، نہ دولت ہے، نہ پیشہ ہے، نہ کوئی نسب اشرف ہے۔ نہ ارذل ہے۔ نہ دولت مندی شرافت کی دلیل ہے۔ اور نہ غریبی و مفلسی رذالت کو مستلزم۔ کوئی پیشہ ذلیل نہیں ہے۔ ہر پیشہ لائق تحسین ہے۔ عزت وشرافت کا معیار آدمی کا حسنِ عمل اور خوبیٔ کردار ہے جسے اسلام نے تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے۔ لہٰذا کفاءت کے مسئلہ کو شرعی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو حتی الامکان شوہر اور بیوی کے مرتبے اور درجے (STATUS) کا لحاظ رکھا جائے گو یہ چیز ضروری بھی نہیں۔ کیونکہ عہدِ رسالت مآب میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جہاں شادیوں میں کفاءت کا لحاظ نہیں رکھا گیا حتیٰ کہ آزاد شدہ غلاموں (موالی) کی شادیاں اعلیٰ خاندانوں میں کی گئیں وہ شادیاں کامیاب بھی ہوئیں اور ناکام بھی۔ حضرت زید ابن حارثہؓ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کے انجام کو تو قرآن کریم نے

اپنے دفتین میں قیامت تک کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں کوئی حتمی قانون بنا دینا مشکل ہے۔ حالات و کوائف کو دیکھتے ہوئے مصلحت کے ماتحت کفارت پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور حالات و کوائف ہی کو دیکھتے ہوئے اسے ترک بھی کیا جا سکتا ہے۔ جن روایات سے کفارت کا اعتبار ثابت ہوتا ہے وہ ہمارے نزدیک اسی مصلحت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اصل بنیادی چیز شوہر اور بیوی کے درمیان موانست، مودّت و محبت کی فضا قائم کرنا ہے۔ اگر یہ کفارت کا لحاظ کئے بغیر قائم ہو سکتی ہے۔ تو فبہا۔ ورنہ اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ دینی نہیں ہے بلکہ معاشرتی ہے اس کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

بعض فقہائے شافعیہ کا یہ قول اسی مصلحت شناسی پر مبنی ہے کہ عورت اور مرد کی عمروں میں بھی زیادہ تفاوت نہیں ہونا چاہیئے۔ بوڑھے بوڑھے لوگ جو نوعمر لڑکیوں سے شادیاں رچا لیتے ہیں وہ بھی مصلحتِ کفارت کے خلاف ہے۔ اور ہم اس کے حق میں ہیں کہ اس قسم کی شادیوں پر قدغن لگنی چاہیئے۔ البتہ جہاں یہ یقین ہو جائے کہ دونوں میں اس تفاوت کے باوجود ہم آہنگی پیدا ہو سکے گی وہاں اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم"

حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ

حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی ناکام شادی کا تذکرہ ہماری تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے۔ اور معاندینِ اسلام نے اس واقعہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کے لئے بُری طرح استعمال کیا ہے۔ معاندینِ اسلام نے جو کچھ بھی کیا، وہ تو معاندین تھے۔ اور

بغض و عناد کی وجہ سے انہوں نے اس واقعہ پر خوب نمک مرچ لگایا مگر ہمیں شکایت خود اپنے مؤرخین، محدثین اور مفسرین سے ہے۔ کیونکہ معاندین نے سیاہی تو ہمارے ہی قلم دان سے لی ہے۔

طبری وغیرہ نے وہ وہ روایات بیان کی ہیں کہ حیا اپنا منہہ دامن میں چھپا لیتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس موضوع پر روشنی ڈال دی جائے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، عادات اور کیریکٹر پر نکتہ چینی کا موقعہ جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے اس کا اصل سرچشمہ اور منبع کہاں ہے۔ بہر حال عیسائی مؤرخوں اور مستشرقین نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تنقیص اور نکتہ چینی (العیاذ باللہ) کے لئے یہ واقعہ ان کے لئے نہایت ہی بکار آمد ہوا ہے۔

تاریخ و سیر کی افسانہ طرازی

سب سے پہلے تو آپ قرآن کریم کی وہ آیات ملاحظہ فرمائیے جن کی تفسیر و تشریح میں ہمارے مؤرخین، مفسرین اور محدثین نے اپنی طباعی کے جوہر دکھائے ہیں۔ سورۃ احزاب میں ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ مَا كَانَ عَلَى النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝

(۳۳ / ۳۷ — ۳۸)

ترجمہ:" اور یاد کرو، (اے نبی!) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام فرمایا تھا کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو اور اللہ سے ڈرو اور تم اس بات کو چھپا رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے جسے اللہ خود ہی ظاہر کر دے گا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ خدا اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو" تو جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی (اور اسے طلاق ہی دے دی) تو ہم نے اس سے تمہارا نکاح کر دیا تاکہ اہلِ ایمان پر ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو جب وہ (منہ بولے بیٹے) اپنی حاجت پوری کر لیں۔ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔ نبی پر کوئی تنگی نہیں ہے اس معاملہ میں جو اللہ نے اس کے لئے ٹھہرا دیا ہے۔ اللہ کی سُنّت (طریقہ) یہی رہی ہے۔ ان لوگوں میں بھی جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور امرِ الٰہی مقرر کردہ اندازہ کے مطابق ہو کر رہتا ہے۔"

آیت اور اس کا ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اس کے بعد تفسیر ابن کثیر کا جو ہمارے ہاں مستند اور دیگر تفاسیر کے مقابلہ میں زیادہ صحیح مانی جاتی ہے بیان ملاحظہ فرمائیے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کا بیان

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اس کے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کو ہر طرح سمجھایا۔ ان پر خدا کا انعام تھا کہ اسلام اور متابعتِ رسول کی توفیق دی اور حضورؐ کا بھی ان پر احسان تھا کہ انہیں غلامی سے آزاد کر دیا۔ یہ بڑی شان والے تھے۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی پیارے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں سب مسلمان حِبّ الرسول (رسول اللہ صلعم کے محبوب) کہا کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو

بھی حِبُّ ابنُ حِبٍّ (محبوب کے بیٹے محبوب) کہتے تھے۔

حضرت عائشہ رض کا ارشاد ہے کہ جس لشکر میں حضور انہیں بھیجتے تھے اس لشکر کا سردار انہی کو بناتے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو رسول اللہ صلعم انہیں ضرور اپنا خلیفہ بناتے (مسند احمد)

بزار میں ہے .... حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی اُمیمہ بنت عبد المطلب کی لڑکی زینب بنت جحش اسدیہ سے کر دیا تھا۔ دس دینار اور سات درہم مہر دیا تھا۔ ایک دوپٹہ، ایک چادر، ایک کُرتہ، پچاس مُد اناج اور دس مُد کھجوریں دی تھیں۔ ایک سال اور کچھ اوپر تک تو یہ گھر بسا لیکن پھر ناچاقی شروع ہو گئی۔ حضرت زیدؓ نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر شکایت کی تو آپ انہیں سمجھانے لگے کہ گھر نہ توڑو۔ اللہ سے ڈرو الخ۔

ابنِ ابی حاتم اور ابنِ جریر طبری نے اس جگہ بہت سے غیر صحیح آثار نقل کئے ہیں جن کا نقل کرنا بھی ہم نامناسب جان کر ترک کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک بھی ثابت اور صحیح نہیں۔ مسند احمد میں بھی ایک روایت حضرت انس رض سے ہے لیکن اس میں بھی بڑی غرابت ہے۔ اس لئے ہم نے اسے بھی وارد نہیں کیا۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ یہ آیت حضرت زینبؓ بنت جحش اور حضرت زید ابن حارثہؓ کے بارے میں اتری ہے۔

ابنِ ابی حاتم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر دے دی تھی کہ حضرت زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ یہی بات تھی جسے آپ نے ظاہر نہیں کیا اور حضرت زیدؓ کو سمجھایا کہ وہ اپنی بیوی کو الگ نہ کریں۔

حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں۔ کہ حضور اگر خدا کی وحی و کتاب اللہ میں سے ایک آیت بھی چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپا لیتے۔ وَطَرٌ کے معنے حاجت کے

ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب زیدؓ ان سے سیر ہو گئے اور باوجود سمجھانے بجھانے کے میل ملاپ قائم نہ رہ سکا بلکہ طلاق ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نبی کے نکاح میں دے دیا۔ اس لئے ولی کی، ایجاب و قبول کی، مہر اور گواہوں کی ضرورت نہیں رہی۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت زینبؓ کی عدت پوری ہو چکی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید ابن حارثہؓ سے کہا۔ تم جاؤ اور انہیں مجھ سے نکاح کرنے کا پیغام پہنچاؤ۔ حضرت زیدؓ گئے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ حضرت زیدؓ پر ان کی عظمت اس قدر چھائی کہ سامنے پڑ کر بات نہ کر سکے۔ منہ پھیر کر بیٹھ گئے اور ذکر کیا۔ مائی صاحبہ نے فرمایا ٹھہرو، میں خدا تعالےٰ سے استخارہ کر لوں۔ یہ تو کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگیں اُدھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی اتری جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں نے ان کا نکاح تجھ سے کر دیا۔ چنانچہ اسی وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بے اطلاع چلے آئے۔ پھر ولیمہ کی دعوت میں آپ نے ہم سب کو گوشت روٹی کھلائی۔ لوگ کھا پی کر چلے گئے مگر چند آدمی وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے الخ

(تفسیر ابن کثیر بائیسواں پارہ ص۱۱ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب کراچی)

حافظ ابنِ کثیرؒ نے جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اپنے نزدیک صرف صحیح اور مستند روایتیں ہی بیان فرمائی ہیں اور ابنِ جریر طبری وغیرہ کی باتی خرافات کو بیان کرنا بھی گوارہ نہیں فرمایا۔ یہی حال حافظ ابنِ حجر عسقلانی کا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اسی قسم کی تفصیلات نقل فرماتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ۔

"اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابنِ ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے ان کو نقل کر دیا ہے۔ وہ روایتیں اس قابل نہیں ہیں کہ

ان پر توجہ کی جائے (فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب)

طبری کی افسانہ طرازی

طبری وغیرہ نے کس قسم کی روایتیں بیان کی ہیں ان کا اندازہ لگانے کے لئے دل پر بہت جبر کر کے ہم صرف ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ تاریخِ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم زیدؓ سے ملنے ان کے گھر گئے۔ زیدؓ موجود نہ تھے۔ حضرت زینبؓ اس وقت کپڑے تبدیل کر رہی تھیں۔ اسی حالت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر ان پر پڑ گئی اور آپ سبحان اللہ العظیم، سبحان اللہ مُصَرِّفِ الْقُلُوْبِ فرماتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ حضرت زیدؓ کو یہ واقعات معلوم ہوئے تو انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ زینبؓ اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں ان کو طلاق دیدوں الخ۔

نقلِ کفر کفر نباشد اسی قسم کی لچر روایتیں ہیں جو مستشرقین کا مایۂ استناد ہیں۔ مؤرخ طبری نے یہ روایت واقدی کے حوالہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذّاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بیہودہ روایتوں سے مسلم معاشرے کو عیش پرستیوں میں مبتلا کرنا اور اس طرح اسے تباہ کرنا تھا۔

(دیکھئے تاریخِ طبری آغاز واقعات ۵ھ)

طبری کی یہ روایت اور دوسری تمام روایات اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے بحث کی جائے۔ لیکن حافظ ابنِ کثیرؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ نے جو روایات اپنے نزدیک صحیح اور مستند سمجھ کر نقل فرمائی ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ جو کچھ حافظ ابن کثیرؒ نے نقل فرمایا ہے وہ آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ خط کشیدہ عبارات پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال لیجئے۔

(۱) ایک سال اور کچھ اوپر تک تو یہ گھر بسا لیکن پھر ناچاقی شروع ہوگئی۔ حضرت

زینبؓ کو طلاق اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کا نکاح مؤرخین، مفسرین اور محدثین کی تصریحات کے مطابق ۵ھ میں ہوا ہے۔ حافظ ابنِ کثیر کے مطابق حضرت زینبؓ کے ساتھ حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کا نکاح ۳ھ میں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے تفصیل آگے آئے گی۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر دیدی تھی کہ حضرت زینبؓ آپ کے نکاح میں آئیں گی۔ یہی بات تھی جسے آپ نے ظاہر نہیں کیا (چھپایا) اور حضرت زیدؓ کو سمجھایا کہ وہ اپنی بیوی کو الگ نہ کریں۔

تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم تھی کہ حضرت زینبؓ میرے نکاح میں آئیں گی۔ یا یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ حضرت زینبؓ سے خود نکاح فرمالیں۔ لیکن حضرت زیدؓ کو دوسری طرف یہ سمجھا رہے تھے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ قرآن کریم میں جو فرمایا گیا ہے وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ کا مطلب یہی ہے۔ کہ جو بات تھی اسے تو آپ اپنے دل میں چھپا رہے تھے مگر اللہ اس بات کو ظاہر کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اور یہ بھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ سے خود نکاح فرمانا چاہتے تھے۔ کیونکہ حضرت زینبؓ نے آپ کے ارشاد پر اپنی مرضی کے خلاف حضرت زیدؓ سے شادی کرلینا منظور کیا تھا۔ حالانکہ حضرت زینبؓ قریشی خاندان کی بلند مرتبہ عورت ہیں۔ اور حضرت زیدؓ آنحضرت صلعم کے متبنّٰی سہی مگر بہرحال آزاد کردہ غلام تھے۔ زینبؓ سے جب ان کا نباہ نہ ہوا اور زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی تو آپ نے حضرت زینبؓ کی اشک شوئی کے لئے ان سے خود نکاح کرلینا چاہا مگر وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بہو تھیں۔ اور منہ بولے بیٹے کی بہو سے نکاح کرنا عرب میں معیوب تھا۔ لہٰذا آپ ڈرتے تھے کہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ حالانکہ

ایک نبی کو تو لوگوں سے نہیں بلکہ خدا سے ڈرنا چاہیئے تھا۔

یہ تمام مفسرین کا بیان ہے۔ کچھ علامہ حافظ ابن کثیر ہی اس میں منفرد نہیں ہیں۔ لیکن بہرحال ہمیں کہیں سے تو یہ باتیں نقل کرنی ہی تھیں اس لئے ہم نے حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر کو منتخب کر لیا۔ گویا علامہ حافظ ابن کثیرؒ نے بھی جو روایات بیان فرمائی ہیں ان سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر دو الزام عائد ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ آپ نے توبہ توبہ العیاذ باللہ منافقت کا ثبوت دیا کہ آپ کے دل میں تو کچھ تھا اور زبان پر کچھ تھا۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خاکم بدہن معاذ اللہ خدا سے نہیں بلکہ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ یہ دونوں الزام بہت بڑے ہیں۔

③ نیز یہ کہ حضرت زینبؓ سے آپ کا نکاح محض وحی پر مبنی تھا اور جیسا کہ دنیا بھر میں نکاح ہوتے ہیں۔ اس طرح پر نہیں ہوا، بلکہ بغیر ولی کے اور بغیر ایجاب وقبول کے اور بغیر مہر اور گواہوں کے عمل میں آ گیا تھا۔ اس دعوے کی سخافت ظاہر ہے۔ یوں تو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے، مجھے الہام ہوا ہے۔ مجھے کشف ہوا ہے کہ میرا نکاح فلاں عورت سے ہو گیا ہے۔ کیا ایسے نکاح کو واقعی نکاح کہا جائے گا۔

④ آپ نے حضرت زید ابن حارثہؓ کو شادی کا پیغام دے کر حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے منظوری بھی نہیں دی تھی بلکہ وہ استخارہ کرنے کے لئے کھڑی ہوئیں اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اُدھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو گئی کہ ہم نے آپ کا نکاح زینبؓ سے کر دیا اور آپ بلا اطلاع اور بلا اجازت حضرت زینبؓ کے ہاں چلے گئے۔ کس قدر بیہودہ اور لچر دعوے ہے۔ کہ آپ نے ان کے جواب کا انتظار بھی نہیں فرمایا۔ یہ تو انتہائی بے صبری اور بیتابی کا اظہار

ہے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تو کیا ممکن ہوتا ایک عام شریف آدمی سے بھی غیر متوقع ہے۔

حضرت زید ابن حارثہؓ

حقیقتِ واقعہ کو سمجھنے کے لئے چند ضروری باتیں ذہن نشین کرلینی چاہئیں کیونکہ جب تک پورا پس منظر سامنے نہ ہو بات کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہے۔ ان میں سب سے پہلے حضرت زید ابن حارثہؓ کے کوائف سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حضرت زید ابن حارثہ بالکل ہی نوعمر یعنی آٹھ سال کے تھے۔ جب ان کو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے خرید کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہِبہ کر دیا تھا۔ یہ اسلام سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔

عرب کے کچھ لوگوں نے حضرت زیدؓ کے قبیلہ پر حملہ کیا اور وہ ان کو گرفتار کرکے مکہ معظمہ میں لائے اور فروخت کرنا چاہا۔ حضرت خدیجہؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو خرید لیا۔ اُسد الغابہ میں ہے کہ۔

حضرت خدیجہؓ نے ان کو مکہ میں خرید کر نبوت سے پہلے ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا جبکہ ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی اور کہا جاتا ہے کہ، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو فروخت ہوتے ہوئے مکہ میں بطحاء کے مقام پر دیکھا۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مال سے انہیں خرید لیا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ چنانچہ آپ نے ان کو آزاد کرکے اپنا بیٹا بنالیا .... (واقعہ یہ ہے کہ) حارثہ (زید کے والد) اور ان کے بھائی جو شراحیل کے بیٹے تھے۔ (عرصہ کے بعد) جب ان کو معلوم ہوا کہ زید مکہ میں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس ہیں۔ تو ان کو چھڑانے کے لئے مکہ معظمہ آئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

عرض کیا کہ اے عبد المطلب کے بیٹے، اے ہاشم کے بیٹے، اے اپنی قوم کے سردار کے بیٹے! ہم آپ کے پاس اپنے بیٹے کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ جو آپ کے پاس ہیں آپ ہم پر احسان کیجیئے اور اس کا فدیہ قبول فرما کر ہم پر کرم فرمائیے۔ آپ نے پوچھا: وہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: "زید ابن حارثہ" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے علاوہ اور کچھ کیوں نہیں؟" انہوں نے کہا: وہ کیا۔ آپ نے فرمایا۔ زید کو بلالو، اور اسے اختیار دیدو، اگر وہ تمہارے ساتھ جانا پسند کرے تو وہ تمہارا ہے اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا پسند کرے تو بخدا میں اس شخص کے بدلہ میں جو مجھے پسند کرلے کسی چیز کو پسند نہیں کرسکتا۔ دونوں نے کہا: "آپ نے تو ہمیں انصاف سے زیادہ دے دیا اور بڑا احسان فرمایا"۔

چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور ان سے پوچھا، تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟ زید نے کہا۔ ہاں "یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں"۔

آپ نے فرمایا، تو تم مجھے بھی خوب پہچانتے ہو، اور میرے ساتھ رہنے کو بھی دیکھ چکے ہو، لہٰذا یا تو مجھے اختیار کرلو یا ان دونوں کو اختیار کرلو، زید نے جواب دیا، میں ان دونوں کو نہیں چاہتا، میں وہ نہیں ہوں کہ آپ پر کسی کو بھی پسند کرسکوں، آپ میرے لئے بجائے والد اور چچا کے ہیں" باپ اور چچا نے کہا۔ اے زید! تیرا خانہ خراب ہو، کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دے رہا ہے اور اپنے باپ اور گھر والوں پر ان کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے؟ زید نے کہا، ہاں! میں نے اس شخص کی وہ باتیں دیکھی ہیں کہ میں اس پر کسی شخص کو کبھی بھی ترجیح نہیں دے سکتا۔

چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کی یہ بات دیکھی تو انہیں

لے کر مسجد حرام میں گئے اور حطیم میں کھڑے ہو کر اعلان فرما دیا۔
"جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ گواہ رہیں کہ زید میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا"
جب زید کے باپ اور چچا نے یہ دیکھا تو ان کا دل خوش ہوگیا۔ اور وہ لوٹ گئے۔ (اُسد الغابۃ صفحہ ۲۳۴ ج ۲ مطبوعہ طہران)
بعینہٖ اسی طرح تمام باتیں حضرت زید کے متعلق اصابہ میں بھی بیان کی گئی ہیں آخر میں اتنا اضافہ ہے کہ۔
"چنانچہ اس کے بعد زید ابن حارثہ کو زید ابن محمد پکارا جانے لگا حتیٰ کہ اللہ اسلام کو لے آیا (اور یہ منع ہوگیا)
(اصابہ صفحہ ۵۴۵ ج ۱ مطبوعہ مصر)
اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے نقل کیا ہے کہ۔
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے زید کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ متبنیٰ بنا لیا تھا۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کی ماں اُمیمہ بنت عبد المطلب تھیں۔ لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے۔ اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارہ نہ تھی۔ لیکن بالآخر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد کے لحاظ سے راضی ہوگئیں۔
(فتح الباری تفسیر سورۃ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم)
علامہ شبلیؒ نعمانی نے بھی سیرت النبیؐ میں اس کو نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو سیرت النبیؐ جلد اول صفحہ ۴۵۱-۴۵۲ مطبوعہ لاہور پاکستان) پھر اس کے بعد اصابہ ہی میں ہے۔

ابن الکلبی نے اپنے والد سے بیان کیا، انہوں نے ابو صالح سے انہوں نے ابن عباس رضؓ سے نقل کیا ہے کہ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو اپنا بیٹا بنا لیا تو ان کی شادی زینبؓ بنت جحش سے کردی۔ وہ آپ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبد المطلب کی بیٹی ہیں اس سے پہلے آپ اپنی باندی ام ایمنؓ سے ان کا نکاح کر چکے تھے۔ چنانچہ ان سے ان کے بیٹے اسامہؓ پیدا ہو چکے تھے۔ پھر جب زیدؓ نے زینبؓ کو طلاق دے دی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے زید کا نکاح ام کلثومؓ بنت عقبہ سے کر دیا۔ ام کلثوم کی ماں اروی بنت کریز تھیں اور اروی کی ماں بیضاء بنت عبد المطلب تھیں۔ چنانچہ ام کلثوم سے حضرت زید کے ہاں زید ابن زید اور رقیہ پیدا ہوئیں۔ پھر زیدؓ نے ام کلثومؓ کو بھی طلاق دے دی اور درۃؓ بنت ابولہب ابن عبد المطلب سے نکاح کر لیا۔ پھر ان کو بھی طلاق دیدی اور ہندؓ بنت العوام سے نکاح کر لیا جو حضرت زبیرؓ ابن العوام کی بہن تھیں۔ ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ ہم ان کو زید ابن حارثہ کہہ کر نہیں پکارتے تھے بلکہ زید ابن محمد ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہو گئی۔ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو)

(اصابہ صفحہ ۵۴۹ ج ۱)

حضرت زینبؓ کے ساتھ حضرت زیدؓ کی ازدواجی زندگی کیوں کہ گذری اس کے متعلق روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ۔

جب شام ہو گئی تو زیدؓ اپنے بستر کی طرف چلے گئے۔ زینبؓ کا بیان ہے کہ زیدؓ میرے ساتھ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اور بجز اس کے کہ خدا نے ہی مجھے ان سے بچایا اور کوئی چیز مانع نہیں تھی چنانچہ وہ مجھ پر قادر نہ ہو سکے۔ یہ ابو عصمۃ نوح ابن ابی مریم کی روایت ہے جو انہوں نے خاص حضرت زینبؓ سے بیان کی ہے کہ انہوں

نے یہ کچھ بیان فرمایا۔ اور بعض روایات میں آتا ہے کہ جب زیدؓ نے حضرت زینبؓ کے قریب جانا چاہا تو انہیں بڑی ناگواری ہوئی۔ یہ بھی پہلی روایت کے قریب ہی ہے اور زیدؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ زینبؓ مجھے اپنی زبان سے سخت اذیت دیتی ہے۔ اور یوں کہتی ہے اور ووں کرتی ہے اور میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔

"اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو اور اللہ سے ڈرو آخر آیت تک۔ اور زیدؓ نے انہیں طلاق دے دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یاد کرو اے پیغمبر اسلام جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے۔ جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام فرمایا" آخر آیت تک۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی صج ۱۸۹/۱۴)

(سورۃ الاحزاب)

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ امام قرطبیؒ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا۔

"اپنی بیوی کو اپنے پاس ہی رکھو اور اللہ سے ڈرو، آخر آیت تک یعنی اور تم وہ چیز چھپا رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے اور اللہ اسے ظاہر کر دے گا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو۔ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اسی سے ڈرو یعنی آخر آیت تک حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اور مخاطب حضرت زیدؓ ہیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے کہ نصف خطاب زید سے ہے اور باقی نصف اللہ کی طرف سے حضورؐ کو خطاب ہے۔

(تفصیل آگے آرہی ہے)

حضرت زیدؓ ابن حارثہ کی امارت غزوۂ موتہ اور ان کی وفات کے متعلق بیان ہوا ہے کہ۔

انہوں نے لشکر تیار کیا اور جرف کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ سپاہی تین ہزار تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ ابن حارثہ کو امیر بنایا۔............ وہ لشکر کو لے کر جمادی الاولیٰ ۸ھ میں روانہ ہوئے۔"

(حیاۃ سیدِ العرب صفحہ ۱۷۵/۲ مطبوعہ مکہ مکرمہ)

اور اصابہ میں ہے کہ۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو غزوۂ موتہ میں فوج کا سپہ سالار بنایا اور اسی میں وہ شہید ہو گئے اور اس وقت ان کی عمر پچپن سال تھی۔" (اصابہ ج ۱ ص ۵۴۶)

حضرت ام کلثوم رضؓ

حضرت زید کی دوسری بیوی حضرت ام کلثومؓ کے حالات میں ابن حجر لکھتے ہیں کہ۔

"ابن اسحاق نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ مجھ سے زہری اور عبداللہ ابن ابوبکر ابن حزم نے بیان کیا کہ ام کلثومؓ بنت عقبہ نے حدیبیہ کے سال ہجرت کی (واضح رہے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کا واقعہ ہے) تو ان کے دو بھائی عمارہ اور فلاں ان کو طلب کرنے کے لئے آئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس کرنے سے انکار فرما دیا۔ اور وہ ہجرت کرنے سے پہلے بغیر شوہر کے تھیں (کنواری تھیں یا بیوہ، بہر حال ان کا شوہر نہیں تھا) تو جب وہ مدینہ منورہ آگئیں تو ان سے زید ابن حارثہؓ نے شادی کر لی۔" (اصابہ ج ۴ ص ۴۶۷)

اسد الغابہ میں حضرت ام کلثومؓ کے حالات میں ہے کہ۔

ام کلثومؓ بنت عقبہ نے رسول اللہ علیہ وسلم کی طرف حدیبیہ کے سال ہجرت فرمائی تو ان کے دونوں بھائی ولید اور فلاں یعنی عقبہ کے بیٹے ان کو طلب کرنے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے۔ آپ نے انہیں واپس دینے سے انکار کر دیا۔........ اور جب وہ مدینہ منورہ آگئیں تو ان سے

زیدؓ ابن حارثہ نے شادی کر لی۔ پھر وہ موتہ کی جنگ میں شہید ہو کر ان سے بچھڑ گئے تو حضرت زبیرؓ ابن العوام نے ان سے شادی کر لی۔ (اسد الغابہ صفحہ ۶۱۴ جلد ۵)

حضرت زینبؓ

اب حضرت زینبؓ کے متعلق بھی سنتے چلئے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زینبؓ بنت جحش بن رباب اسدیہ سے نکاح فرمایا۔ زینبؓ کا نکاح ان کے بھائی ابو احمد ابن جحش نے کرایا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار سو درہم مہر دیا اور وہ آپ سے پہلے زیدؓ ابن حارثہ یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام کے پاس تھیں۔ انہی کے بارہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی تھیں۔

"اور جب زیدؓ نے ان سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے ان کا نکاح آپ سے کر دیا۔" (تہذیب سیرت ابن ہشام لعبد السلام ہارون جلد دوم مکتبہ ربیع حلب شام)

نیز اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھئے کہ حضرت زینبؓ موہوبات میں سے تھیں۔ اسی ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ۔

میمونہؓ بنت الحارث کی شادی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت عباسؓ نے کرائی اور آنحضرت کی طرف سے ان کو مہر میں چار سو درہم بھی حضرت عباسؓ نے ہی ادا کئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی وہ خاتون تھیں جنہوں نے اپنا نفس آپؐ کو ہبہ کر دیا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جن خاتون نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا تھا وہ حضرت زینب بنت جحش تھیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ ام شریک تھیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ قبیلہ بنو سامہ کی کوئی اور خاتون تھیں۔

(ایضاً صفحہ ۱۸۱ نیز دیکھئے تفسیر ابن کثیرؒ)

نیز اُسد الغابہ میں ہے کہ۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمایا تو ان کی عمر پینتیس ۳۵ سال تھی اور ۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا تو وہ پچاس سال کی تھیں۔ اور عمر بن عثمان حجبی نے نقل کیا ہے کہ وہ ترپن سال زندہ رہیں۔ (اُسد الغابہ، ذکر زینبؓ)

نیز حیات سیدؐ العرب میں ہے کہ۔

حضرت زینبؓ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے نکاح فرمایا اور وہ اس وقت پینتیس ۳۵ سال کی تھیں اور ۲۰ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا اور وہ اس وقت ترپن سال کی تھیں اور عمر ابن الخطاب نے نماز جنازہ پڑھائی۔

(حیات سیدؐ العرب صفحہ ۲۴۴ جلد ۴ مطبوعہ المکتۃ المکرمہ)

ام ایمن اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ میں حضرت ام ایمنؓ کے تفصیلی حالات وکوائف بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

عبید حبشی کے بعد حضرت ام ایمنؓ سے حضرت زید ابن حارثہؓ نے شادی کرلی تھی۔ (اُسد الغابہ صفحہ ۵۶۷ جلد ۵)

اسامہ ابن زیدؓ صحیح مسلم میں ہے کہ۔

زیدؓ ابن حارثہ کے لڑکے اسامہؓ کے متعلق لوگ شک کیا کرتے تھے ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت زیدؓ اور اسامہؓ لیٹے ہوتے تھے، وہاں سے ایک قیافہ شناس گذرا۔ اس نے ان دونوں کے قدموں کو دیکھ کر کہا، یہ دونوں قدم ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں (چونکہ قیافہ شناس کی بات پر لوگوں کو بڑا اعتماد ہوا کرتا تھا۔ لہذا) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر بہت خوش ہوتے اور اسے بہت پسند کیا اور حضرت عائشہؓ کو بھی اس بات سے مطلع فرمایا۔ (کتاب الرضاع باب العمل بالحاق القائف الولد)

نتائجِ تصریحات

حضرات محدثین کی ان تصریحات سے یہ باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت زیدؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور متبنیٰ تھے متبنیٰ بنا لینے کے بعد جب حضرت زیدؓ سنِ بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کا نکاح حضرت زینبؓ سے کر دیا (اصابہ) وہ اس نسبت سے خوش نہیں تھیں لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد کے لحاظ سے راضی ہو گئیں۔

(۲) حضرت زینبؓ کے بطن سے حضرت زیدؓ ابن حارثہ کے لئے کوئی اولاد پیدا نہیں ہو سکی۔

(۳) حضرت زینبؓ کا نکاح ان کے بھائی ابو احمد ابن جحش نے کرایا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چار سو درہم مہر ادا فرمایا۔

(۴) حضرت زینبؓ ان خواتین میں سے تھیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا تھا۔

(۵) جنگِ موتہ میں حضرت زیدؓ شہید ہوئے تو ان کی عمر پچپن سال تھی۔ اور اس وقت حضرت زینبؓ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ لہٰذا حضرت زیدؓ سے حضرت زینبؓ کی یہ شادی عین نبوت کے سال میں یا اس سے ایک دو سال آگے یا پیچھے ہونی چاہیئے۔ کیونکہ زیدؓ و زینبؓ کی شادی سے پہلے زیدؓ کی حضرت ام ایمنؓ سے بھی شادی ہو چکی تھی جس سے ان کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ پیدا ہو چکے تھے۔ جہاں تک حضرت زیدؓ کا تعلق ہے۔ وہ تو نبوت سے بہت پہلے سن بلوغ کو پہنچ گئے تھے۔ لیکن شادی کے وقت حضرت زینبؓ کی عمر بھی سولہ سترہ سال ہونی چاہیئے۔ لہٰذا حضرت زید کے سنِ بلوغ کو پہنچتے ہی یہ نکاح ممکن نہیں ہے کیونکہ ۸ھ میں حضرت زید پچپن سال کے تھے تو ۱ھ نبوت میں وہ چونتیس

سال کے ہوئے اور ۵ھ میں حضرت زینبؓ پینتیس ۳۵ سال کی تھیں تو سلہ نبوت میں ان کی عمر سترہ سال ہو گی اور یہی شادی کی عمر ہے جبکہ حضرت زید اس سے انیس بیس سال پہلے بالغ ہو گئے ہوں گے۔ اس وقت تک تو حضرت زینبؓ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

(۶) حضرت زینبؓ سے حضرت زیدؓ جنسی تعلق قائم نہیں کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ حضرت زیدؓ کی اپنی کمزوری ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت زینبؓ ہی میں کوئی ایسا نقص ہو کہ مردان سے جنسی تمتّع حاصل نہ کر سکیں چنانچہ فقہاء نے عورتوں کے کچھ ایسے عیوب گنائے ہیں مثلاً شرمگاہ میں ہڈی ہونا۔ شرمگاہ میں گوشت پیدا ہو جانا وغیرہ۔ اس کے لئے باب خیار الفسخ دیکھیے۔ بظاہر دوسری بات ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت ام ایمنؓ کے بطن سے حضرت زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ پیدا ہو چکے تھے اور حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ کے بطن سے حضرت زید ابن زید اور رقیہ (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) پیدا ہو گئے تھے۔ جس سے اس امکان کی نفی ہو گئی کہ نقص حضرت زیدؓ میں تھا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ نقص حضرت زینبؓ ہی میں تھا۔ آج کل اس قسم کے نقائص کا علاج آپریشن وغیرہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس زمانہ میں یہ بات ممکن نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس عہد میں یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ نقص عورت میں ہے یا مرد میں اس لئے عین قرینِ قیاس ہے کہ حضرت زینبؓ اپنی جگہ قصور وار حضرت زیدؓ کو سمجھتی ہوں اور حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو قصور وار سمجھتے ہوں۔

(۷) حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دی ہے اور اس کے بعد انہوں نے حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ سے نکاح فرمایا ہے جن سے ایک صاحبزادے زید ابن

زید اور ایک صاحبزادی رقیہ پیدا ہوئیں۔ پھر ام کلثوم کو بھی انہوں نے طلاق دے دی اور دُرّہؓ بنت ابولہب ابن عبدالمطلب سے شادی فرمائی۔ پھر اسے بھی طلاق دے دی اور ہند بنت العوام سے شادی کی یعنی حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد یکے بعد دیگرے انہوں نے تین نکاح کئے اور ام کلثومؓ ان کے پاس کافی عرصہ تک رہیں۔ چنانچہ ان کے بطن سے ان کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ اور جمادی الاولیٰ ۸ھ میں زیدؓ شہید ہو گئے۔ ان تمام مرحلوں سے گذرنے کے لئے کم از کم سات آٹھ سال تو ہونے چاہئیں۔ لہٰذا حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو لامحالہ انہوں نے ۱ھ میں طلاق دی ہوگی۔

ہمارے رُوات بیچارے حساب میں عام طور پر بہت بھولے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو بتا رہے ہیں کہ حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی اور اس کے فوراً بعد آنحضرتؐ نے ان سے نکاح کر لیا اور یہ ۵ھ کا واقعہ ہے مگر دوسری طرف بتا رہے ہیں کہ زینبؓ کو طلاق دینے کے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے تین عورتوں سے نکاح کیا اور ایک بیوی سے دو اولادیں بھی ہوئیں اور ۸ھ کے شروع (جمادی الاولیٰ) میں وہ شہید بھی ہو گئے۔ ان راویوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا کہ دو اڑھائی سال کے عرصہ میں یہ ساری باتیں کیسے ممکن ہیں۔

دوسری طرف یہ بتا رہے ہیں کہ حضرت زیدؓ بالغ ہو گئے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے ان کا نکاح کر دیا حالانکہ ۵ھ میں حضرت زینبؓ جب پینتیس سال کی تھیں تو حضرت زید باون ۵۲ سال کے تھے۔ اگر حضرت زیدؓ پندرہ سال کی عمر میں سنِ بلوغ کو پہنچے ہوں تو حضرت زینبؓ اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئی ہوں گی۔ اس قسم کے حساب کے گھپلے روایات میں بہت

ملیں گے۔ لہٰذا ہمیں ان روایات پر غور و فکر کر کے ان تاریخوں کو صحیح کر لینا چاہیئے۔

آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ لوگوں میں عام طور پر اس قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی تھیں کہ حضرت اسامہؓ حضرت زیدؓ کے بیٹے نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک قیافہ شناس نے جب دونوں کے پاؤں دیکھ کر یہ کہا کہ ان دونوں پاؤں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس سے ان شبہات کی تردید ہوگئی جو لوگوں کے دلوں میں حضرت زیدؓ اور حضرت ام ایمنؓ کے متعلق پائے جاتے تھے۔ حضرت ام ایمنؓ نہایت پاکباز اور دیندار عورت تھیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کھلائی تھیں ان کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کسی جنتی عورت سے شادی کرنا چاہے، وہ ام ایمن سے شادی کرلے۔ غالباً اسی فضیلت کی بنا پر حضرت زیدؓ نے ان سے شادی بھی کی ہوگی۔ (دیکھئے اُسد الغابہ صفحہ ۵۶۷ ج ۵)

ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد ظاہر ہے کہ لوگوں کے ان شکوک و شبہات کی وجہ غالباً یہ تھی کہ حضرت زینبؓ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تھی اس لئے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت زیدؓ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ اولاد پیدا کر سکیں۔ ام ایمنؓ کے بطن سے جو ایک لڑکا (اسامہؓ) پیدا ہوگیا ہے وہ بھی خبر نہیں کس کا ہوگا۔ وہ حضرت زیدؓ کا نہیں ہو سکتا۔ ام ایمنؓ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی باندی تھیں جو آپ کو ترکہ میں اپنے والد سے ملی تھیں۔ لہٰذا ان کو متہم کر دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

دوسری طرف یہ بھی واقعہ تھا کہ حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ سے جنسی تعلق قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ عورتیں حضرت زینبؓ سے اولاد نہ ہونے

پر سوالات کرتی ہونگی جیسا کہ نسوانی فطرت ہے اور وہ بتاتی ہوں گی کہ زیدؓ ناکارہ ہیں۔ اس عہد میں یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ ڈاکٹری معائنہ سے یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ نقص مرد میں ہے یا عورت میں۔ زیدؓ کا غلام ہونا اور زینبؓ کا قریشی اعلیٰ خاندان کی خاتون ہونا اس کا بہت بڑا ثبوت تھا کہ نقص اگر ہے تو زیدؓ ہی میں ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "نزلہ بر عضوِ ضعیف می ریزد" تو یہ جرم کچھ کم نہ تھا۔ کہ حضرت زیدؓ غلام رہ چکے تھے۔ اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ حضرت زید ابن حارثہؓ حضرت زینبؓ کے ساتھ گذارہ نہیں کر سکے اور طلاق دینے پر مجبور ہو گئے۔

علاوہ ازیں حضرت زینبؓ رضی اللہ عنہا تیز مزاج بھی تھیں۔ اور فطرۃً ہر وہ عورت جس کے اولاد نہ ہو سکے چڑچڑی اور تیز مزاج ہو جاتی ہے چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ان کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ملتا ہے کہ حضرت زینبؓ کی زبان میں تیزی تھی اور وہ حضرت عائشہؓ سے جھگڑتی رہتی تھیں۔

(صحیح بخاری کتاب الہبہ، صحیح مسلم باب فضل عائشہؓ)

حضرت زیدؓ نے جب ان کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو جو اصل بناءِ طلاق تھی۔ یعنی ان میں نسوانی نقص ہونا۔ اور اس کی وجہ سے لوگوں کی طرف سے حضرت زیدؓ پر طعن اور طنز، اس بات کو حضرت زیدؓ ظاہر نہیں کر سکے۔ کیونکہ انہیں خود بھی یہ احساس تھا کہ میں بہر حال غلام ہوں۔ اور زینبؓ بہر حال اعلیٰ خاندان کی قریشی خاتون ہیں اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ وہ حضرت زیدؓ کے ساتھ شادی کرنے پر راضی بھی نہیں تھیں۔ محض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعمیلِ ارشاد میں رضامند ہو گئی تھیں۔

تھیں۔ اس لئے ایسی بات منہ سے نکالنا نامناسب ہوگا۔ زینبؓ کے سارے خاندان کو ناگوار ہوگا اور شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی کبیدگی کا سبب بنے۔ لہٰذا انہوں نے ظاہر یہی فرمایا کہ وہ زبان اور لہجہ کی تیز ہیں اور ہروقت جھگڑتی رہتی ہیں اس لئے میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

آیت کی صحیح تفسیر

اس ساری صورتِ حال کو سامنے رکھئے تو واضح ہوجائے گا کہ۔

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ۔

حق تعالیٰ کا ارشاد نہیں ہے اور نہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس کے مخاطب ہیں۔ بلکہ یہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ اور حضرت زیدؓ اس کے مخاطَب ہیں۔ جیساکہ اسی آیت کے پچھلے جملوں میں متکلّم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور مخاطَب حضرت زیدؓ ہیں۔ سلسلۂ بیان شروع سے اسی طرح چلا آرہا ہے۔ اب آپ آیات پر دوبارہ غور فرمائیے۔

"یاد کرو (اے نبی!) جب تم اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام فرمایا اور تم نے بھی انعام فرمایا تھا۔ یوں کہہ رہے تھے:"

اپنی بیوی کو اپنے ہی پاس رکھو (طلاق نہ دو) اور اللہ سے ڈرو (طلاق دینا اللہ کو بھی پسند نہیں۔ یہ تو اَبْغَضُ المباحات ہے) تم اس بات کو چھپا رہے ہو جو تمہارے دل میں ہے (یعنی یہ بات کہ زینبؓ ہی میں نقص ہے اور لوگ الٹا مجھے مطعون کر رہے ہیں) حالانکہ خدا اسے خود ہی ظاہر کر دے گا (کیونکہ زینبؓ کو اگر طلاق دی گئی تو لامحالہ تم بھی دوسری شادی کروگے اور زینبؓ کی شادی بھی کہیں ہوگی اور بات کھل جائے گی کہ نقص تم میں ہے یا زینبؓ میں ہے) اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو (کہ کھل کر بات نہیں کرتے) حالانکہ اللہ اس کا

زیادہ حقدار ہے کہ تم اُسی سے ڈرو (اصل بات ظاہر نہ کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ غیر کفو میں نکاح ہونے کی وجہ سے نباہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ ناکامی کی وجہ دوسری ہے) یہ تمام کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اور شروع سے آخر تک پورے کلام کے مخاطب حضرت زیدؓ ہیں۔ پھر خدا نے اس بات کو یوں واضح کر دیا کہ اس کے بعد حضرت زیدؓ نے حضرت ام کلثومؓ بنت عقبہ سے شادی کی اور ان سے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک زید ابن زید اور دوسرے رقیہ بنت زید۔ اور حضرت زینبؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمالیا اور وہاں بھی ان سے کوئی اولاد نہ ہوسکی۔ بات واضح ہوگئی کہ اولاد پیدا نہ ہونے میں حضرت زینبؓ ہی کے کسی نقص کو دخل تھا نہ کہ حضرت زیدؓ کے نقص کو۔

آپ غور فرمائیں کہ آیات کس قدر صاف اور واضح ہیں محض متکلّم اور مخاطب کو بدل دینے سے ہمارے مؤرخین، محدثین اور مفسرین نے کس قدر ظلم فرمایا ہے جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ آپ حضرت زیدؓ کے ساتھ چال چل رہے تھے کہ دل سے تو چاہتے تھے یا جانتے تھے کہ زیدؓ زینبؓ کو طلاق دیدیں اور میں ان سے نکاح کر لوں مگر ظاہر میں ان پر زور دے رہے تھے کہ تم زینبؓ کو طلاق نہ دو۔ انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ اسی کو تو منافقت کہتے ہیں۔

نیز آپ چاہتے تھے کہ۔ زینبؓ سے خود نکاح کرلیں۔ لیکن لوگوں سے ڈرتے تھے کہ بیٹے کی بیوی سے شادی کر لینے پر لوگ کیا کہیں گے اور اس پر حق تعالےٰ کو تنبیہہ فرمانی پڑی کہ خدا سے ڈرنے کے بجائے آپ لوگوں سے کیوں ڈرتے ہیں اگر آپ ایسا ہی ڈرتے ہیں تو لائیے خود ہم آپ کا نکاح زینبؓ سے کئے دیتے ہیں۔

حالانکہ خود اس سے اگلی آیت میں حق تعالےٰ نے خود تصریح فرمادی ہے کہ انبیاءً کرام ہمیشہ سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتے چنانچہ ارشاد ہے کہ۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ (۳۳/۳۹)

ترجمہ: جو لوگ (انبیاء) اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور وہ اللہ سے ڈرتے ہیں اور بجز اللہ کے کسی اور سے نہیں ڈرتے۔ اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

ذرا آیت کریمہ میں زورِ بیان پر غور فرمائیے۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ

ترجمہ: جو لوگ (انبیاء) اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور وہ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں۔

انہی الفاظ سے بات پوری ہوگئی ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ انبیاء کرام صرف اللہ ہی سے ڈرتے ہیں۔ لیکن صرف ان الفاظ پر ہی اکتفاء نہیں فرمایا جا رہا ہے۔ بلکہ آگے مزید زور دے کر اسی بات کو پھر ثابت کیا جا رہا ہے۔

وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ

ترجمہ: اور وہ بجز اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتے۔

اس کے بعد پھر اسی مسئلہ کو مزید ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرے اور اللہ کو اس کی خبر نہ ہو۔ وہ حساب و کتاب رکھنے میں کافی ہے۔ اس کے پاس سب کے اعمال اور نیتوں کا حساب موجود ہے۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝

ترجمہ: اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

توکیا حق تعالےٰ آیت نمبر (۳۳/۳۷) میں یہ فرماکر کہ۔

"اے محمد! تم تو لوگوں سے ڈرتے ہو اور اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ لیکن تم ایسا نہیں کر رہے۔ تم پر لوگوں کا خوف طاری ہے"۔

پھر آیت نمبر (۳۳/۳۹) میں یہ بتا کر کہ۔

"جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں یعنی نبی ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف اور صرف اللہ ہی سے ڈرا کرتے ہیں۔ وہ کسی انسان سے نہیں ڈرا کرتے"۔

یہ بتانا چاہتا ہے کہ اے محمد تم میں انبیاء کی صفات موجود نہیں ہیں اس لئے معاذ اللہ، معاذ اللہ تم نبی ہونے کے اہل نہیں ہو۔ تم نبی نہیں ہو؟ ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ آگے چل کر لوگ ان آیات میں تحریف کریں گے۔

آیت کی غلط تفسیر اور وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ۔

کا مصداق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بنانے کی کوشش کریں گے اس لئے ان کی اس غلط تاویل کی جڑ کاٹنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی یہ آیت رکھدی ہے۔ کہ اے تہی عقل اور کوتاہ اندیش لوگو، تم یہ کیسی تفسیر کر رہے ہو کہ یہ بتا رہے ہو کہ ہمارا رسول لوگوں سے ڈرا کرتا تھا۔ اللہ سے نہیں ڈرتا تھا۔ یہ سراسر غلط ہے۔ ہمارے رسول پر بہتان ہے۔ ہمارے نبی پر اتہام ہے۔ جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچانے پر مامور ہوتے ہیں اور مقامِ نبوت پر فائز ہوتے ہیں وہ کبھی لوگوں سے نہیں ڈرا کرتے وہ تو صرف اللہ سے ڈرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اے کوتاہ اندیش لوگو، یاد رکھو کہ خدا کے

حضور تمہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی کہ تم نے ایسی غلط تفسیریں کر کے ہمارے نبی کے دامنِ عصمت کو کیوں داغدار کیا تھا اور اللہ کے ہاں تمہارے یہ سب کرتوت تمہارے اعمال ناموں میں محفوظ ہیں اور وہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

غرض یہ کہ صحیح مفہوم کو نظر انداز کر کے غلط روایات کی بنیاد پر تفسیریں کرنے سے مستشرقین اور مغربی مصنفین کو طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں کرنے کا موقعہ دیا گیا جس کے نتیجے میں انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مطعون کیا اور آپ پر پھبتیاں کسی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حالانکہ آیات میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ شروع سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کا سلسلہ چلا آ رہا ہے جس کے مخاطب حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ جملے بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام ہی کا حصہ ہیں اور مخاطب وہی زیدؓ ابن حارثہ ہیں۔

حضرت زینبؓ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی زاد بہن ہیں عربوں میں عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اسلام آ جانے کے بعد بھی اٹھارہ سال تک مسلمان عورتوں میں پردہ کا رواج نہیں تھا۔ ۵ھ میں خود حضرت زینبؓ ہی کے ولیمہ میں پردہ کے احکام نازل ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہزار بار حضرت زینبؓ کو دیکھا ہوا تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ حضرت زید کا نکاح نبوت کے ایک سال بعد یا ایک سال پہلے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عین نبوت کے سال میں حضرت زینبؓ کی عمر سترہ سال ہوتی ہے اور یہی شادی کا وقت ہے (کیونکہ وہ ۵ھ میں پینتیس سال کی تھیں) یہ وہ وقت تھا کہ حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور آپ

خود شادی کے ضرورت مند تھے۔ اگر حضرت زینبؓ پر آپ (نعوذ باللہ) اتنے ہی فریفتہ تھے تو جب آپ نے حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ سے نکاح فرمایا حضرت زینبؓ سے نکاح کیوں نہ فرمالیا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف آنحضرت کے تعمیلِ ارشاد میں حضرت زیدؓ سے نکاح کر سکتی تھیں تو کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو انکار کر سکتی تھیں ظاہر ہے کہ ہرگز انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ لہٰذا وہ افسانے جو ہمارے مؤرخین، مفسرین اور محدثین نے گھڑے ہیں وہ محض مَن گھڑت افسانے نہیں تو اور کیا ہیں؟

حضرت زینبؓ سے زیدؓ کی شادی سلہ نبوت میں

حضرت زینبؓ سے

حضرت زیدؓ کی شادی سلہ نبوت میں ہوئی ہے۔ (اس سے واضح ہوگیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ حضرت زیدؓ سنِ بلوغ کو پہنچے تو حضرت زینبؓ سے شادی ہوگئی بالکل غلط ہے) سلہ نبوت میں حضرت زینبؓ سترہ سال کی تھیں اور حضرت زیدؓ پینتیس ۳۵ سال کے تھے۔ حضرت زینبؓ سے پہلے ان کا نکاح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام ایمنؓ سے کر دیا تھا۔ جن سے اسامہ بن زیدؓ پیدا ہو چکے تھے۔ سلہ یا سلہ میں حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ کیونکہ ان کو طلاق دینے کے بعد انہوں نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں اور کی ہیں اور پہلی بیوی ام کلثومؓ بنت عقبہؓ سے ان کے دو بچے بھی پیدا ہوئے ایک زید ابن زید اور دوسری رقیہ بنت زید۔ ان تمام مراحل کے لئے ہمارے نزدیک سات آٹھ سال ضرور ہونے چاہئیں۔ اور چار پانچ سال تک حضرت زینبؓ بیوگی کی زندگی بسر کرتی رہیں۔ ان سے کسی کی شادی نہ ہو سکی کیونکہ وہ مزاج اور زبان کی تیز تھیں اور لاولد تھیں حضرت زیدؓ کے ساتھ تیرہ چودہ سال میں بھی ان

کے کوئی اولاد نہ ہوسکی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ حضرت زینبؓ میں کوئی نسوانی نقص بھی موجود تھا۔ عام قاعدہ ہے کہ کچھ لوگ حضرت زیدؓ میں اس کی وجہ سے نقص نکالتے ہوں گے۔ تو کچھ لوگ حضرت زینبؓ میں بھی نقص نکالتے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ حضرت زید نے اپنے خاص ہم راز دوستوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا ہو۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم تھی چنانچہ وہ فرما رہے تھے کہ جو اصل بات ہے اسے تم چھپا رہے ہو، تو کچھ اور لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہو جانا بعید از امکان نہیں۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی بیوہ بہن (پھوپھی زاد) کو پناہ دینے کے لئے جسے کوئی قبول نہیں کر رہا تھا۔ اور جس نے محض آپ کی تعمیل ارشاد میں اپنی مرضی کے خلاف حضرت زیدؓ سے شادی کی تھی۔ ۵ھ میں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اس میں کوئی بھی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ باقی وہ سب کہانیاں جو ہمارے راویوں نے گھڑ گھڑ کر پیش کی ہیں ان میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ نقلی طور پر بھی وہ سب موضوع ہیں اور عقلی طور پر بھی ناقابلِ اعتبار و اعتماد ہیں۔

ان تفصیلات کے بعد یہ بات ظاہر ہے کہ حافظ ابن حجر اور حافظ ابن کثیرؒ کا یہ فرمانا کہ۔

ایک سال اور کچھ اوپر تک تو یہ گھر بسا لیکن پھر ناچاقی شروع ہو گئی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اصابہ اور اسد الغابہ نیز فتح الباری کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت زینبؓ سے حضرت زیدؓ کی شادی ان کو متبنیٰ بنانے کے بعد ہو گئی تھی اور حضرت زیدؓ کو متبنیٰ اسلام سے بہت پہلے بنا لیا گیا تھا۔ تاہم چونکہ حضرت زینبؓ اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں اس لئے متبنیٰ

بنا لینے کے بعد فوراً تو یہ شادی ممکن نہیں ہے لیکن بہر حال ہجرت سے پہلے ہی عین نبوت کے سال یا اس سے ایک آدھ سال پہلے یا بعد میں یہ شادی یقیناً ہوگئی ہوگی۔ کیونکہ ۵ھ میں ان کو طلاق اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح بیان کیا جارہا ہے۔ اگر ایک سال اور کچھ اوپر ہی وہ حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ان کی پہلی شادی تینتیس ۳۳ سال کی عمر میں ہوئی ہے۔

عربوں میں اتنی تاخیر کا رواج قطعاً نہیں تھا کہ تینتیس سال کی عمر تک لڑکیوں کو بلا شادی کے بٹھلائے رکھا جائے۔ جبکہ حضرت زینبؓ کی اس سے پہلے کسی اور مرد کے ساتھ شادی کا کوئی تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ تمام صحابیات کے متعلق احوالِ صحابہ کی کتابوں میں عام طور پر پوری تفصیل کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ وہ کِس کِس کے نکاح میں رہیں۔ تو ایک اُمّ المؤمنین کے متعلق تمام مصنّفین یوں چُپ سادھ لیں اور کچھ نہ بتائیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔

بغیر مہر، بغیر ولی اور بغیر شاہدوں کے نکاح

نیز یہ بات بھی معاذ اللہ سے خالی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نبی کے نکاح میں دے دیا اس لئے ولی کی، ایجاب و قبول کی، مہر اور گواہوں کی ضرورت نہیں رہی۔ حضرت زینبؓ کنواری عورت نہیں تھیں بلکہ وہ ایک بیوہ عورت تھیں۔ بیوہ عورت کے لئے ولی کی ضرورت گو امام شافعیؒ اور امام مالکؒ (امام محمدؒ) کے نزدیک ہوتی ہے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک ولی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم کتاب النکاح میں بتا چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ (ابویوسف) کا قول ہی اقرب الی القرآن ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ سے امام ابوحنیفہؒ امام ابویوسفؒ

اور ہماری تائید ہوتی ہے۔ رہ گیا ایجاب وقبول تو خود حافظ ابن حجر اور علامہ ابن کثیر کی بیان کردہ روایات کے مطابق حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ حضرت زید رض کو پیغام دے کر بھیجا ہے اور حضرت زینب رض نے انکار نہیں فرمایا بلکہ استخارہ کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہیں یعنی وہ اللہ سے پوچھ رہی ہیں کہ اس کی مرضی کیا ہے۔ اگر اس کی مرضی اس نکاح کی ہوئی تو حضرت زینب رض کو بھی منظور ہے اور اگر حق تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی تو البتہ پھر یہ کہا جائے گا کہ حضرت زینب رض کو بھی منظور نہیں ہو گا۔ اُدھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اپنی مرضی بتا دی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت زینب رض کے پاس تشریف لے گئے تو آپ نے ان کو لامحالہ یہ بتایا ہو گا کہ حق تعالےٰ نے یہ وحی بھیجی ہے۔ لہٰذا حق تعالےٰ کی مرضی معلوم ہو گئی اور جس چیز کے لئے تم استخارہ کر رہی تھیں وہ خدا نے وحی کے ذریعہ سے ظاہر کر دیا ہے۔ لہٰذا ایجاب وقبول دونوں پائے جا رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ ایجاب وقبول کے بغیر ہی یہ نکاح ہو گیا، غلط ہے۔ یہ بات ہم اس روایت کو صحیح مان کر کہہ رہے ہیں کہ اس روایت کے مطابق بھی ایجاب وقبول پایا جا رہا ہے۔ ویسے درحقیقت ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ اور اس کے برعکس صحیح روایات پیش کریں گے۔

اس کے بعد یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ نکاح بغیر مہر کے عمل میں آگیا تھا۔ واضح رہے کہ نکاح کے وقت مہر کا ذکر ضروری نہیں ہے۔ البتہ مہر واجب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر نکاح کے وقت یہ شرط کر لی جائے کہ شوہر کسی قسم کا کوئی مہر نہیں دیگا تو امام مالک رح کے نزدیک نکاح نہیں ہوتا۔ لیکن امام ابوحنیفہ رح، امام شافعی رح اور امام احمد ابن حنبل رح اور اکثر فقہاء کے نزدیک نکاح صحیح ہو گا البتہ مہر لازم ہو گا اور وہ مہر مثل ہو گا۔ یعنی جو اس خاندان کی عورتوں کا مہر

ہوا کرتا ہے اس کے مساوی شوہر کو مہر ادا کرنا ہوتا ہے۔

(دیکھئے کتاب النکاح، باب مہر)

قرآن کریم نے ہر نکاح کے لئے مہر لازم کیا ہے تو لامحالہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ دوسری ازواجِ مطہرات کو مہر دیئے ہیں لازماً حضرت زینبؓ کو بھی مہر دیا ہوگا۔ اور اگر نکاح کے وقت روایات میں مفسرین کو مہر کا تذکرہ نہیں ملا تھا۔ تب بھی یہی سمجھنا چاہیئے تھا کہ حضور اکرمؐ نے انہیں مہر مثل دیا ہوگا۔ جب کہ مہر کی واضح روایت موجود ہے۔

اس کے لئے سیرتِ ابنِ ہشام کی اس روایت کو پھر پڑھ لیجیئے جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح ان کے بھائی ابواحمد ابن جحش نے کیا تھا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چار سو درہم ان کا مہر ادا فرمایا تھا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کیونکہ قرآن کریم کی واضح ہدایات اور اصولِ شرعیہ کے عین مطابق ہے تو یہ ساری باتیں ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا ہو جاتی ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ بغیر ولی کے، بغیر مہر کے، بغیر گواہوں کے اور بغیر ایجاب وقبول کے یہ نکاح ہوا، قرآن کریم کی آیت زَوَّجْنٰكَهَا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ نکاح خود فرما دیا تھا اور زمین پر کوئی نکاح نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس نکاح کا فیصلہ ہم نے کر دیا ہے اور جو رکاوٹ اس میں تھی کہ زینبؓ آپؐ کے منہ بولے بیٹے کی بہو تھیں اس کو ہم نے دور کر دیا ہے۔

بغیر شاہدوں کے نکاح

اس کے بعد یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نکاح بغیر شاہدوں کے ہوا۔ یہ بھی غلط ہے۔

جب حضرت زینبؓ کے بھائی حضرت ابواحمدؓ ابن جحش نے آپ کا نکاح کیا تھا تو کیا

بغیر شاہدوں ہی کے کر دیا تھا ؟ علاوہ ازیں جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اور اس میں "زَوَّجْنٰكَهَا" فرمادیا گیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس وحی کو لوگوں تک پہنچایا، پڑھوایا اور لکھوایا ہوگا جیسا کہ آپ کی عادت شریفہ تھی۔ تو جن لوگوں کے سامنے آپ نے اس وحی کی تلاوت فرمائی تھی، جن لوگوں سے اس وحی کو پڑھوایا تھا اور جن لوگوں سے اس وحی کو لکھوایا تھا۔ کیا وہ سارے کے سارے اس نکاح کے گواہ نہیں تھے؟ یقیناً وہ سب کے سب اس نکاح کے گواہ تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اس نکاح کے گواہ نہیں تھے اور یہ نکاح بغیر گواہوں کے ہوا قطعاً غلط ہے۔ علاوہ ازیں کتاب النکاح باب الشہادات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ نکاح کے لئے امام مالکؒ نے گواہوں کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ اعلان کو ضروری قرار دیا ہے۔ اور قرآن کریم کے الفاظ بھی بڑی حد تک اس کی تائید میں ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۭ (۵/۵)

ترجمہ: آج سب پاکیزہ چیزیں (اے مسلمانو!) تمہارے لئے حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا (ذبیحہ) جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا (ذبیحہ) ان کے لئے حلال ہے، اور مؤمن پاکدامن عورتیں اور اُن لوگوں کی پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے بھی حلال ہیں جب تم اُنہیں ان کے مہر دے دو بشرطیکہ تم اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے ہو، شہوت رانی کرنے والے اور خفیہ یارانے گانٹھنے والے نہ ہو۔

نیز سورۂ نساء میں کنیزوں سے نکاح کر لینے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ (۴/۲۵)

ترجمہ: تو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر سکتے ہو اور انہیں دستور کے مطابق ان کا مہر ادا کرو، وہ پاکدامن ہوں، شہوت رانی کرنے والی اور خفیہ یارانے گانٹھنے والی نہ ہوں۔

ان دونوں آیات میں مردوں اور عورتوں دونوں کو خفیہ طور پر یارانے گانٹھنے اور جنسی تعلق قائم کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ جو کچھ ہو وہ دستور کے مطابق علانیہ طرفین کی رضامندی سے ہونا چاہیئے۔ اس سے اعلان ہی کی تائید ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ ہر موقعہ اور ہر وقت اعلان ممکن نہیں ہوتا اس لئے حنفیہؒ اور عام فقہاء نے ضرورۃً دو گواہوں کو اس اعلان کا قائم مقام قرار دے دیا ہے۔ اور اس حقیقت کو دیگر آیات سے مستنبط کیا ہے۔ تو دراصل ضروری تو اعلان ہی ہے۔ اور دو گواہ اس کے قائم مقام ہیں اور یہاں اعلان پایا جا رہا ہے جو دو گواہوں سے بھی زیادہ ہے۔ نیز صحیحین کی روایت میں مذکور ہے کہ آپ نے حضرت زینبؓ کا ولیمہ بھی کیا ہے اور اس ولیمہ میں لوگوں کو گوشت روٹی کھلایا ہے۔ تو کیا یہ ولیمہ اعلانِ نکاح کے بغیر ہی ہو گیا تھا؟

حضرت زینبؓ کے پاس آنحضرتؐ بغیر اطلاع چلے گئے؟

اس کے بعد روایت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وحی نازل ہونے کے بعد، اسی وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بغیر اطلاع اور بغیر اجازت حضرت زینبؓ کے

ہاں چلے گئے۔ یہ بات بھی مغالطہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اپنی بہن کی مرضی سے ان کے بھائی نے ان کا باقاعدہ نکاح کیا ہے۔ اس نکاح کا اعلان ہو چکا تھا۔ حضرت زینبؓ آپ کی زوجہ مطہرہ بن چکی تھیں۔ حضرت زینبؓ کو بھی معلوم تھا اور عام مسلمانوں کو بھی، اس کے بعد تو شوہر کو اپنے بیوی کے پاس جانے کے لئے کسی قسم کی اجازت درکار نہیں ہوتی۔ کونسا شوہر اپنی بیوی کے پاس اجازت لے کر یا اعلان کر کے جاتا ہے؟

غرضیکہ اس روایت میں جس قدر باتیں بیان کی گئی ہیں وہ سب اس مفروضہ پر مبنی ہیں کہ آپ پر خدا کی وحی نازل ہوئی اور آپ اس وحی کا اعلان فرمائے بغیر چپ چپاتے فوراً ہی حضرت زینبؓ کے پاس چلے گئے۔ یہ مفروضہ ہی غلط ہے اس لئے تمام دعوے غلط ہیں۔ یا یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ رسمی محفلِ نکاح مرتب کئے بغیر اور قاضی، رجسٹرار اور خطبہ نیز وکیل اور ولی کی موجودہ رسومات کے بغیر نکاح ہی نہیں ہو سکتا اور بزعمِ مفسرین یہاں ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی گئی حالانکہ یہ رسوم کسی کے نزدیک بھی ضروری نہیں ہیں۔ اور اگر ضروری ہوں بھی تو سب چیزیں موجود تھیں۔

اس سے پہلے ہم تفصیل کے ساتھ ان روایات پر اور ان کے مضمرات پر بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ ان روایات میں جس قدر دعوے کئے گئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ سب سے پہلے یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ حضرت زیدؓ اپنی بیوی زینبؓ کو طلاق دے دیں گے اور وہ میرے نکاح میں آئیں گی۔ اس کے باوجود حضورؐ نے اس راز کو تو اپنے دل میں چھپایا۔ اور بظاہر حضرت زیدؓ کو یہ نصیحت فرماتے رہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، کھلی ہوئی منافقت تھی جو معاذ اللہ، معاذ اللہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم سے کسی درجہ میں بھی متوقع نہیں ہے۔ یہ دعویٰ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ۔

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ۔

میں حق تعالیٰ کو متکلم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب تسلیم کیا جائے۔ حالانکہ یہ سیاقِ کلام کے خلاف ہے۔ شروع سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم متکلم اور حضرت زیدؓ مخاطب چلے آرہے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ سیاقِ کلام کو یکسر تبدیل کر کے ان آیات میں حق تعالیٰ کو متکلم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ان آیات کا مخاطب مانا جائے۔ (تفصیل گذر چکی ہے۔)

مسند احمد کی روایت میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دے کر حضرت زید ابن حارثہؓ کو حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا عجیب دعویٰ ہے جسے درایت تسلیم نہیں کرتی۔ صحابہ میں بے شمار لوگ ایسے موجود تھے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ، حضرت زبیرؓ ابن العوام اور حضور کے چچا حضرت عباسؓ جو خود قریش سے تعلق رکھتے تھے (آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار اور حضرت زینبؓ کے بھی عزیز تھے) یہ سب حضرات اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے تھے پھر ان کو چھوڑ کر آپ حضرت زیدؓ کا انتخاب فرمائیں جو حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ جن سے ان کی کبھی بنی نہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بیٹے کی جگہ تھے عقل کے خلاف ہے۔ نکاح کا پیغام کسی بزرگِ خاندان یا مقتدر شخصیت کے ہاتھ بھیجا جاتا ہے۔ ماتحتوں اور بیٹوں کے ذریعہ نہیں بھیجا جاتا خصوصاً ایسوں کے ہاتھ جن سے مرسل الیہا کی ہمیشہ سے اَن بَن چلی آتی ہو۔

حضرت زینبؓ کا استخارہ

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ حضرت زینبؓ نے فرمایا۔

"میں اللہ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی، ٹھہرو، میں خدائے تعالیٰ سے استخارہ کر لوں اور وہ کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگیں"۔ الخ

حالانکہ اس سے پیشتر یہ آچکا ہے کہ۔

"حضرت زیدؓ پیغام لے کر حضرت زینبؓ کے پاس گئے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں"۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زیدؓ پیغام لے کر حضرت زینبؓ کے پاس گئے تو وہ دن کا وقت تھا، وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ مگر جب حضرت زیدؓ نے ان کو نکاح کا پیغام پہنچایا تو انہوں نے فرمایا ٹھہرو، میں استخارہ کر لوں اور وہ کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کسی قسم کا استخارہ تھا۔ عام طور پر روایات کے ذریعہ سے جو استخارہ کا مسنون طریقہ پہنچا ہے وہ تو یہ ہے کہ جب آدمی سونے لگے تو دو رکعت نماز پڑھے اور ایک خاص استخارہ کی دعا پڑھے اور قبلہ رخ ہو کر سو جائے اگر ایک دن میں دل مطمئن نہ ہو تو مسلسل سات روز تک ایسا ہی کرتا رہے۔ اس طرح آدمی کا دل ایک بات کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور تردد دفع ہو جاتا ہے لیکن یہ استخارہ جو حضرت زینبؓ کرنے کے لئے کھڑی ہوئیں اور نماز کی نیت باندھ لی، وہ یہ مسنون استخارہ تو یقیناً نہیں تھا۔ وہ قطعاً کوئی ایسا ہی استخارہ تھا جیسا کہ ہمارے ہاں شیعہ حضرات میں رائج ہے کہ نماز کی نیت باندھی اور جاگتے ہوئے ہی کوئی اتفاقیہ امر (CHANCE) ظاہر ہو گیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہ کام کرنا چاہیئے یا نہیں۔ یہ قطعاً فال نکلنے یا نجمتر

کے قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے جو قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ ہم نے اس پر واقعۂ افک کی بحث میں قرعہ اندازی کے ذیل میں تفصیلی تنقید کی ہے۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ بہرحال یہ استخارہ والی بات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت موضوع ہے اور اس کے وضع کرنے میں یقیناً کسی شیعہ کا ہاتھ ہے۔

بہرحال یہ روایات قطعاً اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے جیسا کہ اس باب کی بہت سی روایات کو حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے رد فرما دیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ ان کو ذکر کیا جائے۔ یہی حال خود ان حضرات کی بیان کردہ ان روایات کا بھی ہے۔

صحیح بات یہی ہے کہ ان آیات میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو نصیحت فرما رہے ہیں کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، خدا سے ڈرو، جو اصل بات ہے اسے کیوں چھپاتے ہو، خدا اسے خود ظاہر کر دے گا۔ لوگوں سے کیوں ڈرتے ہو، خدا کا خوف کرو، اور جو اصل بات ہے اسے صاف صاف کہو، الخ

خلاصۂ مبحث

اب آپ دیکھئے کہ اس صحیح واقعہ کے آئینہ میں تینوں حضرات کا کردار کس قدر بلند نظر آ رہا ہے۔ حضرت زیدؓ کو دیکھئے۔ بیوی میں نسوانی نقص ہے۔ وہ ان سے جنسی تعلق ہی قائم نہیں کر پا رہے۔ مگر چوں کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سگی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ اس لئے ان کے احترام میں زبان پر حرف شکایت نہیں لاتے اور پندرہ سولہ سال اسی طرح بسر ہو جاتے ہیں۔ بالآخر چونکہ اولاد کی خواہش ہر مرد میں فطری ہوتی ہے۔ اس لئے پندرہ سولہ سال کے بعد طلاق دینے کا ارادہ کرتے ہیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔

حضرت زینبؓ کا کردار بھی انتہائی بلند ہے کہ پندرہ سولہ سال تک حضرت زیدؓ کے ساتھ نباہ کرتی رہیں. عورتوں میں بہ نسبت مردوں کے اولاد کی خواہش کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے. شوہر ان سے جنسی تعلق قائم کرنے میں برابر ناکام رہا ہے. وہ اپنے نزدیک اس میں حضرت زیدؓ ہی کو قصوروار سمجھتی ہیں مگر پندرہ سولہ سال تک قطعاً حرف شکایت زبان پر نہیں لاتیں اور انتہائی شریفانہ طور پر ان کے ساتھ نباہ کرتی چلی آرہی ہیں. شریعت نے انہیں خلع کا حق دیا تھا مگر وہ خلع نہیں لیتیں. خود حضرت زیدؓ ہی انہیں طلاق دیتے ہیں.

چار پانچ سال حضرت زینبؓ بیوگی میں بسر کرتی ہیں. ان کی جوانی کا زمانہ ہے. کوئی آدمی ان سے شادی نہیں کرتا. کیونکہ وہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی رہ چکی ہیں. اور اس نے بھی انہیں طلاق دے دی. وہ کوئی اولاد پیدا نہیں کر سکیں. لوگوں میں زینبؓ اور زیدؓ کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں. کچھ لوگ حضرت زیدؓ کو مطعون کرتے تھے تو کچھ حضرت زینبؓ کو بھی مطعون کرتے رہے ہوں گے. آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو چکا تھا کہ زینبؓ میں کیا نقص ہے اور کیوں زیدؓ نے انہیں طلاق دی ہے اور کیوں لوگ ان سے نکاح نہیں کر رہے. ان تمام باتوں کے باوجود، حضرت زینبؓ کی درخواست پر (کیونکہ ابن ہشام کی روایت کے مطابق جو اوپر گذر چکی ہے، حضرت زینبؓ نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا تھا) اور اس مصلحت کی خاطر کہ عرب کی اس رسم کو توڑنے کے لئے کہ منہ بولے بیٹے کی بہو سے شادی نہیں کی جا سکتی. حق تعالیٰ کے ارشاد پر آپ نے ان کو اپنے دامن رحمت و عافیت میں پناہ دے دی. کیونکہ وہ ایک عالی نسب قریشی خاتون تھیں اور انہوں نے آنحضرت ہی کے تعمیل ارشاد میں ایک آزاد کردہ غلام سے شادی کرنا منظور

کیا تھا مگر یہ شادی ناکام رہی اور طلاق ہو گئی لہٰذا حضرت زینبؓ کا یہ حق تھا کہ ان کی اشک شوئی کی جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے شادی فرما کر ان کا یہ حق ادا فرمایا اور ایک غلط رسم کو توڑا۔

غرض یہ کہ اصل اور صحیح واقعہ کی بنا پر حضرت زیدؓ، حضرت زینبؓ اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تینوں کی عظمت اُبھرتی اور نمایاں ہوتی ہے جب کہ مشہور عام غلط روایات کی بنا پر تینوں نعوذ باللہ ملزم قرار پاتے ہیں اور تینوں کا کردار خصوصاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا (توبہ توبہ) انتہائی پست معلوم ہوتا ہے۔

اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمیں کیا تسلیم کرنا چاہیئے۔

موہوبات و تخییر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق تیسرا اور چوتھا افسانہ یہ ہے

③ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نو یا گیارہ ازواج مطہرات تھیں اور اس کے بعد بھی آپ کو اجازت تھی کہ جو عورت خود کو آپؐ کی خدمت میں پیش کرے آپ اسے بغیر مہر کے گھر میں ڈال لیں۔

④ اور یہ کہ آپ کی ازواج مطہرات اخراجات کے سلسلہ میں آپ سے جھگڑتی رہتی تھیں۔ اس لئے آپ نے ان کو اختیار دیدیا تھا کہ اگر دنیوی زیب و زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں ساز و سامان دیکر رخصت کر دوں اور اگر اللہ اور اس کے رسول کو چاہتی ہو تو خدا نے تمہارے لئے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

حالانکہ نہ پہلا افسانہ درست ہے، نہ ازواج مطہرات کے جھگڑنے کا افسانہ درست ہے۔

موہوبات اور تخییر کا معاملہ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کے خلاف معاندین اسلام اور دشمنان دین متین نے جہاں بہت سے خلاف واقعہ افسانے تراشے ہیں۔ ان میں یہ دو افسانے بھی شامل ہیں۔

پہلا افسانہ تو یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نو[9] یا گیارہ[11] ازواج مطہرات تھیں اور اس کے بعد بھی آپ کو اجازت تھی کہ اگر کوئی عورت اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہے تو آپ بغیر مہر ادا کئے اسے اپنے گھر میں ڈال سکتے تھے۔ اس طرح آپ کے لئے عیش پرستی کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے اور آپ کو حق تعالیٰ نے عام لوگوں کی بہ نسبت تیس[30] مردوں کے برابر قوت رجولیت (SEXUAL POW.ER) عطا فرمائی تھی اور آپ ایک رات میں تمام ازواج مطہرات کے پاس دورہ فرمالیا کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو دینی مشاغل، مذہبی فرائض، مملکتی ذمہ داریوں مشرکین و منافقین کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں اور اپنی عبادت و ریاضت سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ آپ ان

دنیوی مشاغل کی طرف توجہ فرما سکتے۔ وہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ جس ذات اقدس واعظم نے اپنی پوری جوانی انتہائی پاکبازی اور زہد وریاضت میں گذار دی اور صرف ایک بیوہ خاتون پر اکتفاء کیا وہ پچپن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اتنا عیش پسند کیسے ہو سکتا ہے۔ راتوں کو عبادت وریاضت سے جس کے قدم ہائے مبارک متورم ہو جاتے ہوں، سال میں مسلسل دو دو مہینے اور ہر مہینہ میں دس دس دن روزے رکھتا ہو، اس کے متعلق اس قماش کی ہرزہ سرائیاں اتہام طرازی کا شرمناک شاہکار ہی کہی، جا سکتی ہیں۔

دوسرا افسانہ یہ تراشا گیا ہے کہ ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن اجمعین آپ کو دنیوی سازوسامان کے لئے پریشان کرتی رہتی، تھیں اور آپ نے ایک مرتبہ ایک ماہ تک ان سے ایلاء فرمالیا تھا اور ایک ماہ گذر جانے کے بعد آپ نے ان کو اختیار دے دیا تھا کہ اگر تم دنیوی عیش وعشرت کی خواہاں ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال وسامان دے کر رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور یوم آخرت کی نعمتوں کو چاہتی ہو تو کاشانۂ نبوی میں قیام کر سکتی ہو۔ چونکہ یہ دونوں افسانے خلاف واقعہ ہیں اس لئے مندرجہ ذیل مضمون میں ان دونوں افسانوں کی قرآن کریم کی روشنی میں حقیقت واضح کی گئی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

کتاب النکاح باب المہر (جلد اول) میں ہم تفصیل کے بتا چکے ہیں کہ نکاح کے لئے مہر ضروری ہے۔ بغیر مہر کے کوئی نکاح نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی جس قدر نکاح فرمائے تمام ازواج مطہرات کو مہر ادا فرمایا۔ روایات سے یہی ثابت ہے۔ کسی روایت میں یہ بات نہیں ملتی کہ فلاں ام المؤمنین کو آپ نے مہر نہیں دیا تھا۔

ام المؤمنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے متعلق بعض روایات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ چونکہ ان سے آپ کا نکاح آسمان پر حق تعالیٰ نے خود فرمادیا تھا۔ لہٰذا آپ نے زمین پر ان سے نہ نکاح فرمایا نہ گواہ بنائے اور نہ مہر دیا اور بلا اطلاع ان کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت زینبؓ کے سلسلہ میں ہم گذشتہ باب میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے متعلق بھی یہ تمام دعاوی غلط ہیں۔ روایات سے ثابت ہے کہ ان کا نکاح خود ان کے بھائی نے کیا تھا۔ حضرت زید ابن حارثہؓ کو آپ نے نکاح کا پیغام دے کر ان کے پاس بھیجا تھا۔ اور آپ نے ان کو بھی مہر دیا تھا۔ بہر حال اس سلسلہ میں ہمارے علماء مفسرین نے جس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہے

موہوبات کے متعلق آیتِ احزاب

سورۂ احزاب میں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ لِكَیْلَا یَكُوْنَ عَلَیْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ

تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡہُنَّ ... ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُہُنَّ وَلَا یَحۡزَنَّ وَیَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَہُنَّ کُلُّہُنَّ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا ۝ (پ ۲۲ ۵۰-۵۱)

ترجمہ: اے نبی! ہم نے آپ کے لئے آپ کی ان بیویوں کو حلال کیا ہے جنہیں آپ ان کے مہر دے چکے ہیں نیز ان عورتوں کو جو آپ کی ملک یمین میں ہوں جو خدا نے آپ کو عطا کی ہوں اور آپ کی چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو اور وہ مؤمن عورت جو اپنا نفس نبی کو ہبہ کردے بشرطیکہ نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ حکم (کہ اپنا نفس ہبہ کرنے والی عورت خواہ حرّہ ہو یا ملک یمین مؤمن ہو غیر مسلم نہ ہو) آپ کے لئے مخصوص ہے۔ عام مؤمنین کے لئے نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے عام مؤمنین پر ان کی بیویوں کے بارے میں اور ملک یمین کے بارے میں کیا فرض کیا ہے۔ (یہ خصوصی احکام آپ کے لئے اس لئے ہیں کہ) آپ کسی تنگی میں نہ پڑ جائیں اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ (اے پیغمبر اسلام!) ان میں سے جسے آپ چاہیں مؤخر رکھیں اور جسے چاہیں اپنے پاس جگہ دیں۔ اور ان میں سے بھی جنہیں آپ نے الگ کر دیا تھا جسے آپ چاہیں اپنے پاس جگہ دیں۔ اس میں آپ پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اس سے قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہوں۔ اور سب کی سب اس پر راضی رہیں جو کچھ آپ انہیں مرحمت فرمادیں۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اور اللہ جاننے والا اور بُردبار ہے۔

ان آیات میں حق تعالےٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ، مخصوص احکام نازل فرمائے ہیں جن میں سب سے اہم یہ بات سمجھی گئی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مؤمن عورتوں سے (موجودہ بیویوں کے بعد بھی) جبکہ وہ اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہیں، ان سے نکاح فرمالینا جائز تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں عام مسلمانوں کے لئے حکم

کے برخلاف مشہور یہ ہے کہ کاشانۂ نبوی میں نو یا گیارہ ازواج مطہرات موجود تھیں تو آپؐ کے سلسلہ میں بات یوں بنتی ہے کہ نو یا گیارہ بیویوں کے باوجود آپ کو اجازت تھی کہ آپ مزید نکاح بھی فرما سکتے ہیں۔ اسے مستشرقین اور معاندین اسلام نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عیش پرستیوں کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ نو یا گیارہ بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی عورتیں اپنا نفس آپ کو ہبہ کرتی تھیں اور آپ انہیں بھی گھر میں ڈال لیتے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نو یا گیارہ بیویوں کی تعداد ان موہوبات کو شامل کر کے ہی پوری ہوتی ہے اور موہوبات و ازواج میں ذرا سا فرق بھی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پس منظر اس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات کی صحیح صورت حال سامنے لائی جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ عربوں میں نکاح کے لئے بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی بلکہ عربوں کے علاوہ دوسری قوموں میں بھی ان کی کوئی تعداد متعین نہیں تھی۔ بنی اسرائیل میں لاتعداد عورتوں سے شادی کر لینے کا رواج تھا۔ تورات میں ایسے انبیاء کرام اور بزرگوں کے نام لئے گئے ہیں جن کی متعدد بلکہ سینکڑوں بیویاں تھیں (مثلاً داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام وغیرہ) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے پورا عہد شباب یعنی ۲۵ سال سے ۵۰ سال کی عمر تک صرف ایک بی بی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ گذارا اور اسی پر کفایت فرمائی۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد ایک ساتھ دو نکاح فرمائے۔ ایک تو حضرت

سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے جو کا فی کبیر السن بیوہ تھیں اور دوسرے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے جو منگنی کے وقت سولہ سال کی اور رخصتی کے وقت ۱۹ سال کی کنواری لڑکی تھیں (تفصیل گذر چکی ہے) اس شادی کا مقصد دو خاندانوں میں محبت، یکجہتی اور یگانگت کی ترقی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قربانیوں کا اعتراف تھا۔

ہجرتِ مدینہ منورہ کے بعد آپ نے چند اور نکاح کئے۔ ان نکاحوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کی عورتیں تھیں ایک وہ جو رؤسا قبائل کی لڑکیاں تھیں اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لئے تعلقات کی توسیع اور اضافہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اور حضرت حفصہؓ حضرت فاروق اعظمؓ کی بیوہ صاحبزادی تھیں۔ اور اسلام اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں، حضرات کی خدمات اور قربانیاں اور قریش مکہ میں ان کی سربرآوردہ ہونے کی حیثیت ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیانؓ رئیس مکہ کی بیوہ صاحبزادی تھیں۔ بنو امیہ میں ان کی حیثیت غیر متنازعہ تھی۔ حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی المصطلق کی رئیس زادی تھیں۔ اور حضرت صفیہؓ بنت حیيؓ رئیس خیبر کی نازپروردہ تھیں، اور دونوں شادی شدہ تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوا باقی ازواج مطہرات نہ صرف بیوہ تھیں۔ بلکہ سن رسیدہ تھیں، گویا اس طرح آپ نے ان کی کفالت کا بار اٹھایا تھا۔ چنانچہ حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، اور حضرت زینبؓ ام المساکینؓ یہ سب سن رسیدہ بیوائیں تھیں۔ ایک اور بیوی حضرت زینبؓ بنت جحش گو بیوہ نہ تھیں لیکن مطلقہ تھیں۔ ان کے شوہر (حضرت زیدؓ)

نے انہیں طلاق دیدی تھی۔ اور طلاق کے بعد ان کا کہیں نکاح نہیں ہوا تھا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے اس کتاب کا تیسرا عنوان) اس تفصیل سے آپ کی کثرت ازدواج کے اسباب منکشف ہو جائیں گے۔

اس کی تصریح نہیں ملتی کہ سورۂ احزاب کے یہ مخصوص احکام کب نازل ہوئے۔ لیکن اس بنا پر کہ آپ نے آخری نکاح حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ۷ھ میں ادائے عمرہ کے زمانہ میں فرمایا ہے اور اس کے بعد آپ کا کوئی نکاح ثابت نہیں۔ (طبقات ابن سعد جزء نساء صفحہ ۹۴ مطبوعہ یورپ)

اس لئے ان احکام کے نزول کی تاریخ اسی ۸ھ کو قرار دیا جا سکتا ہے ۸ھ میں اسلام کی طاقت اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ خیبر، طائف اور مکہ معظمہ فتح ہو چکے تھے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تعلقات مصاہرت کے ذریعہ سے قبائل کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مفتوحہ علاقوں کی کثرت اور لوگوں کے جوق در جوق مسلمان ہونے کی وجہ سے (یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا) آپ کی مصروفیات اور مشاغل بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ غریب سن رسیدہ مسلمان یتیم اور بیوہ عورتوں کی کفالت کی ذمہ داریوں میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا تھا۔

شادیوں کی اجازت نہیں

ان حالات میں آیات احزاب کا نزول ہوا جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ کو مزید شادیاں کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ اس سے پہلے یہ اجازت نہیں تھی۔ بلکہ ان آیات کا نزول اس لئے ہوا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم موجودہ ازواج مطہرات کا بار اٹھانے سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ اب چونکہ حالات ایسے ہو چکے تھے کہ نہ آپ کو اب کثرتِ ازدواج کی ضرورت

تھی اور نہ آپ کے پاس اتنی فرصت تھی اس لئے آپ کی خواہش تھی کہ آپ اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو جائیں۔ اگر ان آیات کا مقصد مزید شادیاں کر لینے کی اجازت دینا ہوتا تو لا محالہ آپ اس کے بعد مزید شادیاں بھی فرماتے ورنہ اس اجازت کا فائدہ کیا ہوا۔ یہ بات ثابت ہے کہ ان احکام کے بعد آپ نے کوئی نئی شادی نہیں فرمائی۔ لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ یہ احکام کوئی خصوصی اجازت نامہ نہیں تھے جیسا کہ آیات کا اندازِ بیان خود بتا رہا ہے۔ بات ان الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ الآية

ترجمہ :۔ اے پیغمبر اسلام! ہم نے ہی تو آپ کے لئے آپ کی ان ازواج کو حلال کیا ہے جنہیں آپ نے ان کا مہر دے دیا ہے الخ

إِنَّا أَحْلَلْنَا کے لفظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ماضی کا صیغہ ہے۔ مستقبل کا صیغہ تو نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس پر بھی غور فرمائیے کہ ہم نے حلال کر دیا ہے کے لئے أَحْلَلْنَا کا لفظ کافی تھا۔ اس کے ساتھ انتہائی تاکید کے لئے إِنَّا (بیشک ہم نے ہی) کا اضافہ بلا وجہ تو نہیں ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آپ کے حبالۂ عقد میں جو ازواج مطہرات تھیں خواہ آپ نے ان سے باقاعدہ مہر ادا کر کے نکاح فرمایا ہو یا بطور مِلک یمین کے حاصل ہوئی ہوں اور آپ نے انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا ہو۔ نیز چچا زاد بہنیں، پھوپھی زاد بہنیں، ماموں زاد بہنیں خالہ زاد بہنیں، نیز وہ مؤمن عورتیں جنہوں نے اپنے تئیں آپ کو ہبہ کر دیا تھا۔ جیسا کہ عام مسلمانوں کے لئے حلال تھیں آپ کے لئے بھی حلال تھیں اور ان کا حلال ہونا آپ کو معلوم تھا۔ جو انواع اس آیت کریمہ میں إِنَّا أَحْلَلْنَا کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ان میں سے بیشتر کاشانۂ نبوی میں پہلے ہی موجود

تھیں۔ باقاعدہ منکوحہ بیبیاں بھی تھیں جنکو آپ نے ان کے مہر ادا کر کے حبالۂ عقد میں لیا تھا۔ مال غنیمت سے مِلک یمین میں آنیوالی بھی تھیں (صفیہؓ، جویریہؓ ماریہ قبطیہ، ریحانہؓ) اپنے نفس کو ہبہ کر دینے والیاں بھی تھیں، (زینبؓ ام المساکین ام شریکؓ، میمونہؓ، ام حبیبہؓ وغیرہ) بہنوں میں ایک پھوپھی زاد بہن (حضرت زینبؓ بنت جحشؓ) بھی تھیں۔ آیات بالا میں بیان کردہ ساری انواع سے تعلق رکھنے والی خواتین آپ کے حبالۂ عقد میں موجود تھیں اور آپ ان کو حلال، سمجھتے تھے۔ حلال سمجھتے تھے جب ہی تو آپ نے ان سے نکاح فرمایا تھا سوال یہ ہے کہ ان آیات سے حق تعالیٰ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو وہ کونسی نئی بات بتانا چاہتے ہیں جو آپ کو اب سے پہلے معلوم نہیں تھی؟

لہٰذا آیات کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ فلاں فلاں قسم کی عورتیں آپ کے لئے ہم اب حلال کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ ان سے نکاح فرمالیجیئے جبکہ معلوم ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپ نے کوئی نیا نکاح فرمایا بھی نہیں۔ اگر یہ حکم آئندہ کے لئے تھا تو آپ نے اس سے کوئی فائدہ کیوں نہ اُٹھایا اور جب آپ نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا تو ان آیات کو نازل کرنے کا فائدہ کیا ہوا۔

ازواج مطہرات کو طلاق دینے کی ممانعت

دراصل بات یہ ہے کہ آپ ان ازواج کو چھوڑنا چاہتے تھے اور حق تعالےٰ کو یہ منظور نہیں تھا حق تعالےٰ آپ کی ازواج مطہرات کو پوری اُمت کی مائیں قرار دینا چاہتے تھے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ۔

(۳۳/۶)

ترجمہ :- پیغمبر اسلام مسلمانوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں اور آپ کی ازواج مؤمنین کی مائیں ہیں۔

چونکہ یہ ازواج مطہرات امت کی مائیں قرار پانے والی تھیں۔ لہٰذا اگر ان کو الگ کر دیا جاتا تو وہ کہاں جاتیں ؟ ان کی حفاظت وصیانت، نان ونفقہ کی ذمہ داری، پرورش اور غور و پرداخت کون کرتا۔ یہ تو ان پر بڑا ظلم ہوتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کو الگ کر دیتے اور وہ غریب کہیں کوئی اپنا ٹھکانا نہ بنا سکتیں۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے آپ کو متنبہ فرمایا کہ ہم نے ہی تو ان سب عورتوں کو حلال کیا ہے اور ہمارے اس حلال کر دینے کی وجہ سے ہی آپ نے ان سے نکاح فرمایا ہے۔ اب آپ ان کو چھوڑ دینے کی کیوں سوچتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی تنبیہہ ہے جیسا کہ سورۂ تحریم میں۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِىْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ

(۶۶/۱)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام ! آپ ان چیزوں سے کیوں باز رہتے ہیں جنہیں اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے۔ آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں۔

آپ کو تنبیہہ فرمائی گئی تھی۔ تحریم کے عنوان میں اسی کتاب میں ہم نے بتایا ہے کہ آپ اپنا نفس ہبہ کرنے والی مخدرات کو اپنے حبالۂ عقد میں قبول نہیں فرما رہے تھے۔ حالانکہ وہ معزز خواتین بڑے خلوص اور جذبۂ ایثار و قربانی کے ساتھ اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی خاطر اپنے آپ کو پیش کر رہی تھیں۔ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی پُرخلوص پیشکش قابل پذیرائی سمجھی گئی تھی۔ لہٰذا آپ کو تنبیہہ فرمانی پڑی۔ اسی طرح سورۂ احزاب کی ان آیات میں جب آپ نے اپنی مصروفیات اور کثرتِ مشاغل اور ضعفِ پیری کے

باعث موجودہ ازواج مطہرات کو خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا چاہا تو آپ کو اس سے منع فرما دیا گیا۔ کہ اے پیغمبر اسلام! ہم نے ہی تو ان ازواج مطہرات کو آپ کے لئے حلال کیا ہے۔ اور ہم نے ہی تو ان کو آپ کے حبالہ عقد میں دیا ہے آپ ان کو کیوں الگ کرتے ہیں۔ آپ کے مشاغل بڑھ گئے ہیں۔ آپ کی مصروفیات زیادہ ہو گئی ہیں اور آپ ان کا بار نہیں اٹھانا چاہتے تو ایک صورت یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ آپ ان سب کو اپنے نکاح میں باقی رکھیں اور حسب دستور ان کی خبر گیری اور پرورش فرماتے رہیں مگر ان سے ازدواجی تعلق نہ رکھیں۔ کچھ ازواج مطہرات کو اپنے قرب خاص سے نوازیں اور کچھ کو ملتوی فرما دیں۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ (۳۳/۵۱)

ترجمہ: جسے چاہیں ان میں سے مؤخر کر دیں اور جسے چاہیں اپنے پاس جگہ دے دیں۔

مگر ایسا کرنے سے پہلے ان سے پوچھ لیں کہ انہیں یہ صورت منظور ہے یا نہیں۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (۳۳/۲۸—۲۹)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! آپ اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی (کی خواہشات) اور دنیوی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں ساز و سامان دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ و رسول (کی خوشنودی) اور آخرت کے گھر (کی عیش و راحت) کو چاہتی ہو تو یقیناً اللہ نے تم میں سے نیکوکار خواتین کے لئے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اگر وہ اس پر راضی ہیں تو ان کو علیحدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کو بالکل علیحدہ کر دینے سے طرح طرح کی نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے قبیلہ کے لوگوں کی ہمدردیاں اور حمایتیں مخالفتوں میں تبدیل ہو جائیں۔

لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (۳۳/۵۰)

ترجمہ: (یہ حکم ہم اس لئے دے رہے ہیں) تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو (اور آپ کسی مشکل صورت حال سے دوچار نہ ہو جائیں) اور اللہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

دوسری طرف اس سے یہ بھی فائدہ ہو گا کہ ازواج مطہرات بھی کسی مشکل صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوں گی اور وہ اطمینان و سکون اور خوش دلی کے ساتھ اپنی زندگی گذار سکیں گی۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۱)

ترجمہ: یہ صورتِ حال اس سے قریب تر ہے کہ ان سب کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔ کوئی غمزدہ نہ ہوں اور سب کی سب اس پر راضی خوشی رہیں جو آپ انہیں عطا فرما دیں۔ خدا خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اور اللہ جاننے والا ہے بردبار ہے۔

اس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو موجودہ ازواج مطہرات کو اپنے حبالۂ عقد میں باقی رکھنے کا حکم دے کر طلاق کی رخصت آپ سے سلب فرما لی گئی اور ان ازواج میں سے چند کو قربِ خاص عطا فرمانے اور بقیہ کو شرفِ زوجیت کے ساتھ ساتھ ارجاء (مؤخر رکھنے) کا حکم دے دیا گیا۔

چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت زینبؓ بنت جحشؓ کو اختیار فرمالیا اور حضرت سودہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت صفیہؓ کو ارجاء (ملتوی اور مؤخر) فرما دیا[1]۔

آیت کی دوسری تفسیر

یہ ساری بحث اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ سورۂ احزاب کی ان آیات کا نزول ۵ھ میں تسلیم کیا جائے جیسا کہ عام مفسرین نے بیان کیا ہے۔ مگر انہوں نے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا۔ عین ممکن ہے کہ یہ صورتِ حالات اس وقت پیش آئی ہو جب عام مسلمانوں کے لئے ہنگامی صورتِ حالات کے پیش نظر تحدید ازدواج کا حکم نازل ہوگیا اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے بعد چاہا ہو کہ تمام مسلمانوں کی طرح آپ بھی صرف چار ازواج پر اکتفاء فرمائیں اور باقی ازواج مطہرات کو خوش اسلوبی کے ساتھ کچھ ساز و سامان دے کر رخصت فرما دیں۔ کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ آپ اپنے لئے کوئی امتیازی صورت اختیار فرمائیں۔ ہمیں یقین ہے (اور یہ یقین آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی روشِ زندگی کے پیش نظر ہے۔ کیونکہ آپ نے اپنے لئے کوئی خصوصی امتیاز حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں فرمائی۔ جو حکم امت کو دیا گیا اس پر آپ نے خود بھی عمل فرمایا بلکہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عمل فرمایا) کہ تحدید ازدواج کا یہ حکم آپ کے ان تمام نکاحوں کے بعد ہی نازل ہوا ہوگا۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری سورۂ احزاب ص ۱۶ ج ۲۲، طبع مصر۔

تحدید ازدواج کا حکم کب نازل ہوا

ہم نے یہ جو عرض کیا ہے کہ تحدید ازدواج کا حکم

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ان تمام شادیوں کے بعد نازل ہوا تھا تو واقعہ یہ ہے کہ کسی مفسر نے تحدید ازدواج کی تاریخ بیان نہیں کی۔ ہم نے تمام متداول ضخیم سے ضخیم تر تفاسیر کی کافی ورق گردانی کی لیکن ان میں سے کسی تفسیر میں اس کی تاریخ نہیں ملی۔ بالآخر ہمیں از خود ہی اس کی تحقیق وتفتیش کرنی پڑی اور ہمیں کتب حدیث میں ایسے تین صحابہ کے اسمأ گرامی ملے جن کے حبالۂ عقد میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی چار سے زیادہ بیویوں کو طلاق دلوادی اور چار بیویاں رکھ لینے کا انہیں حکم دیا۔ وہ تین صحابۂ کرام یہ ہیں (۱) غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ، (۲) نوفل بن معاویہ رضی اللہ عنہ (۳) حارث بن قیس بن عمیرہ اسدی رضی اللہ عنہ۔

حضرت غیلان بن سلمہ رضی اللہ عنہ

حضرت غیلان بن سلمہ رضی اللہ عنہ کے متعلق

مسند احمد، شافعی، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی وغیرہ سے حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں نقل فرمایا ہے کہ۔

وہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے پاس ان کی دس بیویاں تھیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے جن چار کو چاہو۔ رکھ لو باقی کو چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اپنی ان بیویوں کو بھی طلاق دے دی اور اپنے لڑکوں میں اپنا مال بانٹ دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا شاید تیرے شیطان نے بات اُچک لی اور تیرے دل میں یہ خیال جمادیا کہ تو عنقریب مرنے

والا ہے۔ اس لئے اپنی بیویوں کو تونے الگ کر دیا کہ وہ تیرا مال نہ پائیں اور اپنا مال اپنی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی بیویوں سے رجوع کر لے اور اپنی اولاد سے مال واپس لے لے۔ اگر تونے ایسا نہ کیا تو میں تیرے بعد تیری مطلقہ بیویوں کو بھی تیرا وارث بناؤں گا۔ کیونکہ تونے اُنہیں اسی ڈر سے طلاق دی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تیری زندگی بھی اب قریب الختم ہے اور اگر تونے میری بات نہ مانی تو میں حکم دوں گا کہ لوگ تیری قبر پر پتھر پھینکیں جیسا کہ ابورغال کی قبر پر پتھر پھینکے جاتے ہیں"۔

پوری روایت نقل فرمانے کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

"حدیث کا مرفوع حصہ تو ان سب کتابوں میں ہے ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا واقعہ صرف مسند احمد ہی میں ہے۔ لیکن یہ زیادتی حسن ہے اگرچہ امام بخاری نے اسے (یعنی اس زیادتی کو) ضعیف کہا ہے اور اس کی اسناد کا دوسرا طریقہ بتا کر اس طریقہ کو غیر محفوظ کہا ہے مگر اس تعلیل میں بھی نظر ہے۔ واللہ اعلم۔ اور بزرگ محدثین نے بھی اس پر کلام کیا ہے لیکن مسند احمد والی حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور شرطِ شیخین (بخاری ومسلم) پر ہیں۔ سنن نسائی کی ایک اور روایت میں ہے کہ یہ دسوں عورتیں بھی اپنے خاوند کے ساتھ مسلمان ہوئی تھیں"۔

ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر اُردو ص۷ پارہ چہارم۔

مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

حضرت غیلان ثقفی کے متعلق صاحب اصابہ فی اسماء الصحابہ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"غیلان بن سلمہ ابن معتب بن مالک ابن کعب بن عمرو ابن سعد ابن

ثقیف .... فتح طائف کے بعد مسلمان ہوئے اور ان کے پاس زمانۂ جاہلیت میں دس عورتیں (بیویاں) تھیں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں حکم دیا کہ ان میں سے صرف چار عورتوں کو پسند کر کے رکھ لیں۔

(اصابہ فی اسماء الصحابہ صفحہ ۱۷۲/۴ طبع مصر)

طائف کے سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی طبری کے حوالہ سے کہتے ہیں۔ یہاں، ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا۔ نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا۔ عروہ ابن مسعودؓ جو یہاں کا رئیس تھا۔ ابو سفیانؓ (حضرت امیر معاویہؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی۔ کفار مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا۔ یہاں کے لوگ فن جنگ سے بھی واقف تھے۔ طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ ابن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جُرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبّابہ، ضبّور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔ بحوالہ طبری صفحہ ۱۶۶۹/۳ مطبوعہ یورپ

(سیرت النبی جلد اول صفحہ ۵۵۹ مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ اُردو بازار لاہور)

اس سے غیلان ثقفی کی شخصیت پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ وہ بھی عروہ ابن مسعود کے ساتھ طائف کی ایک سرآوردہ شخصیت تھے۔

طائف کا محاصرہ آپؐ نے جنگ حنین کے بعد کیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی، لکھتے ہیں کہ۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مال غنیمت اور اسیران جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا۔ حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے۔ غرض محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبّابہ و منجنیق استعمال

کئے گئے۔ دبّابہ پر اہل قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر اندازی کی کہ اسلامی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا بہت سے لوگ زخمی ہوئے بیس دن تک محاصرہ رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔.............. چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اُٹھالیا جائے۔" (سیرت النبیؐ ص ۵۵۹-۵۶۰ ج ۱)

یہ واقعہ ذی قعدہ ۸ھ کا ہے کیونکہ حُنین کی جنگ شوال ۸ھ میں ہوئی ہے۔ علامہ شبلی ہی لکھتے ہیں۔

"شوال ۸ھ مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی اس سر و سامان سے حنین پر بڑھیں کہ بعض صحابہ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے" لیکن بارگاہ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی۔ (سیرت النبیؐ ص ۵۴۹ ج ۱)

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ شوال ۸ھ میں جنگ حنین ہوئی اور اس کے فوراً بعد آپ نے طائف کا محاصرہ فرمایا۔ یہ واقعہ یقیناً ذوالقعدہ ۸ھ کا ہونا چاہیئے۔ لیکن طائف کو آپ فتح نہ فرما سکے اور آپ کو بیس روز کے بعد محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ غیلان بن سلمہ ثقفی فتح طائف کے بعد اسلام لائے ہیں۔ لہٰذا ان کے اسلام لانے کا واقعہ ۹ھ کے کسی وقت پیش آنا چاہیئے۔

دوسرا واقعہ حضرت حارث بن قیس ابن عمیرہ اسدی کا ہے جسے ، ابوداؤد وغیرہ نے نقل کیا ہے جس کی سند یہ ہے۔

حدثنا مسدّد قال حدثنا هشيم ح حدثنا وهب بن بقية قال اخبرنا هشيم عن ابن ابي ليلى عن حميضة ابن الشمردل عن الحارث ابن قيس۔

مسدد نے حارث ابن قیس ابن عمیرہ کہا ہے اور وہب ابن یقیم نے حارث ابن قیس اسدی کہا ہے۔ حارث ابن قیس کا بیان ہے کہ میں اسلام لایا تو میرے پاس آٹھ عورتیں (بیویاں) تھیں۔ میں نے اس کا ذکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا تو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں سے چار کو پسند کر کے رکھ لو۔"

(سنن ابو داؤد ص ۳۶۵/۲ج مطبوعہ مصر ۱۹۵۰ء)

اس حدیث کو حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں ابوداؤد اور ابن ماجہ کے حوالہ سے حضرت عمیرہ اسدی کے نام سے نقل کیا ہے۔ (یہ دراصل عمیرہ نہیں بلکہ ابن عمیرہ ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ابوداؤد کی روایت میں نقل کیا ہے) روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ۔

"اس کی سند حسن ہے اور اس کے شواہد بھی ہیں۔ راویوں کے ناموں کا ہیر پھیر وغیرہ ایسی روایات میں نقصان دہ نہیں ہوتا۔

(تفسیر ابن کثیر ص ۶/۷ پارہ چہارم طبع نور محمد کراچی)

ناموں کے ہیر پھیر کا جو تذکرہ حافظ ابن کثیرؒ نے کیا ہے اس کا اشارہ خود حارث ابن قیس کی طرف ہے کیونکہ بعض لوگوں نے ان کا نام حارث ابن قیس بتایا ہے جبکہ بعض نے ان کا نام قیس ابن حارث بتایا ہے۔ کسی نے حارث ابن قیس اسدی کہا ہے۔ جبکہ بعض نے انہیں حارث بن قیس ابن عمیرہ کہہ دیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض راویوں نے انہیں عمیرہ اسدی ہی کہہ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تذکرہ مجھے نہ اسد الغابہ میں مل سکا نہ اصابہ میں نہ استیعاب میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد ان کا تذکرہ طبقات ابن سعد میں مل سکا۔

چنانچہ محمد بن سعد کاتب واقدی لکھتے ہیں کہ۔

پھر بنو تمیم کی طرف عیینہ ابن حصن فزاری کا سریہ ہے یہ مقام سُقیا

اور سرزمین بنو تمیم کے درمیانی علاقہ میں پیش آیا تھا۔ یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے محرم ۹؁ھ کا واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عیینہ ابن حصن فزاری رضؓ کو عرب کے پچاس سواروں کے ساتھ جن میں کوئی بھی مہاجر یا انصاری نہیں تھا بھیجا۔ وہ رات کو سفر کرتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے۔ عیینہ بن حصن نے ایک صحرا میں ان پر حملہ کیا وہ اپنے مویشیوں کو چرا کر اپنے گھروں کو جانور لے کر جا رہے تھے۔ جب انہوں نے عیینہ ابن حصن کی جماعت کو دیکھا تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے عیینہ نے ان میں سے گیارہ آدمیوں کو پکڑ لیا۔ پھر پڑاؤ پر انہیں گیارہ عورتیں اور تیس بچے مزید مل گئے۔ وہ انہیں گرفتار کر کے مدینہ لے آئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے رملہ بنت الحارث کے مکان میں انہیں قید کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ ان لوگوں کے سلسلہ میں ان کے چند رئیس حاضر خدمت ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔ عطارد ابن حاجب، زبرقان بن بدر، قیس بن عاصم، اقرع ابن حابس، قیس ابن الحارث، نعیم ابن سعد، عمرو ابن الاہتم، اور رباح ابن الحارث ابن مجاشع۔ جب قیدیوں نے اُنہیں دیکھا تو عورتوں اور بچوں نے آواز سے رونا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ تیزی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دروازہ پر حاضر ہوئے اور لگے پکارنے "اے محمد! ہمارے پاس باہر آیئے۔" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ بلال رضؓ نے نماز کی اقامت (تکبیر) کہہ دی تھی۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے چمٹ گئے اور اپنے قیدیوں کے بارہ میں گفتگو چھیڑ دی الخ

(الطبقات الکبیر لمحمد بن سعد کاتب الواقدی صفحہ ۱۱۶/۲ طبع لیڈن ۱۳۲۵؁ھ)

اس سے ثابت ہے کہ محرم ۹؁ھ تک تو قیس ابن الحارث کافر ہی تھے اور

اپنے قبیلہ کے رؤساء کے ساتھ قبیلہ کے قیدیوں کے بارہ میں گفتگو کرنے کیلئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ اور آٹھ بیویوں میں سے چار کو طلاق دے کر الگ کر دینے اور چار کو رکھ لینے کا حکم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد ہی دیا تھا۔ لہٰذا یہ واقعہ بھی محرم ۹ھ کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔

تیسرا واقعہ حضرت نوفل ابن معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہے جو مسند شافعیؒ کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ حضرت نوفل ابن معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب اسلام قبول کیا اس وقت میری پانچ بیویاں تھیں۔ مجھ سے حضورؐ نے فرمایا ان میں سے پسند کر کے چار کو رکھ لو اور ایک کو الگ کر دو۔ میں نے اس بیوی کو جو سب سے زیادہ بڑھیا اور بے اولاد ساٹھ سال کی تھیں انہیں طلاق دے دی۔

حدیث کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ۔

"پس یہ حدیثیں حضرت غیلان والی پہلی حدیث کی شواہد ہیں جیسا کہ، حضرت امام بیہقی نے فرمایا ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ ص۷ پارہ چہارم طبع نور محمد کراچی)

حضرت نوفل بن معاویہ کے متعلق اسد الغابہ میں ہے۔

"نوفل بن معاویہ بن عروہ۔ اور کہا گیا ہے نوفل ابن معاویہ ابن عمرو الدیلی، قبیلۂ بنو دیل میں سے .... رہ گئے ان کے بیٹے نوفل تو وہ اسلام لائے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ فتح مکہ میں شریک ہوئے اور یہ جنگ سب سے پہلی جنگ ہے جس میں وہ شریک ہوئے۔ مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے حتیٰ کہ یزید ابن معاویہؓ کے عہد میں وہیں وفات

پائی۔ (اسد الغابہ صفحہ ۴۷/۵)

اس سے ثابت ہے کہ حضرت نوفل ابن معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے ذرا پہلے مسلمان ہوئے۔ چنانچہ فتح مکہ کی جنگ ہی وہ پہلی جنگ تھی جس میں وہ شریک ہو سکے۔ اس سے پہلے وہ کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ فتح مکہ رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ۔

غرض ۱۰ رمضان ۸ھ کو کوکبۂ نبوی نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا۔ دس ہزار آراستہ فوجیں ہم رکاب تھیں۔ قبائل عرب راہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلے پر ہے۔

(سیرت النبی صفحہ ۵۲۷/۱ مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ اُردو بازار لاہور)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوفل ابن معاویہ کے اسلام لانے کا واقعہ ۸ھ کے اواخر ہی کا ہے۔ لیکن روایت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ اسلام لاتے ہی آپ نے اُنہیں ایک بیوی کو طلاق دینے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ صرف یہ بتا رہے ہیں کہ میں اسلام لایا تو میرے پاس پانچ بیویاں تھیں پھر مجھ سے حضورؐ نے فرمایا کہ ان میں سے پسند کر کے چار کو رکھ لو اور ایک کو الگ کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حکم آپ نے اُنہیں اسلام لانے کے چند ماہ بعد دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام لاتے ہی دیا ہو۔

اس ساری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ جن تین حضرات صحابہ سے آپ نے چار سے زیادہ بیویوں کو طلاق دلوائی ہے ان میں سے ایک غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ ۸ھ کے بالکل آخر یا ۹ھ کے شروع میں اسلام

لائے ہیں اور دوسرے حضرت حارث ابن قیس اسدی محرم ۹ھ تک کافر تھے۔ اس کے بعد کسی وقت اسلام لائے ہیں۔ تیسرے حضرت نوفل بن معاویہؓ بھی ۸ھ کے آخر میں اسلام لائے ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ ہمیں اور کسی صحابی کے متعلق یہ نہیں مل سکا کہ آپ نے اس سے چار بیویوں سے زیادہ کو طلاق دلوائی ہو۔ اور یہ تینوں حضرات ۸ھ کے آخر میں یا ۹ھ کے شروع میں اسلام لائے ہیں۔ چونکہ اس سے پہلے آپ نے کسی سے چار بیویوں سے زیادہ کو طلاق نہیں دلوائی لہٰذا تحدید ازدواج کا یہ حکم لامحالہ ۸ھ کے آخر یا ۹ھ کے شروع ہی میں نازل ہوا ہو گا۔

ساتھ ہی اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قدیم الاسلام صحابہ میں سے کسی کے ہاں بھی چار سے زیادہ بیویاں نہیں تھیں۔ ورنہ آپ ان سے بھی طلاق دلواتے۔ اسلام نے خواتین کے حقوق کے لئے جو ہدایات دے دی ہیں ان کے ہوتے ہوئے دراصل اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ مسلمان تعدد ازدواج کی، جسارت کر سکتے۔ عورتوں کے حقوق صحیح معنے میں تعدد کی صورت میں ادا ہونا بہت مشکل ہے۔ البتہ ہنگامی صورتِ حالات میں چونکہ یتیم اور بیوہ عورتوں کو اپنے ہی معاشرہ میں کھپانا نہایت ضروری ہے اس لئے غیر معمولی حالات میں اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مسئلہ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے تحدید کا حکم نازل ہونے سے بیشتر بھی تعدد ازدواج کی جرأت نہیں فرمائی۔ لے دے کر ہمیں صرف ان تین صحابہ کی مثالیں مل سکی ہیں جو بالکل آخر میں اسلام لائے تھے اور ان کے پاس چار سے زیادہ بیویاں موجود تھیں۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ آپؐ نے تحدید ازدواج کا حکم نازل ہونے کے بعد کوئی نیا نکاح قطعاً نہیں فرمایا۔ آپ نے سب سے آخری نکاح حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقعہ پر فرمایا ہے اور وہ تحدید کا حکم نازل ہونے سے ڈیڑھ دو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اور کل نو ازواج مطہرات میں چھ ازواج مطہرات وہ ہیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا تھا۔ اگر ان آیاتِ احزاب کا نزول تحدید کا حکم نازل ہونے کے بعد تسلیم کیا جاتا ہے تو تحدید کا حکم نازل ہونے کے بعد ان کو آپ نے (ارجاء) ملتوی فرما دیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہے کہ نو ازواج مطہرات کے ہوتے ہوئے پھر بھی عورتیں آپ کو اپنا نفس ہبہ کر دیتی تھیں اور آپ انہیں اپنے حبالۂ عقد میں لے آتے تھے۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ موہوبات کے سلسلہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ کو یہ اجازت تھی کہ آپ بغیر مہر ادا کئے ان سے نکاح فرما سکتے تھے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جو ازواج مطہرات موہوبات میں سے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا آپ نے مہر ادا فرمایا ہے۔ (اس کی کچھ تفصیل آگے آتی ہے)

موہوبات اور روایت ابن عباسؓ

موہوبات کے سلسلہ میں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی لوگوں کے ذہن میں کچھ الجھنیں رہی ہیں یا معاندین اسلام اور مخالفین کی طرف سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف نازیبا پروپگنڈا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اس کا انکار ہی کر دیا ہے۔ جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ۔

"حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کوئی ایسی عورت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ تھی جس نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا ہو" حضرت یونس بن بکیرؒ فرماتے ہیں۔

"گو آپ کے لئے یہ مباح تھا کہ جو عورت اپنے تئیں آپ کو سونپ دے آپ اسے اپنے گھر میں رکھ لیں۔ لیکن آپ نے ایسا کیا نہیں کیونکہ یہ امر آپ کی مرضی پر رکھا گیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر بائیسواں پارہ صنے)

لیکن قرآن کریم میں اس کا تذکرہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا ہوتا تھا۔ مؤمن عورتیں اپنا نفس آپ کو ہبہ کرتی تھیں۔ خود حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث صحیح بخاری سے نقل کی ہے کہ مجھے ان عورتوں پر غیرت آتی تھی جو اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیتی تھیں۔ اور مجھے بڑا تعجب ہوتا تھا کہ عورتیں اپنا نفس ہبہ کرتی ہیں۔ جب یہ آیت اُتری کہ۔

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ۔ الآیۃ

ترجمہ: تو ان میں سے جنہیں چاہے مؤخر رکھ اور جنہیں چاہے اپنے پاس جگہ دے۔ اور جن سے تو نے یکسوئی کر لی ہے انہیں بھی اگر تم لے آؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں۔ تو میں نے کہا۔ پھر تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر خوب وسعت و کشادگی کر دی۔

(یہ حدیث صحیح بخاری صنے۲ مطبوعہ نور محمد کراچی پر موجود ہے)

نیز خود حافظ ابن کثیرؒ نے ان عورتوں کے نام بھی گنا دیئے ہیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا، یہی وہ ہیں جنہوں نے اپنا نفس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کیا تھا اور حضرت زینب رضی اللہ

تعالیٰ عنہا جنکی کنیت ام المساکین تھی اور ایک عورت بنو ابی بکر بن کلاب سے، یہ وہی ہے جس نے دنیا کو اختیار کیا تھا۔ اور بنو جون میں سے ایک عورت جس نے پناہ طلب کی تھی اور ایک اسدیہ عورت جن کا نام زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہے اور دو کنیزیں تھیں صفیہؓ بنت حیی ابن اخطب اور جویریہؓ بنت حارث بن عمرو بن مصطلق خزاعیہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی عورت حضرت میمونہ بنت حارث تھیں۔ لیکن اس میں انقطاع ہے اور یہ روایت مرسل ہے۔ یہ مشہور بات ہے کہ حضرت زینبؓ جن کی کنیت ام المساکین تھی۔ یہ زینب بنت خزیمہ تھیں۔ قبیلۂ انصار میں سے تھیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی انتقال کر گئیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واللہ اعلم۔ مقصد یہ ہے کہ وہ عورتیں جنہوں نے اپنے نفس کا اختیار آپ کو دیا تھا۔ وہ بہت سی ہیں۔

(تفسیر ابن کثیرؒ ص۲۰-۲۱ پارہ بائیسواں، نیز دیکھئے سیرت ابن ہشام)

ان ناموں میں جو حافظ ابن کثیرؒ نے گنائے ہیں۔ ساری کی ساری آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ہیں یعنی انہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا اور آپ نے ان سے نکاح فرمالیا۔ ان میں سے ایک عورت بنو ابی بکر بن کلاب سے تھیں۔ جو موہوبات کی شرائط کو پورا نہیں کر سکیں اور بنو جون میں سے ایک عورت جس نے کسی غلط فہمی کی بناء پر پناہ طلب کر لی تھی ان کو بھی ہم اس لئے ازواج کے زمرہ سے خارج نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان سے آپ نے نکاح فرمالیا تھا۔ البتہ وہ آپ کے زمرۂ ازواج میں شامل نہیں رہیں۔ بہرحال ایسی عورتوں کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے اپنے تئیں آپ کو ہبہ کیا تھا اور آپ نے ان سے نکاح فرمالیا تھا۔ حافظ

ابن کثیرؒ نے سات نام گنائے ہیں جن میں سے پانچ ہر اعتبار سے ازواج مطہراتؓ میں شامل ہیں۔

ویسے بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور نہ آئندہ ہونے والا تھا تو حق تعالیٰ کو کیا ضرورت لاحق ہوئی تھی کہ ایک ایسے امر کے متعلق آیات نازل فرماتا جو قیامت تک تلاوت کی جائیں۔ حالانکہ حق تعالےٰ کو معلوم تھا کہ نہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے اور نہ آئندہ واقع ہونے کی توقع ہے۔ تو کیا محض تلاوت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے یہ آیات نازل فرمائی گئی تھیں۔ ہمارے خیال میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

موہوبات دراصل کون ہیں

بات دراصل یہ ہے کہ صدر اوّل کے مسلمانوں کی زندگی شدید مشنری جذبہ سے معمور تھی۔ جو لوگ اسلام لاچکے تھے۔ ان پر مکہ مکرمہ میں کیا کیا ظلم نہیں توڑے گئے۔ لیکن ان کے جذبۂ ایمانی میں ذرہ بھر ڈگمگاہٹ پیدا نہیں ہوئی اور وہ اسی جوش و خروش سے اشاعتِ اسلام کے کام میں مشغول رہے حضرت بلالؓ، حضرت عمارؓ، اور ان کا خاندان، حضرت خبابؓ اور حضرت صہیبؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ وغیرہ حضرات کے واقعات تمام اسلامی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

عورتوں کا جذبۂ ایمانی بھی کچھ کم نہیں تھا بیشمار خواتین کے اسماء مبارک آج بھی تاریخ اسلام کے اوراق پر درخشاں ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ اسی مشنری جذبہ اور جوشِ ایمانی کے ماتحت کچھ خواتین ایسی بھی تھیں جنہوں نے اشاعتِ اسلام کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینا چاہی ان کا کوئی دنیوی مقصد نہیں تھا۔ نہ وہ مال و دولت چاہتی تھیں نہ کسی جنسی آسودگی

کی خواہشمند تھیں۔ وہ صرف خدا اور اس کے رسول کی محبت میں اپنی زندگی تج دینے کا عزم صمیم لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتی تھیں اور اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرتی تھیں۔ اسے آپ انسانی کمزوری کہہ لیجئے یا جذبۂ ایمانی کی حرارت کا نتیجہ کہ ہر انسان اپنے سے برتر روحانی قوتوں کے سامنے جھک جانا ہی اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ میں تو اسے جذبۂ ایمانی کی حرارت کا نتیجہ ہی سمجھتا ہوں۔ دُور کیوں جائیے روزانہ اخبارات میں ایسے واقعات سامنے آتے رہتے ہیں کہ جعلی پیروں کے جال میں پھنس کر لوگ اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں حالانکہ نہ وہاں کوئی روحانی قوت ہوتی ہے اور نہ کوئی ملکوتی تقدس۔ صرف کچھ شعبدہ بازیاں ہوتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

جب ان جھوٹی ملمع کاریوں سے انسان اتنا مرعوب ہو جاتا ہے تو جہاں برتر روحانی قوت اور ملکوتی تقدس سچ مچ کار فرما ہو وہاں وارفتگانِ شوق و فدا کارانِ دین اور شیفتگانِ مذہب و ملت کا حال کیا کچھ نہ ہوگا۔ اور عورتیں تو زیادہ ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ ان میں قربانی کا یہ جذبہ مردوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ بہر حال چند خواتین، اسلام کی رضا کار بلکہ فدا کار تھیں جو اسلام کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کا عزم صمیم لے کر آئی تھیں۔ اب بجائے اس کے کہ ان خواتین سے محض ایک رضا کار کی حیثیت سے اسلام کی نشر و اشاعت کا کام لیا جاتے اور یوں گھر میں ڈال لیا جائے — آپ نے اسے پسند فرمایا کہ ان خواتین سے باقاعدہ نکاح فرما لیا جائے حق تعالےٰ نے بھی ان خواتین کے جذبۂ ایمانی اور ذوق قربانی کی پذیرائی میں اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔ کیونکہ پہلی صورت میں دشمنوں کو انگشت نمائی کرنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ لیکن نکاح کر لینے سے طرفین کا مقصد یہ نہیں

تھا کہ کسی طرح کی جنسی آسودگی حاصل کی جائے۔

پھر جیسا کہ عام طور پر مشاہدہ ہے۔ اس قسم کے رضاکارانہ جذبات اور فداکارانہ قربانیاں کافی صبر آزما ہوتی ہیں۔ اور راہ کی صبر آزما مشکلات اور صعوبات ایسی ہوتی ہیں کہ اکثر ہمتیں جواب دے جاتی ہیں اور لوگ تھک کر، بد دل ہو کر، مایوس ہو کر خانہ نشین ہو جاتے ہیں۔ ان رضاکار خواتین میں، دو محترم خواتین ایسی بھی نکلیں جو راہ کی صعوبتوں کو برداشت نہیں کر سکیں اور مشنری جذبہ کے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکیں اُنہیں بھی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ وہ دیانتداری کے ساتھ اپنے مشنری مشاغل سے دست بردار ہو گئیں۔ کیونکہ اُنہیں اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا کہ وہ اس کٹھن راہ پر ثابت قدم نہ رہ سکیں گی۔ لیکن وہ اسلامی تحریک سے الگ نہیں ہو گئیں یعنی اسلام سے نہیں پھر گئیں۔

اس قسم کی خواتین سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق زیادہ تر اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و توسیع کا تھا۔ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں ضرور تھیں۔ اور اسی رشتے سے ہم اُنہیں اُمہات المؤمنین میں شمار کرتے ہیں۔ مگر یہ نکاح ارادۃً جنسی تسکین کے لئے نہیں تھے۔ تاہم جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے۔ وہ آپ کی ازواج مطہرات تھیں۔ اس لئے ان سے جنسی آسودگی حاصل کر لینا شجر ممنوعہ بھی نہیں تھا۔ لیکن جب عام مسلمانوں کے لئے تحدید ازدواج کا حکم نازل ہو گیا اور انہیں ایک ہی بیوی پر اکتفاء کرنے اور ہنگامی حالات میں جبکہ معاشرہ میں بیوہ اور یتیم لڑکیوں کی پرورش اور غور و پرداخت مناسب طریقے پر نہ ہو سکنے کا اندیشہ ہو تو چار تک تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی۔ تو آپ نے بھی چاہا کہ ان تمام

موہوبات کو آپ الگ کر دیں۔ اور خوش اسلوبی کے ساتھ اُنہیں رخصت کر دیں۔ آپ نے سوچا کہ ان معزز خواتین سے جنسی تعلق تو تھا ہی نہیں۔ اب آئندہ ان کو اپنے ساتھ لگائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے آپ کی اس خواہش کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ ایسا کرنا ان پر ظلم ہوتا۔ (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) البتہ آپ کو بھی یہ ہدایت فرما دی گئی کہ آپ تعلق زوجیت صرف چار ازواج سے رکھیں اور باقی ازواج سے (ارجاء) مؤخر فرما دینے کا معاملہ فرمائیں۔

تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ($\frac{۳۳}{۵۱}$)

ترجمہ: ان میں سے جنہیں آپ چاہیں مؤخر فرما دیں اور جنہیں چاہیں اپنے قرب خاص سے نواز دیں۔

اس طرح اب تک جو کچھ عملاً ہوتا آرہا تھا۔ اسے قانونی شکل دیدی گئی اور موہوبات سے جنسی تعلق کی نفی کر دی گئی۔ اس کے بعد آپؐ نے ان موہوباتؓ سے کوئی خصوصی تعلق زوجیت قائم نہیں رکھا۔

عربی زبان میں ارجاء کے معنے۔ مؤخر رکھنا، ملتوی رکھنا، کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا آتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ ($\frac{۹}{۱۰۶}$)

ترجمہ: اور دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے حکم کے انتظار میں ملتوی رکھے گئے ہیں۔ خواہ اللہ انہیں عذاب دے دے خواہ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ٥ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ٥ (۲۶ / ۳۶–۳۷)

ترجمہ: ارکان دولت نے کہا، اس کے اور اس کے بھائی کے معاملہ کو ملتوی رکھیئے اور مملکت کے شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیج دیجیئے جو تمہارے پاس بڑے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں۔

لہٰذا تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ کے معنے یہ ہیں کہ ان میں سے جنہیں آپ چاہیں ملتوی رکھیں، یعنی ان سے کوئی مخصوصی علاقہ (جنسی) نہ رکھیں۔ یہ نہیں ہے کہ آپ اُنہیں طلاق دے دیں۔

بہرحال آپ کو عام مسلمانوں کی طرح (مگر ایک پابندی کے ساتھ کہ مؤمنہ ہو کتابیہ نہ ہو) یہ اجازت بھی کہ آپ ایسی عورتوں سے نکاح فرما سکتے تھے جو خود کو مشنری جذبہ کے ماتحت ہبہ کرنا چاہیں اور قربانی وایثار کے جذبہ سے سرشار ہو کر آپ کے اس قرب کی متمنی ہوں۔ لیکن یہ اجازت بھی لا یحل لک النساء من بعد کے بعد ختم ہو گئی۔

چار ازواج مطہرات

حضرت ابورزین رضؓ کی روایت نے معاملہ کو بالکل ہی صاف کر دیا ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ جو فقہائے حنفیہ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں اپنی احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ۔

ہم سے عبداللہ بن محمد بن اسحٰق نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہم سے حسن ابن ربیع نے حدیث بیان کی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمیں عبدالرزاق نے معمر سے خبر دی، اُنہوں نے منصور سے انہوں نے ابورزین رضؓ سے کہ حق تعالےٰ کے ارشاد تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ کے مطابق التوا میں ڈالی ہوئی ازواج

یہ تھیں۔ میمونہؓ، سودہؓ، صفیہؓ، جویریہؓ، اور ام حبیبہؓ، دوسری طرف عائشہؓ حفصہؓ، ام سلمہؓ اور زینبؓ باری کے دنوں میں برابر درجہ کی تھیں اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان چاروں کے درمیان مساوات کا برتاؤ فرمایا کرتے تھے۔ (احکام القرآن صہ ۴۵۲ ج ۳ مطبوعہ مصر)

اس روایت سے معلوم ہوگیا کہ کاشانۂ نبوی میں صرف چار ازواج مطہرات ایسی تھیں جن سے آپ خصوصیت کا تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک کے لئے ایک دن مقرر تھا۔ اور پانچ ازواج مطہرات ایسی بھی تھیں جن سے آپ کا خصوصی تعلق نہیں تھا۔ نہ اُن کا کوئی مخصوص دن مقرر تھا۔ البتہ وہ ازواج مطہرات میں ضرور شامل تھیں اور تعلیم و تربیت اور تبلیغی مہمات کے سلسلہ میں آپ ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ اسلام کی سچی، فداکار تھیں اور اُنہوں نے اپنی زندگیاں اسلام کے لئے وقف فرمارکھی تھیں اشاعتِ اسلام کا مشن آگے بڑھانے کے لئے ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جاتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کو اجازت تھی کہ آپ موھوبات سے بلا مہر کے بھی نکاح فرما سکتے تھے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان پانچوں موہوبات کو آپ نے مہر ادا فرمائے ہیں۔ سیرت کی تمام کتابوں میں تمام ازواج مطہرات کے مہر مذکور ہیں کہ آپ نے کس بیوی کو کتنا مہر دیا ہے۔

حضرت زینبؓ بنت جحشؓ کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آپ نے ان سے بغیر مہر، بغیر ولی، اور بغیر گواہوں کے نکاح کر لیا تھا مگر سیرت ابن ہشام کے حوالہ سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں۔ آپ نے ان کو بھی مہر دیا تھا۔ (دیکھئے اس کتاب کا تیسرا عنوان حضرت زینبؓ)

پھر آپ یہ بھی دیکھیئے کہ ان چار ازواج مطہرات میں جن کے لئے باری کے ایام با قاعدہ مقرر فرما رکھے تھے۔ ان میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی شامل ہیں جن کے متعلق ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں غالباً ان میں کوئی ایسا نسوانی نقص موجود تھا کہ حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے کوئی جنسی آسودگی حاصل نہیں کر سکے اور بالآخر انہیں طلاق دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

حضرت زید ابن حارثہؓ اور حضرت زینبؓ کے اس معاملہ میں اگر حضرت زید ابن حارثہؓ کے کسی نقص کو دخل نہیں تھا۔ اور حضرت زینبؓ ہی کے نقص کو دخل تھا۔ جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت زیدؓ کے ہاں ام ایمنؓ سے اور حضرت ام کلثومؓ سے اولادیں ہو گئیں تو صرف تین ازواج مطہرات ہی ایسی رہ جاتی ہیں جن سے آپ کے خصوصی تعلقات کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اصل زوجۂ محترمہ

——— حقیقت میں تو جو تقرب اور خصوصیت کاشانۂ نبوت میں حضرت عائشہؓ کو حاصل تھی وہ نہ حضرت حفصہؓ کو حاصل تھی۔ نہ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت زینبؓ بنت جحش کو حاصل تھی۔ اور یہ ایسی بات تھی کہ تمام صحابہ تک کو معلوم تھی اور خود ان ازواج مطہرات کو بھی معلوم تھی جن کی باری کے دن باقاعدہ مقرر تھے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ۔

آپ کی اصل زوجۂ محترمہ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں چنانچہ صحابۂ کرام تحائف اور ہدایا اسی دن بھیجا کرتے تھے جب حضرت عائشہؓ کی باری کا دن ہوتا تھا۔ ہر سفر سے واپسی پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سب

سے پہلے حضرت عائشہؓ ہی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ ہر اہم معاملہ کی ابتداء آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی فرماتے تھے چنانچہ آیات تخییر نازل ہوئیں تو آیات کو سنانے کے لئے آپ سب سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ہی تشریف لے گئے۔ حتیٰ کہ آخری مرض الوفات میں باقی ازواج کی اجازت سے آپ نے حجرۂ عائشہؓ ہی میں قیام فرمایا اور اسی حجرہ میں جان، جان آفریں کے سپرد فرمائی۔ اور اسی حجرہ میں آپ کی ابدی قیام گاہ قرار پائی۔ ان سارے حقائق سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی اصل زوجۂ مطہرہ صرف اور صرف حضرت ام المؤمنین سیدۂ کائنات عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ہی تھیں۔ باقی ازواج مطہرات سے آپ کا تعلق پرورش، پناہ اور تعلیم و تربیت کا تھا۔

اس کے بعد ان آیات پر غور فرمائیے جن کو خدانخواستہ آپ کی عیش پرستیوں کی دلیل بنایا جاتا ہے۔ پہلی بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے آپ کے لئے آپ کی ازواج مطہرات کو حلال کیا ہے جن کو مہر دے کر آپ نے ان سے نکاح فرمایا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ آپؐ کے پاس بھی ہنگامی حالات ہونے کی وجہ سے چار ازواج مطہرات تھیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ان چار میں سے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنی کبرسنی اور ضعیفی کے پیش نظر جب اپنے حقوق سے دستبرداری اختیار فرمالی تو آپ نے حضرت زینبؓ بنت خزیمہ ام المساکین سے نکاح فرما لیا جو موہوبات ہی میں سے تھیں۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جلد ہی داغ مفارقت دے گئیں۔

دوسری بات

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ مال فئے میں سے بھی آپ کو جو مِلک یمین حاصل ہوئیں۔ وہ بھی آپ کے لئے حلال تھیں۔ آپ آزاد فرما کر ان سے بھی نکاح فرما سکتے تھے اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تمام مسلمانوں کو اس کی اجازت تھی اور ہر مسلمان کے گھر میں ایسی خواتین موجود تھیں۔ رہ گئی یہ بات کہ آپ کو چار کے بعد بھی اسکی اجازت تھی تو واقعہ یہ ہے کہ تحدید ازدواج کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہر مسلمان کو بھی اس کی اجازت تھی۔ تحدید ازدواج کا حکم ۸ھ کے آخر یا ۹ھ کے شروع میں نازل ہوا ہے اور اس کے بعد عام مسلمانوں کی طرح آپ کو بھی چار سے زیادہ ایسی بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں رہی جن سے آپ خصوصی تعلق رکھ سکیں۔

اس آیت میں تیسری بات

اس آیت میں تیسری بات یہ ہے کہ چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنوں سے بشرطیکہ اُنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو آپ شادی کر سکتے ہیں۔ عام مسلمانوں کے لئے یہ قید نہیں تھی۔ ان کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ مسلمان ہوں لیکن آپ کے لئے یہ شرط عائد فرمادی گئی کہ اُنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو چنانچہ فتح مکّہ کے موقعہ پر ام ہانی رضؓ بنت ابی طالب نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہا لیکن اسی شرط کی بناء پر آپ ان سے نکاح نہ فرما سکے۔ یہ وہی ام ہانیؓ ہیں جن سے آپ نے نبوت سے پہلے پیغام دیا تھا۔ اور ابو طالب نے انکار کر دیا تھا اور جس کے بعد آپ نے ایک بیوہ خاتون یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی تھی۔

چوتھی بات چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے۔ کہ اگر کوئی مسلمان عورت آپ کو اپنا نفس ہبہ کرنا چاہے تو آپ اسلامی اور ملکی مصالح کی خاطر ان سے بھی نکاح فرما سکتے تھے۔ یہ اجازت خصوصی طور پر آپ ہی کو عطا نہیں فرمائی گئی تھی بلکہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی اجازت تھی۔ لیکن یہ اجازت بھی بلا قید نہیں تھی۔ اس میں بھی ایک شرط تھی کہ وہ عورتیں مؤمنہ ہونی چاہئیں جبکہ عام مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے، غرض یہ کہ اس معاملہ میں بھی آنحضرت پر عام مسلمانوں سے زیادہ ایک مزید پابندی ہے کہ آپ کے لئے ان عورتوں سے (موہوبات کی شکل میں) نکاح تو جائز ہے۔ لیکن وہ اہل کتاب کی عورتیں نہیں ہونی چاہئیں بلکہ مؤمن ہونی چاہئیں۔ کیونکہ جس مشنری جذبہ اور ذوق قربانی وخدمت اور شوق خوشنودی خدا اور رسول کے ماتحت ان (موہوبات) سے نکاح کی اجازت دی گئی تھی اس کا امکان مؤمنات ہی سے ہوسکتا تھا۔ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی عورتیں بظاہر کتنا ہی مشنری جذبہ کا، اظہار کرتیں لیکن ان سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے اس اظہار میں صادق ثابت ہوں گی ان سے بجز خفیہ سازشوں کے جال پھیلانے یا اپنی قوم کے لئے جاسوسی کرنے کے اور کوئی توقع نہیں تھی اس لئے شرط لگا دی گئی کہ آپ ان (موہوبات) میں اہل کتاب کی عورتوں کو شامل نہ فرمائیں۔ حالانکہ عام مسلمانوں کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔

پانچویں بات پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اپنی ان ازواج مطہرات میں سے آپ پر یہ پابندی نہیں ہے کہ آپ ان کے لئے باری کے ایام بھی مقرر فرمائیں۔ بلکہ حالات وواقعات کے

مطابق جس کو آپ چاہیں اپنے قرب سے نوازیں اور جس کو مناسب سمجھیں اپنے سے الگ رکھیں۔ البتہ اگر الگ رکھی ہوئی کسی خاتون کو پھر کسی مصلحت کے تحت آپ اپنے قرب سے نوازنا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ ان تمام امور میں ایسی کونسی چیز ہے جس سے عیش پسندی پر دلیل لائی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس یہ صاف نظر آرہا ہے کہ عام مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ پر مزید کچھ پابندیاں ہی عائد فرمائی گئی ہیں، اور عام مسلمانوں کو جن چیزوں کی اجازت ہے آپ کو ان سے بھی منع فرما دیا گیا ہے درحقیقت جس ذاتِ گرامی کو تمام دُنیا اور پوری اُمت کے لئے اسوۂ حسنہ بننا تھا اس کے لئے مناسب بھی یہی تھا صلے اللہ علیہ وسلم وتبارک اللہ احسن الخالقین۔

ضروری تنبیہ آخر میں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے جن جن عورتوں کو حلال کیا گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ آپ کے حبالۂ عقد میں وہ سب عورتیں موجود ہوں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ فلاں فلاں قسم کی عورتیں آپ کے لئے حلال کی گئی ہیں۔ یعنی آپ ان میں سے کسی سے نکاح فرما سکتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ان سب سے نکاح بھی فرمالیں۔ عام مسلمانوں کے لئے سورۂ نساء میں محرّمات (جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں) کا بیان فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ (۴/۲۴)

ترجمہ: اور ان (مذکورہ محرمات) کے علاوہ جو ان کے علاوہ ہوں وہ

سب تمہارے لئے حلال ہیں کہ تم اُنہیں اپنے مالوں کے ذریعہ (مہر دے کر) طلب کرو اپنی عصمت کی حفاظت کے لئے شہوت رانی کے لئے نہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ محرمات کے علاوہ جتنی عورتیں دنیا میں ہیں تم ان سب کو اپنے گھر میں ڈال لو۔ اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا ہے۔ کہ آپ کے لئے کون کون سی عورتیں حلال ہیں۔ کہ ان میں سے آپ اپنی خواہش کے مطابق اگر کسی کو چاہیں تو اپنے حبالۂ عقد میں لے سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب عورتیں چونکہ آپ کے لئے حلال ہیں لہٰذا آپ ان سب کو اپنے گھر میں ڈال لیں مطلب یہ ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات بننے کی صلاحیت فلاں فلاں عورتوں میں ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو موجودہ ازواج مطہرات کو الگ کرنے سے ممانعت فرما دی گئی اور حکم دیا گیا کہ آپ ازواج مطہرات سے یہ دریافت فرمالیں کہ یہ نئی صورتِ حالات انہیں منظور ہے یا نہیں کہ آپ جنسی تعلق صرف چار ازواج مطہرات سے رکھیں گے۔ اور باقی سب حسبِ دستور سابق ملتوی رکھی جائیں گی اگر انہیں یہ صورت منظور ہو تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ اور اگر وہ حیوٰۃ دنیوی کی خواہشات اور زیب و زینت کی خواہشمند ہوں تو آپ بیشک اُنہیں کچھ ساز و سامان دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت فرما دیں۔ چنانچہ آپ نے ازواج مطہرات کو یہ اختیار عطا فرما دیا کہ۔

اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا فَتَعَالَيۡنَ اُمَتِّعۡكُنَّ وَاُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ۝ وَاِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَالدَّارَ الۡاٰخِرَةَ فَاِنَّ

اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ○ (۳۳ / ۲۸-۲۹)

ترجمہ :۔ اگر تم دنیوی زندگی کی خواہشات اور حیاتِ دنیوی کی زیب و زینت کی خواہشمند ہو تو آؤ میں تمہیں ساز و سامان دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم صرف اللہ اور اس کے رسول (کی خوشنودی) کی اور آخرت کے گھر (کی خوشگواریوں) کی طلبگار رہو تو یقیناً حق تعالیٰ نے تم میں سے نیکوکار خواتین کے لئے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

اور اس تخییر کے بعد تمام ازواج مطہرات نے متفقہ طور پر اللہ اور اس کے رسول ہی کو اختیار فرمایا اور کسی نے بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن عافیت سے جدا ہونا گوارہ نہیں فرمایا تو حق تعالیٰ نے ان مخدرات مقدسہ کے اس جذبۂ ایثار و قربانی کو قبول فرماتے ہوئے ان کی قدر افزائی فرمائی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مزید پابند بنا دیا کہ۔

لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِھِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُھُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ ط وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ○ (۳۳ / ۵۲)

ترجمہ :۔ اے پیغمبر اسلام! اس کے بعد آپ کے لئے مزید عورتیں حلال نہیں ہیں اور آپ کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ (موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر) ان کے بدلے میں دوسری بیوی لے آؤ خواہ وہ آپ کو کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگے۔ صرف وہی عورتیں جائز ہیں جو آپ کے قبضۂ قدرت آ چکی ہیں اور اللہ ہر چیز پر نگراں ہے۔

اس آیت کریمہ میں آپ کو مزید کوئی نکاح کرنے کی ممانعت کے ساتھ ساتھ آپ سے طلاق کا حق بھی سلب کر لیا ہے کہ آپ کسی بیوی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی نئی بیوی بھی نہیں لا سکتے۔ یعنی اس حکم کے بعد اب صرف

وہی عورتیں جائز ہیں جو آپ کے ہاتھ کے نیچے، قبضۂ قدرت میں یعنی آپ کے حبالۂ عقد میں داخل ہیں۔

اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ سے مراد اس کے وہ اصطلاحی معنے نہیں ہیں جو عام طور پہ مشہور ہیں بلکہ اس کے لغوی معنے مراد ہیں یعنی جو عورتیں آپ کے قبضۂ قدرت میں داخل ہو چکی ہیں۔ یعنی آپ کے حبالۂ عقد میں داخل ہیں۔ اب وہی آپ کے لئے حلال ہیں۔ مِلک یمین کا وہ تصوّر کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں ان سے بغیر نکاح کے بھی جنسی تمتع جائز ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ نبوت میں کوئی ایسی خاتون نہیں تھیں جن سے آپ نے بغیر نکاح کے جنسی تمتع فرمایا ہو۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا، حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سب کی سب مال غنیمت میں یا بطور فئے کے آئی ہوئی خواتین تھیں مگر آپ نے سب کو آزاد فرما کر ان سے نکاح فرمایا تھا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا تو بالاتفاق ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین میں شمار ہوتی ہیں۔

حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ البتہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق بعض اصحاب سیر و تاریخ نے لکھا ہے کہ۔

"وہ ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین میں سے نہیں تھیں بلکہ سراری میں سے تھیں۔"

لیکن درحقیقت یہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کسی

بھی فقہی توجیہہ کے مطابق کنیز قرار نہیں دی جا سکتیں۔ ہمارے فقہاء کے تصور کے مطابق باندیاں وہی ہو سکتی ہیں جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں۔ جیسا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا تشریف لائی تھیں۔ لیکن وہ دونوں تو متفقہ طور پر ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین میں شامل ہیں۔ البتہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر نہیں آئی تھیں بلکہ اُنہیں مقوقس شہنشاہ مصر نے بطور ہدیہ کے آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا تاکہ ملکی باہمی تعلقات میں استواری پیدا ہو سکے اور جیسا کہ اب سے صدیوں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں فرعونِ مصر نے خیر سگالی کے جذبہ کے ماتحت حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پیش کیا تھا۔ اسی رسم کہن کی تجدید کرتے ہوئے مقوقس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور تحفہ کے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو بھیجا تھا۔ لہٰذا حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فقہی مسلمات کی رو سے بھی مِلک یمین نہیں تھیں۔ علامہ سیوطیؒ نے اس خط کو جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے نامۂ مبارک کے جواب میں مقوقس شہنشاہِ مصر نے لکھا تھا اپنی کتاب حسن المحاضرہ فی اخبار المصر والقاہرہ میں نقل کیا ہے۔

مقوقس لکھتا ہے۔

"حضرت محمد ابن عبداللہ کے لئے مقوقس، قبطیوں کے عظیم رہنما کی طرف سے۔ سلام علیک۔

امابعد! میں نے آپ کا خط پڑھا اور جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اور جس کی آپ دعوت دے رہے ہیں اسے بخوبی سمجھ لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک

نبی کو آنا ابھی باقی ہے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ اس نبی کا خروج شام میں ہو گا۔ میں نے آپ کے ایلچی کا اعزاز و احترام کیا ہے اور میں آپ کو دو لڑکیاں بھیج رہا ہوں، قبطیوں میں ان دونوں لڑکیوں کا بڑا مرتبہ ہے۔ اور کچھ کپڑے بھیج رہا ہوں اور آپ کے لئے ایک خچر بھیج رہا ہوں تاکہ اس پر آپ سواری فرمائیں۔ والسلام

(حسن المحاضرہ فی اخبار المصر والقاہرہ ص ۴۷ ج ۱ مطبوعہ مصر)

مستدرک حاکم میں۔

حدثنا ابو بکر محمد ابن احمد ابن بابویہ قال حدثنا ابراھیم ابن اسحٰق الحربی حدثنا المصعب ابن عبد اللہ الزبیری کی سند سے یہ روایت موجود ہے کہ۔

"پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ماریہ بنت شمعون سے نکاح فرمالیا اور یہ وہی ماریہؓ ہیں جنہیں مقوقس صاحب اسکندریہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں بھیجا تھا اور ان کے ساتھ ان کی بہن سیرین کو بھی بھیجا تھا۔ اور ایک خصی کو جس کا نام مابور تھا بھیجا تھا۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سیرین تو حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادیں۔ یہ والی مصر مقوقس قبطی تھا۔ یہ لوگ نصاریٰ تھے۔ ماریہؓ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاں ذی الحجہ ۸ھ میں ابراہیم پیدا ہوئے اور ان ابراہیم کا انتقال مدینہ میں اٹھارہ ماہ کی عمر میں ہو گیا۔" (مستدرک حاکم ص ۳۵ ج ۴)

مقوقس کے خط کے مضمون سے واضح ہے کہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا مصر میں بھی کسی غلام خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھیں بلکہ وہ وہاں ایک معزز گھرانے کی معزز خاتون تھیں۔ اور مستدرک حاکم کی روایت

سے صراحۃً ثابت ہورہا ہے کہ آپ نے ان سے نکاح فرمالیا تھا۔ چنانچہ طبری نے بھی حضرت ماریہ قبطیہ رضؓ کو ازواج مطہرات ہی میں شمار کیا ہے۔

طبری لکھتے ہیں۔

"اور اللہ نے اپنے رسول کو بنو قریظہ کی ریحانہ بنت زید بطور فئے کے عطا فرمائیں اور حضور کی خدمت میں بطور ہدیہ کے مقوقس صاحب اسکندریہ نے ماریہ قبطیہ کو بھیجا۔ چنانچہ ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کی ولادت ہوئی۔ تو یہ سب کی سب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تھیں جن میں سے چھ کا تعلق خاندانِ قریش سے تھا۔" (طبری صفحہ ۴۱۶ ج ۲ مطبوعہ مصر)

لہٰذا ان تصریحات کے مطابق حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا بھی کنیز نہیں تھیں بلکہ آپ کی منکوحہ تھیں اور ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین میں شامل تھیں۔

حضرت ریحانہ رضؓ بنت زید

سراری کے ضمن میں ایک نام حضرت ریحانہ بنت زید رضی اللہ عنہا کا بھی آتا ہے۔ مگر ان کو بھی طبری نے (جس کا حوالہ گذر چکا ہے) ازواج مطہرات ہی میں شمار کیا ہے اس کے علاوہ حافظ ابن کثیرؒ نے تفصیل کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

واقدی کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی ذئب نے بیان کیا کہ میں نے ریحانہ رضؓ کے متعلق زہری سے پوچھا تو زہری نے بتایا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کنیز تھیں۔ آپ نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح فرمالیا چنانچہ وہ اپنے خاندان میں پردہ کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

واقدی نے کہا ہے کہ یہ حدیث دونوں حدیثوں میں ہمارے نزدیک زیادہ صحیح (ثابت) ہے۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کا شوہر حکم تھا۔ واقدی نے کہا ہے کہ ہم سے عاصم ابن عبداللہ بن حکم نے عمر ابن الحکم سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ریحانہؓ بنت زید ابن عمرو ابن خناقہ کو آزاد کر دیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے پاس تھیں۔ جو ان سے بڑی محبت اور ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں اس کے بعد کبھی سے شادی نہیں کروں گی۔ جب بنو قریظہ گرفتار ہو کر آئے تو تمام قیدی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے۔ چنانچہ ان پیش ہونے والوں میں، میں بھی تھی۔ مجھے آپ نے الگ کر لینے کا حکم دیا۔ آپ کو مال غنیمت میں سے انتخاب کر لینے کا حق ہوا کرتا تھا ـــــــ جب مجھے الگ کر لیا گیا تو آپ نے میرے بارہ میں استخارہ فرمایا۔ چنانچہ مجھے منذر بن قیسؓ کے مکان پر کچھ دن کے لئے بھیج دیا گیا۔ حتیٰ کہ قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ اور عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

ایک روز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے۔ میں شرم کے مارے آپؐ سے چھپ گئی۔ آپ نے مجھے بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور فرمایا اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کر دو تو اللہ کا رسول تمہیں اپنے نفس کے لئے اختیار کر سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ تو جب میں مسلمان ہو گئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح فرمالیا اور مجھے بارہ اوقیہ اور ایک نش (سونا)

مہر میں عطا فرمایا۔ جیسا کہ دوسری ازواج مطہرات کو مہر دیا کرتے تھے اور ام منذر کے مکان میں میرے ساتھ شب عروسی گذاری اور میرے لئے ایسے ہی باری مقرر فرمائی جیسا کہ آپ ازواج مطہرات کے باری کے دن مقرر فرمایا کرتے تھے اور مجھ پر پردہ کا حکم لگا دیا۔ واقدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ریحانہ بہت پسند تھیں اور وہ جو کچھ حضور سے مانگتی تھیں آپ اُنہیں عطا فرما دیتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ صفحہ ۳۰۵-۳۰۶ جلد ۵)

کاشانۂ نبوی میں کوئی مِلکِ یمین نہیں تھی

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ کاشانۂ نبوی میں فقہی اصطلاح کے مطابق مِلکِ یمین نام کی کوئی خاتون موجود نہیں تھیں۔ جن دو خواتین کے لئے اصحاب تاریخ و سیر نے مِلکِ یمین ہونے کا تصور دیا ہے وہ بھی آپ کی منکوحہ تھیں جن لوگوں نے ان کو سراری کہہ دیا ہے وہ محض اس حیثیت سے ہے کہ ابتداءً ان کی آمد کنیزوں کی حیثیت ہی سے ہوئی تھی۔ لیکن آپ نے ان کو آزاد کر کے باقاعدہ ان سے نکاح فرمایا اور اُنہیں اسی طرح مہر بھی عطا کیا تھا۔ جیسا کہ دیگر ازواج مطہرات کو دیا تھا۔ لہٰذا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں جو مَامَلَكَتْ يَمِيْنُكَ کا لفظ آیا ہے تو اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ جو عورتیں فقہی اصطلاح کے مطابق مِلکِ یمین کی حیثیت سے آپ کے گھر میں ہیں۔ کیونکہ اس حیثیت کی تو آپ کے گھر میں کوئی خاتون تھی ہی نہیں اور نہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد کوئی خاتون آئیں۔

لہٰذا لامحالہ ملک یمین کے لغوی معنی مراد ہوں گے یعنی یہ کہ "جو عورتیں

آپ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ زیر اقتدار ہیں۔ آپ کے ہاتھ کے نیچے ہیں۔ یعنی آپ کے حبالۂ عقد میں ہیں"۔ لہٰذا پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ۔

"اے پیغمبر اسلام! اس کے بعد آپ کے لئے مزید عورتیں حلال نہیں ہیں اور آپ کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ (موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر) ان کے بدلے میں دوسری بیویاں لے آئیں۔ خواہ وہ آپ کو کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگیں۔ مگر بس وہی عورتیں جائز ہیں جو آپ کے قبضۂ قدرت (نکاح) میں آچکی ہیں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے"۔

ازواج مطہرات کے فرائض

یہ بات مستقل طور پر طے کر دینے کے بعد کہ آپ نہ موجودہ ازواج مطہرات کو طلاق دے سکتے ہیں نہ مزید کوئی نکاح فرما سکتے ہیں اور ازواج مطہرات کو دنیوی آرائش سے کوئی غرض نہیں ہوگی، نہ وہ دنیوی زندگی کی خواہشات کی طلب گار ہوں گی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم بجز چند خواتین کے باقی ازواج مطہرات سے التوا رکا . . املہ فرمائیں گے۔ البتہ ان کی حفاظت وسیانت اور غور وپرداخت فرماتے رہیں گے۔ ان کی پرورش اور تربیت آپ کا فریضہ ہوگا۔ غرض ان تمام باتوں کو طے کر دینے کے بعد ازواج مطہرات کو بتادیا گیا کہ آئندہ ان کے کیا فرائض و واجبات ہوں گے۔ چنانچہ ازواج مطہرات کو خصوصی خطاب فرمایا گیا۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا ۝ وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِیْمًا ۝ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ

قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (۳۳/۳۰-۳۴)

ترجمہ: اے پیغمبر کی بیبیو! تم میں سے جو کوئی بھی کھلی بیحیائی کی مرتکب ہوگی تو اسے دوگنی سزا دی جائے گی اور یہ بات اللہ پر بڑی آسان ہے۔ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک کام کرے گی اسے ہم اس کا اجر بھی دوگنا کر کے دیں گے اور ان کے لئے ہم نے عزت کی روزی مہیا کر رکھی ہے۔ اے پیغمبر کی بیبیو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو (اس لئے تمہیں خصوصی ہدایات دی جاتی ہیں) اگر تم تقویٰ اختیار کرنا چاہو تو نرم و نازک لہجہ میں باتیں نہ کرو۔ اس سے جن لوگوں کے دلوں میں کچھ روگ ہے (خواہ مخواہ) طمع پیدا ہوتی ہے اُن سے دستور کے مطابق بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں قیام پذیر رہو اور پرانے زمانۂ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر باہر نہ نکلا کرو، نماز قائم رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، خدا تو قطعاً یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! ہر طرح کی گندگی تم سے دُور کر کے تمہیں اچھی طرح پاک صاف کر دے اور تمہارے گھروں میں جن آیاتِ الٰہی اور حکمت کی باتوں کی تلاوت کی جاتی ہے۔ تم برابر ان کا چرچا کرتی رہو۔ بلاشبہ اللہ بڑا مہربان اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے۔

ان آیات کریمہ کے ذریعہ سے وہ فرائض و واجبات واضح کر دیئے گئے جو ازواج مطہرات پر عائد کئے گئے تھے۔

① وہ ان تمام فواحش سے دُور رہیں جو عام طور پر عورتوں میں پائے جا سکتے ہیں۔

② اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی فرمانبرداری کریں۔

③ نرم و نازک لہجہ میں باتیں نہ کریں۔

④ عام شریفانہ دستور کے مطابق باتیں کریں۔

⑤ اپنے گھروں میں قیام کریں۔ سیر و تفریح کے لئے باہر نہ نکلیں۔

⑥ زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگار کر کے گھومتی نہ پھریں۔

⑦ نماز قائم کریں۔

⑧ زکوٰۃ ادا کریں اور لوگوں کو ان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچائیں۔

⑨ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔

⑩ تمہارے گھروں میں جن آیاتِ الٰہی کی تلاوت کی جاتی ہے اور احکامِ الٰہی کے مصالح اور حِکَم کی جو باتیں بیان کی جاتی ہیں ان کا چرچا کریں اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

⑪ حق تعالیٰ کی یہ خواہش ہے کہ اے نبی کی گھر والیو، تم سے ہر قسم کی گندگی اور بُرائی کو دور کر دے اور تمہیں ہر طرح پاک صاف بنا دے۔

اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بھی بتا دیا گیا کہ۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (پ۲۱ ع ۳۳)

ترجمہ: مسلمانوں پر نبی کا حق ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ہے اور آپ کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

اس لئے اُنہیں بھی ازواج مطہرات کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ لہٰذا

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰـہُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ ط اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ط وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ط ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ ط وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَآ اَنْ تَنْکِحُوْٓا اَزْوَاجَہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖٓ اَبَدًا ط اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمًا ۝ (۳۳/۵۳)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوت ایمانی! نبی کے گھروں میں کھانے (وغیرہ) کے لئے بلا اجازت داخل نہ ہوا کرو (کہ جا کر بیٹھ جاؤ، اور) کھانے کے پکنے کا انتظار کرتے رہو۔ لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو گھروں میں جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ، وہاں باتوں میں مشغول نہ ہو جاؤ تمہارا یہ عمل نبی کی اذیت کا باعث بنتا رہا ہے، وہ اپنی حیا کی وجہ سے تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ لیکن اللہ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔ اور جب تم ازواج مطہرات سے کچھ سامان مانگنا چاہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ بات تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہو گی۔ اور تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں ہے کہ تم نبی کو کسی قسم کی ایذا دو اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ تم رسول اللہ کی ازواج سے ان کی وفات کے بعد کبھی بھی نکاح کرو۔ یہ بات اللہ کے نزدیک بڑی ناراضگی کا باعث ہے)

اور اس طرح ازواج مطہرات کی عظمت اور ان کے تقدس کی پوری پوری حفاظت کر دی گئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنھن وارضاھن جمیعًا۔ امین۔

کتابُ الطلاق

طَلَاقٌ ایک تو طَلَقَ سے مصدر ہے جس کے معنے آزاد ہو جانا ہیں اور دوسرے یہ لفظ طَلَّقَ سے اسم ہے۔ اس اعتبار سے اس کے معنے آزاد کرنا ہوں گے طَلَقَ کے معنے ہیں آزاد ہو گیا۔ طَلَقَت المَرْأَۃُ مِنْ زَوْجِھَا۔ عورت اپنے شوہر سے جدا ہو گئی۔ اَطْلَقَ الْاَسِیْرَ قیدی کو رہا کر دیا۔ نَاقَۃٌ طَالِقٌ بلا نکیل کی اونٹنی۔ اَلطَّالِقَۃُ وہ اونٹنی جسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھائے پیے۔ (تاج و محیط)

راغب نے طَلَاقٌ کے بنیادی معنے کسی بندھن سے آزاد کرنا اور نجات دینا بتائے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارۃً شوہر کا بیوی کو نکاح کے بندھن سے آزاد کرنے کے لئے بولا جانے لگا۔ (مفردات القرآن)

جیسا کہ آپ کتاب النکاح میں ملاحظہ فرما چکے ہیں نکاح ایک شرعی معاہدہ ہے۔ قرآن کریم نے اسے بندھن اور گرہ نیز میثاق غلیظ (سخت قسم کا عہد) قرار دیا ہے۔ طلاق اسی بندھن اور گرہ کو کھول دینے اور سخت عہد کو فسخ کر دینے کا نام ہے۔ چنانچہ طَلَّقَ کے معنے ہیں طلاق دے دینا مُطَلَّقَۃٌ طلاق دی ہوئی عورت، اس کی جمع مُطَلَّقَاتٌ ہے۔

قرآن کریم کی رو سے نکاح ایک معاہدہ کا نام ہے جو بالغ مرد اور

عورت کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی وجہ سکون واطمینان بننے کے بجائے اذیت وتکلیف کا باعث بن جائے تو یہ معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق تفصیلی احکام دیئے ہیں کہ اس معاہدہ کے فسخ ہونے کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس کے لئے طریق کار کیا ہوگا۔

طلاق کا طریق کار

اگر شوہر اور بیوی میں ناچاقی ہو اور ایک دوسرے کے حقوق ادا نہ کر رہے ہوں تو اوّل تو انہیں از خود ایک دوسرے کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

واضح رہے کہ میاں بیوی کے درمیان اختلاف اور شقاق کی وجوہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ کھانے پینے پہننے اوڑھنے کے معمولی معاملات عموماً نہیں ہوا کرتے۔ ایسے معاملات کی اتنی اہمیت کبھی بھی نہیں ہوا کرتی کہ نوبت قطع تعلقات تک پہنچ جائے۔ عام طور پر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی اور مخالفت کی سب سے بڑی وجہ جنسی بے توجہی اور بے رغبتی ہوا کرتی ہے۔ عورتوں کو اپنے شوہروں کے متعلق جب یہ بداعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ شوہر کو میری طرف توجہ نہیں ہے وہ دوسری عورتوں کی طرف رغبت رکھتا ہے تو یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کو اگر اپنی بیوی کے متعلق یہ شبہ ہو جائے کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس کا میلان کسی اور طرف ہے تو یہ بات مرد کے لئے بھی قابل برداشت نہیں ہوا کرتی اسی کو نشوز کہتے ہیں۔

نُشُوز نشوز اختلاف کی سب سے بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے بھی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

(۴/۱۲۸)

ترجمہ: اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے اعتنائی کا اندیشہ ہو تو ان دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ اپنے درمیان اچھی طرح صلح کر لیں۔ اور صلح کر لینا ہی بہتر ہے۔ (لیکن) نفوس انسانی (ہمہ وقت) حرص و آز کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اور اگر تم حسن سلوک اور تقویٰ سے کام لو تو (بہتر ہے) تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

اس آیت کریمہ میں بتادیا گیا ہے کہ شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے اعتنائی کا اندیشہ اس امر کی دلیل ہے کہ شوہر کا نفس حرص و آز کا شکار ہے جو نہ ہونا چاہیئے اس کے برعکس شوہروں سے تو حسن سلوک اور تقویٰ شعاری کی توقع رکھی جاتی ہے۔ لہٰذا میاں بیوی کو چاہیئے کہ وہ آپس میں صلح و صفائی کر لیں۔ کیونکہ صلح و صفائی کے ساتھ رہنا ہی بہتر ہے۔ اسی کی تاکید کے لئے مزید یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ اسے ہر بات خوب معلوم ہے۔

واضح رہے کہ نُشُوز کے معنے اپنے آپ کو برتر سمجھنا اور دوسرے کو اپنے قابل نہ سمجھنا ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں کہ یہ نَشْزُ الْاَرْضِ سے ماخوذ ہے جو زمین کی اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ (احکام

القرآن) چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس کے معنے مخالفت پر اُتر آنا۔ نافرمانی کرنے لگنا۔ متنفر ہو جانا، جھگڑنا، بدسلوکی کرنا، مقابلہ پر کھڑا ہو جانا ہیں۔

(تاج و ابن فارس)

راغب نے لکھا ہے کہ نُشُوزٌ کے معنے کسی چیز کا اپنے مقام سے ہٹ جانا ہونے ہیں۔ (مفردات) لہٰذا ہر نامناسب اور ناملایم رویہ نشوز کے ذیل میں آتا ہے۔ یہ آیت کریمہ شوہر کے نشوز کے متعلق تھی۔ اگر بیوی کی طرف سے نشوز ہو تو سورۂ نساء ہی میں ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ○ (۴/۳۴)

ترجمہ:- اور وہ عورتیں جن کی بدسلوکی اور نافرمانی کا اندیشہ ہو تو تم انہیں نصیحت کرو۔ اور انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور معمولی طور پر جسمانی سزا دو۔ پھر اگر وہ تمہاری فرمانبرداری کریں تو ان پہ (زیادتی کی) راہیں تلاش نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ بہت بلند اور بڑی شان والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بتا دیا گیا ہے کہ اگر نافرمانی اور بدسلوکی کا اندیشہ عورتوں کی طرف سے ہو تو مردوں کو چاہیئے کہ وہ عورتوں کو نصیحت کریں۔ اور سمجھائیں۔ اگر اس سے بھی بات نہ بنے تو انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دیں اور بے تعلق ہو جائیں۔ اگر پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آئیں تو انہیں معمولی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

آیت مذکورہ بالا ہمارے دور کے علماء کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا ہتھیار سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو نشوز کے لفظ پر غور کرنے کی ضرورت تھی جیسے ہم بیان کر چکے ہیں۔ مزید یہ کہ آیت نمبر (۴/۱۲۸) میں جو پہلے گذر چکی ہے۔ نشوزًا کے

بعد اِعْرَاضًا کا لفظ آ گیا ہے جس سے واضح ہے کہ بات معمولی نان و نفقہ وغیرہ کی نہیں ہے بلکہ جنسی بے توجہی اور بے اعتنائی کی ہے شوہر کو اپنی بیوی کی جانب توجہ اور رغبت نہیں ہے بلکہ اس کی توجہ کسی اور طرف ہے وہ بیوی کو اپنے قابل نہیں سمجھتا بلکہ خوب تر کی تلاش میں ہے۔ یہ ہے نشوز۔ اس سلسلہ میں ہمارے مفسرین نے شانِ نزول کے طور پر ایک روایت بھی پیش کر دی ہے جو میرے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہے لیکن چونکہ اس سے نشوز کے مفہوم پر روشنی پڑ جاتی ہے اس لئے میں اسے نقل کر دیتا ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ۔

"حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو میری طرف توجہ نہیں رہی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف آپ زیادہ مائل ہیں۔ لہٰذا اُنہیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مجھے طلاق نہ دیدیں تو اُنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مجھے طلاق نہ دیں۔ میری باری کا دن آپ حضرت عائشہ کو دیدیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی" (احکام القرآن صفحہ ۳۴۵/۲)

اوّل تو بقول امام احمد ابن حنبلؒ کے تفسیری روایات کی کوئی اصل و بنیاد ہی نہیں ہے۔ دوسرے اس روایت سے علاوہ اس کے کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی اچھا تصوّر نہیں اُبھرتا خود حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا بڑا ہی بھونڈا تصوّر قائم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے بلا وجہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایسی بدگمانی فرمائی تھی۔ ان حضرات کی شان ان باتوں سے بہت بلند ہے۔ بنا بریں میں اس روایت کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ احادیث وضع کرنے والے حضرات زبان اور اُسلوب

بیان پر مکمل عبور رکھتے تھے اور انہوں نے انتہائی چابکدستی سے قِصّے کہانیاں ایسی ہی گھڑھی ہیں جن پر قرآن کے الفاظ سو فیصد فٹ بیٹھ جائیں تاکہ سننے والے ان پر فوراً یقین کر لیں۔ لہٰذا ان روایات کی بھی کچھ نہ کچھ قدر و قیمت ہے کیونکہ ان سے الفاظ کے معانی و مفاہیم سمجھنے میں ہمیں مدد مل سکتی ہے۔

اس کے بعد ہم آیت نمبر (۴/۳۴) کو لیتے ہیں جسے ہم نے عورتوں کے نشوز کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ اس آیت کریمہ کے سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو وہی "نُشُوزَهُنَّ" کے مفہوم کی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ تو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن خصوصی طور اس آیت کریمہ میں "نُشُوزَ" سے کیا مراد ہے۔ اسے خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں واضح فرما دیا ہے۔ یہ خطبہ کافی طویل ہے ہم صرف وہ حصہ نقل کر رہے ہیں جس سے اس آیت کریمہ کے مفہوم پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"عورتوں کے بارہ میں میری عمدہ وصیت یاد رکھو۔ وہ اپنی جوانی تم پر لٹا کر ادھیڑ ہو جاتی ہیں۔ (حدیث میں عَوَانٍ کا لفظ آیا ہے۔ اور عَوَانٌ کے معنے ادھیڑ کے ہوتے ہیں۔ دیکھیئے آیت ۲/۶۸) تمہیں اس صورت میں کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں اس سے زیادہ کا ان پر کوئی حق نہیں کہ اُنہیں ان کی خوابگاہوں میں اکیلا چھوڑ دو۔ اور انہیں ایسی جسمانی سزا دو جو زیادہ اذیت رساں نہ ہو۔ پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو ان پر (زیادتی کی) راہیں تلاش نہ کرو۔ دیکھو، تمہاری بیویوں پر کچھ تمہارے حقوق ہیں اور تمہاری بیویوں کے کچھ تم پر حقوق ہیں۔ تو تمہارا حق بیویوں پر تو یہ ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ان آدمیوں کو براجمان نہ ہونے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو اور تمہارے گھروں میں ایسے آدمیوں کو نہ آنے دیں جنہیں تم ناپسند

کرتے ہو اور دیکھو، ان کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ ان کے لباس اور کھانے پینے میں حسن سلوک سے کام لو۔"

(اس روایت کو ترمذی نے عمرو ابن الاحوص سے اور بخاری و مسلم نے ابن عمرؓ سے بیان کیا ہے۔ جمع الفوائد کتاب الایمان۔ احکام اللعان و ذکر البیعۃ وغیر ذٰلک صفحہ ۱۴۲ ج ۱)

اس روایت سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں "نشوز" سے کیا مراد ہے؟ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے کہ خوابگاہوں میں تنہا چھوڑنے اور معمولی جسمانی سزا دینے کا حق مردوں کو اس وقت ہے جبکہ عورتوں کی طرف سے کھلی بے حیائی کا صدور ہو رہا ہو اس صورت کے علاوہ مردوں کو ان پر کسی زیادتی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت آپ نے آگے چل کر فرما دی ہے کہ مردوں کا حق عورتوں پر کیا ہے؟ وہ حق یہ ہے کہ ناپسندیدہ لوگوں کو تمہارے بستروں پر جگہ نہ دیں اور ناپسندیدہ لوگوں کو تمہارے گھروں میں نہ آنے دیں کیونکہ انہی باتوں سے شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اور شوہروں کے دل میں یہ اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں کہ بیوی کی آنکھیں کسی دوسرے سے لڑی ہوئی ہیں اسے میری طرف توجہ نہیں ہے۔

اس آیت میں دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں ہے بلکہ جماعت کو ہے۔ لہٰذا گھر کا بڑا بزرگ۔ خاندان کا سربراہ حاکم وقت، باپ بھائی، شوہر سب اس میں آجاتے ہیں کہ وہ اوّل عورت کو نصیحت کریں۔ اسے اس کے سونے کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں۔ ان باتوں سے اصلاح نہ ہو تو ایسی جسمانی سزا دیں جو اذیت رسان نہ ہو،

بشرطیکہ معاملہ کھلی بے حیائی کا ہو۔

مصالحتی ٹریبونل | باہمی اختلافات کو دور کرنے کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ شوہر اور بیوی خود ہی مصالحت کی کوشش کریں اور اختلافات کو دور کر لیں۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے اور معاملات دونوں کے بس سے باہر ہو جائیں تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ○ (۴/۳۵)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) اگر تمہیں ان دونوں میاں بیوی کے درمیان باہمی مخالفت کا اندیشہ ہو تو ایک منصف شوہر کے خاندان سے مقرر کرو اور ایک منصف بیوی کے خاندان سے اگر وہ دونوں اصلاحِ حال کی کوشش کریں گے تو اللہ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

اس آیت کریمہ کے ذیل میں امام ابو بکر جصاص رازی تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ چنانچہ سعید ابن جبیر اور ضحاک سے نقل کیا گیا ہے۔ کہ اس آیت کا مخاطب سلطان ہے جس کی طرف میاں بیوی مرافعہ کریں گے لیکن سدی نے کہا ہے کہ اس آیت کے مخاطب بھی مرد اور عورت (میاں بیوی) ہیں۔ ابو بکر (یعنی خود امام رازی) کہتا ہے کہ اَللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ کا خطاب شوہروں کو تھا کیونکہ آیت کی ترتیب اسی پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ آگے حکم ہے

(فَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ) انہیں انکی خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو لیکن یہ خطاب کہ فَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا (اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان باہمی مناقشہ کا اندیشہ ہو) حاکم ہی کو ہونا چاہیئے جو دو فریقوں کے درمیان غور و فکر کر کے تعدی اور ظلم سے ان کو روک سکے۔ کیونکہ شوہر کا معاملہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے اور اسے حکم دیا جا چکا ہے کہ وہ بیوی کو سمجھائے بجھائے۔ اسے خدا کا خوف دلائے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دے۔ اگر پھر بھی وہ باز نہ آئے تو معمولی طور پر اسے جسمانی سزا دے۔ اگر پھر بھی وہ نافرمانی پر قائم رہے تو جسمانی سزا دے لینے کے بعد شوہر کو اب اور کچھ کرنے کا تو اختیار نہیں رہا بجز اس کے کہ اب وہ ایسے حاکم کے پاس مرافعہ لے جائے جو ظالم سے مظلوم کو انصاف دلا سکے اور اس پر اپنا فیصلہ نافذ کر سکے۔ الخ

(احکام القرآن صـ ۲۳۱ ج ۲)

اس کے بعد امام رازیؒ نے تفصیل کے ساتھ فقہاء کے مختلف اقوال بیان فرمائے ہیں کہ ان ثالثوں کو نکاح فسخ کر دینے کا بھی اختیار ہو گا یا نہیں۔ حنفیہ کا مسلک انہوں نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر طرفین کی طرف سے انہیں یہ اختیار دے دیا گیا ہو تو وہ نکاح کو فسخ بھی کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ لیکن ابن عباسؓ، مجاہد، ابو سلمہ، طاؤس اور ابراہیم نخعیؒ کا یہ مسلک بھی نقل کیا ہے کہ دونوں ثالث جو کچھ فیصلہ کر دیں وہ صحیح ہو گا۔

(ایضاً صـ ۲۳۳ ج ۲)

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ میاں بیوی کے درمیان مناقشہ کی صورت میں اگر پہلا مرحلہ ناکام ثابت ہو، یعنی میاں بیوی خود باہمی صلح و صفائی نہ کرسکیں اور معاملات کو نہ سلجھا سکیں تو پھر عدالت سے رجوع کیا جائے (فریقین میں سے کوئی سا فریق بھی عدالت سے رجوع کرسکتا ہے۔) جو دونوں کے خاندان سے ایک ایک ثالث مقرر کردے گی اور دونوں کے بیانات سننے کے بعد بقول فقہائے حنفیہ کے یہ دونوں ثالث کوشش کریں گے کہ جس کی زیادتی ہو اسے سمجھائیں اور دونوں میں صلح وصفائی کرادیں اور اگر ان کی کوششیں بھی بار آور نہ ہوسکیں تو ظاہر ہے کہ جس حاکم نے ان کو مقرر کیا تھا وہ تمام معاملہ کی رپورٹ اسے دیں گے اور پھر وہ اپنے اختیارات سے کام لے کر اس شخص کو مجبور کرے گا جس کی زیادتی ہو کہ وہ اپنے ظلم اور زیادتی سے باز آجائے اور دوسرے فریق کے ساتھ بدسلوکی نہ کرے۔ لیکن اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہیں کرسکتے اور مفارقت کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں ہے تو اگر بیوی کی زیادتی ہو تو وہ اسے خلع پر مجبور کرے گا۔ یعنی وہ اپنے مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دے اور طلاق حاصل کرلے اور اگر شوہر کی زیادتی ہو تو اسے مجبور کرے گا کہ وہ بیوی کو طلاق دے اور اس کا مہر اسے ادا کرے۔

باہمی مناقشہ کی صورت میں ان دونوں مرحلوں سے گذرنا ضروری ہے۔ پہلے مرحلہ میں اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی اور بدسلوکی ہو تو قرآن کریم نے جو تین ہدایات دی ہیں یعنی فَعِظُوهُنَّ (تو انہیں نصیحت کرو) وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (اور انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو) اور وَاضْرِبُوهُنَّ (اور انہیں معمولی جسمانی سزا دو) تینوں ہدایات

بصیغۂ امر وارد ہوئی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ ان مراحل سے گذرنا فرض اور لازم ہے۔ لیکن اگر مرد کی طرف سے نافرمانی اور بدسلوکی کا اندیشہ ہو تو اگرچہ وہاں امر کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا گیا ہے کیونکہ مردوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان کی جانب سے اس قسم کا سلوک نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ باہر لوگوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ کاروبارِ حیات میں ہر سرد وگرم سے انہیں گذرنا پڑتا ہے۔ مختلف طبائع کے انسانوں سے انہیں ہر وقت سابقہ پڑتا رہتا ہے اس لئے ان کی نگاہ میں عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی اور اخلاق میں زیادہ وسعت ہونا ضروری ہے۔ اس لئے وہاں۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ

ترجمہ:۔ دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ اپنے درمیان اچھی طرح صلح کر لیں۔ اور صلح کر لینا ہی بہتر ہے۔

کے الفاظ فرمائے گئے ہیں۔ لیکن دوسرے مرحلہ میں پھر

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ

ترجمہ:۔ تو ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے خاندان سے مقرر کر دو۔

میں فَابْعَثُوْا امر کا صیغہ لایا گیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم وقت یعنی عدالت سے مرافعہ کرنا ضروری ہے اور عدالت کا فرض ہے کہ وہ ایک ثالثی ٹریبیونل قائم کرے جو تمام معاملات کی تحقیق کر کے اسے رپورٹ دے اور اس کے بعد عدالت خود طلاق یا خلع کا فیصلہ کرے۔ اس مرحلہ سے گذرنا بھی فرض اور لازم ہے۔

یہ ہے صحیح راہِ عمل جو قرآن کریم اس سلسلہ میں تجویز کرتا ہے۔ ہمارے

ہاں صدیوں سے مردوں کو اس بات کی عادت سی پڑ گئی ہے کہ وہ بات بے بات طلاق دینے پر اُتر آتے ہیں۔ اس غلط عادت کو چھڑانے اور یہ بات ذہن نشین کرانے کے لئے کہ طلاق ان دونوں مرحلوں سے گذرنے کے بعد ہی دی جاسکتی ہے۔ نیز یہ کہ طلاق بغیر عدالت کی اجازت کے نہیں دی جاسکتی، حکومتِ وقت کو کوئی ایسا قانون بنانا چاہیئے کہ لوگ اس حق کو غلط طریقہ پر استعمال نہ کرسکیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ان مراحل سے گذرے بغیر ہی طلاق دے دے تو وہ طلاق معتبر نہ مانی جائے یا ایسا کرنے والے کو قید اور جرمانہ کی دونوں سزائیں دی جاسکیں۔ ایسی صورت میں شوہر کو مجبور کیا جانا چاہیئے کہ وہ طلاق سے رجوع کرے جیسا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے غلط طریقہ پر طلاق دیدینے پر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو رجوع کرنے کا حکم دیا تھا۔

نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں آیات کریمہ مسلمانوں نے محض ثواب کی خاطر تلاوت کرنے کے واسطے رکھ چھوڑی ہیں۔ ان پر مطلقاً کہیں عمل نہیں کیا جاتا۔ یاد رکھیئے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت محض ثواب کی خاطر پڑھنے کے لئے نہیں ہے بلکہ عمل کرنے کے لئے ہے۔ ہمارے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کھلا ہوا مذاق ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

تیسرا مرحلۂ طلاق

دونوں مرحلوں سے گذرنے کے بعد تیسرا مرحلہ طلاق کا آتا ہے جس کے متعلق عدالت سے، اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر عدالت سے اجازت ضروری نہ ہوتی تو عدالت کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب دوسرے مرحلہ

میں عدالت کی مداخلت ضروری قرار دی گئی ہے تو اس سے یہ بات خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ تیسرا مرحلہ عدالت سے اجازت حاصل کرنے کا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے عدالت کی اجازت بھی ضروری کا ہے۔ ان تینوں مرحلوں سے گذرنے کے بعد طلاق دی جاسکتی ہے۔

طلاق کا طریقہ اب طلاق کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے؟ قرآن کریم کی رو سے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰي تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْھِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُھَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۲ / ۲۲۹-۲۳۰)

ترجمہ: طلاق دو مرتبہ ہوسکتی ہے۔ پھر دستور کے مطابق روک لینا ممکن ہے یا حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ جو کچھ تم نے بیویوں کو دیا ہے اس میں سے کچھ واپس لے لو بجز اس صورت کے کہ میاں، بیوی کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پھر اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو ان پر کوئی مضائقہ نہیں کہ بیوی کچھ معاوضہ دے کر خود کو بندھن سے چھڑالے۔ یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں

ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو اللہ کی (مقرر کردہ) حدوں سے باہر قدم رکھے گا تو (یاد رکھو) وہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر بیوی کو (تیسری مرتبہ) طلاق دے دی تو اب وہ شوہر کے لئے حلال نہیں رہے گی حتیٰ کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرلے۔ پھر اگر اس (دوسرے شوہر) نے بھی اسے طلاق دیدی تو اب یہ بیوی اور پہلا شوہر ایک دوسرے کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا خیال ہو کہ اب وہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود کی پابندی کرسکیں گے۔ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں جنہیں وہ ان لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دیتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔

ان آیات کریمہ کا حاصل یہ ہوا کہ میاں بیوی میں اگر نباہ کی کوئی صورت نہ نکل سکے اور دونوں مراحل سے گذرنے کے بعد عدالت بھی شوہر کو طلاق کی اجازت دے دے تو شوہر طلاق دے کر معاہدۂ نکاح کے فسخ کا اعلان کر دے۔ چونکہ معاہدۂ نکاح کا فسخ شریعت کے نزدیک کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ بدرجۂ مجبوری اختیار کیا جاتا ہے اس لئے فسخ معاہدہ کے اعلان کے باوجود قرآن کریم نے گنجائش پھر بھی رکھدی ہے کہ شوہر عدت کے دوران اپنے اس فیصلہ کو واپس[ؑ] (رجوع) لے سکتا ہے۔ اگر تین ماہ کی مدت میں بھی اُسے عقل نہیں آئی اور عدت گذر جانے کے بعد وہ اپنے فعل پر نادم ہو گیا تو پھر بھی اسے اجازت ہے کہ تجدید نکاح کر کے از سر نو دوبارہ معاہدہ کرلے۔

عدت کے دوران ہی اگر اس نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا تھا یا عدت گذر جانے کے بعد اس نے تجدید نکاح کر کے از سر نو معاہدہ کر لیا تھا۔ تو شریعت اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ اُنہوں نے ایک ناخوشگوار صورتِ حال کو ختم کر دیا۔ کیونکہ نکاح محض ایک کاروباری

ؑ بعض حضرات نے رجوع کر لینے کے معنے تجدید نکاح ہی کے کئے ہیں۔ کیونکہ طلاق دینے کے بعد نکاح تو ٹوٹ چکا اب طلاق واپس لینے کی صورت یہی ہے کہ از سر نو نکاح کیا جائے دورانِ عدت میں بھی اور بعد عدت بھی۔

معاہدہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ ایک شرعی معاہدہ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک تقدس بھی رکھتا ہے۔ لیکن اگر شومئی قسمت سے کچھ عرصہ تک تعلقات خوشگوار رہنے کے بعد طبائع کے اختلاف نے پھر اپنا رنگ دکھایا اور تعلقات پھر خراب ہوگئے اور جن مرحلوں سے پہلے گذرا جا چکا تھا۔ انہی دونوں مرحلوں سے گذر کر اتفاق و یگانگت کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگئی اور بالآخر عدالت نے پھر طلاق کی اجازت دے دی اور شوہر نے پھر دوسری مرتبہ فسخ معاہدہ کا اعلان کر دیا۔ یعنی طلاق دیدی تو شریعت اب دوسری مرتبہ بھی یہ رعایت دیتی ہے کہ جس طرح پہلے اُنہیں بعد از خرابیٔ بسیار بالآخر عقل آگئی تھی۔ اب بھی اگر عقل آجائے تو شوہر عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے۔ اگر عدت کے عرصہ میں بھی عقل نہیں آئی تھی لیکن بعد میں عقل آگئی تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اب وہ دوبارہ تجدید نکاح کر کے از سر نو معاہدۂ نکاح کر سکتے ہیں۔ اگر اُنہوں نے اس موقعہ (CHANCE) سے فائدہ اُٹھا لیا تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ خدا انہیں اس نئے معاہدہ پر ثابت قدم رکھے۔ لیکن اگر خدانخواستہ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد پھر وہی صورتِ حال پیدا ہو جائے جو دو مرتبہ پہلے پیدا ہو چکی تھی اور جو تدبیریں (دونوں موقعوں پر) پہلے آزمائی جا چکی تھیں اب پھر آزمائی جا چکیں اور شوہر نے طلاق دے کر فسخ معاہدہ کا اعلان کر دیا تو اب یہ جدائیگی حتمی ہوگی۔ اس کے بعد شوہر نہ عدت میں رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گذر جانے کے بعد تجدید نکاح کر سکتا ہے۔ اب یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرلے اور یہ مرد کوئی دوسری عورت تلاش کرے۔ البتہ اگر اس عورت کا نباہ دوسرے شوہر کے ہاں بھی نہ ہو سکے اور کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد وہ بھی تنگ آجائے

---

* اس کے بعد کچھ حضرات کا یہ خیال ہے کہ اب تیسری مرتبہ طلاق نہیں دی جا سکتی کیونکہ تیسری طلاق کا قرآن کی رو سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ دوسری مرتبہ رجوع کر لینے کے بعد اب عمر بھر اس کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا۔ ہمارے نزدیک دلائل کے اعتبار سے یہ موقف قوی ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق دی جا سکتی ہے

اور وہاں بھی دونوں مرحلوں سے گذرنے کے بعد عدالت اس کی اجازت دے دے کہ یہ شوہر بھی اسے طلاق دے سکتا ہے اور وہ طلاق دے کر فسخ نکاح کا اعلان کر دے اور وہ نہ عدت میں اس سے رجوع کرے اور نہ عدت گذر جانے کے بعد تجدید نکاح کرے اور ازیں سورانده اور ازاں سو درمانده ہو کر اب یہ عورت پہلے شوہر کی طرف لوٹنا چاہے اور پہلا شوہر بھی اس سے نکاح کرنے پر راضی ہو تو اب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ شاید اب ان دونوں کو در بدر کی ٹھوکریں کھا لینے کے بعد عقل آ گئی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ اب وہ آپس میں نباہ کر سکیں۔ لہٰذا اب ان کو اجازت ہے کہ وہ از سر نو دوبارہ نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے طلاق کا طریقہ۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے (ہدایہ ج۲ صفحہ ۳۵۴، مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

"طلاق کا بہترین طریقہ (احسن) یہی ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو اس کے (حیض کے بعد) حالت طُہر میں جس میں اس نے اس سے اختلاط نہ کیا ہو صرف ایک ہی طلاق دے اور اسے چھوڑ دے تا آنکہ اس کی عدت گذر جائے۔ کیونکہ صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اسی کو پسند فرماتے تھے۔ کہ ایک طلاق سے زیادہ نہ دیں حتیٰ کہ عدت پوری ہو جائے۔ اور یہی طریقہ ان کے نزدیک اس سے افضل تھا کہ آدمی بیوی کو تین طلاقیں دے یعنی ہر طہر میں ایک ایک طلاق۔ کیونکہ اس میں آدمی کو اس بات کا اندیشہ نہیں رہتا کہ بعد میں اسے شرمندہ ہونا پڑے۔ نیز اس میں عورت کے لئے بھی کم سے کم نقصان اور ضرر ہے۔ اور اس طریقے کے غیر مکروہ

ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

اس کے حاشیہ پر مولانا عبدالحئیؒ صاحب لکھنویؒ امام زیلعیؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو ابن ابی شیبہؒ نے اپنی مصنف میں ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ اسی بات کو پسند کرتے تھے کہ وہ بیوی کو ایک ہی طلاق دیں اور پھر اسے چھوڑ دیں حتیٰ کہ اسے تین حیض آجائیں (یعنی عدت پوری ہو جائے)۔"

نیز علامہ شیخ ابن الہمامؒ نے فتح القدیر صفحہ ۱۴۶/۲ پر نقل کیا ہے کہ امام محمدؒ نے ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ۔

"صحابہ رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند کرتے تھے کہ آدمی بیوی کو صرف ایک طلاق دے اور اسے چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اسے تین حیض آجائیں۔" یہ ابن ابی شیبہ کے الفاظ ہیں۔ خود امام محمدؒ کے الفاظ یہ ہیں۔

"ان کا پسندیدہ طریقہ یہ تھا کہ طلاق کے معاملہ میں ایک سے زیادہ نہ بڑھیں۔ یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ بیوی کو صرف ایک طلاق دی جائے۔ صحابۂ کرام کا عمل بھی یہی تھا اور وہ اسی کو پسند فرماتے تھے۔ اُمت کے تمام فقہاء بھی اس پر متفق ہیں کہ بہترین طریقہ یہی ہے۔ اس میں شوہر کے لئے ندامت کا اندیشہ بھی نہیں۔ عورت کو کم سے کم ضرر پہنچتا ہے اور اس کے بہترین طریقہ ہونے میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم کا منشا بھی یہی ہے اور عقل عامہ (common sence) کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے طلاق، معاہدۂ نکاح کے فسخ کا اعلان ہے۔ یہ نہ کوئی گالی ہے۔ نہ کوسنا ہے جسے بار بار دہرایا جائے۔ نکاح کا معاہدہ ایک مرتبہ ہی ہوتا ہے اس کے فسخ کا اعلان بھی ایک ہی مرتبہ ہونا چاہیئے۔ ایک مرتبہ اعلان ہو جانے کے بعد فسخ میں کوئی کوتاہی یا نقصان نہیں رہ جاتا کہ اسے دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ دہرا کر اس نقصان یا کوتاہی کی تلافی کی جاتی ہو۔ طلاق دیئے جانے کے بعد عورت اپنے شوہر سے بہرحال الگ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اسے بار بار دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

طلاقِ حسن یا سنّت

فقہار حنفیہ نے طلاق کے تین طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ جو اوپر گذر چکا ہے طلاقِ احسن کہلاتا ہے۔ دوسرا طریقہ طلاقِ حسن یا طلاقِ سنّت کہلاتا ہے۔ صاحب ہدایہ تحریر فرماتے ہیں۔ (ہدایہ صفحہ ۳۵۴/۲) مطبوعہ کلام کمپنی کراچی۔

"اور طلاقِ حسن، کہ طلاقِ سنت بھی ہے، یہ ہے کہ اس بیوی کو جس سے شوہر جنسی اختلاط کر چکا ہو تین طلاقیں تین طہروں میں دی جائیں۔ لیکن امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ طلاق بدعت ہے اور مباح (جائز) نہیں ہے بجز اسکے کہ صرف ایک طلاق دی جائے کیونکہ طلاق کے سلسلہ میں اصل حکم ممانعت اور ناجائز ہونے کا ہے۔ اس کی اباحت عورت کی جان چھڑانے کی ضرورت کے ماتحت وارد ہوئی ہے اور یہ ضرورت صرف ایک طلاق سے پوری ہو جاتی ہے۔ اور ہماری دلیل آنحضرت صلے اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد ہے عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث میں کہ سُنت یہ ہے کہ تم بیوی کے پاک ہونے (طُہر) کا انتظار کرو۔ پھر اس کو ہر حیض کے بعد ایک طلاق دے دو۔"

اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک امام مالکؒ کا مسلک قرآن کریم سے قریب تر ہونے کے علاوہ قرینِ عقل بھی ہے۔ کیونکہ تین طہروں میں یکے بعد دیگرے تین طلاقیں دینے پر اگر غور کیا جائے تو وہ خلاف عقل ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے کہ طلاق معاہدۂ نکاح کے فسخ کا اعلان ہے۔ پہلے طہر میں جو پہلی طلاق دی جاتی ہے۔ اس سے معاہدۂ نکاح کے فسخ کا اعلان ہو جاتا ہے۔ شوہر کو یہ اختیار رہتا ہے کہ وہ عدت کے دوران اگر رجوع کرنا چاہے تو کرے۔ نہ رجوع کرنا چاہے تو عدت پوری ہو جانے پر بیوی لازمًا اس سے جدا ہو جائے گی۔ اب دوسرے طہر میں جو دوسری طلاق دی جاتی ہے۔ تو اس سے کونسا نیا فائدہ حاصل ہوگا۔ جو پہلی طلاق سے نہیں ہوا تھا؟ اس سے کوئی بھی تو نیا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اب بھی صورتِ حال بعینہٖ وہی ہے جو پہلی طلاق کے بعد تھی۔ یعنی اب بھی شوہر کو عدت کے دوران رجوع کرنے کا اختیار ہے اور عدت گذر جانے کے بعد وہ اس سے لازمًا علیحدہ ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ جس طرح عدت گذر جانے کے بعد ایک طلاق کی صورت میں میاں بیوی کو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لینے کا اختیار ہوتا۔ دوسری طلاق کے بعد بھی یہ اختیار باقی رہتا ہے۔ نتیجہ اور اثر کے اعتبار سے پہلی طلاق اور دوسری طلاق میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اس دوسری طلاق کو قطعًا بے اثر، بے نتیجہ بلکہ عبث ماننا پڑتا ہے۔ لے دے کر دوسری طلاق کا صرف ایک ہی مصرف

عہ اور بقول بعض اگر تجدید نکاح کرنا چاہے تو کرلے۔

نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ دوسری طلاق کے بغیر تیسری طلاق تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اگر دوسری طلاق نہ دی جائے تو تیسری طلاق، تیسری نہیں بن سکے گی۔ اور تیسری طلاق کا یہ فائدہ ہے کہ بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی۔ اس سے نہ رجوع ہو سکے گا۔ اور نہ تجدید نکاح ہو سکے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح بیوی کو قطعی طور پر حرام کر لینا کس عقل کا تقاضا ہے۔ اس میں کونسا ثواب ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ بات خود قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ (۵/۸۷)

ترجمہ :- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال فرمائی ہیں اُنہیں (اپنے اوپر) حرام نہ کر لو۔ اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ یقیناً اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں کو حرام کر لینا قطعاً ممنوع اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ اور تو اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی حلال چیز کو اپنے اُوپر حرام فرمالیں۔ چنانچہ سورۂ تحریم کی ابتدا ہی اس ممانعت سے ہوتی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ (۶۶/۱)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام! جن چیزوں کو آپ کے لئے اللہ نے حلال فرمایا ہے آپ ان سے کیوں باز رہتے ہیں۔ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں؟۔

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ امام مالکؒ کا یہ مسلک کہ یہ طریقہ قطعاً بدعت اور ناجائز ہے نہ صرف یہ کہ قرینِ عقل ہے بلکہ قرآن کے عین مطابق بھی ہے۔ چنانچہ ہم اِسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ رہ گئی حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث جس کا صاحبِ ہدایہ نے حوالہ دیا ہے اور جسے دارقطنی نے معلّٰی ابن منصور کی سند سے نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک یقیناً ثابت نہیں ہو سکتی جب کہ امام مالکؒ خود حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی احادیث کے بہت بڑے راوی ہیں چنانچہ ان کی سند۔

مالک عن نافع عن ابن عمرؓ

محدثین کے نزدیک عمدہ ترین سند یعنی سِلْسِلَۃُ الذَّھَبْ (سونے کی لڑی) مانی جاتی ہے۔ احناف کی پیش کردہ دارقطنی کی روایت کے یہ الفاظ معتبر نہیں۔ کیونکہ تمام صحاح ستہ میں یہی روایت موجود ہے لیکن کسی نے بھی یہ الفاظ نقل نہیں کئے۔ امام بیہقی نے تو تصریح ہی فرما دی ہے کہ عطار خراسانی نے اس حدیث میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں جن کی کسی نے بھی تائید نہیں کی اور عطا خراسانی ایک ضعیف راوی ہیں۔

(الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ لابن حجر علی ہامش الہدایہ ج ۲ ص ۳۵۵)

لہٰذا اس ضعیف روایت کی بنیاد پر ایسی طلاق کو جو خلاف عقل و شعور ہونے کے ساتھ خلاف قرآن بھی ہے۔ طلاق حسن اور طلاق سنت کے لقب سے یاد کرنا انتہائی زیادتی ہے۔ واللہ اعلم۔ امام مالکؒ کا یہ مسلک ہمارے نقطۂ نظر کی جو ہم نے "طریقۂ طلاق" کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے، مکمل تائید ہے۔

طلاق بدعت

طلاق کی تیسری قسم، طلاق بدعت ہے۔ طلاق بدعت اسے کہتے ہیں کہ آدمی بیک وقت ایک ہی طہر میں بیوی کو ایک ہی لفظ کے ساتھ تین طلاقیں دیدے یعنی یہ کہے، میں نے تجھے تین طلاقیں دیدیں، یا یوں کہے کہ میں نے تجھے طلاق دیدی، میں نے تجھے طلاق دیدی۔ میں نے تجھے طلاق دے دی، یا یوں کہے، تجھے طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔ ایسی صورت میں حنفیہ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ اس طرح طلاق دینا ناجائز اور بدعت ہے لیکن تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور بیوی اپنے شوہر پہ بالکل حرام ہو جائے گی، نہ وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ تاآنکہ کوئی دوسرا آدمی اس سے نکاح کرے اور پھر وہ مرجائے یا طلاق دیدے۔ اب عدت گذارنے کے بعد وہ پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے امام مالکؒ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح طلاق دینے سے تین طلاقیں پڑ جاتی ہیں۔ اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے نہ یہ ناجائز ہے نہ بدعت ہے۔ یہ شوہر کا ایک جائز تصرف ہے۔ جائز تصرف کو ممنوع نہیں کہا جا سکتا۔ امام احمد ابن حنبلؒ سے عام طور سے وہی کچھ نقل کیا گیا ہے جو امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مسلک ہے۔

امام احمد ابن حنبلؒ اور دیگر صحابہ وفقہاء

لیکن امام ابن تیمیہؒ نے ثابت کیا ہے کہ امام احمدؒ نے اپنے قول سے رجوع فرما لیا تھا اور آخر میں وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے قرآن کریم پر غور کیا تو میں نے دیکھا کہ قرآن نے جس طلاق کا ذکر کیا ہے وہ صرف رجعی طلاق ہی ہے۔ چنانچہ ان کا مذہب یہی

ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت نہیں دی جا سکتیں۔ اگر کوئی شخص بیک وقت تین طلاقیں دے دے تو ایک طلاق ہی واقع ہوگی اور شوہر کو رجوع کرنے اور از سر نو نکاح کر لینے کی اجازت ہوگی۔ امام احمدؒ کے تمام اصحاب کا یہی مذہب ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ صہ ۲۲ ج ۳ طبع مصر)

صاحبِ بحر نے اسی کو ابو موسیٰ اشعریؓ کا قول اور حضرت علیؓ کی ایک روایت نیز ابن عباسؓ، امام طاؤس، امام عطاؒ، جابر بن زید، قاسم ناصر، احمد ابن عیسیٰ، عبداللہ ابن عیسیٰ بن عبداللہ کا قول اور ایک روایت زید ابن علی سے نقل کی ہے۔ ابن تیمیہؒ، ابن القیمؒ نیز ابن المنذر نے اسے اصحاب ابن عباس، عمرو ابن دینار وغیرہ سے نقل کیا ہے۔

ابن مغیث نے اسی کو حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر ابن العوام سے بھی نقل کیا ہے۔ نیز ابن مغیث نے اپنی کتاب الوثائق میں اسی کو محمد بن وضاح سے بھی نقل کیا ہے اور مشائخ قرطبہ میں محمد ابن تقی، محمد ابن عبدالسلام وغیرہ کی ایک جماعت کا فتویٰ بھی اسی قول پر نقل کیا ہے (اہلِ حدیث کا نقطۂ نظر یہی ہے۔)

(الجواہر الغالیہ از مولانا ابو عبیدہ اعظمی بحوالہ نیل الاوطار صہ ۲۴۵ ج ۶)

یاد رہے کہ یہ سب حوالے ہم صرف اہلِ سنت علماء کے دے رہے ہیں (خارجیوں اور شیعوں وغیرہ کا تو ہم ذکر ہی نہیں کر رہے ہیں ورنہ اثنا عشری شیعوں کے ہاں تو تین یکجائی طلاقیں سرے سے واقع ہی نہیں ہوتیں) ان اہلِ علم میں حجاج بن ارطاۃ، اور محمد بن مقاتل (حنفی) بھی اس کے قائل ہیں کہ اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

(نووی، شرح مسلم صہ ۴۷۸ ج ۱)

مشہور فقیہہ ماذریؒ نے اپنی کتاب معلم میں امام محمد ابن مقاتل حنفی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ۔ (محمد ابن مقاتل فقہائے حنفیہ میں طبقۂ ثالثہ کے اجل اصحاب میں شمار)

"طلاق ثلاثہ جو ایک ساتھ ہوں وہ ایک رجعی کے حکم میں ہیں اور امام ابو حنیفہ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔"

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی ایک ایک روایت

محمد ابن مقاتل کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے کہ ایک ہی طلاق پڑے گی۔

نیز امام تلمسانیؒ نے "شرح التفریع فی مذہب مالکؒ" میں امام مالکؒ کا مذہب بیان کرتے ہوئے ایک قول بلکہ ایک روایت اسی کے مطابق نقل کی ہے۔ لہٰذا امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے اور شیخ الاسلام نے امام احمدؒ کا مختار قول اسی کے مطابق نقل کیا ہے۔

(اغاثۃ اللہفان عن مصائد الشیطان (ص ۳۰۸ ج ۱) مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی و اولادہ بمصر ۱۳۸۰ھ و ۱۹۶۱ء)

مولانا عبد الحی لکھنویؒ لکھتے ہیں۔ " امام مالکؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی شمار ہوگی۔ بعض اصحاب امام احمد اور داؤد ظاہری کا بھی یہی مسلک ہے۔" (عمدۃ الرعایہ ص ۶۷ ج ۲)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں ان میں سے اکثر اصحاب کا جن کا تذکرہ ہم نے شوکانیؒ کے حوالہ سے کیا ہے یہی مذہب

نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری ص۲۸۹-۲۹۰ ج۹)

علمائے متأخرین

مصر جامعۃ الازہر کی وجہ سے علوم دینیہ و اسلامیہ کا مرکز ہے اور جہاں علماء و محققین اسلام ہمیشہ پیدا ہوتے رہے ہیں اس کے اجلۂ علماء نے اس خاص مسئلہ پر بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ شیخ الازہر علامہ شیخ شلتوت اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں۔

"جو تین طلاقیں ایک مرتبہ دی جائیں ان سے ایک طلاق رجعی ہی واقع ہوگی اور مرد کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو واپسی کے لفظ سے یا مخالطت خاصہ کے ذریعے واپس لے لے۔" (الفتاویٰ ص۳۰۶)

نیز علامہ سید رشید رضا نے بھی اپنی تفسیر (المنار ص۶۸۳ ج۹) میں اسی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ عہد حاضر کے ایک اور جلیل القدر عرب عالم اور مفسر شیخ جمال الدین القاسمی نے بھی اپنی کتاب (الاستیناس لتصحیح انکحۃ الناس) میں نہایت مفصل اور مبسوط گفتگو فرماتے ہوئے اسی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ (بحوالہ حیاۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ص۵۷ ترجمہ اردو مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور)

ہمارے نزدیک امام احمد ابن حنبلؒ کا آخری قول جو امام ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے نیز امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی وہ روایت جو محمد ابن مقاتل اور عمدۃ الرعایہ نے نقل فرمائی ہے نیز دیگر صحابہ، تابعین اور فقہاء کے وہ اقوال جو اوپر نقل کئے گئے ہیں قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں اس لئے ہم انہی کو ترجیح دیں گے۔

امام شافعیؒ نے چونکہ بیک وقت تین طلاقیں دینے میں کوئی قباحت

نہیں سمجھی بلکہ اسے شوہر کا جائز تصرف تسلیم فرمایا ہے۔ اس لئے فقہائے حنفیہ کی طرف سے ان کے خلاف جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں۔

(۱) طلاق میں اصل چیز ممانعت اور ناپسندیدگی ہے کیونکہ اس سے نکاح کا وہ بندھن منقطع ہو جاتا ہے جس کے ساتھ دینی اور دنیاوی مصلحتیں وابستہ تھیں۔

(۲) طلاق کو صرف ضرورةً مباح کیا گیا ہے تاکہ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان نباہ کی کوئی صورت ممکن نہ رہے تو بیوی کی گلو خلاصی ہو سکے یہ ضرورت ایک طلاق سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یکبارگی تین طلاقیں دینا بلا ضرورت ہے۔

(۳) رہ گئی یہ بات کہ پھر تین طہروں میں یکے بعد دیگرے تین طلاقیں دینا بھی ممنوع ہونا چاہیئے۔ تو وہ اس لئے ممنوع نہیں ہے کہ اس کے متعلق صراحتہً ایک نص (عبداللہ ابن عمرؓ والی حدیث جو دارقطنی نے نقل کی ہے اور جس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں) وارد ہو گئی ہے۔ اس لئے اسے جائز بلکہ سنت قرار دینا پڑے گا۔

(۴) نیز بیک وقت تین طلاقیں دینا قرآن کریم کی نص صریح سے متعارض ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (طلاق دو مرتبہ ہو سکتی ہے) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ طلاقوں کے درمیان فاصلہ اور وقفہ ہونا ضروری ہے۔ اور بیک وقت تین طلاقوں میں فاصلہ اور وقفہ نہیں ہوتا جو صراحتہً قرآن کریم کے خلاف ہے۔ برخلاف ان تین طلاقوں کے جو تین الگ الگ طہروں میں ایک ایک کر کے دی جائیں۔

(یہ بات صاحب عنایہ نے شیخ الاسلام سے نقل فرمائی ہے۔) اسی وجہ سے حنفیہ کے نزدیک ایک طہر میں بیک وقت دو طلاقیں دینا بھی بدعت ہے۔

(ہدایہ صفحہ ۳۵۵ ج ۱)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بجز امام شافعیؒ کے پوری اُمت کے نزدیک ایک وقت میں تین طلاقیں دینا تو بہرحال قرآن کریم کے منشأ کے خلاف ہے اس لئے ممنوع اور ناجائز ہے۔ اس کے بعد اختلاف اس امر میں ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن کریم کے منشاء کے خلاف ایک ممنوع اور ناجائز فعل کا ارتکاب کرکے بیک وقت تین طلاقیں دیدے تو کیا تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ اور بیوی مطلقاً حرام ہو جائے گی۔ کہ اس کے بعد نہ شوہر کو رجوع کا حق حاصل رہے گا اور نہ وہ اس سے ازسرِ نو نکاح کر سکے گا تا آنکہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے ہو جائے اور وہ بھی اسے طلاق دے دے۔ یا صرف ایک طلاق رجعی واقع ہو گی۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مشہور مسلک یہ ہے کہ تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور بیوی مطلقاً حرام ہو جائے گی۔ اب وہ کسی دوسرے مرد ہی سے شادی کر سکتی ہے۔ لیکن امام ابن تیمیہ کی تحقیق کے مطابق امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تین طلاقیں واقع نہیں ہو سکتیں۔ صرف ایک رجعی طلاق واقع ہو گی۔ شوہر کو حق ہے کہ عدت کے دوران طلاق سے رجوع کر لے اور اگر عدت گذر چکی ہے تو وہ اس سے ازسرِ نو نکاح کر سکتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی ایک ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے۔

ہمارے نزدیک امام احمد ابن حنبلؒ کا قول اور امام ابو حنیفہؒ اور

امام مالکؒ کی ایک ایک روایت نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کے عین مطابق ہے بلکہ عقل و بصیرت کے بھی مطابق ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ

ہم پہلے قرآن کریم کی آیت کریمہ پر غور کریں گے۔ کیونکہ وہی اصل چیز ہے آپ دیکھ چکے ہیں کہ مَرَّتَانِ کا لفظ (خود فقہائے حنفیہ کے اعتراف کے مطابق) فاصلہ اور وقفہ کا متقاضی ہے۔ ہر طلاق کے درمیان کافی فاصلہ اور مدت ہونی چاہیئے۔ مَرَّتَانِ کا لفظ مَرَّۃٌ کا تثنیہ ہے۔ جس کا ترجمہ دو بار، دو مرتبہ یہ لفظ ہمیشہ ایسے موقعہ پر بولا جاتا ہے جب آپ کوئی کام کریں۔ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد دوسری مرتبہ آپ پھر وہی کام کریں اور پھر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ ہم روزمرہ یہ لفظ اپنی زبان میں بھی انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں۔

"میں تمہارے ہاں دو مرتبہ گیا مگر تم نہیں ملے"

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ گیا۔ تم نہیں ملے۔ پھر واپس چلا آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ گیا مگر تم پھر بھی نہیں ملے اور مجھے ناکام واپس آنا پڑا۔ اس کا مادہ ہی مَرَّ ہے جس کے معنے گذر جانے، اور رفت و گذشت ہو جانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ میں تمہارے ہاں گیا اور دو مرتبہ تمہیں پکار کر چلا آیا۔ عہ مَرَّتَانِ کا لفظ قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہوں پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَقَضَيْنَا اِلٰى بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ الآیۃ (۱۷/۴)

عہ ایک ہی بار ایجاب و قبول سے نکاح قائم ہو جاتا ہے اور ایک ہی طلاق سے نکاح ختم ہو جاتا ہے اگر کوئی کہے، میں نے قلم خریدا، میں نے قلم خریدا، میں نے قلم خریدا، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس نے تین بار قلم خریدا، یا تین قلم خریدے۔ اگر کوئی تین بار اقرار کرے کہ میں نے قتل کر دیا۔ قتل کر دیا، قتل کر دیا تو اس پر قتل کے تین مقدمے نہیں چلائے جاتے کہ اس نے تو تین قتل کئے ہیں۔

ترجمہ :۔ اور (دیکھو ہم نے کتاب میں (یعنی تورات میں) بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور زمین میں دو مرتبہ فتنہ وفساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔ پھر جب ان دو وقتوں میں سے پہلا وقت آگیا تو (اے بنی اسرائیل!) ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیجدیئے جو بڑے ہی قوت وسطوت والے تھے الخ۔

محققین کا بیان ہے کہ یہاں کتاب سے مراد یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل کے صحیفے ہیں جن میں بنی اسرائیل کے دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں کی خبر دے دی گئی تھی۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بنوکدنذر (بخت نصر) کے حملہ سے ہوئی اور دوسری رومیوں کے حملے سے جو ٹیٹس کی زیر قیادت ہوئی تھی۔ (ترجمان القرآن مولانا آزاد ص ۳۴۶/۲۲)

یہاں مَرَّتَيْنِ (دومرتبہ کے درمیان صدیوں کا وقفہ اور فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں جب انہیں طور پر نبوت عطا فرمائی گئی اور خدا نے ان سے کلام فرمایا تو منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی فرمایا گیا تھا۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى ۝ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلٰى أُمِّكَ مَا يُوحٰى ۝ (۲۰/۳۷-۳۸)

ترجمہ :۔ اور (اے موسیٰ!) ہم تجھ پر ایک مرتبہ اور بھی احسان فرما چکے ہیں۔ جب ہم نے تمہاری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی جو (اب) وحی کی جارہی ہے۔

اس کے بعد تفصیل سے وہ واقعہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری ماں نے ہماری وحی کے مطابق تمہیں ایک صندوق میں ڈال کر دریائے نیل کے حوالہ کردیا تھا۔ اور وہ صندوق فرعون کے محل سے جالگا۔ صندوق نکالا گیا تو تم برآمد

ہوئے اور کس طرح فرعون کے محل میں تمہاری پرورش کرائی گئی الخ واقعہ مشہور ہے اس لئے ہم تفصیلات حذف کر رہے ہیں۔ بہر حال کوہِ طور پر مدین سے واپس آتے ہوئے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ ایک احسان تو یہ تھا اور دوسرا احسان اس سے بہت پہلے آپ کی پیدائش کے فوراً بعد ہو چکا تھا۔ جسے اس آیت میں مَرَّةً اُخْرٰی (دوسری مرتبہ کا احسان) فرمایا گیا ہے۔ ان دونوں احسانات میں کم از کم چالیس سال کا وقفہ اور عرصہ ہے۔

علاوہ ازیں سورۂ توبہ میں منافقین مدینہ کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (۹/۱۰۱)

ترجمہ :- اور مدینہ والوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو نفاق پر جمے ہوئے ہیں۔ (اے پیغمبر!) آپ انہیں نہیں جانتے ہم انہیں خوب جانتے ہیں ہم اُنہیں دو مرتبہ عذاب دیں گے۔ پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں ہمارے مفسرین نے بتایا ہے کہ ان منافقین کو ایک مرتبہ عذاب تو اسی دنیا میں ذلت و رسوائی کی صورت میں دیا جائے گا اور دوسری مرتبہ مرنے کے بعد قبر میں یا عالمِ برزخ میں عذاب دیا جائے گا۔ اس کے بعد جہنم میں بڑے عذاب کی طرف وہ لوٹا دیئے جائیں گے۔

یہاں مجھے اس تفسیر کی صحت اور سقم سے بحث نہیں ہے بلکہ بتانا صرف یہ ہے کہ عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق بھی ان دونوں عذابوں میں

کافی وقفہ اور فاصلہ موجود ہے۔ منافقین ہی کے سلسلہ میں سورۂ توبہ ہی میں ذرا آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

اَوَ لَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَ لَا ھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ ۝ ($\frac{9}{126}$)

ترجمہ:- کیا وہ دیکھتے نہیں کہ انہیں ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے لیکن پھر بھی نہ وہ توبہ کرتے ہیں نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے مطابق منافقین کو تنبیہہ و اعتبار کے لئے ہر سال ایک مرتبہ یا دو مرتبہ جن مختلف آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا تھا ان میں لازماً ایک سال کا (سال میں ایک مرتبہ) یا چھ سات ماہ کا عرصہ (سال میں دو مرتبہ) ہوتا تھا۔ یہ وقفہ اور عرصہ بھی کافی ہوتا ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا آیات سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ مَرَّتَانِ (دو مرتبہ) کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اور کیا ہونا چاہیئے۔

مزید تسلی کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے استاذ مولانا شیخ محمد تھانویؒ کا ارشاد برحاشیہ نسائی شریف ص $\frac{29}{2}$ اور اسی صفحہ پر علامہ سندھی حنفیؒ کی تصریح (نسائی شریف ص $\frac{29}{2}$) علامہ ابوالبرکات عبداللہ ابن احمد نسفیؒ کی تصریح۔ (مدارک التنزیل ص $\frac{174}{2}$) اور مولانا عبدالحقؒ کی تصریح۔ (اکلیل علی مدارک التنزیل ص $\frac{171}{2}$) اور علامہ انور شاہ کشمیری کی تصریح۔ (فیض الباری شرح صحیح بخاری ص $\frac{38}{4}$) ملاحظہ فرمائیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر ہمیں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مرّتان کے سلسلہ میں ہمارے فقہاء نے (بشمول امام شافعیؒ کے) وقفہ اور عرصہ کی ضرورت

کو تسلیم فرمایا ہے۔ نیز سب نے یہ بھی تسلیم فرمایا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دیدینا ناجائز، بدعت اور قرآن مجید کے خلاف ہے۔ آپ یہ بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ صحابۂ کرام میں ایک رجعی طلاق سے زیادہ طلاق، دینے کا دستور نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے۔

(ہدایہ صفحہ ۳۵۴ ج ۱)

لہٰذا غور طلب امور صرف یہ ہیں۔

(۱) بیک وقت تین طلاقیں دینا باوجودیکہ غیر مباح، ناجائز اور خلافِ قرآن ہے لیکن اگر کوئی یہ حماقت کر بیٹھے تو کیا تین طلاقیں نافذ ہوں گی اگر نہیں، تو کیوں؟

(۲) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کیا ایسی غلطی کسی نے کی تھی اور آپ نے اسے تین طلاقیں تسلیم فرمایا تھا یا ایک طلاق قرار دیا تھا؟

(۳) بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو تین طلاقیں تسلیم کرنا کب سے شروع ہوا اور کیوں؟

پہلا سوال

اب ہم پہلے سوال کو لیتے ہیں۔ نکاح قرآن کریم کی رو سے ایک شرعی معاہدہ ہے۔ اس نے اسے عقدۃ النکاح (نکاح کا بندھن) اور مِیثَاقًا غَلِیظًا (مضبوط معاہدہ) قرار دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی غرض و غایت اور مقصد نیز اس کا طریقہ بھی خود ہی متعین فرمایا ہے۔ اس نے اسے بندوں کی صواب دید پر نہیں چھوڑا۔ ساتھ ہی اس نے اس بندھن کو کھول دینے۔ اس میثاقِ غلیظ کو فسخ کر دینے کا طریقہ بھی خود ہی متعین فرما دیا ہے۔ لہٰذا نہ یہ معاہدہ قرآن کریم کے مقرر کردہ طریقہ سے ہٹ کر ہو سکتا ہے۔ نہ اس کا فسخ قرآن کریم کے مقرر

فرمودہ طریقہ سے ہٹ کر ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کی غرض و غایت مرد وعورت کی عفت وعصمت کی حفاظت اور افزائش نسل قرار دیا ہے۔ (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) اور اس کا طریقہ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے کم از کم دو گواہوں کے سامنے (اصالتاً یا وکالتاً) ایجاب وقبول مقرر کیا ہے۔ اس نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ معاہدہ کن مردوں اور کن عورتوں میں ہو سکتا ہے اور کن کن میں نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے کسی ایک بات کی بھی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے۔ کسی ایک بات کی بھی خلاف ورزی کی گئی تو وہ معاہدۂ نکاح نہیں ہوگا۔ اسے زناکاری کہا جائے گا۔ نکاح نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح قرآن کریم نے اس کو فسخ کرنے کا طریقہ بھی خود ہی متعین فرمادیا ہے۔ (تفصیلات پہلے گذر چکی ہیں) اس نے

ے اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے زمین خریدی ہے یا زمین فروخت کی ہے تو ہر شخص یہی سمجھے گا کہ اس نے گھر بیٹھے خرید یا فروخت کا لفظ زبان سے ادا نہیں کیا ہوگا بلکہ خرید و فروخت کے تمام قانونی مراحل بھی طے کئے ہوں گے۔ زمین کے دام طے کئے ہوں گے۔ بیعانہ دیا ہوگا۔ اس کے بعد زمین کی قیمت وصول یا ادا کی ہوگی۔ رجسٹرار کے سامنے با قاعدہ لکھا پڑھی، گواہی اور رجسٹریشن بھی ہوئی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی مرحلہ خرید و فروخت کا عرف عام کے مطابق طے نہ ہوا ہو اور صرف زبانی لفظی اقرار یا اظہار ہوا ہو۔ کہ میں نے زمین خریدی یا بیچی تو اسے بیع و شرا (خرید و فروخت) کا معاملہ بتانے والا اور سمجھنے والا دونوں دماغی مریض سمجھے جائیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی زبان سے کہدے کہ میں نے نکاح کر لیا ہے تو اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ رشتہ طے ہوا ہوگا، مہر مقرر ہوا ہوگا۔ معروف کے مطابق بارات گئی ہوگی۔ قاضی صاحب نے خطبۂ نکاح پڑھا ہوگا۔ گواہ آئے ہوں گے ایجاب و قبول ہوا ہوگا۔ چھوہارے

فسخِ معاہدہ سے پہلے تین مراحل سے گذرنا ضروری قرار دیا ہے۔ ان مراحل سے گذرنے کے بعد جو طریقہ قرآن کریم نے متعین فرمایا ہے۔ وہ یہی ہے کہ طلاق دو مرتبہ دی جا سکتی ہے اور ہر مرتبہ شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عدت کے دوران باہمی رضامندی سے رجوع کر کے یا عدت کے بعد ازسرِ نو نکاح کر کے دستور کے مطابق چاہے تو بیوی کو روک لے اور چاہے تو نیک سلوک کے ساتھ رخصت کر دے۔ یہ دونوں طلاقیں رجعی ہی ہو سکتی ہیں۔ اگر دوسری مرتبہ طلاق دے کر بھی اس نے بیوی کو رجوع کر کے یا نکاح کر کے روک لیا تھا اور پھر تیسری مرتبہ اس نے طلاق دیدی ہے تو اب اِسے رجوع کر کے یا نکاح کر کے روک لینے کا حق نہیں رہا۔ اب بیوی کو حُسنِ سلوک کے ساتھ رخصت ہی کر دینا ہوگا۔ نکاح کے معاہدہ کو ختم کرنے کا طریقہ قرآن کریم نے یہی بتایا ہے۔ اس معاہدہ کو اسی طرح

تقسیم ہوتے ہوں گے۔ ملکی دستور کے مطابق نکاح رجسٹرار صاحب نے رجسٹر میں اندراج کیا ہوگا۔ ولیمہ بھی ہوا ہوگا۔ اور کچھ غیر ضروری رسم و رواج بھی ہوئے ہوں گے مثلاً آرسی مصحف، سلامی، رونمائی، کچھ گانا بجانا اور کچھ جہیز کی بدعت وغیرہ وغیرہ غرض نکاح محض زبانی علامتی لفظ نہیں بلکہ ایک پورا طریقِ کار اور مکمل پروسیجر (PROCEDURE) ہے جسے دو لفظوں میں یوں ادا کر دیتے ہیں کہ فلاں کا فلانی سے نکاح ہوگیا۔ غرض نکاح محض یہ کہدینے سے نہیں ہو جاتا کہ میں نے فلاں خاتون سے نکاح کر لیا بلکہ مراحل نکاح کا پروسیجر پورا کرنے سے نکاح کا انعقاد ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح طلاق بھی ایک عملی پروسیجر ہے جسکے مراحل طے کرنے کے بعد طلاق کا وقوع ہوتا ہے۔ یہ پروسیجر ہمارے آپ کے مقرر کردہ نہیں بلکہ ربّ محمدؐ کے بتائے ہوئے ہیں جو قرآن میں موجود ہیں۔ ان مراحل کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

ختم کرنا ہوگا۔

قرآن کریم کے حکم پر ایک مرتبہ امام مالکؒ کی اس روایت کی روشنی میں دوبارہ غور فرمائیے۔

"مالک عن ہشام ابن عروہ عن عروہ کی سند سے بیان کیا گیا ہے کہ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ مرد جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو عدت ختم ہونے سے پہلے اس کو رجوع کر لینے کا حق ہوتا تھا اگرچہ وہ ایک ہزار بار طلاق دے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی۔ یہاں تک کہ جب اس عورت کی عدت ختم ہونے کا وقت قریب آیا تو اس نے رجوع کر لیا اور پھر طلاق دیدی۔ پھر اس نے کہا بخدا میں تجھے نہ اپنے پاس آنے دوں گا اور نہ تو کبھی میرے لئے حلال ہو گی تو اللہ نے یہ آیت نازل کی کہ طلاق (رجعی) دو بار ہو سکتی ہے۔ (رجعی فقہار کی اصطلاح کے مطابق ورنہ قرآن کی رو سے ہر طلاق رجعی ہی ہوتی ہے۔ مغلظہ طلاق کا وجود ہی نہیں) اس کے بعد یا تو دستور کے موافق روک لو یا خوش اسلوبی سے رخصت کر دو۔"

(موطأ امام مالک باب الطلاق مرتان ۲۵)

اب آپ غور فرمائیں کہ حق تعالیٰ نے طلاق کے احکام دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ (طلاق یعنی رجعی صرف دو مرتبہ ہو سکتی ہے) اور عرب میں جو یہ دستور چلا آرہا ہے کہ بے شمار مرتبہ طلاق دیتے جاؤ اور رجوع کرتے جاؤ یہ طریقہ غلط ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ کہ طلاق رجعی دینے کے بعد دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو دستور کے مطابق روک لینا ہے یا خوش اسلوبی کے ساتھ

رخصت کر دینا ہے۔ تیسری کوئی صورت جائز نہیں ہے۔ دستور کے مطابق روک لینا تو یہ ہے کہ طلاق سے رجوع کر لو۔ اگر طلاق سے رجوع نہیں کرتے تو ان کی عدت پوری ہو لینے دو تاکہ اس کے بعد وہ خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت ہو جائیں۔

خبر بہ معنی امر واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں تمام فقرے اگرچہ صورۃً خبر ہیں لیکن حقیقۃً امر ہیں۔ قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ خبر کے صیغوں کے ساتھ اپنے احکام و اوامر کو بیان کرتا ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہے کہ طلاق دو مرتبہ دو اس کے بعد یا تو رجوع کر کے ان کو روک لو یا خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو اس کی مثالیں قرآن کریم میں بے شمار ہیں۔ مثلاً۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ ط

ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین ماہواری ایام کے بقدر انتظار کریں گی۔

مطلب یہ ہے کہ وہ تین ماہواری ایام کے بقدر عدت گذاریں۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ ط

ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں گی۔

یعنی مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ اور

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ

ترجمہ: تو ایک مؤمن غلام یا باندی کو آزاد کرنا ہے اور مقتول کے ورثہ کو دیت (خون بہا) ادا کرنا ہے۔

یعنی ایک مؤمن غلام یا باندی کو آزاد کرو اور مقتول کے ورثہ کو دیت

یعنی خون بہا ادا کرو۔ اور

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

ترجمہ: تو مقتول کے ورثہ کو دیت ادا کرنی ہے اور ایک مؤمن غلام یا باندی کو آزاد کرنا ہے۔

یعنی مقتول کے ورثہ کو دیت ادا کرو اور ایک مؤمن غلام یا باندی کو آزاد کرو۔ اور

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا۔

ترجمہ: تو غلام آزاد کرنا ہے اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔

یعنی ایک دوسرے کو چھونے سے پہلے ایک غلام کو آزاد کرو۔ اور

مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

ترجمہ: اوسط درجہ کا کھانا، جو اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، مساکین کو کھلانا ہے یا اُنہیں کپڑے پہنانے ہیں یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔

یعنی مساکین کو اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ یا اُنہیں کپڑے پہناؤ یا ایک غلام کو آزاد کرو۔ یہ سارے جملہ خبریہ ہیں لیکن امر کے حکم میں ہیں۔ اس سلسلہ میں امام ابوبکر جصاص رازی نے طویل اور کارآمد بحث فرمائی ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

(احکام القرآن ج۱ ص۴۴۷-۴۴۸، مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصر)

ان تصریحات کی روشنی میں آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ دو مرتبہ کر کے وقفہ کے ساتھ طلاق دینا اور ہر طلاق کے بعد یا تو رجوع کر لینا یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا فرض ہے یہ حکم الٰہی ہے۔ اس کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ دو مرتبہ جو طلاق دی جائے گی وہ بھی ایک ساتھ نہیں

دی جا سکتی نہ ایک عدت میں دی جا سکتی ہے بلکہ یہ دو مرتبہ کی دونوں طلاقیں دو الگ الگ عدتوں میں دی جائیں گی۔ اور ہر عدت میں جو طلاق دی جائے گی اس کے بعد یا تو رجوع کرنا ہوگا یا عدت پوری کرا کے خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا ہوگا. کوئی تیسری صورت جائز نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں، بیک وقت دے دینا غلط ہے اور سوائے امام شافعیؒ کے عام فقہائے اسلام نے اسے متفقہ طور پر حرام کہا ہے. نیز قرآن ہی کی رو سے ہر طہر میں ایک ایک طلاق دیتے چلا جانا، تا آنکہ تین طلاقیں پوری ہو جائیں، یہ بھی جائز نہیں ہے۔

ایک طلاق کے بعد دوسری اور تیسری طلاق کیسے دی جاتی ہے؟

قرآن کریم کے مقرر کردہ تین مراحل پورے کر لینے کے بعد جب کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دیدی، تو اسے اسی لمحہ طلاق ہو گئی. وہ اب اس کی بیوی نہیں رہی۔ بقول ہمارے ایک فاضل عزیز کے بھی۔

"طلاق کے دو اثر ہوتے ہیں۔ ایک تو طلاق دینے والے کے نکاح سے نکل جانا۔ اور دوسرے کسی اور مرد سے نکاح کا جائز ہونا۔ ان میں سے پہلا اثر تو طلاق دیتے ہی مرتب ہو جاتا ہے.............. اسی اثر کی وجہ سے جس لمحہ مرد نے طلاق کے الفاظ زبان سے ادا کئے اسی لمحہ سے عورت کو مطلقہ کہا جاتا ہے.............. ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ طلاق کا پہلا اثر (بیوی کا شوہر کے نکاح سے الگ ہو جانا) طلاق کے الفاظ زبان سے نکلتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

(ہمارے عائلی مسائل ص۱۶۵-۱۶۶ مؤلفہ مولانا محمد تقی عثمانی)
مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

لہٰذا سوال یہ ہے کہ ایک طلاق دینے کے بعد دوسری اور تیسری طلاق آخر کس کو دی جارہی ہے؟ کیا اس عورت کو دی جارہی ہے جو اس کی بیوی نہیں رہی، جو اُس سے الگ ہو چکی ہے؟ ظاہر ہے کہ پہلی طلاق کے بعد آپ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ قطعًا لغو اور بے محل ہے۔ آپ اسے طلاق دے رہے ہیں جو اب آپ کی بیوی ہی نہیں رہی۔ آپ کے لئے وہ قطعًا اجنبی ہو چکی ہے۔

حلال کو حرام کرنا

ظاہر ہے کہ اب اس کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ طلاق دینے والا شخص اپنی نظر میں یہ چاہتا ہے کہ اس طرح وہ بیوی کو اپنے اُوپر بالکل ہی حرام کرلے۔ لیکن اس سے اس کا یہ مقصد تو حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جو طلاقیں وہ اب دے رہا ہے وہ غیر محل میں ہیں اور لغو ہیں۔ ان کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوسکتا البتہ وہ اپنی اس غلط خواہش سے عذاب الٰہی کو اپنے لئے دعوت دے رہا ہے کیونکہ ایک حلال چیز کو اپنے لئے حرام کرلینا چاہتا ہے۔ جو کہ ناجائز اور حرام ہے۔ اس بدنیتی کا اثر طلاق کی صورت میں تو نہیں البتہ معصیت ہونے کی وجہ سے عذابِ آخرت کی صورت میں ضرور ظاہر ہوگا۔

حیرت ہے کہ سوائے امام مالکؒ ہمارے اکثر فقہاء نے اسے جائز قرار دے لیا ہے۔ بلکہ ہر طہر میں ایک ایک طلاق دیتے چلے جانے کو طلاق سنت اور طلاق حسن سے تعبیر فرمایا ہے۔ جو قطعًا غلط اور حرام ہونا چاہیئے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (۵/۸۷)

ترجمہ: اے پیروان دعوتِ ایمانی! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال فرمائی ہیں انہیں حرام نہ کرلو۔ حد سے نہ بڑھو۔ بلا شبہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

اور اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہے کہ بیویاں بھی طیبات میں داخل ہیں۔ چنانچہ سورۂ نساء میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ (۴/۳)

ترجمہ: اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ انصاف کا سلوک نہیں کرسکو گے تو ان میں سے جو عورتیں تمہارے لئے طیب، پاکیزہ اور پسندیدہ ہوں، ان سے دو دو کر کے تین تین کر کے چار چار کر کے نکاح کر لو۔

لہٰذا قرآن کی رو سے بیویاں طیّبات میں سے ہیں اور جو طیبات اللہ نے حلال فرمائی ہیں ان کو حرام کر لینا خود ناجائز اور حرام ہے لہٰذا وہ طریقہ جسے ہمارے فقہاء نے حسن فرمایا ہے وہ ہرگز حسن نہیں ہے بلکہ وہ قرآن کریم کی نص صریح سے حرام ہے۔ ایک مرتبہ ایک ہی طلاق دی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد عدت گذار کر اسے بالکل الگ ہو جانا چاہیئے۔ دوسری طلاق کی نوبت رجوع کر لینے یا دوسری مرتبہ نکاح کر لینے کے بعد آئے گی۔ اور تیسری طلاق کی نوبت تو آئے گی ہی نہیں۔

ہر طلاق عدت کی ابتدا پر

علاوہ ازیں سورۂ الطلاق میں اس بات کو اور بھی واضح فرمادیا گیا ہے کہ ایک عدت میں ایک ہی طلاق ہو سکتی ہے۔ دو طلاقیں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ پہلے سورۂ الطلاق کی اس آیت کو ملا کر پڑھیئے۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ؕ (۹۹/۱)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! (آپ مسلمانوں کو ہدایت کر دیجیئے کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انہیں عدت کے وقت طلاق دو۔ اور عدت کو شمار کرتے رہو اور اپنے پروردگار یعنی اللہ سے ڈرتے رہو اور انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود اپنے گھروں سے نکلیں سوائے اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں۔

اس آیت کریمہ میں لِعِدَّتِھِنَّ میں لام وقت کے بیان کے لیئے ہے یعنی حِیْنَ عِدَّتِھِنَّ۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نماز کے سلسلہ میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ (۱۷/۷۸)

ترجمہ: (اے پیغمبر اسلام!) آپ آفتاب کے ہر انتقال کے وقت نماز قائم کیجئے۔

آفتاب کے ایک انتقال کے وقت (مثلاً زوال آفتاب کے وقت) ایک ہی نماز (یعنی ظہر کی نماز) پڑھی جا سکتی ہے۔ پھر دوسرے انتقال پر (کہ آفتاب کی حدت ختم ہو جائے اور وہ آنکھ کے سامنے آجائے) بھی ایک ہی نماز (یعنی عصر کی نماز) پڑھی جا سکتی ہے۔ پھر تیسرے انتقال پر (کہ آفتاب غروب ہو جائے) ایک ہی نماز (یعنی مغرب کی نماز) پڑھی جا سکتی ہے۔

کسی ایک انتقال پر دو نمازیں نہیں پڑھی جا سکتیں۔ بعینہٖ اسی طرح طلاقیں دو مرتبہ کر کے دی جا سکتی ہیں اور ہر طلاق عدت کے وقت دی جا سکتی ہے۔ یعنی جب عورت حیض سے پاک ہو جائے تو اب عدت کا وقت شروع ہو گیا۔ اس وقت طلاق دی جا سکتی ہے۔ اور یہ عدت کا وقت تیسرے ماہواری ایام تک پر محیط ہے۔ اگر عورت کو ماہواری آتی ہو، یا اب سے پورے تین ماہ تک کو محیط ہے اگر عورت کو ماہواری ایام نہ آتے ہوں۔ سورۂ نساء کی آیت نے یہ بتلا دیا تھا کہ طلاق دو مرتبہ کر کے دی جائے گی ایک ساتھ نہیں دی جا سکتی اور سورۂ الطلاق کی اس آیت نے اس ایک بار کی طلاق کا وقت عدت بتایا ہے۔ اور عدت پورے تین مہینے یا تین ماہواری ایام ہوتی ہے۔ ایک طہر نہیں۔

لہٰذا دونوں میں سے ہر بار کی طلاق کا وقت عدت یعنی پورے تین مہینے یا تین ماہواری ایام ہونے چاہئیں۔ جو کام مؤقت ہوتے ہیں یعنی جو وقت مقررہ پر کیئے جانے چاہئیں اس میں وہی کام کیا جا سکتا ہے جو اس وقت کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ جیسے ظہر کے وقت میں آپ ایک ظہر کی نماز ہی پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح پہلی مرتبہ کی طلاق کے وقت آپ پہلی مرتبہ کی طلاق ہی دے سکتے ہیں۔ اسی وقت میں آپ دوسری مرتبہ کی طلاق بھی پہلی کے ساتھ نہیں دے سکتے۔ جیسا کہ ظہر کے وقت میں آپ ظہر کے ساتھ عصر اور مغرب کی نماز نہیں پڑھ سکتے۔ ویسے بھی ہر مرتبہ کی طلاق کے بعد رجوع کر لینا یا عدت پوری کرا کے عورت کو رخصت کر دینا ضروری تھا۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی محولہ بالا آیت میں صراحتًہ، فرمایا گیا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر مرتبہ کی طلاق ختم ہی اس

وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ یعنی شوہر رجوع کرلے یا عدت پوری کرکے عورت رخصت ہو جائے۔

اس ساری تفصیل سے ظاہر ہے کہ ایک طلاق کے وقت میں ایک مرتبہ ہی طلاق دی جاسکتی ہے۔ جسے ہمارے فقہاء طلاق احسن کہتے ہیں۔ دو تین مرتبہ طلاق نہیں دی جاسکتی۔ طلاق دراصل نہ کوئی گالی ہے۔ نہ کوئی وظیفہ ہے کہ اسے ایک دو تین دفعہ دہرایا جائے۔ تو مخاطب کی زیادہ دل آزاری ہوگی یا زیادہ ثواب ملے گا۔ یہ تو معاہدۂ نکاح کے فسخ کا اعلان ہے۔ معاہدہ اگر کسی نے ایک مرتبہ کرلیا ہے اور وہ اسے فسخ کرنے کا اعلان چاہتا ہے تو اپنے فسخ کے اعلان کا لفظ زبان سے ایک مرتبہ ادا کرلے یا دس مرتبہ، چونکہ معاہدہ ایک ہے اس لئے اس کے فسخ کرنے کا جب اعلان کیا جائے گا تو وہ فسخ بھی ایک ہی ہوگا۔ البتہ اگر اس نے معاہدہ کے فسخ کا اعلان کئی مرتبہ کر دیا ہے تو اسے پہلے اعلان کی تاکید کہا جاسکتا ہے۔ نیا فسخ نہیں کہا جاسکتا۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اگر عورت مدخول بہا ہے تو اسے شروع عدت میں طلاق دی جائے گی۔ تو جب کسی نے طلاق کا ارادہ کرکے اس سے کہا کہ " تمہیں طلاق" تو ان الفاظ کے ادا کرتے ہی جو اس کے عزم پر دلالت کرتے ہیں، بلا کسی ادنیٰ تقدیم و تاخیر کے معاً طلاق پڑ گئی۔ اب جب کہ ان دونوں کے درمیان رشتۂ ازدواج ٹوٹ گیا اور قطع تعلق ہوگیا تو دوسری بار اور تیسری بار اس کو توڑنے اور کاٹنے کا حق اس کو کہاں رہا ؟

کیا شریعت مطہرہ یا دیگر قوانین و شرائع میں اس کی کوئی نظیر

پیش کی جا سکتی ہے کہ ایک ہی عقد و معاہدہ کو ایک مرتبہ کاٹ دینے اور توڑ دینے کے بعد اسے دوبارہ، اور سہ بارہ توڑا جائے؟ یہ تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس کی دوبارہ، سہ بارہ تجدید کر لی جائے اس کے بعد ہی اس کے فسخ کی تجدید ممکن ہوگی اور یہ نئے عقد کا فسخ اور توڑنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے نکاح کو ایک بندھن اور معاہدہ قرار دیا ہے۔ یہ دنیوی اور دینی مقدس معاہدہ ہے۔ حق تعالیٰ نے اسے احکام عقل سے کہیں مُستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ یہ بھی دوسرے فسوخ کی طرح ایک فسخ ہے۔ ایک عقد کو ایک ہی بار توڑا جا سکتا ہے۔ اگر مرد اپنی مطلقہ سے عدت کے اندر رجوع کرے۔ یا عدت کے بعد از سر نو نکاح کر لے تو ان کے درمیان عقد کی تجدید ہو گئی۔ گویا اس نے ایک مرتبہ توڑ دینے کے بعد اسے جوڑ لیا۔ اب دوبارہ اس کا قطع کرنا ممکن ہوگا۔ اسی طرح تیسری بار بھی۔ رہا یہ کہ وہ عقد منقطع ہو چکا ہو اور اس کے بعد بھی اِسے کاٹنا ممکن ہو تو اس کو نہ تو عقل ہی باور کرتی ہے اور نہ اس پر کوئی دلیل نقلی ہی موجود ہے۔ بلکہ کتاب و سنت کی نص کے بھی مخالف ہے کیونکہ خدائے تعالےٰ نے طلاق کو مَرَّۃً بَعْدَ مَرَّۃٍ دینے کا حکم دیا ہے نہ کہ اکٹھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد چونکہ رجوع کا حق باقی رہتا ہے اس لئے کہا جائیگا کہ طلاق مکمل نہیں ہوئی۔ اس لئے وہ شخص دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ کہتا ہے تاکہ طلاق پختہ ہو جائے۔ لیکن یہ کہنا بداہت کا انکار ہے۔ رجُوع کا حق ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ طلاق واقع ہو گئی۔ اگر طلاق واقع نہیں ہوئی تو وہ رجوع کس بات

عـہ واضح رہے کہ رجوع بہ معنی تجدید نکاح ہی ہے۔

سے کر رہا ہے؟ کیا ایک طلاق کے بعد عدت گذر جانے پر عورت کسی دوسرے آدمی سے عقدِ ثانی نہیں کر سکتی؟

ایک موٹی سی بات ہے کہ مسلمان آپس میں روزانہ ہزار ہا باہمی معاہدے کرتے ہیں اور اُنہیں توڑتے ہیں۔ جو معاہدہ ہو چکا ہے اسے توڑنے کا اعلان آپ ایک وقت میں ایک لفظ سے کریں یا اس لفظ کو ہزار مرتبہ دہرائیں، یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی نے اپنا معاہدہ توڑ دیا۔ البتہ اگر معاہدہ ایک مرتبہ توڑ دینے کے بعد از سرِ نو دوبارہ معاہدہ کر لیا گیا ہے اور اس کے بعد پھر توڑا گیا ہے تب یہ کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے اپنا معاہدہ دوسری مرتبہ بھی توڑ دیا۔ اگر دوسری مرتبہ توڑنے کے بعد پھر از سرِ نو تیسری مرتبہ معاہدہ کر کے پھر بھی توڑ دیا گیا ہے تو اب یہ کہا جائے گا کہ اس شخص نے تیسری مرتبہ بھی معاہدہ کو توڑ دیا ہے۔ لیکن اگر معاہدہ پہلی مرتبہ توڑا گیا ہے۔ لیکن معاہدہ توڑنے والے نے تین مرتبہ کہا ہے کہ میں نے معاہدہ توڑ دیا۔ میں نے معاہدہ توڑ دیا۔ میں نے معاہدہ توڑ دیا، تو اسے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے تین مرتبہ معاہدہ کو توڑ دیا ہے۔ جب تک ایک معاہدہ توڑنے کے بعد از سرِ نو دوسرا معاہدہ نہ کیا جائے اسے دوسری مرتبہ معاہدہ توڑنا نہیں کہا جا سکتا اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں تمہارے ہاں دو مرتبہ گیا اور تم نہیں ملے حالانکہ وہ صرف ایک مرتبہ گیا تھا اور کھڑے کھڑے اس نے دو تین آوازیں دیں اور واپس چلا گیا تو یہی کہا جائے گا کہ یہ شخص صراحۃً جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ صرف ایک مرتبہ آیا تھا۔

نکاح عبادت ہے

اس کے جواب میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ۔

"ان فرنگی مجتہدین کے خیال میں نکاح ایک خالص خرید و فروخت کا سا معاملہ ہے جس کا تعلق جانبین کی رضامندی سے ہے اور جانبین جس طرح چاہیں اپنے معاملہ کو طے کر لیں۔ .... نکاح کو محض ایک معاملہ سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔ نکاح دراصل عبادت ہے اور اس میں معاملہ کا پہلو نہایت مغلوب ہے۔" الخ

(عائلی مسودہ قوانین پر اختلافی نوٹ از مولانا احتشام الحق تھانوی)

اول تو نکاح کو عبادت کہنا ہی غلط ہے کیونکہ قرآن کریم نے نکاح کو عُقْدَةُ النِّكَاحِ (نکاح کا بندھن) اور مِيثَاقًا غَلِيظًا (نہایت ہی مضبوط عہد) قرار دیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی اسے عبادت نہیں فرمایا لیکن برسبیل تنزل اگر اسے عبادت بھی مان لیا جائے۔ کیونکہ ایک مؤمن رضائے الٰہی کے لئے قانونِ الٰہی کے مطابق جو کام بھی کرتا ہے وہ عبادت ہی ہوتا ہے تو عبادت اور معاہدہ میں کونسا تضاد ہے۔ کیا ایک معاہدہ عبادت نہیں ہو سکتا اور کیا ایک عبادت معاہدہ نہیں ہو سکتی۔ آخر ان دونوں میں منافات کونسی ہے۔ چلئے معاہدہ کا پہلو مغلوب ہی سہی لیکن معاہدہ کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ پھر معاہدہ کے احکام اس پر نافذ کیوں نہیں ہوں گے۔؟

میں کہتا ہوں کہ اگر نکاح معاہدہ نہ بھی ہو بلکہ خالص عبادت ہو تب بھی کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مشروع عبادات کے شروع کرنے کے طریقے اور ختم کرنے کے طریقے شریعت نے جب مقرر کر دیئے ہوں

تو انہیں اسی طرح شروع کرنا ہوگا جس طرح شریعت نے بتایا ہے اور اسی طرح ختم کرنا ہوگا. جس طرح شریعت نے تعلیم دی ہے. نماز اور روزہ عبادات ہیں. ان کو شروع کرنے اور ختم کرنے کے طریقے خود شریعت کے مقرر کردہ ہیں. اگر کسی شخص نے دو رکعت نماز نفل شروع کی اور قاعدہ کے مطابق نماز نہیں پڑھی اور نہ ختم کی بلکہ درمیان میں توڑ دی تو اب اس نماز کی (جو نفل تھی) قضا اس پر واجب ہو جاتی ہے. کسی نے نفل روزہ شروع کیا اور اسے شریعت کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی توڑ دیا تو اس پر اس نفل روزہ کی قضا واجب ہو جاتی ہے عبادات کا تو مقررہ طریقہ پر شروع کرنا اور مقررہ طریقہ کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور بھی واجب ہے. لہٰذا اگر نکاح نری عبادت بھی ہو تب بھی اسے شریعت کے مقررہ طریقہ پر شروع کرنا اور شریعت ہی کے مقرر فرمودہ طریقہ پر پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور بھی واجب ہوگا. یہ فرنگی کا اجتہاد نہیں ہے بلکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے. چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت (دارقطنی کے الفاظ کے ساتھ نہیں جس سے طلاقِ حسن اور طلاقِ سنت پر استدلال کیا جاتا ہے اور جسے بیہقی نے ضعیف کہا ہے. بلکہ) صحاح ستہ کے الفاظ کے ساتھ یوں ہے کہ

"انہوں نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دیدی تھی حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرما دیا. تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ ابن عمرؓ کو اس سے رجوع کرنا چاہیئے. پھر اسے اپنے پاس روکے حتیٰ کہ پاک ہو جائے، پھر اسے حیض آئے

اور پاک ہو جائے۔ پھر اگر وہ طلاق دینا چاہے تو اسے طلاق دے
دے اس سے پہلے کہ اسے وہ ہاتھ لگائے تو یہ عدت کے مطابق
طلاق دینا ہوگا جس کا اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے"

(جمع الفوائد صـ۲۳۲/۱ مطبوعہ مطبعہ خیریہ میرٹھ)

ایک دوسری روایت میں یہ اضافہ بھی آیا ہے کہ۔
"حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔
یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ عِدَّتِهِنَّ
ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! جب تم عورتوں کو طلاق دیا کرو تو ان
کی عدت کے حساب سے یعنی شروع میں طلاق دیا کرو"

(جمع الفوائد صـ۲۳۲/۱)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ معاہدۂ نکاح کا فسخ عین اس طریقہ کے مطابق کرنا لازم ہے جو شریعت نے مقرر فرمادیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے حیض کی حالت میں بیوی کو طلاق دیدی تھی حالانکہ حکم یہ ہے کہ حیض کے بعد جب عورت پاک ہو جائے تو اسے طہر کی ابتداء میں طلاق دی جائے۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے رجوع کر کے بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا اور پھر شریعت کے مطابق طلاق دینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ بحث اپنے موقعہ پر آگے آئے گی کہ طہر کی ابتداء میں طلاق دینا قرآن کریم سے کیسے ثابت ہے۔

دوسرا سوال اب ہم دوسرے سوال کو لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں کیا کسی نے ایسی غلطی کی تھی کہ بیک وقت بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہوں اور آپ نے کیا فیصلہ

فرمایا تھا ؟

اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہؒ نے اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں بڑی تفصیل سے بحث فرمائی ہے۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع احادیث سے بحث کرنا نہیں ہے اس لئے ہم مفصّل بحث کو نظر انداز کرتے ہیں، جنہیں شوق ہو وہ مجموعۂ فتاویٰ صفحہ ۱۹-۲۲ ج ۳، پر اس بحث کو ملاحظہ فرمالیں۔ نیز ابن القیم نے زادالمعاد صفحہ ۲۵ ج ۲ اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں صفحہ ۲۴۵ ج ۶ میں بحث فرمائی ہے۔ وہاں دیکھ لیں۔

مختصراً یہ عرض ہے کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور امام ابوداؤد وغیرہ نے طاؤس سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں اور دو سال تک حضرت عمرؓ کی خلافت میں تین طلاقیں ایک شمار ہوا کرتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ ابن الخطابؓ نے فرمایا کہ لوگوں نے اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لینا شروع کر دیا ہے جس میں انہی کا فائدہ تھا تو کاش ہم انہیں ان پر نافذ کر دیتے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے تین طلاقوں کو نافذ کر دیا۔

امام احمدؒ ابن حنبلؒ اپنی مسند میں بیان فرماتے ہیں کہ ہم سے سعید ابن ابراہیم نے بیان کیا، ان سے ان کے والد نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے داؤد ابن الحصین نے عکرمہ سے نقل کیا ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے کہ رکانہؓ ابن عبد یزید نے جو مُطّلِب کے بھائی تھے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدی تھیں جس پر انہیں بعد میں شدید رنج ہوا۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رکانہؓ سے پوچھا کہ تم نے اپنی بیوی کو کس طرح طلاق دی تھی ؟ رکانہؓ نے عرض کیا کہ میں نے اُسے

تین طلاقیں دی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا ایک ہی مجلس میں؟ رکانہؓ نے اثبات میں جواب دیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تینوں طلاقیں ایک ہی طلاق ہیں۔ لہٰذا تم اپنی بیوی سے اگر چاہو تو رجوع کر لو۔ چنانچہ رکانہؓ نے رجوع کر لیا تھا۔ (بحوالۂ مذکورہ بالا)

حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا حدیث صحیح مسلم، سنن ابو داؤد اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے۔ اس کی سند میں کسی محدث نے کوئی کلام نہیں کیا۔ سب محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور مسلّم ہے۔ اس کے خلاف صرف یہ ایک بات کہی گئی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس کے خلاف فتویٰ منقول ہے۔ لیکن اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ جہاں تک فتوے کا تعلق ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کے موافق بھی فتویٰ منقول ہے۔ اور ابن تیمیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے اور

ع ہمیں آج تک کوئی ایسی نص نہیں مل سکی کہ عہدِ نبویؐ اور دورِ صدیقیؓ کے متفقہ فیصلے کو بدلنے کا سیدنا عمرؓ کو تو اختیار ہے لیکن زمانۂ فاروقی کا کوئی فیصلہ بدلنے کا کسی کو حق نہیں۔ اگر حالات بدل جانے سے عہدِ نبوی کا فیصلہ بدلا جا سکتا ہے تو حالات تبدیل ہو جانے سے عہدِ فاروقی کا فیصلہ بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

غلطی غالباً یہاں سے چلی کہ ہم نے دستور (CONSTITUTION) قانون (LAW) ذیلی قانون (BI-LAWS) اور فرمان (ORDINENCE) میں فرق نہیں کیا۔ سیدنا عمرؓ کا فرمان صرف آرڈی ننس تھا اور آرڈی ننس مشروط اور وقتی ہی ہوتا ہے۔ جب مدّت ختم ہو جاتی ہے تو حکم بھی خود بخود واپس ہو جاتا ہے۔ اور سابق حکم اپنی جگہ لوٹ آتا ہے۔ اسکی مثال یوں سمجھئے کہ اسلامی مملکت کا سربراہ فرمان جاری کرتا ہے کہ منگل اور بدھ کو ذبیحہ نہ کیا جائے تو تمام مسلمانوں کو اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان دنوں میں ذبیحہ حرام ہو گیا بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جانوروں کی قلت جب تک موجود ہے تب تک اس پر عمل ہوتا رہے گا لیکن جب یہ قلت دور ہو جائے گی تو اصل سابق حکم اس وقتی فرمان کی جگہ لے لے گا۔ اس کا نام آرڈی ننس ہے اور یہی سیدنا عمرؓ نے نافذ فرمایا تھا یہ ایک

جو فتویٰ اس کے خلاف منقول ہے اسے انہوں نے دلائل سے ضعیف ثابت کیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں، تین طلاقیں شمار ہوں گی تو اس کے بعد یہی قانون بن گیا تھا۔ اور خلیفۂ وقت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سیاستہً یا مصلحۃً عام قانون سے ہٹ کر کوئی آرڈیننس نافذ کر دے۔ اس کے بعد کسی فرد کو اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ وہ حکومتِ وقت کے خلاف فتوے صادر کر سکے۔ لہٰذا حضرت ابن عباسؓ نے اگر خود اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف فتویٰ دیا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس سے اصل حدیث پر کوئی شبہ یا کوئی اعتراض واقع نہیں ہو سکتا۔ صحابۂ کرامؓ اور آئمہ کے حالات میں اس قسم کے کئی نظائر موجود ہیں۔

وقتی فرمان تھا۔ کیونکہ بے سوچے سمجھے طلاق دینے کا رواج ختم کرنا تھا اور ساتھ غلط حلالے کا چور دروازہ بھی بند کرنا تھا۔ آپ نے جہاں تین یکبارگی طلاقوں کو تین ہی طلاقیں قرار دیا وہاں حلالہ کرنے والے اور کرانے والے دونوں کے لئے حدِ زنا جاری کرنے کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ اس سزائے رجم کا اعلان بھی آرڈی ننس ہی تھا۔ کیونکہ حلالے کی یہ سزا نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ اب ہم نے کیا کیا؟ طلاق والے آرڈی ننس کو تو قرآن کی طرح ازلی ابدی بنا لیا مگر دوسری طرف حلالے والے آرڈی ننس کو نہ فقط یہ کہ جاری نہیں کیا بلکہ اس کو رواج دینے کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ لَا تَتَّخِذُوا الصَّلٰوةَ پر تو عمل کیا اور وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى کو نظر انداز کر دیا۔

یہ ستم ظریفی بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احکام تو وقتی آرڈی ننس مان لیتے ہیں مگر سیدنا عمرؓ کے آرڈی ننس کو دوامی ابدی تسلیم کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ حضورؐ کا یہ فرمان کہ شراب کے فلاں فلاں برتن استعمال نہ کرو یا زیارت قبور نہ کرو، عبوری اور وقتی احکام تھے اسے سب مانتے ہیں مگر سیدنا عمرؓ کے مخصوص وقتی آرڈی ننس کو مستقل اور ہمیشہ کے لئے واجب العمل قرار دینے میں ذرا بھی لیس و پیش نہیں کرتے۔

دوسری حدیث ہم نے حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کے متعلق پیش کی ہے۔ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔ لیکن اصول حدیث کے اعتبار سے صحیح ترین حدیث وہی ہے جو ہم نے پیش کر دی ہے باقی روایات یا ضعیف ہیں یا موضوع ہیں۔ تفصیلی بحث امام ابن تیمیہ کی ہاں دیکھ لی جائے امام ابن تیمیہؒ کی آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اصول حدیث کے اعتبار سے ان کی علمی بحثوں اور پھر احادیث کے صحت وضعف سے متعلق ان کے فیصلوں کا اپنا ایک مقام ہے۔ کیونکہ وہ حدیث کے ایک مسلم امام تھے۔

بہر حال اس مختصر بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں اگر تین طلاقیں بیک وقت دی جاتی تھیں تو وہ ایک طلاق ہی شمار کی جاتی تھی۔ نہ صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بھی اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک بھی اسی پر عمل ہوتا تھا۔

تیسرا سوال اب ہم تیسرے سوال کو لیتے ہیں کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو تین طلاقیں تسلیم کرنا کب سے شروع ہوا اور کیوں ؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضرت فاروق اعظم عمرؓ ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں دو سال گذر جانے کے بعد یہ قانون نافذ فرمایا تھا کہ آئندہ سے بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں تین شمار ہوں گی اور ان کے بعد کسی کو نہ رجوع کرنے کا حق ہوگا نہ ازسرنو نکاح کر لینے کا۔ انہیں ایسا ہی

سمجھا جائے گا جیسا کہ کسی شخص نے مختلف اوقات میں وقفوں کے ساتھ تین طلاقیں دی ہوں۔ اب یہ دیکھنا ہوگا کہ دو سال گذر جانے کے بعد ایسے کیا واقعات پیش آئے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اتنا اہم آرڈی ننس جاری کرنا پڑا۔ یہ خالص ایک تاریخی سوال ہے۔ اس کے لئے ہمیں تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

مصر کے مشہور محقق و مؤرخ محمد حسین ہیکل "الفاروق عمرؓ" میں رقم طراز ہیں۔

"حضرت عمرؓ نے قرآن کریم کی نص صریح میں ایسا اجتہاد فرمایا ہے کہ جس میں ہم آج ان کی مخالفت کر رہے ہیں؛ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط

ترجمہ: طلاق دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔ پھر (طلاق کے بعد) دستور کے مطابق بیوی کو روک لینا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔

پھر ارشادِ الٰہی ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط فَاِنْ طَلَّقَهَا

ترجمہ: پھر اگر شوہر اُسے (تیسری مرتبہ) طلاق دیدے تو بیوی اس کے لئے اس کے بعد حلال نہیں رہے گی الا یہ کہ وہ عورت اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر کے نکاح میں چلی جائے۔ اور وہ بھی اسے طلاق دیدے۔

اور بالکل واضح ہے کہ اس نص کا مقصد ہی یہ ہے کہ طلاق عملاً ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ (وقفہ سے) واقع ہو۔ اور دونوں مرتبہ طلاق کے بعد شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ

اپنی بیوی سے رجوع کرلے، پھر جب وہ اسے تیسری مرتبہ طلاق دیدے تو بیوی اس کے لئے حلال نہیں رہے گی تا آنکہ وہ کسی دوسرے شوہر کے نکاح میں رہ لے۔ اور اس نص صریح کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ پھر یہ کہ طلاق زوجیت کی زندگی کو ختم کر دینے والی چیز ہے جس پر میاں اور بیوی دونوں کے لئے اہم ترین نتائج مرتب ہوتے ہیں، نہ صرف میاں بیوی پر بلکہ اس کے اثرات ان دونوں کی اولاد تک متعدّی ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر اس کے اثرات ان تمام کی زندگی بھر انتہائی دردناک ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لئے کتاب اللہ نے شوہر کو پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد بیوی سے رجوع کر لینے کا حق دیا تھا اور اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمادیا تھا کہ طلاق سے پہلے میاں بیوی کے درمیان صلح و صفائی کی پوری پوری کوشش کی جانی واجب ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا، اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا۔

ترجمہ: اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان مناقشہ کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث شوہر کے خاندان سے اور ایک ثالث بیوی کے خاندان سے مقرر کر دو۔ اگر یہ دونوں ثالث اصلاح حال کی کوشش کریں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت اور ہم آہنگی پیدا فرمادیگا۔

پھر جب موافقت و یگانگت پیدا کرنا مشکل ہو جائے اور طلاق کے ذریعہ سے جدائی واقع ہو جائے تو اس کے باوجود شوہر

کے لئے دو مرتبہ رجوع کی اجازت ہے، تاکہ میاں بیوی مستحکم تعلق ازدواج کے توڑنے کو معمولی بات نہ سمجھیں۔ کتاب اللہ نے فرض کر دیا ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق کے بعد شوہر کے لئے بیوی سے رجوع کرنا حلال نہیں ہوگا۔ تا آنکہ وہ کسی دوسرے شوہر کے نکاح میں نہ رہ لے۔ پھر جب آدمی اپنی بیوی سے یوں کہے کہ تجھے تین طلاقیں ہیں تو یقیناً صرف ایک طلاق ہی واقع ہو گی کیونکہ طلاق ایک فعل کا نام ہے جو وقوع پذیر ہوتا ہے کسی لفظ کا نام نہیں ہے جسے بول دیا جاتا ہو۔ یہی صورت حال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں تھی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق کے عہد میں نیز خلافت فاروق اعظم کے دو سال تک تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں پھر عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں نے اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لیا ہے جس میں انہی کے لئے سہولت تھی تو کاش ہم اس کو ان پر نافذ کر دیتے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے ان پر نافذ فرما دیا۔

حضرت عمرؓ کے اقدام کی وجہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ رائے کیسے قائم فرمائی اور اسے لوگوں پر نافذ فرما دیا باوجودیکہ یہ بات ظاہر نص اور حکمت کے بالکل خلاف تھی؟ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کے لئے آیت کے نزول کے سبب کی طرف رجوع کریں۔۔۔۔

غالب گمان یہ ہے کہ جو لوگ حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنی بیویوں کو طلاق دیتے تھے وہ عورتوں کے ساتھ انہیں طلاق دیدینے کے بعد رحمدلی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ عراق اور شام سے گرفتار ہو کر آنے والی عورتوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اور مدینہ والے اور جزیرۃ العرب کے باشندے ان پر فریفتہ ہو رہے تھے تو یہ لوگ اپنی بیویوں کو جلد جلد طلاقیں دے رہے تھے تاکہ اپنی محبوب اور پسندیدہ عورتوں کو رضامند کرنے میں مبالغہ سے کام لیں اور وہ اپنی بیویوں کو تین طلاقیں ایک لفظ کے ساتھ دیدیتے تھے تاکہ عشوہ نوانا اور غمزہ طراز شامی اور عراقی دوشیزائیں مطمئن ہوجائیں۔ (کیونکہ ان میں تعدد ازدواج کا رواج نہیں تھا اور وہ ایک بیوی کی موجودگی میں سوکن بن کر رہنا کسی طرح گوارہ نہیں کرسکتی تھیں) البتہ تین طلاقوں کی صورت میں انہیں اطمینان ہوجاتا تھا کہ ان کے ہونے والے شوہروں کے دلوں پر تنہا انہی کا قبضہ رہے گا۔ اور شاید کچھ دوسرے اسباب بھی ہوں جنہوں نے اس ابتدائی عہد کے مسلمانوں کی جماعت کو تین طلاقوں کو کھیل بنا لینے اس کی اہمیت کو مذاق بنا لینے اور عرب عورتوں کو نقصان پہنچانے پر آمادہ کردیا ہو۔ منجملہ ان اسباب کے یہ بھی کہ آدمی ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرتا تھا۔ یہ عورتیں جنگ میں گرفتار ہو کر آنیوالی عورتیں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ عربی اور عجمی دونوں قسم کی عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن وہ

شادی کرنے سے پہلے یہ شرط لگاتی تھیں کہ پہلے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدو تاکہ اس کے بعد وہ تمہارے لئے حلال نہ رہے چنانچہ مرد تین طلاقیں دے دیا کرتے تھے۔ یہ عورتیں چونکہ مسائل کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتی تھیں، وہ مطمئن ہوکر ان سے شادی کر لیتی تھیں۔ لیکن پھر جب وہ اس کے باوجود ان سے رجوع کر لیتے تھے تو ان کی یہ رجوع کر لینے کی حرکت مستقل نزاع کا باعث بن جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے نہ حالات کو استقرار حاصل ہوتا تھا اور نہ ہی زندگی میں سکون واطمینان حاصل ہو پاتا تھا" الخ

(الفاروق عمرؓ ج۲ ص ۲۲۵-۲۸۳ مطبوعہ شرکۃ ماہیہ مصریہ القاہرہ ۱۳۶۴ھ)

بہرحال اس عہد میں یہ پیش آمدہ حالات تھے جن کے پیش نظر حضرت عمرؓ کو یہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔ ایران، خراسان، شام و فلسطین کے علاقے مسلمانوں کے زیر نگیں آچکے تھے۔ ان علاقوں میں عیسائی، یہودی اور پارسی قومیں آباد تھیں، حسن وجمال میں ان علاقوں کی عورتیں امتیازی حیثیت کی مالک تھیں۔ عربوں کو ان سے شادیاں رچانے سے انتہائی شغف تھا۔

چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اکثر گھروں میں ان علاقوں کی عورتیں موجود تھیں۔ لیکن ان اقوام میں تعدد ازدواج کا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہ ایک بیوی کی موجودگی میں لازماً شادی کرنے سے انکار کرتی تھیں جب تک پہلی بیوی کی چھٹی نہ کر دی جائے۔ انہیں نکاح وطلاق کی ،

باریکیوں کا بھی علم نہیں تھا۔ کیونکہ ان قوموں میں اسلامی طلاق کا کوئی رواج تھا ہی نہیں۔ ان کی معلومات محض سُنی سنائی باتوں تک محدود تھیں۔ دوسری طرف عرب کے لوگ نسب کی حفاظت کے ہمیشہ سے خوگر اور گرویدہ چلے آتے تھے وہ عرب نژاد خاندانی پچھلی بیویوں کو بالکلیہ چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایرانی اور رومی حسیناؤں کو بھی عربوں سے نکاح کرنے میں رغبت تھی۔ کیونکہ وہ بہر حال فاتح اور حاکم قوم کے افراد تھے۔ اور وہ گرفتار ہو کر ان کے ہاتھوں میں پڑ ہی چکی تھیں۔ انہوں نے یہ سنا کہ مسلمانوں کے ہاں طلاق بھی دی جا سکتی ہے اور اس طرح پچھلی بیوی کی چھٹی کرائی جا سکتی ہے چنانچہ انہوں نے نکاح سے پہلے یہ شرط رکھی کہ آپ اپنی بیوی کو طلاق دیدیں تو ہم شادی کر لیں گے۔ عربوں نے دھڑا دھڑ بیویوں کو طلاق دے کر ان سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ لیکن ایک دو ماہ بعد نسبی حفاظت کی گرویدگی نے اپنا اثر دکھایا اور اُنہوں نے عرب کی خاندانی بیویوں سے رجوع کر کے انہیں پھر واپس لانا شروع کر دیا۔ نتیجۃً ہر گھر میں مستقل چپقلش کا دروازہ کُھل گیا اور باہمی بدمزگیاں پیدا ہونے لگیں۔ گھروں کا امن و سکون غارت ہو کر رہ گیا۔ اس کے نتیجہ میں ایرانی اور رومی دوشیزاؤں نے عربوں سے نکاح کرنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب انہیں معلوم ہو گیا کہ اسلام میں طلاق دینے کے بعد رجوع بھی کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا عرب عورتوں کو طلاق دلوانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہے لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد ان کے علم میں یہ بات آئی کہ اسلام میں تین مرتبہ طلاق دیدینے کے بعد رجوع کرنا ممکن نہیں رہتا تو ان دوشیزاؤں نے اس پر اصرار شروع کر دیا کہ تم اپنی بیویوں کو تین مرتبہ طلاق دیدو

تو پھر ہم تم سے نکاح کر سکتی ہیں۔ عربوں نے دھڑا دھڑ تین طلاقیں دے کر ان سے نکاح کرنا شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ ایک ساتھ تین طلاقیں بھی ایک ہی طلاق کے حکم میں تھیں۔ اس لئے عربوں نے تین طلاقیں دے کر بھی رجوع کرنا شروع کر دیا اور پھر وہی خانگی نزاعات شروع ہو گئے اور وہی صورتِ حالات پیش آئی جو ایک طلاق کی صورت میں پیش آ چکی تھی۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب گھرانوں میں ان عجمیوں کی اس کثرت تعداد سے خوش نہیں تھے۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ عرب ان عجمی دوشیزاؤں سے اپنے حرم آباد کر لیں۔ وہ جانتے تھے کہ عربوں کا نسبی تحفظ کا جذبہ عرب نژاد خاندانی بیویوں کو بالکلیہ چھوڑ دینا گوارہ نہیں کر سکتا۔ نیز اس رویہ سے عربوں کا خانگی امن و سکون بھی برباد ہوتا جا رہا ہے لہٰذا انہوں نے اس کا یہ علاج سوچا کہ بیک وقت تین طلاقوں کو تین مرتبہ کی طلاقوں کا درجہ دیدیا جائے تو اس صورتِ حال کا مداوا ممکن ہے۔ اس طرح عرب اپنی خاندانی بیویوں کو طلاقیں دینا بند کر دیں گے اور عجمی دوشیزاؤں سے کسی حد تک نجات حاصل کر سکیں گے۔ اور عربی گھرانوں کا امن و سکون لوٹ آئے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اقدام خالصتہً ایک سیاسی مصلحت کی خاطر تھا۔ اور اس میں انہیں دیگر صحابہ کرام کی بھی تائید حاصل تھی۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا یہ اقدام جو مخصوص حالات میں انتظامی مصلحت کی خاطر اٹھایا گیا تھا انتہائی ضروری تھا۔ حضرت عمرؓ ان حالات میں اگر یہ قدم نہ اٹھاتے تو ایک کوتاہی ہوتی۔ لیکن

حضرت عمرؓ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ اسے دائمی قانون کی حیثیت دے لی جائے خلیفۂ سوقت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کچھ وقت کے لئے کسی خاص حکم کو خصوصی حالات میں معطل کر دے۔ خلافت راشدہ کے دَور میں اس کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ ہی نے سرزمین عرب میں جب عام قحط پڑا تو چوری (سرقہ) کی سزا کو کچھ دن کے لئے معطل فرمادیا تھا۔ مذکورہ بالا مسئلہ میں چونکہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوتی تھیں اور شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس رجوع کرنے کے حق کو معطل فرمادیا اور اِسے تین مرتبہ کی طلاقیں تسلیم کئے جانے کا حکم صادر فرمادیا۔ خصوصی حالات میں ہنگامی طور پر ہر حکومت کو ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ اور اس میں کوئی تعجب یا حیرت کی بات نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کی ندامت

انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے تمام فقہاء کرام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ سے سند لیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ فرمادیا تھا اور کسی صحابی نے اس سے انکار نہیں فرمایا۔ لہٰذا صحابۂ کرام کا اجماع ہوگیا ہے کہ اگر بیک وقت تین طلاقیں دیدی جائیں تو عورت مطلقاً حرام ہو جائے گی اور بغیر حلالہ کرائے پہلے شوہر سے جدید نکاح نہیں کرسکتی لیکن بیچارے حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود اپنے اس اقدام پر ندامت اور شرمساری کا اعتراف فرما رہے ہیں۔ لیکن کوئی اس طرف دھیان دینے کے لئے تیار نہیں۔ حافظ ابن القیمؒ نے اپنی مشہور کتاب اغاثۃ اللہفان عن مصائد الشیطان

میں نقل کیا ہے کہ۔

حافظ ابوبکر اسماعیلی نے مسند عمرؓ میں نقل کیا ہے۔ ہمیں ابویعلی نے خبر دی کہ ہم سے صالح ابن مالک نے حدیث بیان کی کہ ہم سے خالد ابن یزید ابن ابی مالک نے اپنے والد سے حدیث بیان کی کہ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں کسی بات پر اتنا شرمندہ نہیں ہوا جتنا ان تین باتوں پر شرمندہ ہوا کہ میں نے طلاق کو حرام قرار نہ دیا ہوتا (یعنی اس سے عورت کے حرام ہونے کا فرمان جاری نہ کیا ہوتا) اور میں نے آزاد کردہ غلاموں کا نکاح نہ کرایا ہوتا اور یہ کہ میں نے نوحہ کرنے والی عورتوں کو قتل کر دینے کا حکم نہ دیا ہوتا۔ الخ

حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرمانے کے بعد حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ۔

اور معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ کی مراد طلاق رجعی کو حرام کر دینا تو نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین سے جس کا جواز بداہۃً ثابت ہے اور نہ وہ ناجائز طلاق مراد ہو سکتی ہے جس کے ناجائز ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے یعنی دوران حیض عورت کو طلاق دیدینا یا ایسے طہر میں طلاق دیدینا جس میں شوہر نے مقاربت کر لی ہو اور نہ ہی طلاق قبل الدخول مراد ہو سکتی ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اور تم پر کوئی مضائقہ نہیں اگر تم عورتوں کو انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی یا مہر مقرر کرنے سے پہلے ہی طلاق دیدو۔

(۲/۲۳۶)

یہ تمام صورتیں کھلم کھلا محال ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان میں سے

کسی صورت کو مراد لیا ہو لہذا قطعی طور پر یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اس سے تین طلاقوں سے عورت کے حرام کرنے ہی کو مراد لیا ہے۔ الخ

(اغاثۃ اللہفان عن مصائد الشیطان ص۳۵۱ ج۱ مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ بمصر ۱۳۸۱ھ و ۱۹۶۱ء)

حضرت عمرؓ کے اس اعتراف کے بعد وہ ساری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر ہمارے فقہاء کرام نے تکیہ فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ جامع ترمذی میں ہے دروی عن عمر ابن الخطاب انہ جعل البتۃ واحدۃ یعنی سیدنا عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے طلاق بتہ کو ایک ہی طلاق قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں بیشمار صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین تین طلاق بیک مجلس کو ایک ہی مانتے آئے ہیں۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

فاضل عزیز کی توجیہہ

ہمارے ایک فاضل عزیز نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کی عجیب دعزیب توجیہہ فرمائی ہے جو خود ان کے قول کے مطابق بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"اس سلسلے میں مسئلہ کی حقیقت پہلے ہی واضح کی جا چکی ہے کہ اگر کوئی شخص تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرے، نیت ایک ہی طلاق کی ہو اور اس نے محض تاکید کی نیت سے بار بار الفاظ طلاق استعمال کئے ہوں تو طلاق دیانتہً ایک ہی سمجھی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں نیز حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں دیانت عام تھی جس پر

اعتماد کیا جا سکتا تھا — بعد میں حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہ دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے اور آئندہ کچھ نہ رہے گا۔ اور لوگ جھوٹ بول بول کر حرام کیا کریں گے، صحابہ سے مشورہ کے بعد یہ عام حکم نافذ کرا دیا کہ اب تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی (غالباً کاتب سے یہاں "نہ" کا لفظ ساقط ہو گیا ہے۔ مؤلف) جو شخص اللہ کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کر کے تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کر دے گا تو وہ بہر صورت واقع قرار دی جائیں گی، ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ قرآن و سنّت کے مطابق نہ ہوتا تو حضرت عمرؓ ایسا کیوں کرتے ؟ یا اگر وہ کرتے بھی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر جان دینے والے صحابہ اس کو کیسے گوارہ کر لیتے ؟ معلوم ہوا کہ ان کا یہ فیصلہ قرآن و سنّت کے عین مطابق تھا۔ اور تین طلاقوں کا ایک کی نیت ہونے کی صورت میں ایک شمار ہونا ایک خاص وقت تک تھا۔ جب وہ ختم ہو گیا تو یہ بھی باقی نہ رہا۔ آئمہ اربعہ اور اُمّت کے جمہور علماء نے بھی اسے اسی لئے قبول کیا ہے۔ الخ

(ہمارے عائلی مسائل ص ۱۸۸-۱۸۹)

یہ توجیہہ، بوجوہ نا قابل قبول ہے۔

اوّل تو یہ کہنا بہت بڑی جسارت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف ساڑھے چار سال بعد ہی (اڑھائی سال صدیق اکبرؓ کی خلافت اور دو سال حضرت عمرؓ کی خلافت) جو صحابۂ کرام اور کبار تابعین کا دور ہے دیانت و امانت بالکل ختم ہو چکی تھی کہ لوگ معاذاللہ معاذاللہ

جھوٹ بول بول کر حرام کرنے لگے تھے۔ جبکہ مسلمانوں میں یہ صورت آج تک بھی پیدا نہیں ہوئی۔ جاہل سے جاہل مسلمان اپنے علماء کے غلط فتووں پر آج بھی اپنے گھر برباد کر لیتے ہیں اور جھوٹ بول کر حرام کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے۔ مسلمانوں کے گھروں کی اس بربادی کی دو چار مثالیں ہر شخص کے علم میں ہوں گی۔ مجھے حیرت بلکہ افسوس ہے کہ یہ سطور کسی شیعہ عالم کے قلم سے نہیں نکلیں بلکہ ایک ایسے فاضل مصنف کے قلم سے نکلی ہیں جو خود کو علماء اہل سنّت کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ٥

دوسری بات یہ ہے کہ خود فاضل موصوف تسلیم فرما چکے ہیں کہ۔

"طلاق کے دو اثر ہوتے ہیں، ایک طلاق دینے والے کے نکاح سے نکل جانا اور دوسرے کسی اور مرد سے نکاح کا جائز ہونا۔ ان میں سے پہلا اثر تو طلاق دیتے ہی مرتب ہو جاتا ہے .... اسی اثر کی وجہ سے جس لمحہ مرد نے طلاق کے الفاظ زبان سے ادا کئے اسی لمحہ سے عورت کو مطلقہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں عدّت گذارنے سے پہلے ہی ایسی عورتوں کو "مُطَلَّقَات" کے نام سے یاد کیا گیا ہے"۔

(ہمارے عائلی مسائل ص۱۶۴-۱۶۵)

اور یہ اعتراف فاضل موصوف سے کسی سبقتِ قلم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ائمۂ فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ طلاق اسی لمحہ سے مؤثر ہو جاتی ہے جس لمحہ شوہر کی زبان سے طلاق کا لفظ نکلا تھا۔

ہم تفصیل کے ساتھ اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ شوہر نے جب ایک طلاق کا لفظ مُنہ سے نکالا تو بیوی پر طلاق پڑ گئی اب وہ اس کی بیوی نہیں

رہی۔ وہ اس کے لئے ایک اجنبی عورت ہو گئی۔ تو جب وہ دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ طلاق کا لفظ مزید طلاقیں دینے کے لئے زبان سے نکالتا ہے تو وہ ایک اجنبی عورت کو مخاطب کر رہا ہے جو اب اس کی بیوی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ الفاظ لغو ہیں اور غیر محل میں ہیں۔ اِلّا یہ کہ یہ کہا جائے کہ وہ اپنے پہلے قول کی تاکید ہی میں یہ الفاظ بول رہا ہے۔ ایک عاقل و بالغ آدمی کے قول کو بامعنی اور بامطلب قرار دینا بجائے لغو، غلط اور بے محل قرار دینے کے اولیٰ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا جو طلاقیں بیک وقت دو اور تین کی تعداد میں دی جاتی ہیں وہ تاکید کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس میں دیانت اور امانت کا کیا سوال ہے۔ اس کا کوئی دوسرا صحیح محمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ عاقل و بالغ آدمی ہے تو وہ تاکید کے لئے دوسرا اور تیسرا لفظ استعمال کرے گا۔ اور اگر پاگل اور مجنون ہے تو اس کی بات کا کوئی، اعتبار ہی نہیں۔ لہٰذا یہ سوال اُٹھانا کہ دیانت داری کا فقدان ہو چلا تھا لوگ جھوٹ بول کر حرام کریں گے۔ اس کا اندیشہ پیدا ہو چکا تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے ایسا اقدام فرمایا۔ خود کو اور سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا فاضل موصوف کی یہ توجیہہ خود ان کے قول اور ائمۂ فقہاء کے متفقہ ارشاد کی رو سے غلط ہے اور قابل قبول نہیں ہے۔

هٰذا ما رأيته والله اعلم وعلمه اتم واحكم

علامہ تمنّا عمادیؒ کی تفسیر

ہمارے دور کے بلند مرتبہ عالم علامہ تمنّا عمادی مرحوم محتاج تعارف نہیں۔ علمی حلقوں میں وہ ہمیشہ اپنی قرآنی بصیرت اور اسماء الرجال

کے فن میں مہارت کے اعتبار سے یاد کئے جاتے رہیں گے۔ مسئلہ طلاق میں انہوں نے جمہور مفسرین کے خلاف آیاتِ طلاق کی جو تفسیر فرمائی ہے وہ بھی زبان و لغت کے قواعد و اصول اور اسلامی مسلمات کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اس پر پوری توجہ سے غور کیا جائے۔ ؎

علامہ عمادیؒ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتابچہ "الطلاق مرتان" کے نام سے تحریر فرمایا تھا جو عزیزیہ آرٹ پریس ۲۵۷ لال باغ روڈ ڈھاکہ سے شائع ہوا تھا۔ یہ کتابچہ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ اور چیدہ چیدہ نکات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

آیاتِ طلاق یہ ہیں۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ
اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ
مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ
بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ
يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ
وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا
تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ
اللّٰهِ يُبَيِّنُھَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ

؎ محترم مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی مدظلہٗ بھی علامہ تمنا عمادیؒ کے ہم خیال ہیں اور دلائل کے اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ ان کے استدلال کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ
ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا
اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ
مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (۲۲۸-۲۳۱)

ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں (انتظار کریں) اور ان کے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے پیٹوں (رحم) میں پیدا کیا ہے اسے چھپائیں۔ اگر وہ اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہوں۔ اور طلاق کے سلسلہ میں ان کے شوہر ان کی واپسی کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ باہمی اصلاح کا عزم رکھتے ہوں۔ اور عورتوں کے حقوق دستور کے مطابق ویسے ہی ہیں جیسے ان کے واجبات ہیں۔ اور مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری حاصل ہے اور اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ وہ طلاق (نکاح کو فسخ کر دینا) دو مرتبہ ہو سکتی ہے پھر دستور کے مطابق روک لینے کا امکان ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔ اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی لے لو۔ البتہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے (تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے) تو (اے جماعت مسلمین) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں جو عورت بطور فدیہ کے دیدے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہوں گے۔ تو اگر (عورت نے فدیہ میں کچھ دیا اور) شوہر نے اسے طلاق دے دی تو عورت طلاق کے بعد اس کے لئے حلال نہیں رہے گی جب تک وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے آدمی سے نکاح نہ کر لے۔ پھر اگر اس

دوسرے شوہر نے بھی اسے طلاق دے دی تو اُن دونوں پر اب کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف لوٹ جائیں بشرطیکہ وہ دونوں توقع رکھتے ہوں کہ وہ اب اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں وہ اہل علم کے لئے کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو۔ پھر وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو دستور کے مطابق (تجدید نکاح کر کے) اُنہیں روک لو یا دستور کے مطابق اُنہیں رخصت کر دو۔ اور انہیں نقصان پہنچانے کے لئے نہ روکو کہ ان پر زیادتی کرو۔ اور جو ایسا کرے گا تو اس نے خود اپنے اوپر ہی ظلم کیا اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے انعام کو یاد کرو۔ اور کتاب و حکمت سے جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے۔ تاکہ وہ اس سے تمہیں نصیحت کرے اسے بھی یاد رکھو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

طلاق صرف دو مرتبہ

علامہ تمنا عمادیؒ نے تیسری مرتبہ طلاق کا مطلقاً انکار فرمایا ہے۔ ان کی تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے طلاق صرف دو مرتبہ بتائی ہے۔ وہ دو ہی مرتبہ ہو سکتی ہے۔ دو سے زیادہ مرتبہ نہیں ہو سکتی دو مرتبہ کے بعد بھی اگر تیسری مرتبہ کوئی طلاق دیتا ہے تو یہ لغو ہے قرآن نے شوہر کو اس کا حق ہی نہیں دیا۔ وہ دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد اگر رجوع کرتا ہے یا نکاح کی تجدید کر کے بیوی کو واپس لیتا ہے تو وہ یہ سوچ اور سمجھ کر ایسا کرے کہ اب مجھے اس عورت کے ساتھ مرتے دم تک نباہ کرنا ہوگا اور چاہے عورت کی زیادتی ہی کیوں نہ ہو میں اِسے الگ نہیں کر سکوں گا۔ بیوی بھی خوب سمجھ لے کہ وہ اس کے بعد اس مرد سے چاہے وہ کتنی ہی زیادتیاں کرے الگ نہیں ہو سکے گی۔ الطلاق مرتان میں الطلاق پر

الف لام استغراق کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر طلاق (وہ خلع کی ہو۔ ایلاء کی ہو، ظہار کی ہو، لعان کی ہو) صرف دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔ دو مرتبہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ۔

"کسی کام کی گنتی مقرر کی جاتی ہے اس لئے کہ وہ کام اس سے کم مرتبے نہ ہو یا یہ مقصود ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مرتبے نہ ہو یا کمی و زیادت دونوں کی نفی مقصود ہوتی ہے (تینوں صورتوں کی مثالیں بیان فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ) یہاں مَرَّتٰنِ کہہ کر کمی بیشی دونوں کا انکار ہو، ایسا کسی نے نہیں کہا۔ ایک ہی بار ایک ہی طلاق دیکر عدت پوری کرا دینا (طلاق احسن) بھی جائز بلکہ مستحسن ہے ہر شخص کے نزدیک۔ اس لئے یہاں یقیناً دو سے زیادت ہی کی نفی مقصود ہے۔ اگر گنتی مقرر کرنے سے نہ کمی کی نفی مقصود ہو نہ زیادت کی تو پھر گنتی مقرر ہی کس لئے کی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام لغو اور مہمل نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ بیویوں کو عموماً تین ہی طلاق دیا کرتے تھے۔ اور جب چاہتے تھے دیدیتے تھے اور کبھی تین سے بھی زیادہ دس بیس سو دو سو۔ ہزار دو ہزار طلاقیں کہہ کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دو مرتبے کی حد بندی کر کے دو مرتبے سے زیادہ طلاق کے رواج کو منسوخ فرما دیا۔" (الطلاق مرتان ص۷۶-۷۷)

الف ولام عہد مولانا مرحوم نے الطلاق پر الف ولام استغراق کا بتایا ہے۔ استغراق کا ہو یا جنس کا ہو مآل دونوں کا ایک ہی ہے۔ لیکن ہمارے مفسرین نے الف ولام عہد کا مانا ہے۔ الف ولام عہد کا مطلب یہ ہے کہ وہ خاص چیز مراد ہو جو خارج میں یا ذہن میں پہلے سے موجود ہو اور اس خاص چیز کو مراد لیا جائے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ خارج میں اس کا ذکر پہلے آچکا ہو یا متکلم اور مخاطب دونوں کے ذہن میں وہ پہلے سے موجود ہو۔ ہمارے مفسرین نے الطلاق پر جو الف لام عہد کا مراد لیا اور اس سے مراد طلاق رجعی لی اس کا ذکر پہلے کہیں نہیں آیا بلکہ بعد میں آرہا ہے یعنی فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ سے اسی لئے مولانا مرحوم اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے وہ فرماتے ہیں۔

"مفسرین لکھتے ہیں کہ الف لام عہد کا تو ہے مگر اس کا معہود طلاق رجعی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد فَاِمۡسَاكٌۢ موجود ہے اور شوہر کو امساک کرنے (بیوی کو روک لینے) کا حق رجعی طلاق ہی میں ہوتا ہے۔ مفسرین کے نزدیک تو والمطلقت یتربصن میں استغراق کی وجہ سے ان کی خارج از قرآن روایات والی بائنہ و مغلظ سب طلاقیں داخل ہیں اور باوجود بینونت تامہ و تغلظ کے بھی مطلقہ بائنہ، مبتوتہ و مغلظہ کو عدت کرنی ہی پڑے گی۔ اس لئے اگر یہاں طلاق میں لام عہد کا ہے تو اس کا معہود اس اَلۡمُطَلَّقٰتُ والیوں کی طلاق تو ہو نہیں سکتی۔ تو پھر معہود کون اور کہاں ہو گا۔ وہ طلاق رجعی ہو گی

جو بعد میں فَاِمْسَاكٌ کے پیٹ میں چھپی ہوئی ہے۔ یعنی معہود عہد کے بعد فَاِمساك کی آڑ میں چھپا ہوا ہے تو نہ یہ عہد ذہنی ہوا نہ عہد خارجی بلکہ عہد رافضی ہوا کیونکہ آگے سے بھاگ کر پیچھے ایک لفظ کی آڑ میں چھپا بیٹھا ہے۔

(الطلاق مرتان ص۷۴-۷۵)

مولانا مرحوم کے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ الطلاق پر الف لام عہد کا مان کر اس سے طلاق رجعی مراد لینا صحیح نہیں ہے اگر لام عہد کا ہو تو یہ بات ضروری ہے کہ طلاق رجعی کا ذکر اس سے پہلے کہیں آچکا ہو۔ پورے کلام میں طلاق رجعی کا تذکرہ کہیں نہیں آیا۔ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ سے جو طلاق سمجھی جاتی ہے وہ طلاق رجعی نہیں ہے کیونکہ ہمارے فقہاء کے نزدیک عدت (یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ) صرف طلاق رجعی ہی میں نہیں بلکہ بائنہ، مبتوتہ، مغلظہ سب طلاقوں میں لازم آتی ہے۔ لہٰذا جو طلاق الْمُطَلَّقٰتُ سے سمجھی گئی تھی وہ تو ہر قسم کی طلاق تھی۔ صرف طلاق رجعی نہیں تھی۔ اس کے جواب میں مفسرین نے فرمایا کہ الف لام عہد کا ہے اور معہود کا ذکر بعد میں آرہا ہے یعنی

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط

ترجمہ: تو دستور کے مطابق روک لینا ہے یا خوش اسلوبی سے رخصت کر دینا ہے۔

اور یہ بات یعنی دستور کے مطابق روک لینا یا خوش اسلوبی سے رخصت کر دینا صرف طلاق رجعی میں ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے معہود کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ یہ کیسا معہود ہے

جو عہد کے بعد آ رہا ہے مولانا نے اسے عہد رافضی کا خطاب دیا ہے کیونکہ نہ یہ عہد خارجی ہے نہ عہد ذہنی ہے اور عہد رافضی کوئی عہد نہیں ہوتا۔[1]

آیاتِ خلع قرآن مجید میں یہ بیان فرما دینے کے بعد کہ طلاق صرف دو مرتبہ ہی ہو سکتی ہے، طلاق (طلاقِ مطلق) کی بات ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایک دوسری قسم کی طلاق، یعنی طلاق بالمعاوضہ کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ طلاق بالمعاوضہ کی بات کرنے سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ بیوی کو جو کچھ دے چکے ہو طلاق دے کر عام حالات میں اسے واپس لے لینا انتہائی ناپسندیدہ اور ناجائز ہے۔

چنانچہ بتایا گیا ہے کہ۔

(اے مسلمانو!) تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ جو کچھ تم نے بیویوں کو مہر یا دیگر چیزیں دیدی ہوں، وہ سب یا ان میں سے کچھ ان سے واپس لے لو۔ البتہ اگر ان دونوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو (مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ سے مرافعہ کیا جائے)

---

[1] مولانا تمنا عمادی لام عہد کا انکار نہیں فرماتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لام عہد کا بھی ہو سکتا ہے اور اس سے مراد وہی طلاق ہے جو وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ سے سمجھی جاتی ہے۔ لیکن وہ ساتھ ہی اس کے بھی قائل ہیں کہ عدت صرف رجعی طلاق ہی میں واجب ہوتی ہے۔ جس طلاق میں شوہر کو طلاق کے بعد رجوع کا حق نہیں ہوتا مثلاً غیر مدخولہ اور مختلعہ عورتیں کہ وہ طلاق ملنے پر بائنہ یعنی قطعاً الگ ہو جاتی ہیں ان پر عدت بھی واجب نہیں ہے۔ جہاں تک غیر مدخولہ کا تعلق ہے۔ مولانا کا ارشاد صحیح ہے لیکن مختلعہ پر بھی عدت واجب نہیں، یہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر ہم آگے بحث کریں گے۔ اسی صفحہ ۲۱۷ پر ہماری وضاحت دیکھئے
(محمد جعفر)

تو اگر تم (یعنی مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ) کو (بھی) یہ اندیشہ ہو کہ وہ واقعی اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو میاں بیوی پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں جو بیوی بطور فدیہ کے کچھ دے کر طلاق طلب کر لے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھو۔ جو اللہ کی ان حدود سے آگے بڑھے گا تو وہی لوگ ظالم ہوں گے۔"

اس سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں کہ۔

"وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا یہ عطف تفسیری ہے۔ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ پر یعنی اپنی مطلقہ کو عدت کے ختم ہو جانے کے بعد اپنے گھر سے رخصت کرو تو احسان یعنی حسن سلوک کے ساتھ، اور سب سے بڑا احسن سلوک اور سب سے ضروری اور اہم حسنِ سلوک یہ ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ تم اسے دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی اس سے واپس نہ لو۔

یہ حکم سورۂ نساء میں بھی آیا ہے۔ آیت نمبر ۱۹ میں ارشاد ہے۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

ترجمہ: تم ان کو مقید نہ رکھنا کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو وہ ان سے پھیر کے رہو۔

اور اسی کے بعد آیت نمبر ۲۰ میں ہے۔

وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا

ترجمہ: اگر تم ان کو سونے چاندی کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

یہاں بھی شَیْئًا کا لفظ آیا ہے۔ یعنی دی ہوئی چیزوں میں سے کچھ بھی واپس لینا اپنی مطلقہ سے جائز نہیں۔ غرض بطور خود اس خیال سے کہ اب تو یہ میری بیوی رہی نہیں پھر اس کے پاس میری دی ہوئی چیزیں کیوں رہیں۔ اس سے شوہر کوئی چیز بھی واپس نہیں لے سکتا۔

مگر ایسا ہو سکتا ہے کہ شوہر نے اپنا پورا مکان اپنی پوری جائداد، اپنا کھیت، اپنا باغ، اپنا پورا کارخانہ بیوی کے نام میل محبّت کے زمانہ میں لکھدیا ہو۔ اب چند برسوں سے رفتہ رفتہ شوہر کو اس بیوی کی سرکشی اور نافرمانی کے باعث اس سے بیزاری سی پیدا ہوگئی۔ وہ طلاق دینا چاہتا ہے مگر اپنے گھر، اپنی جائداد، اپنے کھیت، اپنے باغ اور اپنے کارخانے کے باعث طلاق نہیں دے سکتا۔ اور دلی بیزاری کے باعث باہمی حسنِ معاشرت کے حقوق و فرائض جو حدود اللہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ادا بھی نہیں کر سکتا نہ روکے بن پڑتی ہے۔ نہ چھوڑے۔ ایسی کشمکش میں بعض شوہر مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح کوئی عورت شوہر سے غایت درجہ بیزار ہو سکتی ہے۔ باوجود اس کے کہ شوہر نے اس کا مہر بھی ادا کر دیا ہے۔ اسے زیورات اور قیمتی ملبوسات بھی لا لا کر دیئے ہیں۔ اس شوہر سے اس کی بیزاری نہیں مٹتی۔ یہ شوہر سے طلاق مانگتی ہے۔ شوہر طلاق نہیں دیتا اور احسان جتاتا ہے کہ ہم نے مہر بھی ادا کر دیا۔ اتنے روپئے، اتنے زیورات اور ایسے ایسے قیمتی

کپڑے لاکر دیئے پھر بھی ہم طلاق دیدیں ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے. مگر عورت اپنی غایت بیزاری کی وجہ سے اس شوہر کے ساتھ حسن معاشرت کے جو فرائض ہیں نہ انجام دے سکتی ہے نہ اس کے حقوق خوش دلی سے ادا کر سکتی ہے. یعنی کسی طرح بھی حدود اللہ کو اس کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتی الخ

(الطلاق مرتان ص ۸۶-۸۷)

اس کے بعد مولانا نے یہ بتایا ہے کہ معاوضہ لے کر طلاق دینے کو قرآن کریم نے انتہائی ناپسند فرمایا ہے۔ نہ عورت کے لئے یہ کوئی پسندیدہ بات ہے کہ وہ طلاق جیسی ناپسندیدہ چیز کو قیمت ادا کر کے خریدے اور نہ مرد کے لئے یہ کوئی شریفانہ فعل ہے. کہ وہ طلاق جیسی ناپسندیدہ چیز کا معاوضہ حاصل کرے. لیکن بعض حالات ایسے ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں کہ مرد چاہے بھی تو بلا معاوضہ طلاق نہیں دے سکتا۔ اور عورت بھی بعض اوقات معاوضہ ادا کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے اس لئے مخصوص حالات میں جبکہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ میاں بیوی حدود الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکتے تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے اور ایسی صورت میں یہ سودے بازی جو صورۃً نہایت شرمناک فعل ہے کوئی شرعی گناہ نہیں ہوگا۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ

ترجمہ :- پھر اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دیدی تو معاوضہ لینے کے بعد وہ اس کے لئے حلال نہیں رہے گی تاآنکہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے آدمی سے

نکاح نہ کرلے۔

اس پر مولانا فرماتے ہیں کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا میں فاء تعقیب کے لئے ہے اور اس کا عطف فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ پر ہے۔ جو بالکل اس جملے سے پہلے آرہا ہے۔ مفسرین نے جو اس جملہ کا عطف اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ پر کیا ہے اسے مولانا تسلیم نہیں کرتے جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ جملہ بہت دور واقع ہے۔ اُس جملہ کے درمیان اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے درمیان کئی جملے آگئے ہیں۔ چنانچہ مولانا کا ارشاد ہے کہ۔

"مفسرین جو فَاِنْ طَلَّقَهَا کا عطف اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ پر کرتے ہیں تو کس قاعدے سے کرتے ہیں؟ کیا وہ درمیان کے سب جملوں کو جملہ ہائے معترضہ قرار دیں گے؟ یا دے سکتے ہیں؟"
(الطلاق مرتان ص۹۵)

دوسری وجہ یہ ہے کہ۔

اسی اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ پر اس کے فوراً بعد میں آنے والے جملہ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا کا عطف ہو رہا ہے جس میں مردوں کے لئے جمع مذکر حاضر (لَكُمْ، تَاْخُذُوْا، اٰتَيْتُمُوْا) کی ضمیریں آرہی ہیں اور عورتوں کے لئے جمع مؤنث غائب (هُنَّ) کی ضمیر آرہی ہے۔ اگر فَاِنْ طَلَّقَهَا کا عطف بھی "الطلاق مرتان" ہی پر ہو تو قاعدہ کے مطابق ضمیریں اسی انداز سے آنی چاہئیں تھی۔ جیساکہ ضمیریں اس جملہ میں آئی تھیں جس پر اس کا عطف کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آیت یوں ہوتی۔

فَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ فَلَا يَحِلُّنَّ لَكُمْ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى يَنْكِحْنَ اَزْوَاجًا

غَيْرَكُمْ فَاِنْ طَلَّقُوْهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَتَرَاجَعُوْا اِنْ ظَنَنْتُمْ اَنْ يُّقِيْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط

ترجمہ: پھر اگر تم نے ان کو طلاق دے دی تو وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہوں گی اس کے بعد تا آنکہ وہ تمہارے علاوہ دوسرے شوہروں سے نکاح کر لیں۔ پھر اگر وہ بھی انہیں طلاق دے دیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم رجوع کر لو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکو گے۔

لیکن فَاِنْ طَلَّقَهَا والے جملہ میں مردوں کے لئے واحد مذکر غائب (طَلَّقَ، لَہٗ، غیرہٗ) اور عورتوں کے لئے واحد مؤنث غائب رہا، تحل، تنکح) کی ضمیریں آ رہی ہیں جو اس سے پہلے جملے (آیتِ خلع) کے عین مطابق ہیں۔ (یَخَافَا، یُقِیْمَا، یُقِیْمَا، عَلَیْہِمَا، افْتَدَتْ) لہٰذا یہ بات خود اس کی دلیل ہے کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا کا عطف اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ والے جملہ پر نہیں ہے۔ بلکہ اس سے متصل آیت یعنی آیت خلع پر ہے۔ (ایضاً ص ۹۵-۹۶)

مولانا کی اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر فدیہ لینے والے شوہر نے اپنی فدیہ دینے والی بیوی کو طلاق دیدی تو وہ فدیہ دینے والی بیوی اپنے اس فدیہ لینے والے شوہر کے لئے اس کے بعد حلال نہیں رہے گی۔

من بعد کا مضاف الیہ

مولانا سوال فرماتے ہیں کہ۔ "یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مِنْ بَعْدُ کس فعل سے تعلق رکھتا ہے؟ فَاِنْ طَلَّقَهَا سے یا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ سے؟ دوسرا سوال یہ کہ مِنْ بَعْدُ کا مضاف الیہ کون ہو؟ مفسرین فَاِنْ طَلَّقَهَا کا عطف اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ پر کرتے ہیں اور فَاِنْ طَلَّقَهَا

کے بعد اپنی طرف سے طَلَّقَهَا ثَالِثَةً تفسیر میں بڑھاتے ہیں۔ (یعنی پھر اگر شوہر نے بیوی کو تیسری طلاق دیدی) اس اضافے کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ کیونکہ محذوف تو اس کو کہتے ہیں جو لفظ اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے اور کسی غالب قرینے سے گویا مذکور اور عبارت میں موجود ہو مگر لفظاً مذکور نہ ہو جیسے اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا یعنی اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا فَاتَّقِ اللّٰہَ (اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے تو خدا سے ڈر۔) مگر جہاں کوئی قرینہ حالیہ یا مقالیہ کسی لفظ کے محذوف ہونے پر دلالت کرنے والا نہ ہو، وہاں بغیر کسی قرینے کے کوئی لفظ کسی آیت میں محذوف ماننا کھلی ہوئی تحریف لفظی اور تحریف معنوی دونوں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (آیت کلالہ کی مثال پیش فرما کر آگے کہتے ہیں)

ہمارے مفسرین رحمہم اللہ ادب عربی کے امام تھے۔ مگر کیا یہ لوگ اتنا نہیں جانتے تھے کہ مِنْ بَعْدُ جب آئیگا تو اپنے فعل مظروف (وہ فعل جس کا وہ ظرف ہے) کے بعد ہی آئے گا۔ کسی دوسرے فعل کے بعد نہیں آتا۔ اگر طَلَّقَهَا بَعْدَ الْمَرَّتَیْنِ تفسیر صحیح ہوتی تو مِنْ بَعْدُ، فَلَا تَحِلُّ لَهٗ کے بعد نہ آتا بلکہ فَاِنْ طَلَّقَهَا کے بعد آتا اور عبارت یوں ہوتی فَاِنْ طَلَّقَهَا مِنْ بَعْدُ فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰی تَنْكِحَ۔ مگر قرآن مجید میں مِنْ بَعْدُ، فَلَا تَحِلُّ لَهٗ کے بعد آیا ہے۔ اس لئے مِنْ بَعْدُ کا تعلق فَاِنْ طَلَّقَهَا سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک بھی مثال نہیں دکھائی جا سکتی کہ مِنْ بَعْدُ یا بَعْدُ کبھی اپنے فعل مظروف کو چھوڑ کر کسی دوسرے فعل کے بعد آیا ہو۔ اس لئے ان کی تفسیر کی جڑ ہی کٹی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس مِنْ بَعْدُ کا مضاف الیہ یہاں اَلْمَرَّتَیْنِ ہوتا تو وہ کبھی محذوف

نہ ہوتا۔ اس لئے کہ مَرَّتَانِ کا لفظ آیت نمبر ۲۲۹ کے شروع میں نہیں تو تقریباً شروع میں ہے۔ دونوں کے درمیان بُونِ بعید اور فاصلۂ مدید ہے۔ اور اس مِنْ بَعْدُ کے دوسرے مضاف الیہ قریب میں مل رہے ہیں جو مفہوم کے اعتبار سے بھی قریب تر ہیں۔ اس قریب کے مضاف الیہ کو چھوڑ کر اتنی دُور کسی کا ذہن نہیں جا سکتا۔ اگر مفسرین تیسری طلاق کو قرآن مجید سے کسی طرح ثابت کرنے کی دُھن میں نہ ہوتے تو وہ کبھی مِنْ بَعْدُ کو جو لَا تَحِلُّ لَہٗ کے بعد آیا ہے۔ خلافِ ادبِ عربی فَاِنْ طَلَّقَهَا کے متعلق نہ بتاتے اور مِنْ بَعْدُ کا مضاف الیہ قریب موجود ہوتے ہوئے اس کو چھوڑ کر دو آیت اُوپر زبردستی تلاش کرنے نہ جاتے۔ بلکہ ان کا ذہن بھی اس طرف نہ جاتا۔ یہ جوئے شیر تو تیسری طلاق کے عشق میں لائی گئی ہے۔

مِنْ بَعْدُ کا مضاف الیہ ایک تو بہت قریب نظر آرہا ہے اور وہ طلاق کا لفظ ہے۔ یعنی عبارت یوں ہو فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ هٰذَا الطَّلَاقِ۔ مگر اس تفسیر میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ اس صورت میں مِنْ بَعْدُ کا لفظ بیکار سا رہتا ہے۔ بغیر مِنْ بَعْدُ کے بھی فَلَا تَحِلُّ لَهٗ کی فائے تعقیب سے وہی مفہوم نکل رہا ہے۔ اور اس کو بے ضرورت مؤکد کرنا مِنْ بَعْدُ لاکر فضول ہے۔ قرآن مجید میں کوئی لفظ فاضل، بے سود نہیں آیا ہے۔ یہاں تو سیاق وسباق عبارت کا چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا کے معنے یہ ہیں کہ " تو اگر اس فدیہ لینے والے نے اس فدیہ دینے والی کو طلاق دیدی۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ اَخْذِ مَا افْتَدَتْ بِهٖ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ

ترجمہ: تو وہ فدیہ دینے والی اس شوہر کے لئے حلال نہ رہے گی اس فدیہ لے لینے کے بعد جب تک وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے۔

(الطلاق مرتان ص۹۶-۹۸)

مولانا عمادی مرحوم کے ان معارضات کا حاصل یہ ہے کہ فَاِنْ طَلَّقَھَا کا عطف اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ پر کرکے طَلْقَةً ثَالِثَةً کا لفظ محذوف ماننا قابل تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ محذوف ہمیشہ ایسا لفظ ہوتا ہے جو قرینۂ حالیہ یا مقالیہ سے خود سمجھ میں آرہا ہوتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ سمجھ میں خود تو نہ آرہا ہو، زبردستی آپ اسے محذوف مان لیں۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کے اور فَاِنْ طَلَّقَھَا کے درمیان پوری پانچ سطریں ہیں۔ درمیان میں دوسرے مضمون، مسائل خلع اور حدودِ الٰہی کا بیان آچکا ہے۔ عام ذہن تیسری طلاق کی طرف خود منتقل نہیں ہوتا بلکہ اسے جبراً منتقل کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مِنْ بَعْدُ جار مجرور سے مرکب لفظ ہے، سوال یہ ہے کہ یہ کس فعل سے متعلق ہے۔ یہاں دو فعل آرہے ہیں۔ ایک تو فَاِنْ طَلَّقَھَا اور دوسرے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ۔ یہ بتانا چاہیئے کہ یہ جار مجرور دونوں فعلوں میں سے کس سے متعلق ہے؟ مفسرین اسے فَاِنْ طَلَّقَھَا سے متعلق مانتے ہیں یعنی فَاِنْ طَلَّقَھَا مِنْ بَعْدِ الْمَرَّتَيْنِ (تو اگر دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دیدی) اگر ایسا ہوتا تو مِنْ بَعْدُ کا لفظ فَاِنْ طَلَّقَھَا کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ فعل کا متعلق اسی فعل کے ساتھ آنا چاہیئے جس سے وہ متعلق ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ متعلق تو کسی اور فعل سے ہو اور بعد میں کسی

دوسرے فعل کے آجائے۔

نیز یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ مِنۡ بَعۡدُ مبنی بر ضمہ اس لئے ہے کہ اس کا مضاف الیہ محذوف ہے۔ لہٰذا یہ بتانا چاہیئے کہ وہ مضاف الیہ کون ہے جو محذوف ہے۔ مفسرین نے یہاں بَعۡدُ کا مضاف الیہ مَرَّتَيۡنِ محذوف مانا ہے۔ اگر مَرَّتَيۡنِ اس کا مضاف الیہ ہوتا جو پوری پانچ سطریں پہلے گذر رہا ہے تو اسے قطعًا محذوف نہیں ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اس کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔ محذوف ہمیشہ وہ لفظ ہوتا ہے جو فحوائے کلام سے خود بخود سمجھ میں آجاتا ہو۔ یہاں اس سے قریب تر مضاف الیہ موجود ہیں جن کی طرف ذہن آسانی سے منتقل ہو رہا ہے۔

اس کے بعد ایک سوال یہ بھی ہے کہ مِنۡ بَعۡدُ ظرف ہے یعنی وہ کسی فعل کا وقت بتا رہا ہے تو پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کس فعل کا وقت بتا رہا ہے۔ یعنی اس کا مظروف کون ہے؟ ظاہر ہے کہ مِنۡ بَعۡدُ کا لفظ جس فعل کا وقت بتا رہا ہے اسے اسی فعل کے ساتھ متصل آنا چاہیئے مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ طلاق کا وقت بتا رہا ہے کہ دو مرتبہ طلاق دے دینے کے بعد اگر تیسری مرتبہ طلاق دیدی تو عورت اپنے شوہر کے لئے اس کے بعد حلال نہیں رہے گی۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو مِنۡ بَعۡدُ کو فَاِنۡ طَلَّقَهَا کے بعد آنا چاہیئے تھا۔ مگر قرآن کریم میں مِنۡ بَعۡدُ کا لفظ فَاِنۡ طَلَّقَهَا کے بعد نہیں آرہا ہے بلکہ فَلَا تَحِلُّ لَهٗ کے بعد آرہا ہے۔ یہ بات بھی اصول کے خلاف ہے۔

نیز اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مِنۡ بَعۡدُ کو فَاِنۡ طَلَّقَهَا کے

متعلق ماننے سے مِنْ بَعْدُ کا لفظ بالکل ہی بے ضرورت اور بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا پر تو پہلے ہی فائے تعقیب لگی ہوئی ہے جس کے معنے ہی یہ ہیں کہ جو فعل اس فار کے بعد آرہا ہے وہ زمانہ کے اعتبار سے اپنے ماقبل کے بعد واقع ہو رہا ہے۔ اور مِنْ بَعْدُ کا فائدہ بھی صرف یہی تو تھا۔ لہٰذا مِنْ بَعْدُ کا لفظ بالکل بیفائدہ اور بے ضرورت ہوگا حالانکہ قرآن کریم میں کوئی لفظ بے فائدہ اور بے ضرورت نہیں ہوتا۔

اس ساری تفصیل سے مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ تین طلاقوں کا قرآن کریم سے کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا۔ (پہلے والے) فَاِنْ طَلَّقَهَا کا تعلق اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے نہیں ہے۔ قرآن کریم نے وہ بات تو بتا دی کہ مطلقاً طلاق صرف دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ طلاق کا وہ بیان تو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا مسئلہ شروع ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ شادی کے بعد بیوی کو جو تم نے مہر یا مال و اسباب جو کچھ دیا تھا۔ طلاق کے بعد اس میں سے کچھ یا سب کا سب تم واپس نہیں لے سکتے۔ اگر تم ایسا کرو تو یہ انتہائی ناپسندیدہ غیر شریفانہ فعل ہوگا۔ البتہ مجبوری کی حالت میں اگر اس کی واقعی ضرورت پیش آجائے اور تمہاری ہیئت اجتماعیہ بھی اس کی ضرورت محسوس کرے (جس کی کچھ مثالیں خود مولانا نے پیش کی ہیں اور ہم ان کا مختصراً تذکرہ کر چکے ہیں۔) اور بیوی طلاق حاصل کرنے کے لئے معاوضہ دینا چاہے تو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اسی کو فقہار کی اصطلاح میں خلع لینا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ اللہ کی حدود

سے تجاوز کرتے ہیں تو وہی ظالم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ

ترجمہ:۔ تو اگر شوہر نے بیوی کو (معاوضہ لے کر) طلاق دے دی تو وہ (معاوضہ قبول کرنے کے بعد) شوہر کے لئے حلال نہیں رہے گی تا آنکہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے۔

یعنی اس ارشاد کا تعلق۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ

ترجمہ:۔ تو میاں بیوی پر کوئی گناہ نہیں اس معاوضہ میں جو عورت بطور فدیہ کے شوہر کو دے دے۔

سے ہے۔ چونکہ یہ عمل قرآن کے نزدیک ناپسندیدہ اور غیر شریفانہ تھا کہ عورت طلاق جیسی ناپسندیدہ چیز کو معاوضہ دے کر خریدے اور مرد طلاق جیسی ناشائستہ چیز کا معاوضہ قبول کر کے اسے فروخت کرے لیکن قرآن نے اس کی اجازت مجبوری کی صورت میں دی تھی۔ لہٰذا ان دونوں کو یہ سزا دی گئی کہ وہ عورت اب اس شوہر کے لئے حلال نہیں رہی۔ عام طلاقوں کے متعلق جو یہ اجازت تھی کہ۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ ۗ

ترجمہ:۔ دستور کے مطابق روک لینا بھی ممکن ہے اور حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا بھی۔

وہ رعایت اس صورت میں نہیں دی جا سکتی۔ شوہر نے جب معاوضہ وصول کر کے طلاق دی ہے تو رجوع کا کیا سوال، اور عورت نے جب باقاعدہ قیمت ادا کر کے طلاق خریدی ہے تو اس کے معنے یہ

ہیں کہ وہ شوہر سے انتہائی بیزار ہو چکی تھی کہ اوّل تو اس نے طلاق جیسی ناپسندیدہ چیز کو طلب کیا اور پھر اس کا معاوضہ بھی ادا کیا۔ لہٰذا ان دونوں میں اب نباہ ہونے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا وہ اب اس مرد سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتی۔

قاضی ثناءاللہؒ کی تائید

علامہ عمادیؒ کی یہ تفسیر کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ کا تعلق اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے نہیں ہے بلکہ اس سے پچھلی آیت میں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ سے ہے یعنی تو اگر مرد نے طلاق دے دی فدیہ لینے کے بعد تو عورت اس کے لئے حلال نہیں رہے گی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے طلاق حاصل نہ کر لے۔" کوئی ایسی تفسیر نہیں ہے۔ کہ وہ ان کی اپنی اُپج ہو اور ان سے پہلے کسی مفسر نے یہ تفسیر نہ کی ہو برصغیر کے مستند علماء تفسیر میں قاضی مفتی ثناءاللہ صاحب پانی پتیؒ محتاج تعارف نہیں ہیں ان کی تفسیر مظہری نہایت مستند تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔ قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ثُمَّ قال الله تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له، الفاء لفظ خاص للتعقيب وقد عقب الطلاق الافتداء فان لم يقع الطلاق بعد الخلع يبطل موجب الفاء۔ والقول بانه متصل باول الكلام، وقوله تعالیٰ ولا يحل لكم الی قوله تعالیٰ الظلمون معترض تحكم واخلال بنظم الكلام بلا دليل۔ وما قال الشافعیؒ ان الله سبحانه وتعالیٰ ذكر الطلاق فی اول الاٰية واٰخرها وذكر

الخلع فی ما بین ذالك، لیس بشیٔ، فانه لم یذکر الخلع والفسخ فی الکلام اصلا۔ انما ذکر افتداء المرأة وسکت عن فعل الزوج۔ فلیس فعله الا ما ذکر من الطلاق فظهر ان الطلاق المذکور سابقا ان لم یکن بمال فهو رجعی وان کان بمال فهو بائن حتی یتحقق الفداء ولا یجتمع البدل والمبدل منه فی ملك الزوج۔ سواء کان ذالك بلفظ الطلاق او بلفظ الخلع او غیرهما مما یؤدی معناه۔ وتسمیته خلعا اصطلاح لم یثبت من القراٰن واللّٰه اعلم۔ (تفسیر مظہری صفحہ ۲۹۸)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ (اگر اس نے طلاق دیدی تو وہ اس کے لئے حلال نہ رہے گی) اس میں "فاء" ایک ایسا لفظ ہے جو تعقیب کے مفہوم کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہاں طلاق کا ذکر افتداء (عورت کے فدیہ دینے) کے بعد کیا گیا ہے۔ تو اگر خلع کے بعد طلاق نہ ہو تو "فاء" کے لانے کی جو غرض تھی، وہ فوت ہو جاتی ہے۔ (لہٰذا یہ طلاق عورت کے فدیہ دینے کے بعد ہونی چاہیئے) اور یہ کہنا کہ وہ (یعنی فَاِنْ طَلَّقَهَا) شروع کلام میں جو اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ آچکا ہے اس سے متعلق اور متصل ہے اور درمیان میں لَا یَحِلُّ لَکُمْ سے اَلظّٰلِمُوْنَ تک جملہ معترضہ ہے۔ زبردستی کی بات ہے اور نظم کلام میں خلل ڈالنا ہے بغیر کسی دلیل کے۔ اور وہ جو امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ

تعالےٰ نے آیت کے اوّل و آخر میں طلاق کا ذکر فرمایا ہے۔ (ایک آیت کے اوّل و آخر میں نہیں بلکہ آیت ۲۲۸ اور آیت ۲۲۹ کے بالکل شروع میں۔ مؤلف) طلاق کا ذکر فرمایا ہے اور درمیان میں خلع کا۔ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خلع اور فسخ کا اس کلام میں بالکل ذکر کیا ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو عورت کے اپنی گلوخلاصی کیلئے مال پیش کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ مگر شوہر اس کے بعد کیا کرے گا؟ اس کے متعلق سکوت اختیار فرمایا ہے۔ تو یقیناً شوہر کا (اس موقعہ پر) طلاق کے سوا کوئی دوسرا فعل نہیں ہو سکتا جس کا ذکر فرمادیا گیا ہے (یعنی آیت ۲۲۸ میں طلاق کا ذکر نہیں کیا گیا اور آیت ۲۲۹ میں اس کا ذکر کر دیا گیا) تو ظاہر ہو گیا کہ وہ طلاق جو پہلے مذکور ہوئی ہے (اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ میں) وہ (دو قسم پر ہے) اگر مال کے بغیر ہو تو رجعی ہے اور اگر مال لے کر دی گئی ہو تو بائن ہے (یعنی عورت کو شوہر سے بالکل جدا کر دینے والی) تاکہ فدیہ دینے کا مقصد پورا ہو۔ اور بدل اور مبدل منہ (یعنی عوض اور وہ چیز جس کا عوض دیا گیا ہے) دونوں پر شوہر کا قبضہ نہ رہے (یعنی شوہر، عورت سے مال بھی لے لے اور رجعی طلاق دے کر اس سے رجوع بھی کر لے اور اسے روک لے تاکہ نکاح بھی باقی رہے۔ ایسا نہ ہونے پائے۔ اس لئے مال کے بدلے میں جو طلاق دی جائے وہ پوری طرح جدا کرنے والی ہو) اب

چاہے شوہر طلاق کا لفظ زبان سے ادا کرے یا خلع کا لفظ یا کوئی اور لفظ جو طلاق ہی کے مفہوم کو ادا کرے۔ اور اس معاملے کا نام جو خلع رکھا گیا ہے یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ اور اللہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ علامہ تمنا عمادی مرحوم سے بہت پہلے قاضی مفتی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو برصغیر کے اکابرین میں سے ہیں۔ بعینہٖ وہی بات فرما چکے ہیں کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ کا تعلق اس سے پچھلی آیت کے آخری حصہ میں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ سے ہے۔ پچھلی آیت کے بالکل شروع میں اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے نہیں ہے۔ نیز امام شافعیؒ کا یہ فرمانا کہ اس کا تعلق اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے ہے۔ اور کلام میں اس کے شروع اور آخر میں طلاقوں کا تذکرہ ہے اوّل دو مرتبہ کی طلاقیں اور پھر فَاِنْ طَلَّقَهَا سے تیسری مغلظہ طلاق اور ان طلاقوں کے درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر خلع کا ذکر آگیا ہے قاضی صاحب کے خیال میں لیس بشیئ (کچھ بھی نہیں ہے) خلع اور فسخ قرآن کی اصطلاح ہی نہیں ہے۔ قرآن نے تو صرف طلاق کا ذکر کیا ہے کہ وہ دو مرتبہ دی جا سکتی ہے۔ اگر بغیر معاوضہ لئے دی ہے تو وہ طلاق رجعی ہوگی اور اگر معاوضہ لے کر دی گئی ہے تو وہ بائن (بالکلیہ جدا کرنے والی) ہوگی۔ اسی کو قرآن کریم نے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (تو بیوی اس کے لئے حلال نہیں رہے گی۔ وہ اس سے بالکلیہ الگ ہوگئی تا آنکہ وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرلے) سے

بیان فرمایا ہے۔ یعنی وہ اپنے شوہر کے لئے حلال نہیں رہی اب وہ اس سے نہ رجوع کر سکتا ہے نہ دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ البتہ اگر اس عورت نے کسی دوسرے آدمی سے عقد نکاح کر لیا ہے۔ لیکن اس کا نباہ وہاں بھی نہیں ہوا، اس نے بھی اسے طلاق دیدی یا وہ مر گیا تو اس سزا کے بعد اب وہ اپنے پہلے شوہر کی طرف واپس جا سکتی ہے۔ یعنی اب پہلا شوہر اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

مولانا تمنا عمادی مرحوم فرماتے ہیں کہ اس دوسرے آدمی سے صرف عقد نکاح کر لینا بھی کافی ہو سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرا شوہر اس سے مقاربت بھی کرلے۔ وہ صرف عقد نکاح کر کے عورت کو ہاتھ لگائے بغیر اس کو طلاق دے دے تو بھی یہ عورت اپنے پہلے شوہر کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔

اصطلاحی حلالہ کوئی چیز نہیں

مولانا فرماتے ہیں کہ۔ "مفسرین لکھتے ہیں کہ صرف سعید ابن المسیب جو محدثین کے نزدیک جلیل القدر تابعی تھے فقط وہی یہاں حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ میں صرف زبانی عقد نکاح کو کافی سمجھتے تھے مگر جمہور آئمہ نکاح کے بعد مجامعت کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں زوجۂ رفاعہ والی حدیث کی وجہ سے۔" (الطلاق مرتین ص۱۰)

اس کے بعد آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"تَنْكِحَ، نکاح کا لفظ مجامعت کے معنے میں بھی آتا ہے۔ اور صرف زبانی ایجاب و قبول کے معنے میں بھی جیسا کہ منکوحہ غیر ممسوسہ کے

متعلق طلاق والی آیت میں مذکور ہے۔ مجامعت مرد کرتا ہے۔ عورت نہیں کرتی۔ اس لئے نکاح کا فاعل مرد ہی ہو سکتا ہے اگر نکاح بمعنیٰ مجامعت ہو۔ عورت منکوحہ ہوتی ہے ناکحہ نہیں ہوتی۔ مگر زبانی ایجاب وقبول میں مرد وزن دونوں یکساں طور سے برابر حصّہ لے سکتے ہیں۔ اس لئے عورت کی طرف جب "نکاح" کی نسبت فاعلی ہوگی (یعنی عورت کو نکاح کرنے والی بتایا جائے گا) تو اس نکاح سے زبانی ایجاب و قبول ہی مراد ہوگا۔ مجامعت مراد نہیں ہو سکتی۔

(ایضاً ص۱۰۱)

آیتِ مذکورہ بالا حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (یہاں تک کہ عورت اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرلے) میں نکاح کی فاعل عورت ہے۔ وہ نکاح کر رہی ہے۔ لہٰذا یہاں نکاح سے مراد مجامعت کے معنے نہیں ہو سکتے زبانی عقد نکاح کر لینے کے ہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس عورت نے معاوضہ ادا کر کے شوہر سے طلاق حاصل کی ہو (خلع لیا ہو) وہ اپنے اس شوہر کے لئے حلال نہیں رہے گی تاآنکہ وہ کسی دوسرے آدمی سے (اس کے سوا) عقد نکاح نہ کرلے۔ عقد نکاح کرنے کے بعد وہ اسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدے یا اس سے جنسی تعلق قائم کر لینے کے بعد طلاق دیدے یا وہ مر جائے۔ ہر صورت میں یہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائے گی۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ

آیاتِ طلاق ہم شروع میں از اوّل تا آخر لکھ آئے ہیں انہیں ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے اور مولانا مرحوم کے مزید استدلال پر

غور فرمائیے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ پہلی آیت (۲/۲۲۸) یوں تھی۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ط وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا

ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی تمام عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین حیض تک انتظار کریں گی اور ان کے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہو (حمل وغیرہ) اسے چھپائیں، اگر وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہوں۔ اور ان کے شوہر ان کو واپس کئے جانے کے زیادہ حقدار ہیں بشرطیکہ لوگ اسی میں اصلاح کی توقع رکھتے ہوں۔

یہاں سوال یہ ہے کہ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں هُنَّ جو ضمیر جمع مؤنث آرہی ہے اس کا مرجع کیا ہے۔ وہ کس طرف لوٹ رہی ہے ظاہر ہے کہ وہ اَلْمُطَلَّقٰتُ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ضمیر اسم ظاہر کی جگہ آتی ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ضمیر کی جگہ اس اسم ظاہر ہی کو رکھدیا جائے تو مضمون بالکل صحیح رہتا ہے اور مفہوم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لہٰذا عبارت یوں ہوئی۔

وَبُعُوْلَةُ الْمُطَلَّقٰتِ اَحَقُّ بِرَدِّ الْمُطَلَّقٰتِ

ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی تمام عورتوں کے شوہر ان کو واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اَلْمُطَلَّقٰتُ پر الف لام استغراق کا تھا جس میں وہ تمام عورتیں شامل تھیں جن کو طلاق دی گئی ہو کیونکہ الف لام جمع کے صیغہ پر آرہا ہے اور جمع کے صیغہ پر جب الف لام آتا ہے تو وہ استغراق ہی کے لئے

ہوا کرتا ہے جب انہی مُطَلَّقٰت کو هُنَّ کی ضمیر سے بیان کیا گیا تب بھی وہی الف ولام کے ساتھ مطلقات مراد ہوں گی یعنی تمام طلاق دی ہوئی عورتیں۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ وہ تمام عورتیں جن کو طلاق دی گئی ہو (یعنی ان کے شوہروں نے اُنہیں ازخود طلاق دی ہو) ان کے شوہر اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ عورتیں انہی کو واپس کی جائیں۔ صرف وہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہوں گی جنہوں نے طلاق معاوضہ دے کر خریدی ہو، کیونکہ وہ مطلقات نہیں ہیں بلکہ مُسْتَطْلِقَات (طلاق لینے والی) ہیں۔ آگے خلع کی بحث میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ بعض صحابہ، تابعین اور آئمہ فقہاء نے خلع کو طلاق مانا ہی نہیں بلکہ اسے فسخ نکاح قرار دیا ہے۔ تو ان حضرات کے نزدیک تو وہ مُسْتَطْلِقَات (طلاق طلب کرنے والیاں) بھی نہیں ہیں بلکہ وہ نکاح فسخ کرانے والیاں ہیں۔ بہرحال صرف خلع لینے والی عورتیں مستثنیٰ ہوں گی کہ وہ اپنے شوہروں کی طرف اس وقت تک نہیں لوٹ سکتیں جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلیں ورنہ ہر طرح کی مطلقات رجعی طلاق والیاں، بائنہ اور مبتوتہ طلاق والیاں، مغلظہ طلاق والیاں (یہ سب فقہاء کی اصطلاحات ہیں ورنہ قرآن کے نزدیک یہ اقسام کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ سب مطلقات ہیں اور مطلقات رجعی ہی ہوتی ہیں) سب کے شوہر جنہوں نے اُنہیں طلاق دی ہے اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کی بیویاں انہی کی طرف لوٹا دی جائیں بشرطیکہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی اس واپسی ہی میں اصلاح احوال کی توقع رکھتی ہو۔

واضح رہے کہ وہ عورتیں جنہوں نے اپنے شوہروں سے طلاق کا مطالبہ کیا اور شوہروں نے حسن سلوک کرتے ہوئے ان کے مطالبہ پر بدون کسی معاوضہ کے طلاق دے دی اور عورتوں نے طلاق کی کوئی قیمت ادا نہیں کی۔ ایسی عورتیں بھی مُطَلَّقَاتٌ ہی شمار ہوں گی ان کو مستطلقات (طلاق لینے والیاں) نہیں کہا جائے گا۔ ان کے شوہر بھی اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ ان عورتوں کو سمجھائیں بجھائیں اور وہ ان کے شوہروں ہی کو واپس کردی جائیں۔

ہمارے فقہاء اور مفسرین نے وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ سے خصوصیت کے ساتھ ان عورتوں کو مراد لیا ہے جن کو رجعی طلاق دی گئی ہو۔ حالانکہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ خود ان حضرات نقہاء اور مفسرین کے قول کے مطابق بھی طلاق رجعی کا بیان آیت نمبر ۲۲۹ میں اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے کیا گیا ہے۔ تو ایسی طلاق جس کا قرآن نے ابھی بیان ہی نہیں کیا وہ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ سے کیسے مراد ہوسکتی ہے۔ نیز ہمارے فقہاء اور مفسرین نے بالاتفاق آیت نمبر ۲۲۸ کے شروع میں اَلْمُطَلَّقَاتُ سے مراد وہ تمام طلاق دی ہوئی عورتیں لی ہیں جو مدخولہ ہوں، غیر حاملہ ہوں اور جنہیں ماہواری ایام ہونے ہوں۔ چنانچہ کسی عورت کو کسی قسم کی بھی طلاق دی گئی ہو، رجعی، بائنہ، مبتوتہ، مغلظہ، ساری مطلقہ عورتوں کی عدت تین حیض تک انتظار کرنا اسی آیت کی وجہ سے بتائی جاتی ہے صرف حاملہ اور غیر حائضہ اور غیر مدخولہ عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں

جن کا حکم دوسری آیات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اور بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں هِنَّ کی ضمیر انہی اَلْمُطَلَّقٰتُ کی طرف راجع ہو رہی ہے جن کی عدت تین ماہواری ایام بتائی گئی ہے۔ لہٰذا اس آیت کا لامحالہ یہی مطلب ہونا چاہیئے کہ تمام مطلقات خواہ (فقہاء کی اصطلاح میں) ان کو رجعی طلاق دی گئی ہو، بائنہ طلاق دی گئی ہو، مبتوتہ طلاق دی گئی ہو یا مغلظ طلاق دی گئی ہو، ان کے شوہر اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان کی مطلقہ بیویوں کو اُن ہی کی طرف لوٹایا جائے۔

مختلعہ پر عدت نہیں؟

اس ضمن میں مولانا نے ایک دعویٰ یہ بھی فرمایا ہے کہ خلع کی صورت میں جب شوہر نے معاوضہ لے کر طلاق دیدی تو یہ نکاح بالکل ختم ہو گیا اور اب عورت پر عدت گذارنے کی بھی پابندی نہیں ہے۔ مولانا عمادیؒ یہ سمجھتے ہیں کہ عدت کا مقصد صرف یہ ہے کہ شوہر اس طویل مدت میں اپنے اقدام کے بھلے بُرے نتائج پر اچھی طرح غور کر لے اور عورت بھی اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا احساس کر لے اور اگر ہو سکے تو شوہر کو رجوع کے لئے آمادہ کر سکے۔ رہ گئی وہ عورت جسے اس کے شوہر نے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدی یا وہ عورت جس نے معاوضہ دے کر طلاق خریدی ہے تو چونکہ وہ فوراً اپنے شوہروں سے جدا ہو جاتی ہیں اس لئے طلاق کے بعد انہیں عدت گذارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غیر ممسوسہ کے متعلق تو قرآن کریم نے خود صراحت فرمادی ہے۔

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (۳۳/۴۹)

ترجمہ: تمہارے لئے ان کے ذمہ کوئی عدت نہیں ہے جسے تم شمار کرو۔

اس لئے یہی حکم خلع لینے والیوں کا بھی ہے۔ لیکن مولانا مرحوم نے اس کی کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ۔

"مستطلقہ یعنی مختلعہ اگر شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے گی تو ظاہر ہے کہ وہ امساکی (رجعی) طلاق کا کبھی مطالبہ نہیں کرے گی۔ چاہے مال دے کر مطالبہ کیا ہو، چاہے بغیر کچھ مال دیئے۔ اس کا مطالبہ جب ہوگا تو مکمل فسخ نکاح کا ہوگا اس لئے عورت کے مطالبہ پر جب طلاق دی جائے گی تو وہ تسریحی (بائنہ) ہی ہوگی۔.......... اور چونکہ طلاق کے ساتھ نکاح ٹوٹ گیا۔ اور اب شوہر کا مفاد اس سے وابستہ نہ رہا اس لئے وہ مُستَطلِقَہ مُختَلِعَہ عدت بھی نہیں گذارے گی" الخ

(الطلاق مرتان ص۳۹)

پھر ایک جگہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"عورت غیر ممسوسہ (غیر مدخولہ) ہو تو طلاق کے بعد اس پر عدت ہی فرض نہیں۔ اسی طرح عورت ہی شوہر سے بیزار ہو اور شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر کے باصرار طلاق لے لے تو اس پر بھی عدت فرض نہیں۔ ان دو قسموں کے سوا اور کوئی بے عدت کی تیسری طلاق ہی نہیں اور جس طلاق کے بعد عورت پر عدت فرض ہے وہی طلاق امساکی یعنی رجعی ہوتی ہے" (ایضاً ص۵۷)

اس بحث سے قبل کے مباحث جو علامہ نے پیش کئے ہیں ان پر تو غور کیا جا سکتا ہے مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم مختلعہ کی عدت کے متعلق مولانا مرحوم کے اس ارشاد سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ اگر طلاق کے بعد بغیر

عدت گذارے عورت کو دوسری شادی کر لینے کی اجازت[1] دیدی جائے اور اتفاق سے عورت کو پہلے شوہر سے چند دن کا حمل ہو تو جو بچہ پیدا ہو گا وہ کس شوہر کا بچہ کہا جائے گا۔ اختلاط نسب کی وجہ سے معاشرہ میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ان سے بچنے کے لئے عدت فرض کی گئی ہے۔ تین ماہواری ایام گذر جانے کے بعد یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ عورت کو پہلے شوہر سے حمل نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نیا نکاح کر سکتی ہے۔ اس کے بعد جو بچہ پیدا ہو گا اس کے متعلق یہ اطمینان ہو گا کہ وہ دوسرے شوہر ہی کا بچہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے عدت کے حکم کے ساتھ ہی عدت کی مدت بھی بتا دی ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ط

ترجمہ :۔ اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ تین حیض آنے تک انتظار کریں گی۔

یہ عدت کی مدت کا بیان ہے۔ اور اس کے فوراً بعد اس کی مصلحت بتا دی گئی ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ ط الآیۃ

ترجمہ :۔ اور عورتوں کے لئے جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں کے اندر پیدا کیا ہے اسے چھپائیں۔

---

[1] مولانا تمنا اس کی اجازت نہیں دے رہے ہیں کیونکہ یہ تو نص صریح ہے کہ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ ان یکتمن ما خلق اللہ فی ارحامہن ان کن یؤمن باللہ والیوم الآخر۔ بلکہ مولانا کا مطلب صرف یہ ہے کہ عدت پوری ہونے تک مرد کے ذمے جو نان و نفقہ ہے اور مسکن دینے کا حق ہے وہ مختلعہ کے لئے نہیں ہے (ص ۲/۲۲۸)
(محمد جعفر پھلواروی)

عدت کے بیان کے ساتھ ساتھ اس مضمون کے بیان کرنے کی ، مصلحت یہی تو ہے کہ عدت کی اصل مصلحت سامنے آجائے۔ ورنہ عدت سے اس مسئلہ کا اور کیا تعلق ہو سکتا ہے ؟ یہی وجہ ہے کہ غیر ممسوسہ (غیر مدخولہ) عورت جس کی رخصتی ہی نہیں ہوئی جسے شوہر نے ہاتھ لگایا ہی نہیں۔ چونکہ وہاں اس سے حمل رہ جانے کا احتمال نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم نے صراحت سے بتا دیا ہے کہ اس پر عدت واجب نہیں ہے وہ طلاق ملنے کے فوراً بعد دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے۔

غالباً مولانا مرحوم کو اس قول پر اس لئے مجبور ہونا پڑا کہ وہ آیت نمبر ($\frac{65}{4}$) میں وَالّٰئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ اور وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اور جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آرہا ہو) کو حل نہیں فرما سکے۔ ان دونوں قسم کی عورتوں کے متعلق عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ انہیں تو حمل نہیں رہ سکتا۔ پھر قرآن کریم نے ان کے لئے بھی کیوں عدت مقرر فرما دی۔ چونکہ اُن کی عدت (تین ماہ تک انتظار) حمل نہ ہونے کا یقین حاصل کرنے کے لئے تو ہو تی نہیں اس لئے لامحالہ وہ شوہر اور بیوی کے غور و فکر کے لئے مہلت مہیا کرنے کے لئے ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے مولانا نے اسی کو اختیار فرما لیا حالانکہ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ جو عورتیں سن یاس کو پہنچ چکی ہوں یا جنہیں حیض نہ آسکا ہو وہ حاملہ نہیں ہو سکتیں۔ عدت کے بیان میں ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے کہ ایسی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بلکہ ہوتی ہیں کہ انہیں عادۃً ماہواری ایام نہیں ہوتے پھر بھی وہ حاملہ ہوتی ہیں اور بچے پیدا کرتی ہیں۔ اور ان کی صحت قطعاً نارمل ہوتی ہے

نیز کسی مرض کی وجہ سے انہیں ماہواری تو نہیں آتی مگر حمل ٹھہر جاتا ہے اسی طرح وہ عورتیں جو سنِ یاس کو پہنچ چکی ہوں انہیں بھی حمل ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی دوائیں اور انجکشن ایجاد ہو چکے ہیں کہ ضروری ہارمونز وغیرہ عورتوں کے رحم تک پہنچا دیئے جائیں اور ان میں حمل قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی جائے۔ عورتیں تو عورتیں اب تو (BABYTUBES) ٹیوبس کے اندر حمل قائم کیا جاسکتا ہے جنین کی باقاعدہ پرورش کئے جانے کے امکانات عملی صورت اختیار کر چکے ہیں مولانا مرحوم کو ان ایجادات واختراعات کا علم نہیں تھا اس لئے وہ اس قول پر مجبور ہو گئے۔

بقیہ مسائل طلاق

ہمارے فقہاء نے طلاق کے سلسلہ میں بیشمار مسائل بیان فرمائے ہیں۔ لیکن وہ تمام مسائل اسی بنیاد پر مبنی ہیں کہ شوہر بیک وقت ایک طلاق، دو طلاقیں اور تین طلاقیں دے سکتا ہے اور اس کی دی ہوئی طلاقیں نافذ ہوتی ہیں۔ نیز یہ کہ طلاق دینا شوہر کا اپنا ذاتی اور انفرادی حق ہے۔ اور وہ اپنے اس حق کو جب چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔
ہم نے قرآن کریم کی رو سے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ یہ دونوں بنیادی باتیں صحیح نہیں ہیں۔ طلاق کوئی قول نہیں ہے بلکہ ایک عمل ہے یعنی نکاح کے لئے عمل تنسیخ یا عملِ فسخ کا اعلان ہے اور قرآن کریم کی رو سے یہ فسخ و تنسیخ کا عمل تین مرتبہ ہو سکتا ہے یعنی ایک مرتبہ معاہدۂ نکاح فسخ کیا جائے۔ پھر جوڑ لیا جائے اور کچھ عرصہ کے بعد پھر فسخ کیا جائے اور پھر جوڑ لیا جائے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد

تیسری مرتبہ فسخ کیا جائے تو اب اسے جوڑنے کا حق نہیں رہتا۔ اب یہ دونوں[ع] میاں بیوی کسی اور عورت اور مرد سے نکاح کا معاہدہ کریں۔ البتہ اگر دوسرا مرد بھی عورت کو طلاق دے دے تو پھر یہ عورت پہلے شوہر کی طرف واپس جا سکتی ہے۔ اسی طرح معاہدۂ نکاح کو فسخ کر دینا مرد کا بایں معنیٰ ذاتی اور انفرادی حق نہیں ہے کہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے اس حق کو استعمال کرے بلکہ طلاق سے پہلے تین مرحلوں سے گذرنا واجب اور فرض ہے۔

عہ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ عورتوں پر یہ ظلم ہے کہ ان کے لئے پہلے شوہر کی طرف واپس ہونے کے لئے تو یہ شرط رکھدی گئی ہے کہ وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرکے اگر اس سے بھی نباہ نہ ہو سکے اور وہ بھی طلاق دیدے یا وہ مرجائے تب وہ پہلے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہیں۔ اس سے پہلے نہیں۔ لیکن مردوں کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی گئی کہ وہ بھی کسی دوسری عورت سے شادی کریں اور اس کو طلاق دے کر پھر پہلی بیوی کی طرف رجوع کر سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ یہ کوئی رعایت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ مردوں ہی کے حق میں بہت بڑی سزا ہے۔ کوئی غیرتمند مرد اسے گوارہ نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کا فراش بنے۔ یہ اس کی غیرت و حمیت کو بہت بڑا چیلنج ہے۔ جیسے شیر کسی دوسرے درندہ کا جھوٹا شکار نہیں کھاتا اسی طرح کوئی غیرت مند شخص بھی اسے گوارہ نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دوسرے مرد کے پاس گئی ہوئی عورت کو اپنے آغوش میں جگہ دے۔ ؎

مشرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہوکے رہے یہ شب فرقت میری

① باہمی افہام وتفہیم کی کوشش۔
② جانبین کی طرف سے دو ثالثوں کا تقرر اور ان کے ساتھ مکمل تعاون۔
③ عدالت سے فسخ نکاح کی اجازت حاصل کرنا ان تینوں مراحل سے گذرنے کے بعد طلاق دی جا سکتی ہے کیونکہ نکاح محض ایک کاروباری معاہدہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک دینی اور شرعی معاہدہ بھی ہے۔ لہٰذا اس کی تقدیس کا احترام ضروری ہے۔ مگر طلاق کے بیشتر مسائل جو ہمارے فقہاء نے بیان فرمائے ہیں وہ انہی دو بنیادوں پر مبنی ہیں لہٰذا ہمیں ان مباحث میں جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

نابالغ کی طلاق

ہم کتاب النکاح میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نابالغ بچوں کا نکاح ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے نکاح کی عمر بلوغ کو بتایا ہے۔ لہٰذا نابالغ بچہ کی طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجنون اور نائم کی طلاق

اگر شوہر پاگل ہو گیا ہے اور وہ دیوانگی میں طلاق دے دیتا ہے یا کوئی شخص گہری نیند سویا ہوا ہے اور وہ نیند میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو ان دونوں کی طلاق تمام فقہاء کے نزدیک متفقہ طور پر نافذ نہیں ہوتی۔ یہ مسئلہ بھی اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ طلاق دینا شوہر کا اپنا ذاتی اور انفرادی حق ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے تفصیل سے پہلے بتا دیا ہے کہ طلاق سے پہلے تین مراحل سے گذرنا ضروری اور واجب ہے۔ اگر ان مرحلوں سے گذر کر طلاق دی جائے گی تو ان صورتوں کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

جبری طلاق کسی شخص کو ڈرا دھمکا کر یا مار پیٹ کر طلاق لے لی جائے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہو گی۔ لیکن یہ مسئلہ بھی اسی مفروضہ پر مبنی ہے کہ طلاق دینا شوہر کا اپنا ذاتی اور انفرادی حق ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر مذکورہ بالا تینوں مرحلوں سے گذر کر طلاق دی جائے تو ان باتوں کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

مدہوش آدمی کی طلاق اگر کسی شخص نے نشہ کی حالت میں بیوی کو طلاق دیدی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام کرخیؒ اور امام طحاویؒ کے نزدیک نیز امام شافعیؒ کی بھی ایک روایت یہی ہے۔ کہ طلاق واقع نہیں ہو گی۔ ہم اس سلسلہ میں بھی یہی عرض کریں گے کہ یہ مسائل ہمارے فقہاء کو اس لئے پیش آئے کہ انہوں نے طلاق کے سلسلہ میں ان تین مراحل کو نظر انداز فرما دیا ہے جو قرآن کریم نے مقرر فرمائے تھے۔ ورنہ یہ مسائل پیش ہی نہیں آتے۔

(باب ایقاع الطلاق)

صریح اور کنایہ رہی یہ بات کہ طلاق کس طرح واقع کی گئی ہے۔ ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ طلاق واقع کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ایسے الفاظ کے ساتھ طلاق دی جائے جو طلاق کے مفہوم میں صریح ہوں۔ اس کی مثالیں انہوں نے یہ دی ہیں

کہ شوہر نے کہدیا کہ تجھے طلاق ہے۔ میں نے تجھے طلاق دیدی۔ تو مطلقہ ہے وغیرہ۔ تو اس صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہو گی۔ دوم یہ کہ شوہر نے ایسے الفاظ کے ساتھ طلاق دی ہے جو طلاق کے مفہوم میں صریح نہیں ہیں بلکہ وہ طلاق کے لئے کنایہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً تو مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ تو مجھ پر حرام ہے۔ اپنے میکے چلی جا، میں نے تجھے تیرے ماں باپ کو واپس دیدیا۔ میں نے تجھے رخصت کر دیا، میں تجھ سے الگ ہو گیا، مجھ سے پردہ کر لے، دور ہو جا، نکل جا، چلی جا، کھڑی ہو۔ دوسرے شوہر تلاش کر لے وغیرہ وغیرہ۔ اگر شوہر اس قسم کے الفاظ استعمال کرے اور اس کی نیت طلاق دینے کی ہو تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ اور اگر نیت طلاق دینے کی نہ ہو بلکہ محض بیوی کو ڈرانا دھمکانا ہو تو طلاق واقع نہیں ہو گی۔

ہمارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر ان الفاظ سے شوہر کی نیت ایک طلاق دینے کی ہو تو ایک طلاق رجعی واقع ہو گی اور اگر تین طلاقیں دینے کی نیت ہو تو تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ البتہ اگر دو طلاقیں دینے کی نیت ہو تو ایک طلاق ہی واقع ہو گی۔ کیونکہ ایک اور دو طلاقوں میں نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا کم سے کم عدد لینا بہتر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ تین طلاقیں، قرآن کریم کی رو سے بیک وقت واقع نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔ بشرطیکہ طلاق مقررہ طریقہ سے تینوں مراحل سے گذر کر دی جائے۔

ہمارے فقہاء نے طلاق کا لفظ صریح قرار دیا ہے۔ لیکن اس

مقصد کے لئے ہر زبان میں مختلف الفاظ صریح ہو سکتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر زبان میں طلاق (جو عربی زبان کا لفظ ہے) ہی اس مفہوم کے لئے صریح تسلیم کیا جائے۔ ایسے ہی کنایہ کے لئے جو الفاظ اوپر بیان ہوئے ہیں وہ بھی بعینہٖ ضروری نہیں ہیں دوسری زبانوں میں ان الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ جن الفاظ کو ہمارے فقہاء نے کنایہ کے الفاظ تسلیم کیا ہے وہ کسی زبان میں طلاق کے معنے میں صریح ہوں۔ تاہم ہر زبان میں صریح اور کنایہ کے الفاظ میں فرق کرنا ہوگا۔

باب تفویض الطلاق

تفویض اسے کہتے ہیں کہ شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے کا حق خود بیوی ہی کو تفویض کر دے۔ یعنی طلاق کے تین مرحلوں سے گذر لینے کے بعد شوہر از خود طلاق نہیں دیتا بلکہ وہ خود بیوی کو اختیار دیدیتا ہے کہ وہ چاہے تو خود کو طلاق دے لے۔ تو جب تک بیوی اسی مجلس میں موجود ہے اُسے یہ اختیار حاصل رہے گا۔ اگر وہ اس مجلس سے اُٹھ کر چلی گئی یا کسی دوسرے کام میں لگ گئی تو اسے اِعراض پر محمول کیا جائے گا اور اختیار اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لیکن اگر اس نے جواب میں کہدیا کہ میں نے اپنے آپ کو طلاق دے لی۔ تو اس صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔

تفویض کے لئے ہمارے فقہاء نے زیادہ تر اِختَارِیْ (اختیار کر لے، پسند کر لے) اور اِختَارِیْ نَفسَکِ (اپنے آپ کو اختیار کر لے،

اپنے آپ کو پسند کرلے) کے الفاظ نقل فرمائے ہیں اور شوہر کی طرف سے یا بیوی کی طرف سے نفس (اپنا آپ) کا لفظ ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن عربوں میں یہ لفظ طلاق کا اختیار دینے کے لئے استعمال ہوتا ہوگا۔ ہمارے یہاں یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال نہیں، ہوتا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس جیسے لفظوں سے نہ طلاق کی تفویض صحیح ہے اور نہ ان سے طلاق کا وقوع صحیح ہے۔"

ہمارے فقہاء نے لفظ اختیار کے مختلف استعمالات کی نشاندہی فرماتے ہوئے مختلف حکم صادر فرمائے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایک طلاق رجعی۔ دوسری بعض صورتوں میں ایک طلاق بائن اور کچھ دوسری صورتوں میں تین طلاقوں کا حکم صادر فرمایا ہے۔ یہ تفصیلات فقہ کی کتابوں میں بیان کردی گئی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں قرآن کریم کی رو سے نہ طلاق بائن کوئی چیز ہے اور نہ ہی بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں کوئی حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن کریم نے طلاق کی صرف ایک ہی صورت بیان فرمائی ہے اور وہ طلاقِ رجعی ہے۔ البتہ اگر تیسری مرتبہ اس طرح طلاق دیدی جائے کہ اس سے پہلے شوہر دو مرتبہ طلاق دے چکا ہو۔ اور ہر مرتبہ طلاق دے کر رجوع کرچکا ہو، یا عدت گذر جانے کے بعد تجدید نکاح کرچکا ہو تو اب تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد نہ وہ رجوع کرسکتا ہے نہ اس سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔ جب تک وہ کسی دوسرے آدمی کے نکاح میں رہ کر اس سے بیوہ نہ ہوجائے۔ یعنی دوسرا شوہر فوت ہوجائے یا وہ اسے طلاق دیدے۔ اس سے پیشتر قرآن کریم نے نہ طلاق بائن کا کوئی تصور دیا ہے نہ تین طلاقوں کا۔

الامر بالیہ تفویض کے سلسلہ میں ایک لفظ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ۔

"تجھے اپنے بارہ میں اختیار ہے"

یا یہ کہ۔

"تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے"

اس قسم کے الفاظ سے بھی تفویض ثابت ہو جائے گی اگر اس کے بعد بیوی اسی مجلس میں اپنے آپ کو طلاق دے لے تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔ نیز اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ شوہر وقت کی تعیین کر دے کہ۔

"تجھے اپنے بارہ میں کل تک اختیار ہے" یا یہ کہ "تجھے اپنے بارہ میں فلاں آدمی کے آجانے تک اختیار ہے" یا یہ کہ "تیرا معاملہ فلاں آدمی کے آجانے تک تیرے ہاتھ میں ہے" تو وقت مقررہ تک بیوی کو اختیار حاصل رہے گا اور اگر وہ خود کو طلاق دے لے تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ قرآن کے بیان کردہ تین مراحل سے گذر لینے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

طلاق مشروط

طلاق مشروط اگر کسی شرط کے ساتھ معلق کر کے طلاق دی جائے تو شرط کے پائے جانے پر طلاق واقع ہو جائے گی بشرطیکہ طلاق کے لئے قرآن کریم نے جو مراحل مقرر فرمائے ہیں ان کو پورا کر لیا گیا ہو۔ مثلاً بیوی کسی ایسے رشتہ دار سے ملتی ہے

یا اس کے گھر جاتی ہے جسے شوہر صحیح طور پر یا غلط طور پر پسندیدہ نہیں سمجھتا (نشوز کا بیان جو گذر چکا ہے اسے دوبارہ ملاحظہ فرمالیں) چنانچہ شوہر نے اپنے طور پر بیوی کو سمجھا کر اس سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئی جانبین کی طرف سے دو ثالثوں کا تقرر بھی ہو چکا، دونوں ثالثوں نے بھی کوشش کر لی کہ میاں بیوی میں مصالحت ہو جائے لیکن نہیں ہو سکی، آخر میں معاملہ عدالت کے سامنے گیا۔ عدالت نے شوہر کو حکم دیا کہ وہ بیوی کو اپنے اس رشتہ دار کے ہاں جانے سے اور اس سے ملنے سے نہ روکے یا بیوی کو حکم دیا کہ وہ اس رشتہ دار سے نہ ملے اور اس کے گھر نہ جائے لیکن شوہر عدالت کا حکم تسلیم کرنے سے معذرت خواہ ہے یا بیوی معذرت خواہ ہے۔ عدالت محسوس کرتی ہے کہ جانبین کی بدگمانی یا ضد کا معاملہ ہے اس لئے کسی فریق کو مجبور کرنا مشکل ہے اور وہ طلاق کی اجازت دیدیتی ہے (عموماً باہمی نزاعات اسی انداز کے ہوا کرتے ہیں) شوہر کہدیتا ہے کہ اگر یہ آئندہ اس رشتہ دار سے ملی یا اس کے گھر گئی تو اسے طلاق ہے۔ تو شرط کے عمل پذیر ہونے پر ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔

لیکن ان تین مرحلوں کو پورا کئے بغیر اگر کسی شرط کے ساتھ طلاق دی ہے تو ایسی طلاق واقع نہیں ہو گی۔ شرط ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ کیوں نہ پائی جائے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ طلاق کے لئے مذکورہ بالا تین مراحل کا پورا کر لینا ضروری ہے۔

اگر کسی نے ایک اجنبی عورت سے کہدیا کہ اگر میں نے تجھ سے نکاح کر لیا تو تجھے طلاق ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، شعبیؒ، زہریؒ، مکحولؒ اور

سالمؒ ابن عبد اللہ وغیرہ کا خیال ہے کہ اگر اس شخص نے اس عورت سے نکاح کر لیا تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی۔ امام شافعیؒ اور دیگر آئمہ فرماتے ہیں کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے یوں کہدیا کہ میں جس عورت سے بھی شادی کروں اسے طلاق ہے۔ تب بھی امام ابو حنیفہؒ، شعبیؒ، زہریؒ، مکحولؒ، اور سالمؒ ابن عبد اللہ کا یہی خیال ہے کہ ایسا شخص کسی عورت سے بھی نکاح کرلے تو اسے طلاق پڑ جائے گی لیکن امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ فرماتے ہیں کہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ فریقین کے دلائل کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں :۔ اس قسم کی صورتوں میں طلاق واقع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ طلاق دیتے وقت نہ ابھی نکاح ہوا ہے، نہ کوئی نزاع پیدا ہوا ہے، نہ طلاق کے مراحل میں سے کسی مرحلہ کو پورا کیا گیا ہے تو ایسی صورتوں میں طلاق کا تصوّر ہی بے معنیٰ ہے لہٰذا اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

استثناء اگر کسی نے طلاق کے تینوں مرحلے گذار لینے کے بعد یوں کہا کہ تجھے طلاق ہے یا میں نے تجھے طلاق دیدی مگر ساتھ ہی انشاء اللہ بھی کہہ دیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس نے طلاق کو خدا کی مشیت کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ اور خدا کی مشیت معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ طلاق لغو ہوگی۔

طلاق مریض کسی بیمار آدمی نے طلاق کے تینوں مرحلے پورے کر لینے کے بعد اگر اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہو گیا اور عورت ابھی تک عدت میں ہے تو طلاق واقع جائے گی لیکن بیوی اپنے شوہر کے ترکہ سے اپنا حصّہ پائے گی۔ کیونکہ عدت کے دوران میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل تھا۔ اور اس کا امکان ہے کہ شوہر نے محض اسے وراثت سے محروم کرنے کے لئے طلاق دی ہو۔ کسی کو اس کے حق سے محروم کرنا جائز نہیں ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (۲۶/۱۷)

ترجمہ:۔ اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی۔

نیز سورۂ روم (۳۸/۳۰) میں بھی یہی حکم موجود ہے۔ لہٰذا یہ طلاق بدنیتی پر مبنی مانی جائے گی اور بیوی وارث ہوگی۔

اگر مرض شدید ہوا اور مریض کے صحتیاب ہونے کی توقع نہ ہو تو عدالت کو بھی طلاق کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔

البتہ اگر عدت گذر چکی ہو اور عورت کی عدت گذر جانے کے بعد شوہر کا انتقال ہوا ہے تو عورت شوہر کے ترکہ سے حصّہ نہیں پائے گی۔

(باب الرجعة)

پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ طلاق دیدینے کے بعد شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہوتا ہے۔ البتہ اگر شوہر نے تیسری مرتبہ پھر طلاق دیدی تو شوہر کو رجوع کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ دو طلاقوں تک عام فقہا نے شوہر کو رجوع

کر لینے کا حق دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے بیوی کی رضامندی بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر بیوی راضی نہ ہو تب بھی شوہر رجوع کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ رجوع عدت کے اندر اندر کر لیا جاتے۔ البتہ عدت گذر جانے کے بعد میاں بیوی کی رضامندی سے تجدید نکاح ہو سکتی ہے اب رجوع کرنے کا موقعہ باقی نہیں رہا۔ مگر ہمارے نزدیک دونوں صورتوں میں بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔

(ملاحظہ ہو بدایۃ المجتہد صفحہ ۸۵ ج ۲)

گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ طلاق حقیقۃً معاہدۂ نکاح کے فسخ کا اعلان ہے۔ شوہر نے جوں ہی طلاق کا لفظ منہ سے نکالا بیوی پر طلاق پڑ گئی۔ یعنی معاہدۂ نکاح فسخ ہو گیا۔ اب ان دونوں میاں بیوی میں رشتۂ ازدواج باقی نہیں رہا۔ نہ شوہر، شوہر رہا اور نہ بیوی، بیوی رہی دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو گئے عدت کا زمانہ اس لئے نہیں ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور وہ عدت گذرنے کے بعد واقع ہو گی بلکہ عدت کا انتظار اس لئے ہے کہ میاں بیوی اس عمل طلاق کے نتائج و عواقب پر خوب غور و خوض کر لیں۔ اس عرصہ میں بیوی شوہر کو رجوع پر راضی کرنا چاہے تو کر سکے اور شوہر اپنی غلطی محسوس کر سکے تو کر لے، نیز یہ معلوم ہو جائے کہ عورت کو اس شوہر سے حمل تو نہیں ہے۔ تاکہ اگر بعد میں بچہ پیدا ہو تو اس کے نسب میں پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں۔

چنانچہ قرآن کریم نے شوہر کی طرف سے طلاق کا لفظ ادا ہوتے ہی عورتوں کو مُطَلَّقَت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ (۲/۲۲۸)

ترجمہ:۔ اور جن عورتوں کو طلاق دیدی گئی ہو وہ اپنے نفوس کو تین ماہواری ایام تک روکے رکھیں۔

لہٰذا وہ مطلقات تو ہوگئیں۔ ان کا نکاح فسخ تو ہوگیا۔ اور تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ طلاق واقع ہوگئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد اگر شوہر رجوع کرلے تو یہ طلاق محسوب ہوتی ہے۔ دوسری مرتبہ پھر طلاق دے کر رجوع کرے تو یہ دوسری طلاق بھی محسوب ہوتی ہے۔ پھر اگر تیسری مرتبہ طلاق دیدے تو یہ بھی محسوب ہوتی ہے۔ اور بالاجماع یہ عورت مطلقہ بہ طلاق مغلظہ مانی جاتی ہے کہ اب نہ شوہر رجوع کرسکتا ہے۔ نہ اس سے تجدید نکاح کرسکتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر مرتبہ طلاق دینے کے بعد طلاق واقع اور نافذ ہوجاتی ہے۔ اب رجوع کے معنے یہ ہیں کہ آپ اپنے اُس فیصلہ کو جو آپ نے کیا تھا واپس لینا چاہتے ہیں۔ اور جو معاہدہ آپ نے فسخ کیا تھا آپ اسے دوبارہ جوڑ لینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا طرفین کی رضامندی ضروری ہونی چاہیئے۔ تمام معاہدے جو توڑ کر پھر جوڑے جائیں وہ طرفین کی رضامندی ہی سے جوڑے جاسکتے ہیں۔ اگر ایک فریق راضی نہ ہو تو معاہدہ کیسے جوڑا جاسکتا ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں کہ کسی معاہدہ کو فسخ کرکے دوبارہ جوڑ لیا جائے اور اس میں دوسرے فریق کی رضامندی اور نارضامندی کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ بلکہ دوسرے فریق کی ناراضگی کے باوجود اسے جوڑ لیا جائے۔

فقہاء کی تائید میں علامہ ابن رشدؒ نے اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے۔

وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا

(۲/۲۲۸)

ترجمہ:۔ اور طلاق کے سلسلہ میں عورتوں کے شوہران کو واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ان عورتوں کے شوہر اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ ان کو واپس لے لیں۔ اس سے علامہ ابن رشد نے یہ استدلال فرمایا ہے کہ وہ انکی رضامندی کے بغیر بھی انہیں واپس لے سکتے ہیں۔ (بدایۃ المجتہد صفحہ ۸۵/۲)

لیکن مجھے انتہائی افسوس ہے کہ مجھے آیت میں ایسا کوئی اشارہ نظر نہیں آرہا جس سے عورت کی رضا مندی کے بغیر شوہر کو رجوع کا حق دینا ثابت کیا جاسکے۔ آیت کریمہ میں إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا (اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں) کی شرط موجود ہے اور فریق ثانی کی نا رضامندی کی صورت میں میں نہیں سمجھتا کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن ہے۔ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا میں۔ اصلاح احوال کا ارادہ کرنے والے ضروری نہیں ہے کہ مرد ہی ہوں، قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ مذکر کے صیغے استعمال کرتا ہے اور مراد مرد اور عورتیں دونوں ہوتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں آیت نمبر(۲۳۲) میں بالکل ایسے ہی الفاظ آئے ہیں۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ

يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ط (۲/۲۳۲)

ترجمہ:۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو انہیں اپنے شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کر لینے سے روکو نہیں جب وہ دستور کے مطابق باہم اس کے لئے رضامند ہوں۔

اس آیت میں اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ، دستور کے مطابق باہم رضامند ہونے والے شوہر اور بیوی ہیں۔ لیکن ان، میاں بیوی کے لئے جمع مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح اِنۡ اَرَادُوۡۤا اِصۡلَاحًا میں بھی شوہر اور بیوی دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ عورتوں کے شوہر اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ ان عورتوں کو واپس لے لیں اگر میاں بیوی اصلاح حال کا ارادہ کریں۔ ظاہر ہے کہ میاں بیوی اصلاح حال کا ارادہ کریں گے تو دونوں کی مرضی ضرور شامل حال ہو گی۔ مرضی کے بغیر تو اصلاح حال کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس آیت کریمہ سے یہ استدلال فرمانا کہ عورت کی نارضامندی کی صورت میں بھی شوہر کو رجوع کر لینے کا حق ہے بہت ہی مستبعد ہے۔

علاوہ ازیں اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ کے معنے تو صرف یہ ہیں کہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں شوہر اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ انہیں واپس لے لیں۔ دوسروں کے حق کی نفی نہیں کی جا رہی ہے اور نہ واپس لینے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ دوسرے آدمی اگر ان عورتوں کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آئیں تو ظاہر ہے کہ ان کی مرضی ہی سے وہ ایسا کر سکیں گے۔ بعینہٖ اسی طرح شوہر بھی اگر ان کو اپنے حبالۂ عقد

میں پھر لے لینا چاہیں تو وہ بھی ان کی مرضی ہی سے ایسا کر سکیں گے آیت میں اس کے خلاف کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

صاحب ہدایہ نے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ط (۲۳۱/۲ ، ۲/۶۵)

ترجمہ: تو انہیں دستور کے مطابق روک لو۔

سے استدلال فرمایا ہے کہ آیت کریمہ میں شوہروں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ دستور کے مطابق اپنی بیویوں کو روک سکتے ہیں اور اس کے ساتھ بیویوں کی رضامندی کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی لہٰذا شوہر کو بیوی کی رضامندی کے بغیر بھی رجوع کر لینے کا حق ہوگا لیکن یہ استدلال دو وجہ سے محل نظر ہے۔

اوّل تو آیت میں بِمَعْرُوْفٍ کی قید موجود ہے۔ اور دستور کے مطابق رجوع کی صورت یہی ہے کہ طرفین کی رضامندی سے رجوع ہو۔ جیسا کہ تمام باہمی معاہدوں میں ہوتا ہے۔ کہ فسخ کر دینے کے بعد جب دوبارہ معاہدہ کو جوڑا جاتا ہے تو طرفین کی رضامندی ہی سے جوڑا جاتا ہے۔ کوئی معاہدہ فریق ثانی کی نارضامندی کے ساتھ ازسرنو نہیں جوڑا جا سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ دونوں آیات کریمہ میں۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ (۶۲/۲)

ترجمہ: جب وہ اپنی عدت پوری کر چکیں۔

اور۔

فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ (۲/۲۳۱)

ترجمہ: پس وہ اپنی عدت کو پورا کر چکیں۔

کے الفاظ موجود ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں آیتیں رجوع سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ عدت گذر جانے کے بعد تجدید نکاح سے متعلق ہیں اور تجدید نکاح کی صورت میں تمام فقہار بالاجماع عورت کی رضا مندی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان آیات سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔

علاوہ ازیں آیت نمبر (۲۳۱) میں اسی کے ساتھ یہ لفظ بھی موجود ہیں۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا۔

ترجمہ: اور بیویوں کو تکلیف دینے کے لئے نہ روکو تاکہ ان پر زیادتی کر سکو۔

اور عورت کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی روک لینا عورت کو تکلیف دینا اور اس پر زیادتی کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس آیت سے خود ہمارے موقف کی تائید ہو رہی ہے۔

سورۂ نسار میں حق تعالیٰ کا واضح ارشاد موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا

(۴/۱۹)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں زبردستی عورتوں کا وارث، مالک اور قابض بن بیٹھنے کی ممانعت فرما دی گئی ہے۔ اور عورت کی مرضی کے بغیر شوہر

کے رجوع کو جائز اور نافذ قرار دینا، اسے زبردستی اس کا وارث، مالک اور قابض قرار دینا نہیں تو اور کیا ہے؟

طریق رجوع کہا جاتا ہے کہ رجوع قولاً بھی ہو سکتا ہے۔ اور عملاً بھی۔ یعنی شوہر اپنی بیوی سے کہدے کہ میں نے طلاق سے رجوع کر لیا یا باہر کچھ لوگوں سے کہدے کہ میں نے جو بیوی کو طلاق دیدی تھی اس سے رجوع کر لیا۔ قولاً رجوع کی صحت پر تمام فقہاء متفق ہیں۔ کہ رجوع صحیح ہو گا۔ عملاً رجوع یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے جنسی اختلاط کرے۔ اس کا بوسہ لے، اسے شہوت کے ساتھ چھو لے یا شہوت کے ساتھ اس کے مستور اعضاء کو دیکھ لے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک یہ عملاً رجعت بھی صحیح ہے۔ خواہ رجعت کی نیت ہو یا نہ ہو۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ان اعمال سے اگر نیت رجعت کی تھی تو رجعت صحیح ہو جائے گی۔ لیکن اگر کوئی نیت ہی نہیں تھی تو رجعت نہیں ہو گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عملاً رجعت کر لینا کوئی چیز نہیں ہے۔ رجوع کے الفاظ زبان سے ادا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ طلاق کی وجہ سے پچھلا نکاح ختم ہو چکا ہے۔ اگر شوہر رجوع کرتا ہے تو گویا وہ تجدید عہد کر رہا ہے یعنی دوبارہ نکاح کر رہا ہے۔ لہذا رجوع کے الفاظ زبان سے ادا کرنے ضروری ہیں۔

شہادت رجوع کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ دو معتبر آدمیوں کو گواہ ضرور بنا لیا جائے۔ کیونکہ طلاق کے متعلق ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ طلاق سے پہلے تین مرحلوں سے

گذرنا ضروری ہے۔

(۱) طلاق سے پہلے باہمی افہام و تفہیم۔

(۲) ثالثوں کا تقرر اور ان کی مصالحانہ کوشش۔

(۳) ثالثوں کی رپورٹ پر عدالت کا فیصلہ اور طلاق کی اجازت۔

ان تین مراحل سے گذرنے کے بعد طلاق کا اعلان، اور طلاق کے اعلان کے لئے دو گواہ بنا لینا ضروری تھا۔ چنانچہ سورۃ طلاق میں ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ط (۶۵/۲)

ترجمہ: تو جب وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو انہیں دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق (حسن سلوک کے ساتھ) انسے جدا ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو (دونوں صورتوں میں) گواہ بنالو اور اللہ کے لئے شہادت کو قائم کرو۔

لہٰذا طلاق کوئی نجی اور خفیہ معاملہ نہیں تھا۔ اب اس کے بعد شوہر رجوع کرتا ہے تو اس کا علم بھی لوگوں کو ہو جانا چاہیئے۔ ورنہ لوگ خواہ مخواہ شبہات میں مبتلا ہوں گے۔ اور دونوں میاں بیوی کو متہم کریں گے۔ لہٰذا لازماً گواہ بنا لینا چاہیئے۔

نکاح کے سلسلہ میں ہم (فقہ القرآن ج ۱ ص ۴۶۸) تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ نکاح کے لئے گواہ بنا لینا ضروری ہے۔ بغیر دو گواہوں کے نکاح نہیں ہو سکتا۔ رجوع بھی اگرچہ بالکلیہ جدید نکاح نہیں ہے لیکن پچھلے نکاح کی تجدید تو ہے ہی۔ لہٰذا شہادت قائم کر لینا ضروری ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا ایک قول نیز امام احمد ابن حنبلؒ کی ایک

روایت یہی ہے کہ رجوع کے لئے گواہ بنالینا ضروری ہے۔ کچھ علماء نے امام مالکؒ کا مذہب بھی یہی نقل فرمایا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کا مذہب اور امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور امام مالکؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ رجوع کے لئے گواہ بنالینا ضروری نہیں ہے۔ البتہ مستحب ہے۔
(المیزان الکبریٰ للشعرانی صفحہ ۱۲۴/۲)

ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کا وہ قول، اور امام احمد ابن حنبلؒ کی وہ روایت نیز امام مالکؒ کا وہ مذہب کہ رجوع کے لئے گواہ بنالینا ضروری ہے۔ قرآن کریم سے قریب تر ہے۔ لہٰذا ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس پوری تفصیل کے بعد غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کا یہ ارشاد کہ عملاً رجوع کرلینا کوئی چیز نہیں۔ شوہر کو رجوع کے الفاظ زبان سے ادا کرنے چاہئیں زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ عملاً رجوع کرنے کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں ان میں لازماً کسی کو گواہ نہیں بنایا جا سکتا۔ واللہ اعلم

حضرت مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی مدظلہ العالی نے اس موقعہ پر اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ۔

امساک

امساک کے معنے ہیں روک لینا۔ طلاق دینے والا، شوہر عدت کے اندر بھی روک سکتا ہے اور عدت کے بعد بھی۔ لیکن دونوں روک کے لئے تجدید نکاح ہونی چاہیئے۔ کیونکہ طلاق کے بعد رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے جسے از سر نو جوڑنے کے لئے دوبارہ نکاح کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں یہ حکم

نہیں مل سکا کہ شوہر زبان سے کہدے کہ میں نے طلاق واپس لے لی یا اس کے ساتھ بوس وکنار کرلے تو امساک یعنی رجوع یا ردّ ہوجائے گا۔ قرآن کریم کا یہ حکم ہے کہ۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۶۵/۲)

ترجمہ:۔ توجب وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق ان سے جدائی اختیار کرلو اور دو معتبر آدمیوں کو اپنے میں سے گواہ بنالو۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہے کہ امساک اور مفارقت دونوں کے لئے شاہدین عادلین کا ہونا ضروری ہے تو کیا وہ دو گواہوں کو بلا کر کہے گا کہ دیکھو بھائی میں اپنی مطلقہ بیوی سے عدت کے اندر تمہارے سامنے بوس وکنار وغیرہ کرنے لگا ہوں تم دونوں گواہ رہنا۔ اگر زبانی رجوع کا اقرار کرنے کے لئے دو گواہ ضروری ہیں (اور یقیناً ضروری ہیں۔ کیونکہ یہ قرآن کریم کا حکم ہے) تو عملی رجوع کیلئے بھی گواہوں کی موجودگی لازمی ہونی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح نکاح اور طلاق کے لئے گواہ ضروری ہیں۔ اسی طرح تجدید نکاح کیلئے بھی ضروری ہیں۔ اسی تجدید نکاح کو امساک یا ردّ کہتے ہیں جسے فقہاً کرام رجوع یا مراجعت سے تعبیر فرماتے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۲/۲۳۰) میں۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط (۲/۲۳۰)

ترجمہ: تو ان پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف لوٹ آئیں بشرطیکہ ان کا یہ خیال ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے۔

اسی کو تَرَاجُعْ فرمایا گیا ہے۔ تو کیا یہ رجوع بلا نکاح ہوگا؟ (واضح رہے کہ یہ تراجع تین طلاقوں کے بعد دوسرے شوہر سے نکاح کرنے پھر اس سے طلاق ہو جانے کے بعد پہلے شوہر کی طرف رجوع کر لینے سے متعلق ہے)

سیدھا سوال یہ بتائیے کہ جو عورت اپنے طلاق دینے والے شوہر کے گھر میں عدت گذار رہی ہے وہ حسبِ سابق بیوی رہتی ہے یا نہیں؟ اگر رہتی ہے تو رجوع اور امساک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جب چاہے اس سے جنسی تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی بیوی نہیں رہتی تو بغیر تجدید نکاح کے کوئی جنسی حرکت کِس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا صاف بات یہی ہے کہ امساک، ردّ، رجوع یا تراجع کے معنے یہی ہیں کہ تجدید نکاح کے بعد عورت کو روک لیا جائے۔ اور تجدید نکاح بغیر طرفین کی رضامندی کے ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا بیوی کی رضا مندی کے بغیر رجوع صحیح نہیں ہو سکتا۔

(بابُ الایلاء)

اِیْلَاءٌ کا لفظ، اَلْوٌ یا اَلْیٌ سے مأخوذ ہے جس کے معنے کوتاہی کرنا، تاخیر کرنا، سستی کرنا، باز رہنا ہوتے ہیں۔ اَلْاَلِیَّۃُ قسم کو کہتے ہیں۔ اِیْلَاءٌ باز رہنے کی قسم کھا لینا، بیوی کے پاس نہ

جانے کی قسم کھالینا۔ (تاج العروس ومحیط المحیط)

راغب نے بتایا ہے کہ اس لفظ میں بنیادی مفہوم ایذارسانی کا ہوا کرتا ہے۔ (مفردات)

اصطلاح فقہ میں اِیلاء اِسے کہتے ہیں کہ آدمی یہ قسم کھالے کہ وہ بیوی کے پاس نہیں جائے گا۔ یا چار مہینے اور اس سے زیادہ مدت کے لئے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے۔

سورۂ بقرہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۲ / ۲۲۶–۲۲۷)

ترجمہ:۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے باز رہنے کی قسم کھا لیتے ہیں ان کے لئے چار مہینے تک انتظار کرنے کا حق ہے تو اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ معاف کردینے والا اور رحم فرمانے والا ہے اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کرچکے ہیں تو اللہ اسے بھی سننے والا جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بتادیا گیا ہے کہ بیوی سے چار ماہ سے زیادہ قطع تعلق نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے اور چار ماہ سے زیادہ قطع تعلق پر قائم رہتا ہے تو اسے بیوی سے مستقلاً قطع تعلق کرلینا یعنی اسے طلاق دے دینی ہوگی نکاح کے سلسلہ میں ہم بتاچکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے سکون واطمینان اور باہمی محبت ومودت کے علاوہ نکاح کے دو عظیم مقاصد ہیں۔ اوّل عفت وعصمت کی حفاظت اور دوسرے افزائش نسل، ایک

جوان مرد اور جوان عورت میں جنسی اشتہار ایک فطری جذبہ ہے۔ جسے بالکلیہ دبایا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا نہ مرد کو اس کی اجازت ہے اور نہ عورت کو کہ وہ جنس مخالف کے اس فطری جذبہ کی تکمیل میں بیجا احتراز کر کے اسے ناجائز طریقوں سے اپنے جائز جذبہ کی تکمیل پر مجبور کر دے یہ جذبہ فطری ہے۔ آدمی اس جذبہ کی تکمیل کے لئے بسا اوقات مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لئے فطرت نے اس کی تکمیل کے لئے نکاح کا ایک جائز طریقہ رکھا ہے۔ قدرت جانتی ہے کہ ایک جوان مرد اور ایک جوان عورت زیادہ سے زیادہ چار ماہ کے عرصہ تک اس جذبہ کو بہ آسانی دبا سکتے ہیں۔ چار ماہ سے زیادہ عرصہ تک وہ اس جذبہ کو بہ سہولت نہیں دبا سکتے۔ لہٰذا چار مہینہ تک تو مرد کو چھوٹ دی جا سکتی ہے کہ وہ بیوی سے الگ رہے۔ لیکن چار ماہ سے زیادہ عرصہ تک اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر کسی شخص نے بیوی سے علیحدہ رہنے کی قسم بھی کھا لی ہے تو لازماً اسے چار مہینے سے پہلے پہلے اپنی قسم توڑ کر بیوی کے پاس چلا جانا چاہیئے ورنہ اسے بیوی کو طلاق دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

واضح رہے کہ قسم کھا کر اس بات کی پابندی کرنا جس کے لئے قسم کھائی گئی ہے۔ انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ قسم کھانیوالا شخص خدا کو گواہ بنا کر ایک عہد کرتا ہے کہ میں فلاں کام کروں گا یا فلاں کام نہیں کروں گا اول تو خود عہد کو پورا کرنا ہی فرض اور ضروری ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ (۱۷/۳۴)

ترجمہ: اور عہد کو پورا کرو۔ یقیناً عہد کی باز پرس کی جائے گی۔

اور پھر جو عہد خدا کو گواہ بنا کر کیا جائے اس کی شدت کا کیا پوچھنا؟ اس کو تو لازماً پورا کرنا ہی ہے۔ لیکن بیوی کے پاس نہ جانے کا عہد کرلینا اور اس پر قسم کھا بیٹھنا حق تعالیٰ کے نزدیک اس قدر ناپسندیدہ فعل ہے کہ اگر شوہر اپنی قسم کو توڑ دے اور اپنے عہد سے رجوع کرلے تو حق تعالیٰ وعدہ فرمارہے ہیں کہ۔

فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ: تو اللہ یقیناً معاف فرما دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ الگ بات رہی کہ قسم توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا۔ بہرحال اس اندازِ بیان سے واضح ہے کہ منشائے الٰہی یہی ہے کہ ایسی قسم کو توڑ دیا جائے۔ اور اگر شوہر اس قسم کو نہ توڑے اور چار مہینے گذر جائیں تو بیوی کو مستقل طور پر جدا کر دینا ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ چار ماہ کی مدت گذر جانے سے خود بخود طلاق واقع ہوجائے گی۔ لیکن امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ چار ماہ کا عرصہ گذرنے پر عدالت اسے مجبور کرے گی کہ وہ یا تو رجوع کرلے یا طلاق دیدے۔

(المیزان الکبریٰ للشعرانی ج ۲ ص ۱۲۵)

ہمارے نزدیک آئمہ ثلاثہ کا مسلک قرآن کریم سے قریب تر ہے کیونکہ طلاق کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ طلاق کیلئے دو مرحلے گذر جانے کے بعد تیسرا مرحلہ عدالت سے اجازت حاصل کرنے کا ہے۔ اس کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی اگر عدالت کے حکم پر شوہر طلاق نہ دے تو عدالت خود نکاح کو توڑ دے گی اور عورت

کو اجازت دے دیگی کہ وہ عدت گذار کر کسی اور مرد سے شادی کرلے۔

بغیر حلف کے یہ عہد کرلینا ایلاء اور اس کے احکام

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا ہے اس حلف سے متعلق ہیں کہ آدمی اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے۔ لیکن اگر کوئی شخص قسم نہیں کھاتا بغیر قسم کھائے یہی کچھ کہہ دیتا ہے کہ میں تیرے پاس نہیں آؤں گا۔ میں تجھ سے واسطہ نہیں رکھوں گا وغیر ذالک۔ تو اسے کیا کہا جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اسے ایلاء نہیں کہا جائے گا۔ اور ایسی صورت میں شوہر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔

لیکن امام مالکؒ فرماتے ہیں اور امام احمد ابن حنبلؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے کہ اسے بھی ایلاء کہا جائے گا اور شوہر کے خلاف وہی کارروائی کی جائے گی جو قسم کی صورت میں کی جاتی ہے۔

(المیزان الکبریٰ للشعرانی صہ ۱۲۵ ج ۲)

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ جس امر کے چھوڑنے کی قسم کھالی جائے اگر اس کی ادائیگی قسم کھالینے سے واجب ہو جاتی ہو تو قسم کھائے بغیر بھی اس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص قسم کھالے کہ میں بیوی کو نان ونفقہ نہیں دوں گا۔ تو جیساکہ اس پر قسم کھالینے کی صورت میں نان ونفقہ کی ادائیگی واجب ہے بعینہٖ اسی طرح قسم نہ کھانے کی صورت میں بھی واجب

ہوتی ہے۔ یہی حال تمام دوسرے واجبات کا بھی ہے۔ قسم کھا لینے سے کوئی غیر واجب عمل واجب نہیں ہو جاتا۔ اگر قسم کھا لینے کی صورت میں ایلاء سے رجوع کر لینا چار ماہ کے بعد واجب ہے ورنہ شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے تو قسم نہ کھانے کی صورت میں بھی چار مہینے گذر جانے پر عدالت شوہر کو مجبور کر لے کہ وہ یا تو رجوع کر لے ورنہ بیوی کو طلاق دے۔ (المغنی لابن قدامہ ج ۷ ص ۳۳۶)

ہمارے نزدیک امام مالکؒ کا مذہب اور امام احمد ابن حنبلؒ کی یہ روایت قرآن کریم سے قریب تر اور صحیح ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ چار ماہ کی مدت گذر جانے کے بعد ایلاء کی صورت میں شوہر کو رجوع کرنے یا طلاق دینے پر جو مجبور کیا جاتا ہے وہ اس لئے تو نہیں کیا جاتا کہ اس نے قسم کھائی تھی بلکہ اس لئے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ بیوی کی ایک حق تلفی کر رہا ہے۔ حق تلفی جرم ہے۔ نفس قسم کھا لینا کوئی جرم نہیں ہے۔ حق تلفی قسم کی صورت میں بھی ہوتی ہے اور بغیر قسم کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔

البتہ قسم کھا لینے کی صورت میں تو شوہر کے لئے ایک شرعی عذر بھی ہے کہ وہ قسم کے خلاف کیسے کرے لیکن بغیر قسم کی صورت میں تو یہ عذر بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں عدالتی کارروائی کی اجازت نہ دینا ناقابلِ فہم ہے۔

عملاً بیوی کو چھوڑے رہنا

تیسری صورت یہ بھی ہے کہ شوہر نے قسم نہیں کھائی نہ بیوی سے یہ کہا ہے کہ میں تیرے پاس نہیں آؤں گا۔ یا میں تجھ سے

میاں بیوی کا تعلق نہیں رکھوں گا۔ لیکن وہ عملاً بھی کچھ کر رہا ہے اور چار ماہ سے زیادہ ہو چکے ہیں وہ بیوی کے پاس نہیں گیا ہے۔ اسے کوئی عذر مثلاً بیماری وغیرہ بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ عدالت سے رجوع کر کے شوہر کو مجبور کرائے کہ وہ اس کی حق تلفی سے باز آجائے ورنہ اسے طلاق دیدے۔ کیونکہ ایسا تو نہیں ہے کہ شوہر اگر کہہ کر حق تلفی کرتا ہے تو اسے تو حق تلفی شمار کیا جائے اور بغیر کچھ کہے اگر وہ حق تلفی کرتا ہے تو اسے حق تلفی نہ کہا جائے۔

شادی کر کے دور دراز چلا جانا

بعض لوگ شادی کر کے ملازمتوں کے سلسلہ میں دور دراز جگہ بلکہ غیر ممالک میں چلے جاتے ہیں اور مہینوں بلکہ برسوں تک گھر نہیں آتے۔ اگر وہ بیوی سے اجازت حاصل کر کے اس کی مرضی سے چلے جاتے ہیں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن بیوی کی مرضی کے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہیئے خصوصاً جبکہ بیوی جوان ہو۔ اگر بیوی کی مرضی نہیں ہے تو شوہر کو چاہیئے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ لیکن اگر وہ بیوی کو ساتھ نہیں لے جاتا اور اس کی مرضی کے خلاف مہینوں اور سالوں کے لئے چلا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت میں بھی بیوی کو عدالت سے مرافعہ کرنے، شوہر کو واپس بلا لینے یا بیوی کو اپنے پاس بلا لینے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اگر شوہر کسی بات پر راضی نہ ہو تو اسے مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے یا عدالت خود ہی نکاح کو ختم کر دے۔

ضبط تولید کی خاطر

بعض لوگوں کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ چونکہ وہ اولاد پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اولاد پیدا کرکے ان کی صحیح پرورش اور تربیت کے فرائض سے بحسن وخوبی سبکدوش ہوسکیں۔ یا چند بچے ہوچکے ہیں اور زیادہ بچوں کی وہ سکت نہیں رکھتے اس لئے وہ بیوی سے بالکلیہ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ بلاشبہ بیوی کی رضامندی سے ایسا کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اگر بیوی رضامند نہ ہو تو اس کے جذبات کی پذیرائی ضروری ہے۔ پھر ضبط تولید کے لئے دوسرے جائز اور مناسب ذرائع اختیار کئے جائیں۔ لیکن اگر کوئی شخص بغیر بیوی کی مرضی کے اس سے الگ تھلگ رہتا ہے اور بیوی کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھتا تو میں سمجھتا ہوں کہ ایلاء کی کارروائی اس صورت میں کی جاسکتی ہے اور بیوی عدالت سے مرافعہ کرسکتی ہے۔

عجیب استدلال

بعض حضرات کے اس ارشاد پر مجھے حیرت ہے کہ وہ سرے سے جنسی جذبہ کو فطری جذبہ ماننے سے ہی انکار کردیتے ہیں اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال فرمانے لگتے ہیں کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد الٰہی ہے۔

نِسَاۤؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)

ترجمہ: تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں جب چاہو آسکتے ہو۔

وہ اس کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں

ہیں۔ تم اپنی کھیتی میں اسی وقت آسکتے ہو جب تم کھیتی کرنا یعنی اولاد پیدا کرنا چاہو۔ جب اولاد پیدا نہ کرنی ہو تو تمہیں اپنی بیویوں کے پاس ہرگز نہیں جانا چاہیئے۔ حالانکہ آیت کریمہ کے الفاظ اس مطلب کے متحمل نہیں ہیں۔ اَنّٰى شِئْتُمْ کے معنے تو صرف اتنے ہی ہیں کہ۔ "جب تم چاہو" جب اولاد پیدا کرنا چاہو تو ظاہر ہے کہ اَنّٰى شِئْتُمْ کے معنے نہیں ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ قرآن کریم میں اپنی طرف سے الفاظ بڑھا کر اپنی مرضی کے مطابق اس سے مطلب نکال لے۔

یہ حضرات قطعاً بھول جاتے ہیں کہ نکاح کا مقصد قرآن کریم نے محض افزائش نسل ہی نہیں بتایا ہے بلکہ اس نے تین مقصد بتائے ہیں۔

(۱) لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ (۳۰/۲۱)

ترجمہ:۔ تاکہ تمہیں بیویوں کی طرف سے سکون واطمینان حاصل ہو اور خدا نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی کے جذبات رکھ دیئے ہیں۔

(۲) عفت وعصمت کی حفاظت۔

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ (۴/۲۴)

ترجمہ:۔ عفت وعصمت کو محفوظ بنانے والے ہوں شہوت رانی کرنے والے نہ ہوں۔

اور۔

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ۔ (۴/۲۵)

ترجمہ:۔ عفت وعصمت کو محفوظ بنانے والی ہوں، شہوت رانی کرنے

والی نہ ہوں۔

③ افزائش نسل۔

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ (۲/۱۸۸)

ترجمہ:۔ اور جو کچھ خدا نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے (یعنی اولاد) اسے طلب کرو۔

بہر حال نکاح اور جنسی تعلق کے یہ تین بڑے مقصد قرآن کریم نے بتائے ہیں صرف افزائش نسل ہی نہیں بتایا ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ جنسی تعلق صرف اسی وقت قائم کرنا چاہیئے جب اولاد پیدا کرنی ہو۔ اگر قرآن کریم کا یہ منشا رہوتا اور۔ نِسَاۤؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ۔ (۲/۲۲۳) کا یہی مطلب ہوتا جو ان حضرات نے بتایا ہے تو جب کوئی شوہر چار ماہ تک اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھاتا ہے یا ایسا کوئی عہد کرتا ہے تو قرآن کریم اسے کیوں مجبور کرتا ہے کہ وہ یا تو اپنی قسم اور عہد کو توڑے اور اس کا کفارہ دے ورنہ بیوی کو طلاق دے۔ ہر چار ماہ کے بعد تو کسی کو بھی اولاد پیدا کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ اولاد پیدا کرنے کی ضرورت تو لازماً تین سال کے بعد ہی لاحق ہو سکتی ہے۔ اور ہونی چاہیئے۔ زمانہ حمل میں کس بیوقوف آدمی کو اس کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے اور یہ مدت بھی کم سے کم نو یا دس ماہ تو ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو سال تک بیوی بچہ کو دودھ پلاتی ہے اس عرصہ میں بھی اولاد پیدا کرنے کی ضرورت لاحق نہیں ہونی چاہیئے اور نہیں ہوتی۔ پھر قرآن کریم نے یہ چار مہینے کی قدغن کیوں لگا دی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی

معقول جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے ہمارے نزدیک نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَأْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ کی وہ تفسیر جو ان حضرات نے فرمائی ہے صراحۃً قرآن کریم سے متعارض ہے۔ واللہ اعلم

باہمی رضامندی سے

واضح رہے کہ یہ ساری بحث اس مفروضہ کے ماتحت ہے کہ بیوی کی خواہشات کو نظر انداز کر کے شوہر جنسی تعلق سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ لیکن باہمی رضامندی سے اگر ایسا کیا جائے تو اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کیا جانا چاہیئے۔ شوہر اور بیوی دونوں کو اس سلسلہ میں کافی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اس مشغلہ کو ایک کھیل بنا لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنی موت کو دعوت دیتے اور اپنی قبریں خود ہی کھودتے ہیں۔ بلاشبہ جنسی جذبہ کو کنٹرول کر کے اپنی قیمتی صلاحیت (ENERGY) سے بہتر سے بہتر کام لیا جا سکتا ہے۔ قدرت نے یہ صلاحیت اس لئے نہیں دی ہے کہ اسے دونوں ہاتھوں سے لٹا دیا جائے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر آدمی موت کی آغوش میں چلا جائے۔ عنفوانِ شباب کا دور ختم ہو جانے کے بعد جب آدمی ادھیڑ عمر میں قدم رکھ دیتا ہے تو یہ جذبہ خود بخود سرد پڑتا جاتا ہے۔ بلکہ غالباً مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں یہ جذبہ زیادہ سرد پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا باہمی رضامندی سے جنسی تعلق سے احتراز عین ممکن ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہمیں کچھ اسی قسم کی جھلک نظر آتی ہے۔ بات کو سمجھانے اور سیاق و سباق کو واضح کرنے کے لئے ہمیں بحث کو ابتداء سے شروع کرنا ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق پانچواں افسانہ

آیاتِ تخییر

اور

افسانۂ ایلاء

حضورؐ کی زندگی

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق ایک افسانہ یہ بھی تراشا گیا ہے کہ آپ انتہائی زہد و قناعت کی زندگی بسر فرماتے تھے اور ازواج مطہرات کو بھی مجبور فرماتے تھے کہ وہ بھی اسی زہد و قناعت کی زندگی بسر کریں جیسی آپ بسر فرماتے تھے۔ لیکن تنگ آمد بجنگ آمد ازواج مطہرات کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے باقاعدہ اجتماعی طور پر آپ کو مجبور کیا کہ ان کے نان و نفقہ اور دیگر اخراجات میں اضافہ کریں۔ آپ ان کے اس مطالبہ کو پورا نہیں کر سکے تو آپ نے ایک مہینہ کا ایلاء فرما لیا اور تمام ازواج مطہرات سے کنارہ کش ہو کر آپ اپنے ایک بالاخانے میں فروکش ہو گئے۔ ایک ماہ کے بعد آپ پر وحی نازل ہوئی کہ ازواج مطہرات کو اختیار دیدو کہ اگر وہ ناز و نعم اور دنیوی زندگی کی وسعت چاہتی ہیں تو آپ اُنہیں کچھ ساز و سامان دے کر رخصت کر دیں اور اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی چاہتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لئے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ اس افسانہ کی حقیقت واضح

کرنے کے لئے ہمیں بحث کو ابتداء سے شروع کرتا ہوگا۔ آنحضرتؐ کے متعلق معلوم ہے کہ آپ پیدا ہوئے تو والد محترم اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ دادا نے پرورش کی۔ جب آٹھ نو سال کی عمر میں دادا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تو قبائلی رواج کے مطابق خاندانِ بنو ہاشم کے سربراہ زبیر ابن عبدالمطلب نے سہارا دیا جو حضورؐ کے سگے اور مشفق چچا تھے (زبیر، عبداللہ اور عبد مناف ابوطالب تینوں ایک ہی ماں کے بطن سے تھے) زبیر کی وفات کے وقت حضور اکرمؐ بالغ مگر غیر شادی شدہ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد خاندانی رواج کے مطابق ان (زبیر) کے چھوٹے بھائی عبد مناف ابوطالب سربراہِ قبیلہ ہوئے تو خاندان کے نوجوانوں کی سرپرستی ان کے ذمّے قرار پائی دادا کے انتقال کے بعد سے حضورِ اکرمؐ نے بکریاں چرا کر اپنی معیشت کا بندوبست فرما لیا تھا۔ اور بالغ ہونے کے بعد سے شراکت کی بنیاد پر تجارت شروع کر دی تھی۔ اپنے چچا زبیر کے ساتھ غیر ممالک کے کئی تجارتی سفر بھی کئے اور خاصا تجارتی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اپنی خودداری کی بنا پر نہ اپنے چچا زبیر ابن عبدالمطلب کا احسان اُٹھایا نہ عبد مناف ابوطالب کا۔ ہاں بزرگانہ سرپرستی یکے بعد دیگرے ان دونوں کی حضور اکرمؐ کو حاصل رہی۔

کاروبار میں خود کفیل ہونے کے بعد حضور اکرمؐ نے اپنے چچا ابوطالب کی صاحبزادی ہند سے (جن کو فاختہ بھی کہا جاتا ہے اور بعد میں ام ہانی کے نام سے بھی مشہور ہوئیں) نکاح کے لئے اپنا پیغام دیا جسے ابوطالب نے مسترد کر دیا اور بجائے حضور اکرمؐ سے کرنے کے اپنی بیٹی ہند یعنی ام ہانی کا نکاح ایک مالدار شخص ہبیرہ ابن ابی وہب سے کر دیا۔ بھتیجے

نے شکایت کی تو چچا نے جواب دیا۔

الکریم یکافی الکریم۔

یعنی اشراف کا میل اشراف ہی سے ہو سکتا ہے۔

(طبری ،الاصابہ ،طبقات ابن سعد)

حضرت خدیجہؓ سے شادی

یہ آپ کی یتیمی پر طنز تھا کہ تم ام ہانی کے لائق نہیں ہو۔ کیونکہ تم یتیم ہو۔ اور ام ہانی سردار قبیلہ کی بیٹی ہے یہ جواب ظاہر ہے کہ نہایت حوصلہ شکن بلکہ دل آزار تھا۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ کچھ ہی عرصہ بعد حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کے مشورہ کے مطابق آپ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے شادی کا فیصلہ فرمالیا جو ایک بیوہ خاتون تھیں۔

(سیرت ابن ہشام اردو ترجمہ شائع کردہ شیخ غلام علی لاہور ۱۹۷۵ء جلد اول صلا۲۱۲ بعنوان حضرت خدیجہؓ سے نکاح)

بیوہ ہونا یوں بھی کوئی عیب کی بات نہیں اور پھر عربوں میں تو بیوگی کو عیب سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ البتہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس وقت خدیجہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر چالیس سال ہو چکی تھی مبالغہ آرائی ہے۔ صحیح روایت کے مطابق جو طبقات ابن سعد وغیرہ میں ہے۔

"اس وقت حضورؐ اکرم کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر اٹھائیس سال تھی"

اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے دو صاحبزادے قاسم اور عبد اللہ جن کا لقب طیب اور طاہر ہے۔ اور بعض روایات کے مطابق طاہر تیسرے صاحبزادے کا نام ہے اور چار صاحبزادیاں۔ حضرت زینبؓ ،حضرت رقیہؓ ،حضرت ام کلثومؓ اور حضرت

فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن پیدا ہوئیں۔

ان میں عام روایات کے مطابق سب سے چھوٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں جن کی پیدائش بقول حضرت عباس رضؓ ابن عبدالمطلب اس سال ہوئی تھی جس سال قریش کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے۔ یعنی جب آنحضرتؐ کی عمر پینتیس سال ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ (استیعاب ۲/۷۵۱)

حضرت خدیجہ رضؓ سے آپ کی چھ یا سات اولادیں پیدا ہوئیں۔ عرب جیسے گرم ملک میں جہاں لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں (ہمارے علماء کے بقول)، وہیں عرب کی عورتیں سن یاس کو بھی جلد پہنچنی چاہئیں۔ پنتالیس سال کی عمر میں تو عورتیں ہمارے ہاں سن یاس کو پہنچ جاتی ہیں عرب میں تو یہ مرحلہ اس سے پہلے ہی آجانا چاہیئے۔ اگر حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال ہو چکی تھی تو یہ چھ سات بچے کیسے ہو گئے۔

باقی ازواج سے کوئی اولاد نہیں ہوئی

بہرحال ہمیں بتانا یہ تھا کہ حضرت خدیجہ رضؓ سے آپ کے چھ یا سات بچے پیدا ہوئے۔ یعنی آپؐ میں خدانخواستہ ایسا کوئی نقص نہیں تھا کہ آپ کے اولاد پیدا نہ ہو۔ حضرت خدیجہ رضؓ کے بعد آپ نے گیارہ شادیاں فرمائیں۔ دس بیویاں بیوہ تھیں اور ایک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کنواری تھیں۔ جو دس بیویاں بیوہ تھیں ان میں سے بیشتر پہلے شوہروں سے صاحبِ اولاد تھیں اور سن یاس کو پہنچی ہوئی بھی نہیں تھیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپؐ کے نکاح میں آنے کے بعد ان میں سے کسی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

البتہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک صاحبزادے

حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے۔ جو محدثین کی تصریحات کے مطابق ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ۶ھ میں آنحضرتؐ نے مختلف سلاطین کو نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے ہیں اور اس کے بعد ہی مقوقس یعنی شہنشاہِ مصر نے دیگر تحائف کے ساتھ باہمی ملکی تعلقات میں اضافے کے لئے اور حضورؐ کے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہ کی مثال سامنے رکھ کر آنحضرتؐ سے بھی مصر کی نامور خاتون حضرت ماریہؓ (مریم) سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی فرمائش کی اور اسی لئے حضرت ماریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ حضور اکرمؐ نے اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا جس کی نشانی حضرت ماریہؓ سے حضور اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ ہیں جن کا یہ اسم گرامی بھی اسی پرانے تعلق کو زندہ کرنے کے لئے تھا۔ بہرحال اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اکسٹھ سال کی عمر تک آپ میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ باقی تمام بیویوں سے آپؐ کی ایک بھی اولاد کیوں نہیں ہوئی۔

جنسی آسودگی نہیں

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ جو دیگر ازواج مطہرات تھیں ان سے آپ نے نکاح جنسی آسودگی کی خاطر فرمایا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اصل مقصد ان بیوہ عورتوں کی پرورش، خبرگیری سرپرستی اور مختلف قبائل میں رشتہ داریاں پیدا کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لئے ان قبائل کی ہمدردیاں حاصل کرنا۔ نیز ان کے ذریعے سے اسلامی معاشرہ کی مستورات کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام فرمانا تھا۔ کیونکہ عورتوں کی تعلیم و تربیت عورتوں ہی کے ذریعے سے بہتر طور پر ہو سکتی

تھی۔ تمام ازواج مطہرات سے قطعاً اولاد کا پیدا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا ان سے ایسا کوئی جنسی تعلق قائم نہیں تھا جیساکہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان ازواج مطہرات سے جنسی تعلق قائم کرنا آپ کے لئے ممنوع تھا جب کہ وہ بہر حال آپؐ کی ازواج مطہرات تھیں. قرآن کریم نے بھی ان سب کو آپ کی ازواج ہی فرمایا ہے چنانچہ اسی تعلق کی بناء پر وہ تمام امت کی مائیں کہی جاتی ہیں۔ اور ان کا امت میں انتہائی بلند مقام ہے بلکہ میرا مطلب ان افسانہ طرازیوں سے انکار کرنا ہے جو ہمارے اذہان میں صدیوں سے جاگزیں چلی آتی ہیں۔

مثلاً یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک رات میں ساری ازواج مطہرات کے پاس دورہ فرمالیا کرتے تھے۔ آپ میں قدرت نے اتنی جنسی قوت رکھدی تھی جتنی تیس بہشتی جوانوں میں ہوتی ہے وغیرہ۔

یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ کس انداز سے گذری ہے۔ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی قوم کی بے راہ روی پر خون کے آنسو روتی رہی۔ پوری زندگی سراپا اضطراب بنی رہی۔ روشنی کی کوئی کرن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ سرتاپا قلق اور سرتاپا بے چینی تھی۔ غارِ حرا میں تذکر و تفکر اور تدبر و مراقبہ میں ہفتوں گذر جاتے تھے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ (۹۳/۷)

ترجمہ: خدا نے آپ کو سراپا اضطراب و قلق پایا تو خدا نے آپ کو راہ دکھادی۔
نبی کے دل میں جبتک اسے وہ روشنی میسر نہیں آتی جو بالآخر اسکا مقدر ہوتی ہے اس وقت تک اس کی زندگی کس بے چینی اور اضطراب میں گذرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسے ہم سمجھ بھی نہیں

سکتے۔ ایک تپش اور خلش ہوتی ہے ایک طلب اور تشنگی ہوتی ہے جو کسی طرح فرو ہونے میں نہیں آتی اور جب وہ روشنی نظر آجاتی ہے جس کیلئے وہ سراپا قلق و اضطراب بنا ہوا تھا تو وہ اتنا بارگراں ثابت ہوتی ہے کہ بپناہ بخدا۔ نبی کی کمر اس سے دوہری ہو جاتی ہے اسی کو اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (۹۴/۳-۲)

ترجمہ: اور ہم نے آپ کا وہ بوجھ ہلکا کر دیا جو آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔

پھر ایک نبی جو پیغام لے کر آتا ہے وہ قوم کی صلاح و فلاح خیر خواہی و بہبودی کا ضامن ہونے کے باوجود پوری قوم کو اس کی مخالفت پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ تضحیک و استہزاء کا کونسا حربہ نہیں آزمایا جاتا۔ اس پر جھوٹے، مفتری، ساحر، کاہن اور شاعر کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں اس پر سنگباری کی جاتی ہے۔ شریر بچوں کا غول اس پر فقرے کستا ہے تالیاں بجاتا ہے، پتھر برساتا ہے، کنکریاں مارتا ہے۔ ان تمام باتوں سے جو کچھ ایک نبی کے دل پر گذرتی ہے اسے بس وہی اور آپ نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۶/۳)

ترجمہ: شاید آپ تو اپنے آپ کو اس غم میں ہلاک ہی کر ڈالیں کہ لوگ مؤمن کیوں نہیں ہوتے۔

علاوہ ازیں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں سے ماہ رمضان کے روزے رکھوا رہا ہے تو خود رمضان کے ساتھ ساتھ پورے شعبان کے بھی روزے رکھ رہا ہے۔ عید کے بعد شوال کے آٹھ روزے مزید رکھ رہا ہے اور ہر مہینہ کے ایام بیض یعنی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخوں کے بھی روزے رکھ رہا ہے۔ لوگوں سے پانچ وقت کی نماز پڑھوا رہا ہے تو خود راتوں کو تہجد میں دو تہائی یا آدھی اور ایک تہائی رات قیام و قعود اور رکوع و سجود میں گذار دیتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ ط

(۷۳/۲۰)

ترجمہ:۔ آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ آپ دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کھڑے رہتے ہیں۔

حتیٰ کہ قدم ہائے مبارک پر ورم آجاتا ہے۔ لوگ عرض کرتے ہیں کہ خدا نے تو آپ کی اگلی پچھلی تمام لغزشیں معاف فرما دی ہیں آپ اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں تو آپ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا۔

ترجمہ:۔ کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔

آپ کے مشاغل

پھر آپ کے مشاغل پر بھی غور فرما لیجئے۔ کہ اپنی قائم کردہ سلطنت کے امیر اور سربراہ بھی ہیں۔ پوری قوم کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے والے جج بھی ہیں۔ نمازوں کی امامت بھی کراتے ہیں۔ دشمن سے برابر جنگیں لڑی جا رہی ہیں۔ ان میں اسلامی فوجوں کی کمان بھی آپ کرتے ہیں اموال غنیمت آتے ہیں تو اسے لوگوں میں تقسیم بھی آپ ہی کرتے ہیں۔ قوم کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تصفیہ کا کام بھی آپ انجام دے رہے ہیں۔ وعظ و نصیحت کی محفلیں قائم ہوتی ہیں تو خطبے بھی دے رہے ہیں مشرکین و منافقین کی ہر ممکن ریشہ دوانیوں کا دفاع بھی کر رہے ہیں خود فقر و فاقہ میں بسر ہو رہی ہے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھود رہے ہیں مگر ساتھ ہی فقیروں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور بے آسرا لوگوں کے پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کی فکر بھی دامن گیر ہے۔ ان سب کا انتظام و انصرام بھی آپ ہی کر رہے ہیں۔ اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے بالکل ہی نہیں چھوٹ گیا ہے اور نورِ بصیرت بالکل ہی سلب نہیں ہو گیا ہے تو خدارا انصاف کے ساتھ غور کیجئے کہ اس ذاتِ اقدس و اعظم کے پاس

دنیا داریوں کے لئے اور نو نو بیویوں سے بیک وقت جنسی آسودگیوں کے لئے کہاں فرصت تھی؟

کیا کوئی انسان ان تمام گرانبہا ذمہ داریوں کے ساتھ جنس اور جنسی ملاعبتوں کا سوچ بھی سکتا ہے۔ ہمیں تو آپ کی ازواجِ مطہرات کے سلسلہ میں قرآن کریم کی یہ ہدایت ملتی ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْکُنَّ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ وَاِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْکُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (۳۳ / ۲۸-۲۹)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! آپ اپنی ازواج سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زیبائش و آرائش چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں ساز و سامان دیدوں اور خوش اسلوبی کے ساتھ تمہیں رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور اُخروی زندگی کی راحتیں چاہتی ہو تو یقیناً اللہ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

ان آیات میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اگر تمہارا مقصد دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا حصول ہے تو میرے ہاں تمہارا گزارہ نہیں، پھر تو آؤ میں تمہیں رخصت کر دوں اور اگر اللہ، اس کا رسول اور اُخروی زندگی کی راحتیں چاہتی ہو تو چشمِ ما روشن دلِ ما شاد

ان آیاتِ کریمہ میں اَلْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَھَا کے الفاظ انتہائی اہم اور غور طلب ہیں۔ اس میں دُنیوی ناز و نعم، تنعم و تعیش، عمدہ لباس، عمدہ زیورات، سامانِ آرائش و زیبائش، نیز سامانِ خورد و نوش

کی فراوانی بھی آجاتی ہے اور ساتھ ہی سارے دنیوی معاملات ومشاغل بھی جن میں سرفہرست جنسی تعلقات ہیں۔ اس کے بعد وضاحت سے بتادیا گیا ہے کہ تمہارے اصل وظائف کیا ہیں۔ اور تم کو اس منصب کے لئے کیوں منتخب کیا گیا ہے۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝ (۳۳ / ۳۳-۳۴)

ترجمہ:۔ اور اے ازواج مطہرات! اپنے گھروں میں قیام پذیر رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانہ کی طرح زیب وزینت ظاہر کرتی نہ پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو۔ اللہ چاہتا ہے۔ اے رسول کی گھر والیو! کہ تم سے گندگی کو دور کردے اور تمہیں اچھی طرح پاک وصاف کردے۔ اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں تلاوت کی جاتی ہیں ان کو (دوسری عورتوں کے سامنے) بیان کرتی رہو (اور اس طرح ان کا چرچا کر کے ان کی تعلیم وتربیت کرتی رہو) یقیناً اللہ بڑا مہربان اور خبر رکھنے والا ہے۔

ازواج مطہرات کا اصل کام

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوگیا کہ ازواجِ مطہرات کا اصل کام اور ان کا فریضہ کیا تھا اور ان کے شب وروز کن مشاغل میں گذرتے تھے۔ دنیاوی عیش وعشرت نہ ان کا مقصد تھا اور نہ اس میں وہ مصروف رہتی تھیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم وتربیت

کا ایک مرکز قائم فرمایا تھا اسی مرکز کے حصۂ خواتین کی معلمات ازواج مطہرات تھیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں عام صحابہ کو تعلیم و تربیت فرماتے تھے تو ازواج مطہرات مسلم خواتین کو تعلیم و تربیت فرماتی تھیں۔ پہلے خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرتی تھیں اور پھر اسے آگے بڑھاتی تھیں۔ جن مسائل کے متعلق ان کو علم نہیں ہوتا تھا ان کو آنحضرتؐ سے پوچھ کر مسلمان خواتین کو بتلاتی تھیں۔ مستورات کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں جنہیں وہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں پوچھ سکتی تھیں۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں جو آپ کی جنسی تفاصیل ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہیں ان کی کوئی اصل و بنیاد ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ کا اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ زیادہ تر ان کی سرپرستی اور پرورش کا تعلق تھا۔ جنسی تعلق نہیں تھا۔ راویان حدیث کی وہ تمام افسانہ طرازیاں بالکل بے اصل اور لغو ہیں۔ ورنہ پھر کیا وجہ ہے کہ کسی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حالانکہ تمام بیویاں وہ ہیں جن کے پہلے شوہروں سے (باستثنار چند) اولاد موجود ہے۔ لہٰذا ان سب کو بانجھ بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ۸ھ میں حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ایک اولاد بھی پیدا ہو گئی جس سے ثابت ہو گیا کہ اکسٹھ سال کی عمر تک آپؐ میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔

دراصل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سامنے ایک مشن تھا اور اسی مشن کے لئے آپ کے شب و روز وقف تھے۔ آپ کی ازواج مطہرات بھی

اسی مشینری کے پرزے تھیں۔ ان کا مقصدِ حیات بھی وہی تھا جو آپ کا مقصدِ حیات تھا۔ وہ بھی اس مشن میں ممد و معاون تھیں۔ ان کا وظیفۂ حیات بھی اسلام کی نشر و اشاعت اور اسلامی احکام و ہدایات کی تبلیغ و ترویج تھا۔ تاہم وہ چونکہ آپ کی ازواجِ مطہرات تھیں اس لئے ازواج ہونے کی حیثیت سے جنسی آسودگی بھی ان کا ایک حق تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشرطِ فرصت اسے بھی ادا فرماتے ہوں گے۔ چونکہ عرب میں اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد بھی بیس سال تک نکاح کے سلسلہ میں کوئی تحدید نہیں تھی۔ اس لئے سب مسلمان متعدد بیویاں رکھتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق آپ نے بھی تبلیغی مصالح اور اسلامی معاشرہ کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر متعدد نکاح فرمائے تھے۔ لیکن جب ۸ھ میں نکاح کے سلسلہ میں تحدید کا حکم نازل ہو گیا اور مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ وہ عام حالات میں صرف ایک بیوی پر ہی اکتفا کریں۔

البتہ اگر ایسے ہنگامی حالات معاشرہ میں رونما ہو جائیں کہ یتیم اور بیوہ عورتوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ ان کی پرورش، حفاظت و صیانت اور غور و پرداخت اس کے بغیر نہ ہو سکے تو مسلمان دو، دو، تین تین، چار چار تک شادیاں کر سکتے ہیں۔ تاکہ اس مشکل مسئلہ کا حل ہو سکے۔ چنانچہ صحابہ میں جن چند لوگوں کے پاس چار سے زیادہ بیویاں تھیں، ان سے کہا گیا کہ چار بیویاں رکھ لو اور چار سے زیادہ جتنی بیویاں ہوں ان کو طلاق دے دو۔ چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ مشکل در پیش تھی کہ آپ کی ازواج

مطہرات امت کی مائیں قرار دی جا چکی تھیں۔ ان کا کسی اور سے نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ان کو طلاق دیدی جاتی تو یہ ان پر ظلم ہوتا۔ لامحالہ آپ کو اجازت مرحمت فرمائی گئی کہ آپ ان موجودہ ازواج مطہرات کو اپنے حبالۂ عقد میں باقی رکھ سکتے ہیں۔ لیکن آپ ان میں سے صرف چار ازواج مطہرات کو ہی اپنے قربِ خاص سے نواز سکتے ہیں۔ باقی ازواج مطہرات کو مؤخر (ارجاء) رکھا جائے۔ یعنی وہ قانوناً آپ کی ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین رہیں گی۔ لیکن عملاً آپ ان سے جنسی تعلقات نہیں رکھیں گے۔ (تفصیل اس کی "موہوبات" والے مضمون میں ملے گی) ازواج مطہرات کے سلسلہ میں یہ ایک بڑی تبدیلی تھی۔ اس لئے ان کو اختیار دینا ضروری تھا کہ اگر وہ اس صورتِ حالات پر راضی ہوں اور

آیات کا تعلق خاص اس تبدیلی سے ہے

اس کے باوجود وہ آپ کے حبالۂ عقد میں رہنا چاہیں تو حق تعالیٰ کے ہاں ان کے بڑے اجر ہوں گے۔ اور اگر انہیں یہ صورت منظور نہ ہو اور وہ دنیوی زندگی اور اس کی زینت کی خواہشمند ہوں تو آپ کو اجازت دی گئی کہ ان کو دنیوی ساز و سامان دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت فرما دیں۔

بہرحال ان آیاتِ کریمہ کا تعلق خاص اس تبدیلی سے ہے۔ ایلاء وغیرہ سے نہیں ہے۔ ہم ان احادیث کا بالکلیہ انکار نہیں کر رہے ہیں جن کا تعلق ازواج مطہرات کی طرف سے نفقہ کی توسیع کے لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست پیش کرنے سے ہے اور جو بخاری وغیرہ میں ہیں (ہم ان روایات پر کچھ گفتگو آئندہ آنے والے مضمون "تحریم" اور "پیغمبر کے راز" میں بھی کریں گے) لیکن ازواج

مطہرات کی طرف سے یہ مطالبہ قطعاً اس شدت کے ساتھ نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس کی بناء پر آپ ازواج مطہرات کو طلاق دینے پر تیار ہو جائیں یا ایک ماہ تک ان سے کنارہ کشی اختیار فرمالیں۔

ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی انتہائی قناعت اور زہد کی زندگی تھی۔ چالیس چالیس دن تک گھروں میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ کھجور اور کبھی کبھار دودھ پر گذارہ تھا۔ گیہوں میسر نہیں تھا۔ جَو کی روٹی مرغوب ترین غذا تھی۔ فتوحاتِ اسلامی کے بعد جو کچھ دولت آتی تھی وہ باہر کے باہر ہی ضرورت مندوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

دوسری طرف ازواج مطہرات آپ کی ازواج اور امہات المؤمنین ہونے کے باوصف اسی جنس لطیف سے تعلق رکھتی تھیں جس کی مرغوب ترین چیز زیب وزینت اور آرائش وزیبائش ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ آپ کے شرف صحبت نے ان کو تمام نبات جنس سے ممتاز کر دیا تھا۔ تاہم بشری امنگوں اور تقاضوں سے بالکل ہی مبرا نہیں کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ جبکہ فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور اموالِ غنیمت اور اموالِ خراج کا سرمایہ اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اگر اس میں سے کچھ تھوڑا سا حصہ ازواج مطہرات کی طرف منعطف کر دیا جاتا تو ان کی راحت وآسائش کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ مدینہ منورہ میں منافقین ومعاندین کا ایک طاقتور ٹولہ موجود تھا جن کی تعداد چار سو کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ اُن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔

چنانچہ ایک فتنہ پرداز عورت اُمِ جَلْدَح کا نام اصابہ میں ملتا ہے اس کے علاوہ اور عورتیں بھی ہوں گی جو ازواج مطہرات کے درمیان سہیلیوں اور مخلص ساتھنوں کے روپ میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ اُنہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات زہد وقناعت معلوم تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ازواج مطہرات میں زیادہ تر بڑے اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی صاحبزادی تھیں جو کپڑے کے تاجر اور متمول آدمی تھے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت فاروق اعظم رضؓ کی صاحبزادی تھیں جو قریش میں انتہائی با اثر شخصیت تھے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا رئیس مکہ اور سردار قریش حضرت ابوسفیان رضؓ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا قبیلۂ بنی المصطلق کے رئیس کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خیبر کے رئیس اعظم کی صاحبزادی تھیں۔ جو نہایت متمول یہودی تھا۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا آنحضرت کی سگی پھوپھی زاد بہن اور بڑی اچھی دستکار تھیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام ہی زاد الراکب پڑگیا تھا۔ کیونکہ ہر سفر میں وہ تمام رفقاء کے زادِ راہ کے خود کفیل ہوا کرتے تھے۔ وغیر ذلک۔

منافقین نے جو انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے۔ ان حالات سے یقیناً فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی اور ازواج مطہرات کو اس پر آمادہ کیا ہوگا کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے توسیع نفقہ کی درخواست کریں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ازواج مطہرات نے کسی وقت ان منافقین ومنافقات کے زیر اثر اس قسم کی کوئی درخواست کر دی ہو۔ لیکن اس

کی حیثیت ایک معمولی گھریلو معاملہ سے زیادہ ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی یہ حیثیت کبھی بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ آپ ازواج مطہرات سے ناراض ہو کر ان کے پاس ایک ماہ تک نہ جانے کی قسم کھالیں۔ دو ازواج مطہرات مظاہرہ پر اُتر آئیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلہ میں حق تعالیٰ، جبرئیل، صالح مؤمنین اور ملأ اعلیٰ کے فرشتوں سے مدد لینے پر مجبور ہو جائیں۔ استغفر اللہ۔

اس قسم کے معمولی تنازعات گھروں میں ہو ہی جاتے ہیں ان کی یہ اہمیت ہرگز نہیں ہوتی (مزید بحث تحریم کے سلسلہ میں کتاب الایمان میں آئے گی) اس رائی کے دانے کا پہاڑ بنانا یقیناً سبائی یہودیوں کی کارستانی ہے جس کا اثر پروپگنڈے کی بنا پر ہماری کتابوں تک میں آگیا ہے اور اسی لئے ہم نے توجہ دلانا ضروری محسوس کیا، اللہ تعالیٰ ہم پر اور سب مسلمانوں پر پیغمبرؐ اور ازواج پیغمبرؐ کی صحیح عظمت آشکارا فرمائے۔ آمین۔

(باب الخلع)

خُلع، خائے معجمہ کے ضمہ (پیش) کے ساتھ خَلْعٌ سے مأخوذ ہے جس کے معنے اتار دینے کے ہوتے ہیں۔ خَلْعٌ اور نَزْعٌ کو علمائے لغت نے ہم معنیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ خَلْعٌ میں مہلت اور آہستگی ہوتی ہے یعنی یہ عمل فوراً ایک دم نہیں ہو جاتا اور نَزْعٌ میں جلدی اور تیزی پائی جاتی ہے۔ اَلْخَالِعُ گرا ہوا اور ٹوٹا ہوا، درخت۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اس چیز سے الگ ہو جانا جس کے ساتھ وہ پہلے شامل تھی۔ اَلْخُلْعُ وہ طلاق جو عورت اپنے خاوند سے کچھ مال ادا کرکے حاصل کرے۔

(تاج العروس وراغب)

واضح رہے کہ خُلْعٌ بمعنی طلاق فقہی اصطلاح ہے۔ قرآن کریم نے اس اصطلاح کو استعمال نہیں فرمایا۔ فقہ کی اصطلاح میں خُلع اس طلاق کو کہتے ہیں جو بیوی شوہر کو کچھ مال ادا کرکے حاصل کرلے، جب بیوی اور شوہر کے درمیان مناقشہ پیدا ہو جائے اور اندیشہ ہو کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرسکیں گے تو بیوی اپنے مہر کا کچھ حصہ یا تمام مہر واپس کرکے طلاق حاصل کرلے تو اسے خُلْعٌ کہتے ہیں۔ خلع کی صورت میں بیوی جو طلاق حاصل کرتی ہے اس میں شوہر کو رجوع کا حق نہیں ہوتا۔ کیونکہ شوہر طلاق کا معاوضہ لے چکا ہے۔ لہٰذا یہ طلاق بائنہ یعنی لازمی طور پر جدا کرنے والی ہوگی۔ خلع بھی چونکہ طلاق ہی ہے اس لئے اس کا فیصلہ بھی باہمی طور پر نہیں ہو سکتا بلکہ فیصلہ عدالت ہی سے ہوگا۔

خلع طلاق ہے یا فسخ

فقہاء نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ خلع طلاق ہے یا فسخِ نکاح ہے۔

امام احمد ابن حنبلؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ یہ طلاق نہیں ہے بلکہ نکاح کا فسخ ہے۔ امام شافعیؒ سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔

حضرت ابن عباس رضؓ، طاؤس رحؒ، عکرمہ رحؒ، اسحاق رحؒ، ابو ثور رحؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

لیکن امام احمد ابن حنبل رحؒ کی دوسری روایت یہ ہے کہ فسخ نہیں ہے۔ بلکہ طلاق ہے۔ سعید ابن المسیبؒ، حسن بصریؒ، عطاؒ، قبیصہؒ، شریحؒ، مجاہدؒ، ابو سلمہ ابن عبدالرحمٰن، نخعیؒ، شعبیؒ، زہری، مکحولؒ، ابن ابی نجیحؒ، امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ وغیرہ نے اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اپنے قول کی یہ دلیل دی ہے کہ قرآن کریم نے صرف تین مرتبہ طلاقوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ترجمہ: طلاق دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔ پھر یا تو دستور کے مطابق بیوی کو روک لینا ہے یا حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔

دو مرتبہ طلاقیں یہ ہو جاتی ہیں جن میں آدمی رجوع کر کے بیوی کو روک بھی سکتا ہے۔ اور عدت گذار کر اسے رخصت بھی کر سکتا ہے۔ پھر آگے چل کر تیسری مرتبہ طلاق کا تذکرہ ان الفاظ سے فرمایا گیا ہے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ

ترجمہ: پھر اگر اسے تیسری مرتبہ طلاق دیدی تو وہ اس کے بعد شوہر کے لئے حلال نہیں ہوگی تا آنکہ وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے۔

یہ تو تین مرتبہ کی تین طلاقیں ہوگئیں، لیکن ان دونوں بیانوں کے درمیان خلع کا ذکر فرما دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَأْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ

ترجمہ: اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے اُنہیں دیا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی واپس لے لو بجز اس صورت کے کہ میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو اگر تمہیں (اے مسلمانوں کی جماعت!) یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو میاں بیوی پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ بیوی کچھ معاوضہ دے دے۔

ان آیاتِ کریمہ میں خلع کا بیان فرمایا گیا ہے جبکہ دو مرتبہ طلاقوں کا تذکرہ اس سے پہلے آچکا ہے اور تیسری مرتبہ طلاق کا تذکرہ خلع کے بیان کے بعد آرہا ہے۔ تو اگر خلع کو بھی طلاق تسلیم کر لیا جائے تو طلاقیں تین مرتبہ نہیں رہتیں بلکہ چار مرتبہ ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ طلاقیں تین مرتبہ ہوتی ہیں چار مرتبہ تو نہیں ہوتیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ خلع کو طلاق نہ مانا جائے۔ بلکہ فسخِ نکاح تسلیم کیا جائے۔

اختلاف کا نتیجہ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ خلع کو فسخ مانتے ہیں، طلاق نہیں مانتے ان کے نزدیک ایک مرتبہ خلع کرنے کے بعد، اگر میاں بیوی از سرِ نو نکاح

کرلیں تو اس کے بعد بھی شوہر کے لئے تین مرتبہ بیوی کو طلاق دینے کا حق باقی رہتا ہے۔ بلکہ اگر بیوی ہزار مرتبہ خلع لے لے تب بھی وہ شوہر پر حرام نہیں ہو گی اور اسے کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے اسی شوہر سے از سرِ نو نکاح کر سکتی ہے۔ جبکہ ان حضرات کے نزدیک جو خلع کو طلاق مانتے ہیں۔ ایک مرتبہ خلع لینے کے بعد اگر از سر نو نکاح کر لیا جائے تو شوہر کو صرف دو مرتبہ مزید طلاق دینے کا حق باقی رہے گا۔ اگر شوہر نے دوسری مرتبہ بیوی کو طلاق دے دی تو وہ شوہر پر مطلقاً حرام ہو جائے گی۔ تا آنکہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے طلاق حاصل نہ کرے۔ اسی طرح اگر بیوی نے تین مرتبہ خلع لے لیا ہے تو وہ بھی شوہر پر حرام ہو جائے گی تا آنکہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے بھی طلاق حاصل نہ کر لے۔

(المغنی لابن قدامہ ج ۷ ص ۵۶-۵۷)

خلع کو فسخ نہیں کہا جا سکتا

ہمارے خیال میں جمہور کا مسلک کہ خلع طلاق ہی ہے یہ فسخِ نکاح نہیں ہے زیادہ صحیح اور قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم نے نہ خلع کا نام لیا ہے نہ فسخ کا نام لیا ہے، خلع قرآن کی اصطلاح ہی نہیں ہے۔ یہ تو محض فقہ کی ایک اصطلاح ہے۔ قرآن کریم نے دو مرتبہ کی طلاقوں کا تذکرہ فرما کر یہ ہدایت فرمائی ہے کہ شوہر کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ طلاق دیتے وقت بیوی سے اس میں سے کچھ طلب کرے جو اس نے بیوی کو دے رکھا ہے۔ البتہ اگر جماعتِ

مسلمین (جن کی نمائندگی عدالت کرتی ہے) یہ سمجھے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکیں گے اور طلاق کا مطالبہ بیوی کی طرف سے ہو رہا ہو تو وہ اس کی اجازت دیدے کہ شوہر نے بیوی کو جو کچھ دے رکھا ہے۔ اس کا کچھ حصّہ شوہر کو واپس کر دے اس صورت میں شوہر اپنے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ لے سکتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ حکم کہ۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَأْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا۔

ترجمہ:۔ اور تمہارے لئے حلال نہیں کہ جو کچھ تم نے بیویوں کو دے رکھا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی واپس لے لو۔

طلاق ہی کے متعلق ہے جس کا ذکر۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ۔

ترجمہ:۔ طلاق دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔

میں اس سے پہلے آیا تھا۔ یہ یقیناً طلاق سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر یہ طلاق سے الگ کوئی چیز ہے یعنی خلع سے اس کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔ کیونکہ خلع میں تو شوہر اپنے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ لیتا ہے اور یہ جائز ہوتا ہے۔ اسے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہ حکم طلاق ہی سے متعلق ہے۔ جب یہ حکم طلاق سے متعلق ہے تو پھر اِسی حکم سے تو یہ استثناء کیا جا رہا ہے۔

اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔

ترجمہ:۔ بجز اس صورت کے کہ انہیں اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود

کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

تو جب مستثنیٰ منہ طلاق سے متعلق ہے تو مستثنیٰ کو طلاق سے الگ کوئی چوتھی چیز کیسے مانا جا سکتا ہے۔ مستثنیٰ کے لئے اصل تو یہی ہے کہ وہ مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہو۔

ابن قدامہ نے حضرت ابن عباسؓ کی جانب جو استدلال منسوب فرمایا ہے مجھے اس کی صحت میں شبہ ہے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ حضرت ابن عباسؓ اس طرح کا استدلال فرما سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

خلع کا معاوضہ اگر بیوی کی خواہش طلاق لینے کی نہ ہو بلکہ طلاق کی خواہش شوہر کی طرف سے ہو تو شوہر کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ بیوی سے اپنے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ بھی واپس لے لے۔

چنانچہ یہ جو دیکھا گیا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا، اسے مارتا پیٹتا اور تنگ کرتا ہے، نان و نفقہ کے بارہ میں تنگی برتتا ہے تاکہ وہ طلاق لینے اور معاوضہ ادا کرنے پر مجبور ہو جائے چنانچہ وہ حالات سے مجبور ہو کر اپنا مہر چھوڑ دیتی ہے یا اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیتی ہے۔ ایسی صورت میں خلع باطل ہے اور جو معاوضہ شوہر نے وصول کیا ہے وہ اسے واپس کرنا ہوگا۔ جس عدالت نے باوجود ان حالات کے خلع کا فیصلہ دیا ہے وہ غلط ہے۔ اس کے خلاف عدالت عالیہ سے اپیل کی جائے اور اس فیصلہ کو بدلوایا جائے۔ ان حالات میں جو طلاق دلوائی گئی ہے وہ صحیح ہے لیکن معاوضہ لینا غلط ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، عطاءؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ، نخعیؒ، قاسم ابن محمدؒ، عروہؒ، عمرو بن شعیبؒ،

حمید بن عبدالرحمٰن، زہری وغیرہ سے ایسا ہی منقول ہے۔ امام مالک، ثوری، قتادہ، امام شافعی اور اسحاق بن ابراہیم ابن راہویہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

البتہ امام ابوحنیفہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان حالات میں عقدِ خلع صحیح ہے اور بیوی کو معاوضہ ادا کرنا لازم ہے۔ لیکن شوہر گنہگار اور عاصی ہوگا۔

ہمارے نزدیک جمہور ائمہ کا قول صحیح اور قرآن کریم کے مطابق ہے سورۂ نساء میں ارشاد ہوا ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (۴/۲۰-۲۱)

ترجمہ:۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم نے ان میں سے کسی کو سونے کا ایک ڈھیر بھی دے رکھا ہو تو اس میں سے کوئی چیز بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کا ارتکاب کر کے لینا چاہتے ہو؟ اور تم اسے کیسے لے سکتے ہو حالانکہ تم تنہائیوں میں ایک دوسرے کے شریک رہ چکے ہو اور بیویوں نے تم سے شدید قسم کا عہد لے رکھا ہے

نیز سورۂ نساء ہی میں اس سے پچھلی آیت میں آچکا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ (۴/۱۹)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے والی وارث (یعنی شوہر) بن جاؤ۔ اور ان پر کسی قسم کی زبردستی اور سختی نہ کرو تاکہ جو کچھ تم نے اُنہیں دیا ہے اس کا کچھ حصّہ واپس لے لو۔ بجز اس صورت کے کہ بیویاں کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں۔ اور ان کے ساتھ دستور کے مطابق گزران کرو۔

خود سورۂ بقرہ میں بھی جہاں خلع کی اجازت دی گئی ہے، خلع کی اجازت سے پہلے یہ وضاحت فرمادی گئی ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط (۲/۲۲۹)

ترجمہ: اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لے لو۔ بجز اس کے کہ میاں بیوی دونوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

پھر جب معاوضہ کی اجازت دی گئی تو وہاں بھی بیوی کی اپنی مرضی اور خواہش پر مدار رکھا گیا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط (۲/۱۲۹)

ترجمہ: پھر (اے جماعت مسلمین!) اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو میاں بیوی پر کوئی مضائقہ نہیں اس مال میں جو بیوی بطور معاوضہ کے ادا کر دے۔

یہاں معاوضہ ادا کرنے کی نسبت خود بیوی کی طرف فرمائی گئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے ایسا کر رہی ہے۔

اس پر کسی قسم کا کوئی جبر یا اکراہ نہیں ہے۔ اس کی مزید تشریح سورۂ نساء کی اس آیت کریمہ سے ہو جاتی ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ؕ (۴/۴)

ترجمہ: اور عورتوں کو ان کے مہر نہایت خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔ پھر اگر وہ اپنی دلی رضامندی سے خود اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو اسے آسودہ اور خوشگوار بنا کر کھالو۔

ان تمام آیاتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ بیوی کو ایذاء پہنچا کر، اسے تنگ کرکے جو کچھ بھی وصول کیا جائے وہ شوہر کے لئے قطعاً حلال نہیں ہے۔ اسے شوہر سے واپس دلوایا جائے گا۔

البتہ اگر طلاق کا مطالبہ اگرچہ ہے تو شوہر کی طرف سے مگر یہ اس بناء پر ہے کہ بیوی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو رہی ہے اور وہ اس وجہ سے بیوی کو الگ کر دینا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں شوہر کے لئے جائز ہے کہ وہ بیوی سے مہر کا کچھ حصّہ بذریعۂ عدالت واپس لینے کے لئے زور دے کیونکہ آیت نمبر (۴/۱۹) میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ؕ (۴/۱۹)

ترجمہ: اور ان پر کسی قسم کی سختی اور زبردستی نہ کرو تاکہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس کا کچھ حصّہ واپس لے لو بجز اس صورت کے کہ بیویاں کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں۔

معاوضہ کی مقدار

خلع میں شوہر جو معاوضہ لیتا ہے وہ کتنا ہونا چاہیئے؟

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ وہ مہر کی مقدار سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ برابر بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی ہو سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ اگر نشوز (نشوز کی تشریح طلاق کے سلسلہ میں پہلے گذر چکی ہے) بیوی کی طرف سے ہو تو شوہر مہر سے زیادہ بھی معاوضہ لے سکتا ہے۔ البتہ ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہو گا۔ اور اگر نشوز شوہر کی طرف سے ہو تو شوہر کے لئے کچھ بھی معاوضہ لینا مکروہ تحریمی ہے۔ لیکن قضاءً (یعنی قانوناً) جائز تصور کیا جائے گا۔

امام احمد ابن حنبلؒ کا ارشاد یہ ہے کہ ہر صورت میں مہر مقررہ سے زیادہ معاوضہ لینا مکروہ تحریمی ہو گا۔ شوہر صرف اتنا ہی معاوضہ لے سکتا ہے جتنا اس نے بیوی کو مہر دیا ہے۔

(المیزان الکبریٰ للشعرانی صفحہ ۱۱۹ ج ۲ وہدایہ صفحہ ۴۰۴ ج ۱)

ہماری رائے

مجھے افسوس ہے کہ میں ان اقوال میں سے کسی قول سے بھی اتفاق نہیں کر سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنا کچھ شوہر نے بیوی کو مہر دیا ہے۔ اگر نشوز عورت کی طرف سے ہو تب بھی وہ اس میں سے کچھ لے سکتا ہے، پورا مہر نہیں لے سکتا۔ اور اگر نشوز مرد کی طرف سے ہو تو وہ کچھ بھی نہیں لے سکتا۔ اس کے لئے ایک پائی لینا بھی حرام ہے۔ معاوضہ کے سلسلہ میں جو آیات قرآن کریم میں آئی ہیں وہ ہم نے اوپر بیان کر دی ہیں۔ تمام آیات میں پورا مہر واپس لینے کی اجازت کسی آیت میں بھی نہیں دی گئی ہے۔ ہر آیت میں

مہر کا کچھ حصّہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ آیت نمبر (۲/۲۰) میں ہے۔

وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئًا

ترجمہ:۔ اور تم نے انہیں سونے کا ایک ڈھیر بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی نہ لو۔

پھر آیت نمبر (۲/۲۲۹) میں ہے۔

وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا

ترجمہ:۔ اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے بیویوں کو دیا ہے اس میں سے کچھ بھی واپس لیلو۔

یہاں بھی مہر میں سے کچھ واپس لینے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ اور پھر اسی سے استثناء فرمایا گیا ہے کہ۔

اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط

ترجمہ:۔ بجز اس صورت کے کہ میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔

اس سے واضح ہے کہ اگر یہ اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو شوہروں نے جو کچھ بیویوں کو مہر میں دیا ہے وہ اس میں سے کچھ واپس لے سکتے ہیں۔ آگے پھر اسی پر تفریع فرماتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط

ترجمہ:۔ تو اے جماعت مسلمین! اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی مضائقہ نہیں جو

کچھ بیوی بطور معاوضہ کے شوہر کو ادا کر دے۔

یہ تفریع خود استثناء پر ہے جس کا مستثنیٰ منہ وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْئًا تھا جس میں مہر کے کچھ حصّہ کو واپس لینے کی بات فرمائی گئی تھی تو لامحالہ فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ (جو کچھ بیوی معاوضہ میں دیدے) سے مراد بھی مہر کا کچھ حصّہ ہی ہو سکتا ہے۔ نہ پورا مہر ہو سکتا ہے نہ مہر سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ صاحبِ ہدایہ کا یہ استدلال کہ آیت میں مطلقاً معاوضہ دینے کا بیان ہے کم اور زیادہ کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی گئی ہے۔ (ہدایہ صفحہ ۴۰۴/۱۲)

ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ نیز سورۂ نساء کی آیت نمبر (۴/۴) میں۔

فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا ط

ترجمہ: پھر اگر وہ اپنی دلی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ دیں۔

کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جس سے خود مہر کے کچھ حصّہ ہی کی اجازت نکلتی ہے نہ کل مہر کی اجازت نکلتی ہے نہ مہر سے زیادہ کی۔ حتیٰ کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر (۴/۱۹) میں تو صراحت کے ساتھ فرما دیا گیا ہے۔

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ ط

ترجمہ: اور ان پر کسی قسم کی زبردستی اور سختی نہ کرو تاکہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس کا کچھ حصّہ واپس لے لو بجز اس صورت کے کہ بیویاں کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں۔

اس آیت کریمہ میں صراحت کے ساتھ شوہروں کے دیئے ہوئے

مہر میں سے صرف اس کا بعض حِصّہ واپس لینے کی بات کی جا رہی ہے اور اسی سے منع کیا جا رہا ہے اور پھر اس کے بعد استثناء کے ذریعہ سے اگر عورتیں کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں تو اسی کی اجازت دی جا رہی ہے۔ یہاں بالکل واضح ہے کہ نشوز قطعًا عورت کی طرف سے ہے کیونکہ وہی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہے لیکن پھر بھی مہر کا بعض حِصّہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔

لہٰذا ان آیات کریمہ کی واضح تصریحات کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ پورے مہر یا مہر سے بھی زیادہ معاوضہ پر خلع کر لینے کو کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

مزید ایک نکتہ ان تمام تصریحات کے بعد آیت نمبر (۴/۲۱) پر بھی غور کرنا ضروری ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا ۝ (۴/۲۱)

ترجمہ:۔ اور تم دیئے ہوئے مہر کو کیسے واپس لے سکتے ہو؟ حالانکہ تم تنہائیوں میں ایک دوسرے کے شریک رہ چکے ہو اور بیویوں نے تم سے شدید قسم کا عہد لے رکھا ہے۔

نُشُوز عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے ہو یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ دونوں میاں بیوی تنہائیوں میں ایک دوسرے کے شریک رہ چکے ہیں اور بیویوں نے اپنے شوہروں سے شدید قسم کے عہد لے رکھے ہیں۔ ان دونوں باتوں کا لازمًا یہ تقاضا ہے کہ عورتوں

کے لئے کچھ نہ کچھ ادائیگی کو ضروری قرار دیا جائے۔ اس کا تقاضا ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ نشوز کی صورت میں بھی مہر کا کچھ حصّہ ضرور اس کے لئے چھوڑا جائے۔ واللہ اعلم

(باب الظہار)

ظِہَارٌ، ظَھْرٌ سے مشتق ہے۔ ظَھْرٌ کے معنے پُشت کے ہوتے ہیں۔ عربوں میں یہ دستور تھا کہ شوہر اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے لئے اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ جیسے الفاظ بھی کہدیا کرتے تھے۔ یعنی تو میرے لئے ایسی ہی ہے جیسی میرے لئے میری ماں کی پشت۔ اسے ان کے ہاں ظِہَارٌ کہتے تھے اور اسے طلاق سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کہدینے سے بیوی شوہر کے لئے بجائے ماں ہی کے ہو جاتی ہے۔ یعنی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔ اسلام نے اسے طلاق تسلیم نہیں کیا لیکن بیوی کو ہمیشہ کے لئے نہیں البتہ اس وقت تک کے لئے حرام ہو جانا تسلیم کیا ہے۔ جب تک شوہر اپنی اس بیہودہ اور غلط بات کا کفارہ ادا نہ کر دے۔ ظِہَارٌ اگرچہ ظَھْرٌ سے مشتق ہے جس کے معنے پشت کے ہوتے ہیں لیکن پشت کا لفظ استعمال کرنا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ماں کا لفظ بھی استعمال کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بیوی کو کسی محرم عزیزہ کے ایسے حصّۂ جسم سے تشبیہ دینا جس کی طرف دیکھنا جائز نہ ہو، مثلاً پیٹ، ران اور شرمگاہ۔ یہ سب ظہار ہی کہلاتا ہے۔

محرم ان رشتہ داروں کو کہتے ہیں جن سے اس کا نکاح کرنا حرام

ہے۔ مثلاً۔

بہن، خالہ، پھوپھی، بیٹی، بھانجی، بھتیجی، دادی اور نانی وغیرہ نیز ساس اور رضاعی ماں بہن وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔

سورۂ احزاب میں ہے۔

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ

(۳۳/۴)

ترجمہ:۔ اللہ نے تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر لیتے ہو تمہاری مائیں نہیں بنا دیا اور نہ ہی تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا بنا دیا ہے۔ یہ محض تمہاری اپنے منہ سے نکالی ہوئی باتیں ہیں (جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔

اس آیتِ کریمہ سے اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے جو عربوں میں رواج پذیر تھا کہ ظہار کر لینے سے بیوی ماں کی طرح ہو جاتی یعنی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔ سورۂ مجادلہ میں پھر اس امر کا اعادہ فرما دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۭ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰۗـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝

(۵۸/۲)

ترجمہ:۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر لیتے ہیں، وہ بیویاں ان کی مائیں نہیں بن جاتیں۔ انکی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا ہے۔ اور بلا شبہ وہ لوگ انتہائی ناپسندیدہ اور جھوٹی بات منہ سے نکال دیتے ہیں

اور یقیناً اللہ معاف فرما دینے والا اور بخشنے والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں عربوں کے اس مروجہ خیال کی تردید کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگرچہ ایسا کہہ دینے سے وہ مائیں نہیں بن جاتیں اور نہ وہ ماؤں کی طرح ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہیں، لیکن یہ بات ہے انتہائی شرمناک، بیہودہ، ناپسندیدہ اور غلط۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایسا کہنے سے بالکلیہ احتراز لازم ہے۔ اس کے بعد اگلی دو آیتوں میں اس کا حکم بتایا جا رہا ہے۔

کفارۂ ظہار

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ۚ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۵۸/۳-۴)

ترجمہ: اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر لیتے ہیں پھر جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس سے پھرتے ہیں تو اس سے پہلے کہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ایک غلام یا کنیز کو آزاد کرنا ضروری ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جاتی ہے۔ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ پھر جو شخص ایک غلام یا کنیز نہ پا سکے تو اس کو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنے ہیں اس سے پہلے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ پھر جو شخص اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو اسے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا لازم ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو، اور یہ اللہ

کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ اور انکار (کفر) کرنے والوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

بہر حال شوہر کو اپنی کہی ہوئی غلط اور شرمناک بات کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ جبتک وہ کفارہ ادا نہ کردے اسے بیوی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے۔ کفارہ ادا کرنے سے پہلے تک وہ واقعی اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔ کفارہ ادا کرنے سے پہلے نہ وہ اس سے جنسی اختلاط کرسکتا ہے۔ نہ اسے شہوت کے ساتھ چھو سکتا ہے نہ اس سے بوس و کنار کرسکتا ہے نہ اس کے پوشیدہ اعضا کو شہوت کے ساتھ دیکھ سکتا ہے کیونکہ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا کا لفظ ان تمام امور پر حاوی ہے۔ کیونکہ اس کے معنے چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں۔

ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا فقہاء و مفسرین اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں کہ آیت ظہار میں ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا کا مطلب کیا ہے۔

اصحاب الظاہر اور ابو العالیہ کا خیال تو یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا وہ دوبارہ بھی اسی بات کو دہراتے ہیں ان حضرات کے نزدیک ایک مرتبہ اگر کسی نے یہ نازیبا اور جھوٹی بات منہ سے نکال دی تو پہلی مرتبہ تو معاف ہے۔ لیکن دوسری مرتبہ اسے کفارہ دینا ہوگا۔ ہمارے دور کے ایک بزرگ عالم مولانا تمنا عمادی مرحوم نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

لیکن طاؤس نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا کے معنے یہ ہیں کہ ظہار کرنے کے بعد جو کچھ کہا تھا اس سے پلٹ جاتے

ہیں اور بیوی سے مقاربت کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ابن عباسؓ، طاؤسؒ، قتادہؒ، اور زہریؒ نے کہا کہ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ظہار کرنے سے جو بیوی حرام ہو گئی تھی اب اس کو حلال کرنا چاہتے ہیں۔ لیث ابن سعدؒ اور سفیان ثوریؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ظہار کرنے کے بعد اگر شوہر نے طے کر لیا ہے کہ وہ بیوی کو جدا نہیں کرے گا اور اس سے مقاربت کرے گا تو اس پر کفارہ واجب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہہ چکا تھا اس سے پھرتا ہے اور اس کے خلاف فیصلہ کر لیتا ہے۔ لیکن اگر شوہر نے طے کر لیا ہے کہ وہ اسے طلاق دے کر الگ کر دے گا اور اس سے کبھی مقاربت نہیں کرے گا۔ یعنی اپنی بات پر قائم ہے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ حسن بصریؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ظہار کرنے کے بعد شوہر کو چاہیئے تھا کہ وہ طلاق دے کر بیوی کو جدا کر دیتا۔ لیکن اگر اس نے اتنے عرصہ تک طلاق نہیں دی جس میں وہ طلاق دے سکتا تھا تو اس پر کفارہ واجب ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے عمل سے اس کا ثبوت بہم پہنچا دیا کہ وہ اپنے ارادہ پر قائم نہیں رہا۔ لہٰذا وہ اپنی بات سے پھر رہا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے فقہائے حنفیہ فرماتے ہیں کہ ظہار کرنے سے نکاح نہیں ٹوٹتا۔ البتہ بیوی سے مقاربت حرام ہو جاتی ہے۔ اگر ظہار کرنے کے بعد شوہر اس مقاربت کو جائز کر لینا چاہتا ہے تو اس پر کفارہ واجب ہے کیونکہ وہ اپنی بات سے پھرتا ہے اور بیوی کو حلال کر لینا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ حلال کرنا نہیں چاہتا اور اسے طلاق دے کر الگ

کر دینا چاہتا ہے تو اس پر کفارہ واجب نہیں ہے۔

عثمان بتی نے کہا ہے کہ اگر کسی نے بیوی سے ظہار کیا۔ پھر بیوی سے مقاربت بھی نہیں کی اور اسے طلاق دے کر اپنے سے جدا کر دیا۔ تو اس پر کفارہ واجب ہے وہ طلاق سے رجوع کرے یا نہ کرے۔ کفارہ ان الفاظ کا ہے جو اس نے اپنے منہ سے نکال دیئے تھے۔ اس ساری تفصیل سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ ابن عباسؓ، طاؤسؒ، قتادہؒ، زہریؒ، لیث ابن سعدؒ، سفیانؒ ثوری، امام مالکؒ، حسن بصریؒ، امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ کے اقوال تھوڑے تھوڑے فرق سے، شوہر کے عزم، ارادہ اور فیصلہ پر مدار رکھ رہے ہیں کہ چونکہ وہ اپنے قول سے پھر جانا چاہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ کفارہ ادا کرے۔

(ان تفصیلات کے لئے دیکھئے احکام القرآن لابی بکر الجصاص الرازیؒ ص ۵۱۴-۵۱۷ ج ۳ و احکام القرآن لشیخ الاسلام مولانا ظفر احمد العثمانی ص ۱۱ ج آخر)

طاؤس کے والد مقاربت کرنے پر یعنی ظہار شکنی پر مدار رکھتے ہیں۔ عثمانؒ بتی محض ظہار کے الفاظ منہ سے نکالنے پر مدار رکھ رہے ہیں اور اصحاب الظاہر اور ابو العالیہ ظہار کے الفاظ دوسری مرتبہ ادا کرنے پر مدار رکھ رہے ہیں۔

لیکن ان میں سے کوئی قول بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کے خلاف کسی طرح کا کوئی اشکال نہ ہو۔ جمہور کے قول پر تو یہ اشکال ہے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ محض ارادہ، عزم اور فیصلہ پر کفارہ واجب کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اسلام کے مسلمہ اصولوں میں سے یہ بات ہے کہ محض

ارادہ، عزم اور فیصلہ کرنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا نہ اس کا کوئی اعتبار ہے جب تک آدمی اِس ارادہ، عزم اور فیصلہ کو عملی جامہ نہ پہنادے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَفَا لِاُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ اَنْفُسُهَا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوْا بِهٖ اَوْ يَعْمَلُوْا بِهٖ۔

ترجمہ: یقیناً خدا نے میری امت کے لئے وہ تمام باتیں معاف کردی ہیں جو ان کے دلوں میں پرورش پاتی رہتی ہیں جب تک وہ انہیں منہ سے نہ نکال دیں یا ان پر عمل نہ کرلیں۔

لہٰذا ارادہ اور عزم پر کفارہ کا واجب ہو جانا اسلام کے مسلمات کے خلاف ہے۔ رہ گیا طاؤس کے والد کا ارشاد کہ مقاربت کرلینے اور ظہار شکنی کی وجہ سے کفارہ واجب ہوتا ہے تو وہ بھی قرآن کی صراحت کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے تو کفارہ کی ادائیگی مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا (ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے) ضروری قرار دی ہے۔ لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مقاربت یعنی ظہار شکنی کی وجہ سے کفارہ دینا ہوتا ہے۔ عثمان بتیؒ کا یہ ارشاد کہ ظہار کے الفاظ منہ سے نکال دینے ہی کی وجہ سے کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ شوہر اگر بیوی کو طلاق دے کر الگ کردے، اس کے بعد رجوع کرے یا نہ کرے، اسے ہر حال میں کفارہ دینا ہوگا، یہ قول بھی اشکال سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (پھر وہ جو کچھ کہا تھا اس سے پھر جاتے ہیں) کا مطلب کیا ہوگا اور اس کی ضرورت کیا رہتی ہے۔ یہ پورا جملہ بالکل بے فائدہ اور بیکار ہو جاتا ہے۔ اس قول پر تو۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا۔

ترجمہ:۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام یا کنیز کو آزاد کریں۔

کافی تھا اور اس سے مقصد پورا ہو جاتا تھا۔ اس کے درمیان میں ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (پھر وہ جو کچھ کہا تھا اس سے پھر جاتے ہیں) کا فقرہ لانے کی کیا ضرورت تھی؟

رہ گیا ابو العالیہ اور اصحاب الظاہر کا یہ ارشاد کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ تو ظہار کے الفاظ اگر منہ سے نکل جائیں تو معاف ہیں لیکن اگر دوسری مرتبہ پھر کسی نے یہ الفاظ دہرائے تو کفارہ دینا ہوگا سب سے زیادہ عجیب ہے۔ کیونکہ پورے اسلامی قوانین میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی گناہ کی بات (مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا یعنی ناروا اور نامناسب بات، ساتھ ہی جھوٹی بات) پہلی مرتبہ تو معاف ہے لیکن اگر اسے دوسری مرتبہ زبان سے نکالا جائے تو قابل مؤاخذہ ہے ہر گناہ کی بات پہلی مرتبہ بھی گناہ کی بات ہے اور دوسری مرتبہ بھی گناہ کی بات ہے۔ اگر کوئی بات دوسری مرتبہ قابلِ مؤاخذہ ہے تو پہلی مرتبہ بھی قابل مؤاخذہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت کریمہ مشکلات القرآن میں سے ہے۔ بہرحال غور و فکر کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (پھر انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس سے پھر جاتے ہیں) کا مطلب وہی صحیح ہے جو جمہور نے قرار دیا ہے۔ لیکن کفارہ عزم، ارادہ

اور ظہار کے خلاف فیصلہ کا نہیں ہے۔ بلکہ دراصل ظہار کے الفاظ جنہیں قرآن نے مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا (نازیبا اور جھوٹی بات) فرمایا ہے منہ سے نکال دینے کی وجہ سے عائد ہوتا ہے۔ صورت یہ ہے کہ شوہر نے جب ظہار کے الفاظ ادا کیئے تو بیوی اگرچہ نکاح سے الگ نہیں ہوئی لیکن وہ حرام ہوگئی۔ بیوی ہونے کے باوجود اسے ہاتھ لگانا جائز نہیں رہا۔ مقاربت کے لئے وہ ایک ایسی عورت ہوگئی جیسے ایک غیر عورت ہوتی ہے۔ جس طرح ایک اجنبی عورت سے آپ کے لئے مقاربت جائز نہیں ایسے ہی اس سے بھی مقاربت جائز نہیں رہی۔ اگر آپ اجنبی عورت سے جنسی تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں تو شریعت نے اس کا یہ طریقہ رکھا ہے کہ آپ دو گواہوں کے سامنے اس سے نکاح (ایجاب وقبول) کریں اور اس کے لئے مہر مقرر کریں تو اس سے مقاربت کرنا آپ کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ظہار کردہ بیوی سے اگر آپ جنسی تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں تو اب اس کا طریقہ شریعت نے یہ مقرر کر دیا ہے کہ آپ کفارہ ادا کریں۔ تو اس کے بعد یہ حرمت ختم ہو جائے گی۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے دیگر اعمال میں اصل عمل سے پہلے آپ کو کچھ چیزیں لازماً کرنی پڑتی ہیں جیسے نماز کے لئے وضو، اور حدث اکبر میں غسل، حج کے لئے احرام، روزہ کے لئے سحر کے وقت یا رات سے نیت، قرأتِ قرآن سے پہلے وضو اور اعوذ باللہ پڑھنا۔ (اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ یعنی جب قرآن کی تلاوت کرو تو اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھو) جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد کی طرف لپکنا (اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ

یعنی جب جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کا ذکر یعنی نماز کے لئے لپکو) جس طرح دیگر بہت سے اعمال سے پہلے وہ امور بجالانے پڑتے ہیں جو شریعت نے اس کے لئے مقرر کر دئیے ہیں ایسے ہی ظہار کے بعد جو حرمت طاری ہو گئی ہے اِسے رفع کرنے کے لئے بھی شریعت نے ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے۔

بہر حال مسئلہ کی اصل صورت یہ ہے اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کفارہ مقاربت اور ظہار شکنی کا ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شوہر چونکہ حرمت کو اباحت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ طے کر چکا ہے اس لئے اس پر کفارہ واجب ہو رہا ہے۔ اِسے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ شوہر نے نازیبا اور جھوٹی بات یعنی ظہار کے الفاظ منہ سے نکال دیئے تھے اس کی وجہ سے کفارہ واجب ہو رہا ہے تعبیرات میں اختلاف ہو رہا ہے مگر حقیقت سب کے نزدیک ایک ہی ہے۔

اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ۔

"تو میرے لئے میری ماں یا میری بہن کی طرح ہے"

تو شوہر سے پوچھا جائے گا کہ اس قول سے اس کا کیا مقصد تھا۔ اگر ظہار کی نیت تھی تو ظہار مانا جائے گا۔ اور اگر محض بیوی کا اعزاز و احترام یا عزت و محبت مقصود تھی۔ یعنی میں تیرا ایسا ہی ادب و احترام کرتا ہوں جیسا کہ اپنی ماں کا کرتا ہوں، تو ظہار تسلیم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر اس کی نیت طلاق دینے کی تھی۔ تو اگر اس نے اس سے پہلے طلاق کے تینوں مرحلے پورے کر لئے تھے تو طلاق ہو جائے گی۔ اور اگر کچھ بھی نیت نہیں تھی تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔

کفارہ کے مسائل

ظہار کے کفارہ کے سلسلہ میں جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ سب سے مقدم ایک غلام یا ایک کنیز کو آزاد کر دینا ہے۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں۔

تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ

ترجمہ:۔ ایک گردن کو آزاد کر دینا۔

کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ لہٰذا غلام یا کنیز، اس میں دونوں شامل ہیں۔ ہمارے فقہاء نے اس سلسلہ میں بہت سے مسائل بیان کئے ہیں۔ لیکن آجکل نہ غلام اور کنیزیں موجود ہیں نہ ان کو آزاد کرنا ممکن ہے۔ اس لئے ہم ان مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے باقی دو کفارہ کو بیان کرتے ہیں۔ اگر غلام اور باندی میسر نہ ہوں تو دوسرا کفارہ یہ ہے کہ شوہر دو ماہ کے مسلسل اور لگاتار روزے رکھے۔ یہ روزے بھی بیوی سے جنسی اعمال اور جنسی دواعی پیش آنے سے پہلے پہلے رکھنے ہوں گے۔ جبتک شوہر دو ماہ کے لگاتار روزے نہ رکھ لے بیوی اس کے لئے حلال نہیں ہو گی۔

اگر کسی عذر کی وجہ سے روزوں کے تسلسل میں خلل پڑ گیا ہے تو جتنے روزے رکھ چکا ہے وہ محسوب نہیں ہوں گے۔ اب پھر از سرِ نو دو ماہ کے مسلسل روزے شروع کرنا ہوں گے۔ اگر آدمی کو دو ماہ تک مسلسل روزے رکھنے کی قدرت و قوت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا چاہیئے۔ مسکینوں کو کھانا شکم سیر کر کے کھلانا ہو گا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک ہی مسکین کو ساٹھ روز تک کھانا کھلا دیا جائے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ساٹھ آدمیوں کو پونے دو سیر گیہوں یا

ان کی قیمت دیدی جائے۔ اگر گیہوں میسر نہ ہوں تو ساڑھے تین سیر جَو، جوار، چنا وغیرہ یا ان کی قیمت دیدی جائے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی مسکین کو ساٹھ روز تک روزانہ کے حساب سے پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جَو وغیرہ دے دیا کرے۔ لیکن ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن کا غلہ یا اس کی قیمت یکمشت ایک دن میں دید ینے کو ہمارے فقہاء نے جائز نہیں رکھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے ایک ہی دن میں ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن کا غلہ یکمشت دے دیا ہے تو وہ صرف ایک دن کا غلہ شمار ہوگا۔ اس کے بعد انسٹھ دن کا غلہ بعد میں دینا ہوگا۔ (ہدایہ ص ۴۱۳-۴۱۶)

جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ایک ہی دن میں ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن کا غلہ یا اس کی قیمت یکمشت دید ینا ظاہر قرآن یعنی۔ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا کے خلاف ضرور ہے۔ غالباً فقہاء نے اسی طرف توجہ فرمائی ہے۔

(بابُ اللعَان)

لِعَانٌ، لَعْنٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں، کسی کو ناراضگی کی وجہ سے اپنے سے دُور کر دینا۔ خدا کی طرف سے لعنت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے محروم اور دور ہوگیا۔

اصطلاح فقہ میں لِعَانٌ اسے کہتے ہیں کہ شوہر اور بیوی تہمت کے سلسلہ میں عدالت میں پانچ شہادتیں پیش کریں۔ چار شہادتوں میں شوہر خدا کو گواہ بنا کر کہے کہ میں نے اپنی بیوی پر جو تہمت لگائی ہے میں اس میں سچا ہوں اور پانچویں شہادت میں کہے کہ میں نے اپنی

بیوی پر جوزنا کی تہمت لگائی ہے اگر میں اس میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔ اسی طرح بیوی بھی پانچ شہادتیں دے کہ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میرے شوہر نے جو مجھ پر تہمت لگائی ہے وہ اس میں جھوٹا ہے اور پانچویں شہادت میں کہے کہ میرے شوہر نے مجھ پر جو زنا کی تہمت لگائی ہے اگر وہ اس میں سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔ میاں اور بیوی کی یہ پانچوں شہادتیں ہو جانے کے بعد عدالت ان کے نکاح کو فسخ کر دے گی اور یہ طلاق بائنہ شمار ہو گی۔

جیسا کہ معلوم ہے جنسی جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر انسان خواہ مرد ہو یا عورت اپنے اس جذبہ کی تسکین چاہتا ہے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر عہد میں انسانوں کے اجتماعی نظامات نے اس جذبہ کی تسکین کے لئے جائز اور قانونی شکلیں وضع کر رکھی ہیں۔ معاشرہ کا امن و امان اور سکون و اطمینان اس امر کا متقاضی ہے کہ معاشرہ کے افراد جائز اور قانونی طریقوں ہی سے اس جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچائیں۔ نسب کی درستگی، اولاد کی مصالح اور خیر و خوبی اسی پر منحصر ہے۔ آج تک دنیا کے کسی معاشرہ نے جنسی بے راہ روی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ دنیا کا کوئی معاشرہ کسی وقت بھی اس متفقہ لعنت سے بالکلیہ پاک رہا ہو۔ کسی معاشرہ میں کم کسی میں زیادہ اس کا وجود نا مسعود کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا رہا ہے۔

اسلام نے اپنے معاشرہ کو اس لعنت سے پاک و صاف رکھنے کی زبردست کوشش کی ہے اور وہ اپنے اس مقصد میں اگر سو فیصد نہیں

تو بہت بڑی حد تک کامیاب بھی رہا ہے۔ اس نے غیر قانونی اور ناجائز طریقہ پر اس جذبہ کی تسکین کرنے کو زِنَا کا نام دیا ہے اور اس کے لئے سخت سزا مقرر کی ہے۔ جس سے بڑی حد تک اس کا سدِّباب بھی ہوا ہے لیکن اس کی سزا جس قدر سخت مقرر کی گئی ہے اس کا اثبات بھی اسی قدر مشکل بنا دیا گیا ہے تاکہ لوگ اِس سخت سزا کو دوسرے ناجائز مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہ بنا سکیں۔ ایسا کرنا انتہائی ضروری تھا کیونکہ حضرتِ انسان ہر بہتر سے بہتر قانون کو اپنے مذموم مقاصد کا آلۂ کار بنانے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی رنجشوں اور عداوتوں کا سامانِ تسکین بھی اس میں تلاش کر سکتے تھے۔

(زنا کی سزا پر تفصیلی بحث کتاب الحدود میں آئے گی)

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ بعض لوگ اپنے خبثِ باطن کی وجہ سے پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت بھی لگانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ قانون نافذ کیا گیا کہ وہ چار عینی شاہد پیش کریں کہ انہوں نے فلاں عورت کو فلاں مرد کے ساتھ اپنی آنکھوں سے مصروفِ اختلاط دیکھا ہے۔ اگر وہ چار ایسی شہادتیں پیش کر دیں تو عورت اور مرد پر زنا کی حد جاری کر دی جائے گی اور اگر وہ چار عینی شاہد پیش نہ کر سکیں تو اسے قَذَف یعنی بیجا تہمت تصور کیا جائے گا۔ اور تہمت لگانے والے شخص کو قذف کی حد یعنی اَسّی کوڑے مارے جائیں گے۔

(حدِّ قذف کا بیان بھی ہم کتاب الحدود میں کریں گے)

اسی سِلسلہ کی ایک کڑی لِعَان بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے

بتایا ہے کہ زِنا کو دنیا کے کسی معاشرہ نے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ صرف مانویت کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے زنا کو حلال کر دیا تھا۔ لیکن مانویت کے خود بانی کا جو حسرتناک انجام ہوا تھا وہ بھی تاریخ کا ایک باب ہے۔

لہٰذا زنا کے سلسلہ میں چار عینی شاہدوں کو پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ کیونکہ یہ متفقہ جرم کھلم کھلا نہیں کیا جا سکتا بلکہ جب بھی کیا جاتا ہے ہزار احتیاطوں کے ساتھ چھپ چھپا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اسلامی معاشرہ میں جہاں زنا کی سزا بھی انتہائی شدید رکھی گئی ہے۔ شوہر اگر اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ مصروفِ اختلاط پائے تو یا تو وہ اس پر چار شہادتیں پیش کرے یا حدّ قذف کی سزا بھگتنے پر راضی ہو۔ یہ صورتِ حال مشکل بھی تھی اور ناقابلِ عمل بھی۔ شوہر اتنے چار آدمیوں کو بلا کر اُنہیں شاہد بنائے اتنے عرصہ میں تو بیوی اور اس کا آشنا ایک دوسرے سے الگ ہو چکے ہوں گے۔ اگر وہ چار گواہ نہ بنا سکے تو یا تو خاموشی سے اس صورتِ حالات کو برداشت کرتا رہے اور کوئی لب کشائی نہ کرے ورنہ اَسیّ کوڑوں کی سزا کو قبول کرے۔ دونوں صورتوں میں میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو نکاح کا مقصدِ اعلیٰ ہے گھر ہمیشہ نمونۂ جہنم بنا رہے گا۔ اور دونوں ایک دوسرے کو ہمیشہ نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے رہیں گے۔ لِعان اسی ناگوار صورتِ حالات کا مداوا ہے۔

چنانچہ سورۂ النور میں فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۴/۶-۹)

ترجمہ: اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور سوائے ان کی اپنی ذات کے ان کے لئے کوئی گواہ موجود نہیں ہیں تو ان میں سے ایک (یعنی شوہر) چار شہادتیں یہ دے کہ بخدا (وہ اپنی زنا کی تہمت میں) بالکل سچا ہے اور پانچویں شہادت یہ دے کہ اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ (اپنی زنا کی تہمت میں) جھوٹا ہو۔ اور بیوی سے بھی سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ بھی چار شہادتیں یہ دے کہ بخدا وہ (اپنی زنا کی تہمت میں) جھوٹا ہے اور پانچویں شہادت یہ دے کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہو اگر وہ (اپنی زنا کی تہمت میں) سچا ہو۔

زوجین قابل شہادت ہوں لعان کے لئے یہ ضروری ہے کہ میاں بیوی دونوں شہادت کے اہل ہوں۔ اگر دونوں میں سے کوئی فاسق و فاجر ہے یا اس پر تہمت کی حد لگائی جا چکی ہے تو ایسی صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لعان نہیں ہو سکتا ـــــ اگر شوہر نا قابل شہادت ہے (وہ فاسق ہے یا اس پر قذف کی حد جاری کی جا چکی ہے) تو وہ لعان کرنے کا اہل نہیں۔ اس پر دوبارہ قذف کی حد لگا دی جائے۔ نیز

اگر شوہر تو شہادت کا اہل ہے لیکن بیوی شہادت کی اہل نہیں ہے (وہ فاسق ہے یا اس پر قذف کی حد جاری ہو چکی ہے) تو بیوی لعان نہیں کر سکتی۔ شوہر نے اس پر تہمت لگائی ہے تو اس پر زنا کی حد جاری کر دی جائے۔

اس کے بر عکس امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا مذہب یہ نقل کیا گیا ہے کہ لعان شہادتیں نہیں ہیں بلکہ وہ پانچ قسموں کا نام ہے۔ لہٰذا شوہر اگر طلاق دینے کا اہل ہے تو وہ لعان بھی کر سکتا ہے۔ ایسے ہی عورت اگر حلف اُٹھانے کی اہل ہے تو وہ لعان بھی کر سکتی ہے۔ (المیزان الکبریٰ للشعرانی ص ۱۲۷ ج ۲)

امام ابو حنیفہؒ قرآن کریم کے الفاظ سے استدلال فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے ان قسموں کو شہادت ہی فرمایا ہے (فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ) لہٰذا ان پر شہادت ہی کے احکام نافذ ہوں گے۔

ہمارے نزدیک امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا مذہب زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ لعان کی قسمیں اس معنے میں شہادت ہیں کہ مدعی اپنے دعوے کی صداقت پر خدا کو گواہ بنا رہا ہے۔ ایسے ہی مدعی علیہا (بیوی) بھی شوہر کے کذب پر خدا کو گواہ بنا رہی ہے (قسم کی حقیقت یہی ہوتی ہے) لہٰذا یہ لفظاً تو واقعی شہادت ہیں مگر حقیقۃً اصطلاحی شہادت نہیں ہیں۔ لہٰذا ان پر اصطلاحی شہادت کے احکام نافذ نہیں کئے جا سکتے۔ یہ دونوں میاں بیوی لعان کے اہل ہیں اور انہیں لعان کرنا چاہیئے۔

بچہ کا انکار اگر شوہر نومولود بچہ کے متعلق کہدے کہ یہ بچہ زنا سے پیدا ہوا ہے یا یہ کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے تو یہ بھی تہمت شمار ہوگی اور بیوی کے مطالبہ پر شوہر سے کہا جائے گا کہ وہ لعان کرے ورنہ قذف کی حد کو قبول کرے۔ تمام ائمہ اس پر متفق ہیں اور یہ قرآن کریم کے مطابق ہے۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں تہمت کے ہی زمرہ میں آتی ہیں۔

لعان سے انکار اگر شوہر لعان کرنے سے انکار کردے تو امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ اس پر محض اس کے انکار سے قذف کی حد جاری کر دی جائے گی۔

لیکن امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ محض لعان سے انکار کافی نہیں ہے۔ بلکہ قذف کا اقرار ضروری ہے۔ اگر شوہر لعان سے انکار کرتا ہے تو اسے قید کر دیا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ یا تو وہ لعان کرے ورنہ قذف کا اقرار کرے۔ جب وہ تہمت کا اقرار کرے تو اس پر قذف کی حد لگا دی جائے۔

اسی طرح بیوی اگر لعان کرنے سے انکار کر دے تو امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عورت کا محض لعان سے انکار کر دینا ہی اس پر زنا کی حد جاری کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کے انکار کر دینے پر اس پر زنا کی حد جاری کر دی جائے۔

لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا مشہور مذہب یہی ہے کہ صرف انکار کر دینا کافی نہیں ہے۔ اگر عورت لعان سے انکار

کر دے تو اسے قید کر دیا جائے تا آنکہ وہ لعان کرنے پر تیار ہو جائے ورنہ زنا کا اقرار کرے۔ اگر زنا کا اقرار کرے تو اس پر زنا کی حد جاری کر دی جائے۔

کیا لِعان تفریق ہے؟

فقہاء کرام نے اس مسئلہ میں مختلف رائیں ظاہر فرمائی ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کے لعان کر لینے سے جدائی واقع نہیں ہوتی بلکہ حاکم کی تفریق کے بعد جدائی واقع ہوگی۔ اور حاکم نے تفریق نہیں کی ہے تو محض لِعان کر لینے سے نکاح ختم نہیں ہو جاتا۔

امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ خصوصیّت کے ساتھ عورت کے لِعان کر لینے سے حاکم کی تفریق کے ساتھ جدائی واقع ہو جاتی ہے۔

امام شافعیؒ کا خیال یہ ہے کہ جدائی صرف شوہر کے لِعان کر لینے ہی سے واقع ہو جاتی ہے۔

(المیزان الکبریٰ ص ۱۲۷ ج ۲، نیز رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ ص ۶۷ ج ۲)

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، قرآن کریم نے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی کہ لِعان سے تفریق ہوگی یا نہیں ہوگی، اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ شوہر نے جو تہمت لگائی ہے۔ اس تہمت کی سزا سے بچنے کے لئے یا تو وہ چار شاہد پیش کر کے اپنی تہمت کو ثابت کر لے اگر چار شاہد پیش نہ کئے جا سکیں تو وہ لعان کرے اور اگر وہ لعان بھی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اسے قذف کی حد قبول کرنی ہوگی۔ اسی طرح بیوی

یا تو زنا کا اقرار کرے اور زنا کی حد قبول کرے ورنہ لعان کر کے اس سزا سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ لیکن لعان کر لینے کے بعد ان میاں بیوی کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ آیا وہ میاں بیوی کی طرح حسبِ سابق رہتے رہیں گے یا ان میں جدائی واقع ہو جائے گی؟ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں کوئی واضح فیصلہ نہیں دیا ہے۔ فقہاء کرام نے اس ضمن میں سنت سے استنباط فرمایا ہے۔ تاہم یہ فیصلہ تمام فقہاء کا متفقہ ہے کہ لعان کے بعد تفریق ضروری ہے۔ اگرچہ وہ اس میں مختلف رائیں رکھتے ہیں کہ یہ تفریق صرف لعان ہی سے ہو جاتی ہے یا عدالت کی تفریق کے بعد ہوتی ہے۔

اتنی بات ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے نکاح کے جو مقاصد بتائے ہیں وہ لعان کے بعد حاصل نہیں ہو سکتے اس لئے دونوں میاں بیوی میں تفریق ہو جانا ضروری ہے۔ اب یہ تفریق خود لعان کر لینے سے واقع ہو جاتی ہے۔ یا عدالت کے تفریق کر دینے سے تفریق ہونی چاہیئے۔ اس میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔

ہمارے نزدیک عدالت سے تفریق ضروری ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ہم طلاق کے سلسلہ میں بھی بتا چکے ہیں کہ عدالت سے طلاق کی اجازت لینا ضروری ہے۔ لہٰذا لعان میں بھی عدالت ہی سے تفریق ہونی چاہیئے۔

لعان طلاق ہے یا فسخ؟

لعان سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نکاح فسخ ہو جاتا ہے؟ اس میں بھی ائمہ کرام نے اختلاف فرمایا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ لعان سے ایک طلاق بائنہ واقع

ہو جاتی ہے۔

لیکن امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ لعان سے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور یہ فسخ ابدی ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں آپس میں نکاح نہیں کر سکتے حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، عطاءؒ، زہریؒ، ثوریؒ اور اوزاعیؒ کا قول بھی یہی نقل کیا جاتا ہے۔

سعید ابن جبیرؒ کا قول یہ ہے کہ لعان کی وجہ سے بیوی سے استمتاع حرام ہو جاتا ہے۔ لیکن جب شوہر اپنے آپ کو جھٹلا دے تو حرمت مرتفع ہو جائے گی اور اگر بیوی عدت میں ہے تو وہ اس کی بیوی علیٰ حالہا باقی رہے گی رجوع کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

(المیزان الکبریٰ صہ ۱۲۷ ج ۲)

جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر شوہر بعد میں لعان سے رجوع کرے اور اقرار کرے کہ اس نے لعان میں جھوٹی قسمیں کھائی تھیں تو اگرچہ اس پر قذف کی حد جاری کرنی ہو گی لیکن وہ اس کے بعد اس بیوی سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ عدت میں ہے تو اس سے رجوع کر سکتا ہے۔ (رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ صہ ۶۷ ج ۲)

ہمارے نزدیک ائمہ ثلاثہ اور دیگر صحابہ و تابعین کا قول قابلِ فہم ہے کیونکہ جو تفریق عدالت سے ہو اسے طلاق کہنا قابل فہم نہیں ہے اسے فسخ ہی کہنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

بچہ کا نسب لعان کے بعد جو بچہ پیدا ہوا اس کا نسب لعان کرنے والے مرد سے ثابت نہیں ہو گا بلکہ وہ اپنی

ماں کی طرف منسوب ہو گا۔ قرآن کریم نے اگرچہ لعان کے ضمن میں اس امر کی تصریح نہیں فرمائی ہے۔ لیکن لِعان کرنے کا نتیجہ بہرحال یہی ہونا چاہیئے کہ اس بچہ کو لعان کرنے والے مرد کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ کیونکہ شوہر کی تہمت یہی تو تھی کہ اس کی بیوی نے زنا کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو بچہ پیدا ہو گا وہ اس کا نہیں ہو گا۔ لِعان کے بعد قرآن کریم نے اسے تہمت کی سزا سے بری کر دیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ قرآن کریم نے اس کی تہمت کو اس کی حد تک تسلیم فرما لیا ہے۔

متعین مرد کے ساتھ تہمت

اگر شوہر نے اپنی بیوی پر کسی خاص شخص کا نام لے کر تہمت لگائی ہے کہ تجھ سے فلاں آدمی نے زنا کیا ہے یا تجھے جو حمل ہے وہ میرا نہیں ہے بلکہ فلاں آدمی کا ہے تو جہاں تک عورت پر تہمت لگانے کا تعلق ہے اس کی حد تو لعان کر لینے سے ساقط ہو جائے گی لیکن جس آدمی کا نام لے کر تہمت لگائی گئی ہے وہ شخص اگر قذف کی حد کا مطالبہ کرے تو لعان کر لینے سے اس شخص کے متعلق تہمت کی حد ساقط نہیں ہو گی۔ اس سلسلہ میں شوہر پر قذف کی حد جاری کی جائے گی۔ امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہی ہے۔

امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ بیوی اور اس کے متعین آشنا کے متعلق تہمت لگانے سے ایک ہی حدِ قذف لازم ہوتی ہے۔ اور چونکہ لِعان کر لینے کی وجہ سے قذف کی حد ساقط ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ متعین آدمی اپنے پر تہمت لگانے کی وجہ سے حدِ قذف کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ امام شافعیؒ کا راجح قول امام احمد ابن حنبلؒ کے قول کے مطابق

ہے لیکن امام شافعیؒ کی دوسری روایت امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے مطابق بھی نقل کی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا قول راجح ہے کیونکہ اگرچہ تہمت کا واقعہ ایک ہے لیکن تہمتیں اس معنے میں الگ الگ اور دو ہیں کہ اس سے دو آدمیوں کی نیکنامی داغدار ہو رہی ہے۔ تہمت لگانے والا شوہر اپنی تہمت کو ثابت نہیں کر سکا۔ جہاں تک بیوی کی نیکنامی کے داغدار ہونے کا تعلق تھا وہ تو بیوی سے لعان کر لینے پر اس کے حق میں ہلکی ہو جاتی ہے لیکن اس شخص متعین کی نیکنامی تو علیٰ حالہ داغدار رہ جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا حق عورت کے لعان کر لینے سے ساقط نہیں ہونا چاہیئے۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ شوہر پر ایک حد قذف جاری کی جانی چاہیئے۔

عورت کی تہمت شوہر پر

عام طور پر فقہ کی کتابوں میں صرف شوہر کی طرف سے بیوی پر تہمت لگانے کے سلسلہ میں لعان کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اگر بیوی اپنے شوہر کے خلاف تہمت لگائے کہ وہ زانی ہے۔ وہ زنا کرتا ہے تو اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ عورت اگر شوہر کے خلاف چار گواہ پیش کر دے تو شوہر پر زنا کی حد جاری کر دی جائے گی۔ نیز اگر بیوی چار گواہ پیش نہ کر سکے لیکن وہ تہمت لگا دے تو کیا بیوی پر حد قذف ہی جاری ہوگی یا وہ لعان بھی کر سکتی ہے۔ ہماری فقہ کی کتابیں اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ حد قذف کے بیان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی پر حد قذف تو جاری ہونی چاہیئے۔ کیونکہ قذف کے سلسلہ میں مرد اور عورت کے ضمن میں فقہاء کرام نے کسی امتیاز کو جائز

نہیں رکھا ہے تہمت عورت پر لگائی جائے یا مرد پر لگائی جائے حد قذف دونوں صورتوں میں جاری ہوتی ہے۔ نیز تہمت لگانے والا مرد ہو یا عورت ہو، اس میں بھی کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے جس نے بھی تہمت لگائی ہو، وہ اگر چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اس پر تہمت کی حد جاری کر دی جائے گی۔ البتہ اگر شوہر نے بیوی پر تہمت لگائی ہو تو تمام فقہاء لعان کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اگر بیوی نے شوہر پر تہمت لگائی ہے اور وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو تمام فقہ کی کتابیں لعان کے سلسلہ میں خاموش ہیں۔ غالباً ہمارے فقہاء نے اس مسئلہ پر غور نہیں فرمایا۔ ورنہ کتابوں میں اس کا کوئی تو ذکر ہونا لازمی تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے یا بیوی شوہر پر زنا کی تہمت لگائے۔ نتائج اور عواقب کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر شوہر کے لئے چار گواہ مہیّا کرنا دشوار ہو سکتا ہے تو بیوی کے لئے اس سے بھی زیادہ دشوار ہو سکتا ہے۔ تہمت لگانے کے بعد اگر شوہر پر حد قذف جاری کر دی جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں شریعت نے محسوس کیا ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی ازدواج کے مقاصد پورے نہیں کر سکیں گے اور کما حقہٗ ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکیں گے اس لئے لعان کر کے ان دونوں میں تفریق کر دینے کو ضروری سمجھا گیا ہے تو بعینہٖ یہی تمام اندیشے اس صورت میں بھی ہیں کہ بیوی اپنے شوہر پر زنا کی تہمت لگا دے۔ اور بعینہٖ دونوں میں تفریق کی ضرورت اس صورت میں بھی ہے۔ لہٰذا اس

صورت میں بھی لعان کی اجازت ہونی چاہیئے۔

قرآن کریم کے الفاظ۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ وَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ شُھَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُھُمْ ط

ترجمہ:۔ اور جو لوگ اپنے ازواج پر تہمت لگاتے ہیں اور بجز ان کے اپنے نفسوں کے ان کے پاس کوئی اور گواہ نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں کو شامل ہیں کیونکہ اَزْوَاجٌ کا لفظ شوہر اور بیوی دونوں کو شامل ہے۔ تعدد ازدواج کے باب میں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ زَوْجٌ شوہر کو بھی کہتے ہیں اور بیوی کو بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم کی یہ آیت صرف ایک صورت کو مخصوص نہیں کرتی کہ شوہر ہی بیوی پر تہمت لگائے تو لعان ہو سکے اور بیوی اپنے شوہر پر تہمت لگائے تو لعان نہ ہو سکے۔

رہی یہ بات کہ اَلَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ میں تمام مذکر کے صیغے آئے ہیں جس سے مردوں کی طرف سے تہمت لگانے کی صورت ہی میں لعان کا حکم معلوم ہو رہا ہے عورت کی طرف سے تہمت لگانے کی صورت میں لعان کا حکم معلوم نہیں ہو رہا ہے تو یہ استدلال قابل تسلیم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُھَدَآءَ فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً۔ (۲۴/۴)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ پاکدامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگاتے ہیں پھر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو انہیں اسی۸۰ کوڑے مار دو۔

میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تہمت لگانے والوں کے لئے مذکر کے صیغے استعمال فرمائے گئے ہیں۔ لہٰذا اگر عورتوں کی طرف سے کسی پر تہمت لگا دی جائے تو اس آیت سے اس کا کوئی حکم معلوم نہیں ہو رہا۔ لہٰذا عورتوں کی طرف سے اگر کسی مرد پر تہمت لگائی گئی ہو تو اس پر حد قذف لازم نہیں آئے گی۔ نیز آیت کریمہ میں صرف پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا اگر مرد پر تہمت لگا دی جائے تو اس سے بھی حد قذف جاری نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ یہ استدلال بداہتہً غلط ہے اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ تو اس استدلال کو لعان کے سلسلہ میں کیسے تسلیم کر لیا جائے۔

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اگر بیوی اپنے شوہر پر زنا کی تہمت لگائے اور وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو وہاں بھی لعان کا حکم نافذ ہوگا کیونکہ عورت کا یہ حق قرآن کریم نے تسلیم فرمایا ہے کہ وہ زنا کار مرد کے ساتھ نہ رہے۔ اسی سورۃ النور میں قذف کے حکم سے پہلے فرما دیا گیا ہے

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (۲۴/۳)

ترجمہ: زنا کار مرد نکاح نہیں کر سکتا مگر زنا کار عورت یا مشرک عورت سے اور زنا کار عورت سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا بجز زنا کار مرد اور مشرک مرد کے۔ اور صاحبِ ایمان لوگوں پر یہ نکاح حرام کر دیا گیا ہے۔

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے اگر شوہر زنا کار ہے تو اس کی پاکدامن بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے شوہر سے الگ ہو جائے۔ عموماً

ایسی صورتوں میں عورتوں کے لئے چار گواہ مہیا کرنا آسان بلکہ ممکن نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا عورت کے لئے یہی ایک صورت ممکن ہے کہ وہ لعان کر کے اس سے جدا ہو جائے لہٰذا عورتوں کو یہ حق دینا ضروری ہے اور یہ قرآن کے عین مطابق ہے۔

حیرت ہے کہ ہمارے فقہائے کرام نے اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

(باب خیار الفسخ)

خیار فسخ بعض عیوب ایسے ہیں جو اگر شوہر یا بیوی میں پائے جائیں تو فریق ثانی کو نکاح فسخ کرا لینے کا اختیار ہوتا ہے۔ فقہاء نے اس سلسلہ میں نو عیوب گنائے ہیں۔ تین عیوب مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہو سکتے ہیں۔ دو عیب صرف مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور چار عیوب صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں ان عیوب کی تفصیل یہ ہے۔

مشترک عیوب یہ ہیں۔

(۱) جنون (۲) برص (۳) جذام

مردوں کے ساتھ مخصوص دو عیوب یہ ہیں۔

(۴) مجبوب یعنی آلۂ تناسل کا کٹا ہوا ہونا (۵) نامردی

عورتوں کے ساتھ مخصوص چار عیوب یہ ہیں۔

(۶) عورت کی شرمگاہ میں ہڈی کا ہونا جس کی وجہ سے جنسی اختلاط نہ ہو سکے (۷) رَتق یعنی شرمگاہ کا سوراخ بند ہونا (۸) فَتق ،

یعنی شرمگاہ کے سوراخ اور پیشاب کے راستہ کے درمیانی عصب کا پھٹا ہوا ہونا کہ دونوں راہیں ایک ہوگئی ہوں (۹) عَفَل، یعنی شرمگاہ میں گوشت پیدا ہوجانا۔

امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ان تمام عیوب کی موجودگی میں فریق ثانی کو نکاح فسخ کرالینے کا اختیار ہوگا۔

امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سوائے فَتَق کے باقی آٹھ عیوب میں فریق ثانی کو نکاح فسخ کرالینے کا اختیار ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ بجز اس کے کہ شوہر مجبوب یا نامرد ہو اور کسی صورت میں نکاح فسخ کرانے کا اختیار نہیں ہوگا۔ مجبوب کی صورت میں عدالت فوراً نکاح فسخ کردے گی اور یہ ایک طلاق بائنہ شمار ہوگی اور اگر خلوتِ صحیحہ ہوچکی ہے تو بیوی پورے مہر کی مستحق ہوگی۔

نکاح کے باب میں ہم تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کے تین بڑے اور اہم مقصد ہیں۔

(۱) طرفین کو ایک دوسرے سے تسکین، محبت والفت کا حاصل ہونا۔

(۲) عصمت اور پاکدامنی کی حفاظت اور۔

(۳) افزائش نسل۔ جہاں نکاح کے یہ مقاصد حاصل نہ ہوسکیں وہاں نکاح کو بے معنی اور بے مصرف ہی سمجھا جائے گا۔

مذکورہ بالا تمام عیوب کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ نکاح کے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوسکتے جن پر قرآن کریم نے زور دیا ہے۔

لہٰذا ان تمام صورتوں میں فسخ نکاح کا اختیار ہونا چاہیئے۔ مذکورہ بالا نوعیوب پر میں ایک اور عیب کا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں اور وہ عیب بانجھ پن ہے۔ بانجھ پن عورت میں بھی ہو سکتا ہے اور مرد میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ائمہ فقہ کے دور میں اس کا پتہ لگانا غالباً ممکن نہیں تھا۔ لیکن سائنسی اور میڈیکل ترقی کی وجہ سے آج اس کا پتہ چلا لینا دشوار نہیں رہا۔ لہٰذا یہ بھی ایسا عیب ہے کہ اس کی موجودگی میں فریق ثانی کو فسخ نکاح کا اختیار ملنا چاہیئے۔ تاہم اگر بانجھ پن قابل علاج ہو تو عدالت اس کے لئے مہلت دے سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ مرض لا علاج ہو تو عدالت فوراً نکاح کو فسخ کر سکتی ہے۔

علاوہ ازیں کچھ دوسرے امراض بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو قدیم زمانے میں نہیں پائے جاتے تھے لیکن آج کل پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آتشک اور سوزاک وغیرہ۔ ان امراض میں بھی فسخ کا اختیار ہونا چاہیئے۔ واللہ اعلم

ناپسندیدگی اسی سلسلہ میں عورت یا مرد کا کریہہ المنظر اور بدصورت ہونا بھی شامل ہے۔ اگر شوہر کو اپنی بیوی پسند نہیں ہے تو اسے قرآن کریم نے اختیار دیا ہے کہ وہ اسے طلاق دے کر کسی دوسری عورت سے شادی کر لے۔ اسی طرح اگر شوہر بدصورت اور کریہہ المنظر ہے تو بیوی کو بھی شریعت نے اختیار دیا ہے کہ وہ خلع لے لے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے۔

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ

وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ط (۴/۱۹-۲۰)

ترجمہ: پھر اگر تم بیویوں "کو ناپسند کرو" تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اسی میں بہت زیادہ بھلائی رکھدے اور اگر تم بیوی (کو طلاق دے کر اُس) کے بدلے میں دوسری بیوی لانا ہی چاہو اور تم نے ان میں سے کسی کو سونے کا ڈھیر بھی دیدیا ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

اس طرح قرآن کریم نے اگرچہ اس استبدال کو پسند نہیں فرمایا تاہم اس کی اجازت دیدی ہے۔ لہٰذا بیوی اگر شوہر کو پسند نہ ہو تو وہ اسے طلاق دے سکتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے۔ نیز بیوی کے سلسلہ میں سورۂ بقرہ میں طلاق ہی کے ضمن میں آچکا ہے کہ۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط (۲/۲۲۹)

ترجمہ: پھر (اے جماعت مسلمین!) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ دونوں میاں بیوی اللہ کے ضوابط کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو میاں بیوی پر کوئی مضائقہ نہیں (اس مال کے لینے اور دینے میں) جو عورت اپنی جان چھڑانے کے لئے دیدے۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے عورتوں کے لئے کوئی خاص شرط عائد نہیں کی کہ وہ صرف اسی صورت میں خلع لے سکتی ہیں۔ بلکہ ایک عام بات فرمائی ہے کہ اللہ کی مقرر فرمودہ حدود کو قائم نہ رکھ سکنے کا اندیشہ ہو تو عورتیں خلع لے سکتی ہیں۔ مرد کا بدصورت

اور کریہہ المنظر ہونا اس کی سب سے بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا وہ اس میں شامل ہے۔

چنانچہ بخاری، نسائی اور سنن ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ کی بیوی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں ثابت بن قیس پر ان کے دین اور اخلاق کے سلسلہ میں قطعاً ناراض نہیں ہوں۔ لیکن میں اسلام میں کفر کو پسند نہیں کرتی (یعنی مسلمان ہو کر ناشکری کرنا نہیں چاہتی) تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم ثابت کو اس کا وہ باغ واپس کر دو گی جو اس نے تمہیں (مہر میں) دیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں واپس کر دوں گی۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ثابتؓ سے فرمایا کہ باغ قبول کر لو اور اسے دو طلاقیں دیدو۔

(بحوالہ جمع الفوائد صہ ۲۳۴ ج ۱)

اس حدیث میں ثابت ابن قیس ابن شماس کی بیوی نے غالباً شوہر کی بدصورتی کی بناء پر ہی خلع کا مطالبہ فرمادیا ہے جسے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ خود اعتراف کر رہی ہیں کہ انہیں حضرت قیس کی دینداری اور اخلاق پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس کے بعد لے دے کے ایک صورت کا معاملہ ہی رہ جاتا ہے۔ البتہ اس روایت میں دو طلاقوں کی بات قابل قبول نہیں ہے۔ کیونکہ خلع میں تو بالاتفاق ایک طلاق ہی بائنہ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا بھی حق نہیں رہتا۔ لہٰذا دوسری مرتبہ طلاق دینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ روایت میں تطلیقتین کا لفظ

ہمارے نزدیک کسی راوی کی غلطی ہے۔

باب العدۃ

عدت شریعت میں اس انتظار کی مدت کو کہتے ہیں جس میں طلاق یا شوہر کی وفات یا فسخ نکاح کے بعد عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی تاآنکہ عدت کی مدت نہ گذر جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی غلطی پر نادم ہو جائے اور وہ طلاق سے رجوع کرنا چاہے جو شریعت کی نظر میں مستحسن ہے تو وہ اس مدت میں رجوع کر لے اور اگر رجوع نہ بھی کرے تو پھر بھی یہ بات ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے۔ اگر وہ حاملہ ہو تو نسب میں اختلاط کا شبہ باقی نہ رہے۔ اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکے کہ عورت سے پیدا ہونے والا بچہ کس شوہر کا ہے۔

خلع، طلاق اور فسخ کی عدت

اگر شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے یا عورت نے خلع لے لیا ہے، یا عدالت سے نکاح فسخ ہو گیا ہے تو اس کی عدت قرآن کریم نے تین حیض مقرر فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ خلع کے باب میں ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ خلع قرآن کی اصطلاح نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اسے طلاق ہی شمار کیا ہے۔ رہا فسخ نکاح تو وہ بھی فقہ کی اصطلاح ہے، قرآن کریم نے یہ اصطلاح ہی استعمال نہیں کی، قرآن کریم کی رو سے یہ بھی طلاق ہی کی ایک صورت ہے۔ طلاق بجز اس کے کہ وہ نکاح کو توڑنے اور فسخ کرنے کا اعلان ہوتا ہے۔

اور کیا ہے؟

ہمارے فقہائے کرام نے نکاح کے معاہدہ کو اگر شوہر کی جانب سے توڑا جائے تو اسے طلاق کہا ہے۔ اگر عورت کی جانب سے توڑا جائے تو اسے خلع اور اگر عدالت کی طرف سے توڑا جائے تو اسے فسخ فرمایا ہے۔ کیونکہ ان مختلف صورتوں کے بعض احکام ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں اس لئے ان میں فرق و امتیاز قائم رکھنے کے لئے الگ الگ نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم نے ان میں کوئی فرق نہیں فرمایا وہ خلع، فسخ اور طلاق تینوں کو طلاق ہی کہتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

(۲/۲۲۸)

اور جن عورتوں کو طلاق ہو گئی ہے وہ اپنے آپ کو روکے رکھیں تین ماہواری ایام گذر جانے تک۔ اور ان کے لئے قطعاً جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے (ماہواری کا خون یا حمل) وہ اسے چھپائیں بشرطیکہ وہ اللہ پر اور (قیامت کے) آخری دن پر ایمان رکھتی ہوں۔

اگر انہیں ماہواری کے ایام نہیں ہوئے تو شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ حمل سے ہوں، مسلسل تین ماہواری کے عرصوں میں ماہواری کے ایام نہ ہونے سے یہ شبہ عموماً یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے اب فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ عورت حاملہ ہے اور اس کی

عدت ماہواری ایام سے نہیں گذاری جا سکتی۔ اگر بیوی کو اپنے وقت پر ایام ہو گئے ہیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیوی حاملہ نہیں ہے لیکن بسا اوقات عورت کو خون آجاتا ہے جو ماہواری کا خون نہیں ہوتا بلکہ کسی مرض کا خون ہوتا ہے لیکن مسلسل تین مرتبہ ماہواری ایام آجانے کے بعد وہ اندازہ یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عام طور پر یقین کے ساتھ یہ فیصلہ کرنا ممکن ہوتا ہے کہ عورت حاملہ نہیں ہے لہٰذا نسب کے اختلاط کا کوئی اندیشہ نہیں ہے اس کے بعد اسے اجازت ہے کہ وہ چاہے تو کسی دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔

قُرُءٌ کی تحقیق

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ قُرُءٌ کے معنی طُہر کے ہیں۔ یعنی حیض سے پاک رہنے کا زمانہ۔

امام ابو حنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ قُرُءٌ کے معنے حیض کے ہیں۔ امام احمد ابن حنبلؒ سے بھی ایک قول امام ابو حنیفہؒ کے مطابق نقل کیا گیا ہے۔ علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ قُرُءٌ کا لفظ اضداد میں سے ہے اور اس کے دونوں معنے آتے ہیں۔

(المیزان الکبریٰ ج ۲ صفحہ ۱۳۶ و ہدایہ ج ۱ صفحہ ۴۲۲)

ہمارے خیال میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ قُرُءٌ کے بنیادی معنے جمع کرنے کے ہوتے ہیں، ماہواری ایام کے عرصہ میں عورت کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اپنے رحم میں حیض کا خون جمع کر چکی ہے جسے اب وہ خارج کر رہی ہے۔

بر خلاف طہر کے عرصہ کے کہ اس میں تو وہ جمع کرتی رہتی ہے، جمع کر چکی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں ماہواری ایام آجانے سے ہی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کو حمل نہیں ہے۔ طہر سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا اور عدت کے مقرر کرنے کا بڑا مقصد یہی معلوم کرنا ہوتا ہے۔ کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے۔ لہٰذا ماہواری ایام کو قروء کہنا زیادہ قرین مصلحت ہے بہ نسبت ایام طہر کے۔ واللہ اعلم

حاملہ کی عدت

اگر عورت حمل سے ہو تو خلع، فسخ، طلاق اور شوہر کی وفات چاروں صورتوں میں عورت کی عدت وضع حمل ہے۔ وضعِ حمل ان چاروں صورتوں میں طلاق کے فورًا بعد ہو جائے یا نو مہینے کے بعد ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جبتک وضع حمل نہ ہو جائے وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی اور وضع حمل جونہی ہو جائے وہ کسی دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔ تمام فقہاء اس پر متفق ہیں۔

سورۃ الطلاق میں ہے۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (۶۵/۴)

ترجمہ :- اور حمل والی عورتیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا وضع حمل کر لیں۔

اس آیت کریمہ میں سب حاملہ عورتوں کی عدت بیان فرمائی گئی ہے خواہ عورت کو طلاق دی گئی ہو، یا عورت نے خلع لیا ہو، یا عدالت سے نکاح فسخ ہوا ہو یا شوہر مر گیا ہو، کسی خاص صورت کی تخصیص نہیں فرمائی گئی ہے۔ تمام فقہائے امت کا اس پر اتفاق

ہے۔ البتہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر شوہر کا انتقال ہوا ہو تو چونکہ قرآن کریم نے شوہر کی وفات کی عدت چار مہینے دس دن مقرر فرمائی ہے اس لئے یہ دیکھا جائے گا کہ وضع حمل سے عدت طویل ہوتی ہے یا چار مہینے دس دن کے حساب سے عدت طویل ہوتی ہے۔ جس حساب سے عدت طویل ہوتی ہو اس کو اختیار کرنا چاہیئے۔ (المغنی لابن قدامہ ص ۴۷۴ ج ۷)

لیکن اس قول کو کسی فقیہہ نے اختیار نہیں کیا۔ ہمارے خیال میں جمہور فقہاء کا قول ہی صحیح ہے۔

جسے ماہواری نہ آتی ہو

جن عورتوں کی عدت (طلاق، فسخ، خلع کی صورت میں) تین ماہواری ایام قرار دی گئی ہے۔ اگر ان میں کوئی عورت ایسی ہو کہ اسے ماہواری نہ آتی ہو جیسا کہ سن یاس کو پہنچ جانے کے بعد عورتوں کی ماہواری بند ہو جاتی ہے یا ماہواری بند تو نہیں ہوئی لیکن کسی عارض کی وجہ سے اسے ماہواری نہیں آتی جیسا کہ بچہ کو دودھ پلانے کے زمانہ میں ماہواری بند ہو جاتی ہے یا کسی مرض اور بیماری کی وجہ سے بھی اکثر ایسا ہو جاتا ہے تو ایسی عورتوں کی عدت تین ماہ مقرر فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ الطلاق ہی میں ہے۔

وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ (۶۵/۴)

ترجمہ: اور جو تمہاری بیویوں میں سے حیض سے مایوس ہو چکی ہوں (اور ان کی ماہواری ختم ہو چکی ہو) اگر تمہیں ان کے متعلق شبہ ہو

تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اسی طرح ان عورتوں کی بھی جنہیں ماہواری (کسی عارضہ کی وجہ سے) نہ آسکی ہو۔

بہرحال ان دونوں طرح کی عورتوں کی عدت قرآن کریم نے تین مہینے مقرر فرمائی ہے۔ اس آیت کریمہ میں وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (اور وہ عورتیں جنہیں ماہواری نہ آسکی ہو) کے لفظ سے ہمارے فقہاء نے صغر سنی کی شادی کے جواز پر استدلال فرمایا ہے۔ جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے اس موضوع پر کتاب النکاح میں "نکاح کی عمر" کے باب میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ اسے وہاں دیکھ لیں۔

جسے شوہر نے ہاتھ ہی نہ لگایا ہو

بعض عورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جنہیں ان کے شوہروں نے ہاتھ ہی نہیں لگایا اور شوہر کے ہاں جانے سے پہلے ہی ان کو طلاق ہو گئی یا کسی حادثہ میں شوہر کا انتقال ہو گیا تو ایسی عورتوں پر کسی قسم کی کوئی عدت نہیں ہے۔

سورۂ احزاب میں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝ (۳۳/۴۹)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تم نے مومن عورتوں سے نکاح کیا ہو پھر تم نے انہیں اس سے پہلے ہی طلاق دیدی ہو کہ تم نے انہیں چھوا ہو، تو تمہارے لئے ان پر کوئی عدت نہیں ہے جسے

تم شمار کرو۔ پھر انہیں کچھ سامان (کپڑے وغیرہ) دیدو اور انہیں خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دو۔

چونکہ عدت کا بڑا مقصد عورت کے رحم کا استبراء ہے یعنی یہ اطمینان حاصل کرنا ہے کہ عورت کو حمل نہیں ہے تاکہ اختلاط نسب کا اندیشہ باقی نہ رہے اور ایسی عورت میں جسے اس کے شوہر نے ہاتھ ہی نہیں لگایا یہ اندیشہ نہیں ہوتا اس لئے عدت کی ضرورت نہیں ہے۔ (المغنی لابن قدامہ ص ۴۴۸ ج ۷)

ایسی عورتوں کا مہر

ایسی عورتیں جنہیں ان کے شوہروں نے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدی ہو یا شوہر کا انتقال ہو گیا ہو اگر ان کے لئے مہر مقرر کر لیا گیا تھا تو طلاق کے بعد یا شوہر کی وفات کے بعد وہ نصف مہر کی حقدار ہوں گی۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ عورتیں یا ان کا ولی ان کی مرضی سے مہر معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ معاف نہ کریں تو وہ نصف مہر لے سکتی ہیں۔ اور اگر ان کا کوئی مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو شوہر کو چاہیئے کہ کچھ تحفۃً انہیں دیدے جو کم از کم ایک جوڑا یا اس کی قیمت ہونا چاہیئے۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ

النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ
فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۲/۲۳۶-۲۳۷)

ترجمہ :- (اے پیروانِ اسلام!) جبکہ تم نے اپنی بیویوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور نہ ان کے لئے کوئی مہر مقرر کیا، اگر تم انہیں (اس سے پہلے ہی) طلاق دیدو تو تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (تم انہیں طلاق دے سکتے ہو) اور انہیں کچھ سامان یا رقم دیدو۔ یہ سامان یا رقم خوش حال آدمی پر اس کے مطابق ہونا چاہیئے اور تنگدست آدمی پر اس کے مطابق یہ سامان یا رقم دستور کے مطابق ہونا چاہیئے۔ یہ نیکو کار لوگوں پر واجب ہے۔ اور اگر تم نے انہیں اس سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے کہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو اور تم اُن کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو جتنا مہر تم نے (ان کے لئے) مقرر کیا تھا اس کا نصف انہیں دیدو بجز اس صورت کے کہ وہ (اپنا مہر) معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے (جو ان کی اجازت سے ان کا نمائندہ ہو اور) جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن ہو۔ اور یہ بات کہ تم معاف کر دو، تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اپنے مابین مہربانی کا برتاؤ کرنے کو فراموش نہ کرو۔ اور یقیناً جو کچھ بھی تم کرتے ہو اسے اللہ دیکھنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ نے دونوں صورتوں کا حکم بیان فرما دیا ہے۔ اگر بیوی کے لئے کوئی مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور شوہر نے اسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدی ہے تو بیوی کو کچھ رقم یا سامان مثلاً پہننے کے کچھ کپڑے دینے ہوں گے۔ یہ رقم یا سامان شوہر کے مالی حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اگر شوہر خوش حال ہے تو اس

کے مطابق اور اگر وہ تنگدست اور غریب آدمی ہے تو اس کی حالت کے مطابق۔ اور اگر بیوی کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور شوہر نے اسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی ہے تو پھر مہر مقررہ کا نصف حصّہ ادا کرنا ہو گا۔ البتہ اگر بیوی اپنا مہر معاف کر دے تو پھر یہ نصف مہر دینے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اور بیوی کو مہر معاف کر دینا بہتر ہے۔ کیونکہ شوہر نے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ اِسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی اسے طلاق دیدی ہے۔ یہ معافی خود بیوی کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے اور بیوی کے ولی کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔ جو معاہدۂ نکاح کی تکمیل میں بیوی کی طرف سے نمائندگی کر رہا تھا۔

اس دوسری صورت میں یعنی جبکہ بیوی کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور اسے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دیدی گئی ہے۔ اس صورت میں بیوی نصف مہر کی حقدار تھی۔ لیکن بیوی نے یا اس کے ولی نے مہر معاف کر دیا ہے تو شوہر کو نصف مہر تو ادا کرنا نہیں ہو گا۔ البتہ شوہر کو چاہیئے کہ بیوی کو کچھ نقد یا سامان دے کر رخصت کرے کیونکہ ارشادِ الٰہی ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ○ (۲/۲۴۱)

ترجمہ: تمام مطلقات کے لئے دستور کے مطابق کچھ دینا متقی لوگوں پر واجب ہے۔

مزید یہ کہ اس ضمن میں وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ کا حکم موجود ہے۔ یعنی تم باہم مہربانی کا برتاؤ کرنے کو فراموش نہ کرو۔ بیوی کی

جانب سے اپنا نصف مہر معاف کرکے مہربانی کا برتاؤ ہو چکا ہے۔ لہٰذا شوہر کی طرف سے بھی اس کے جواب میں مہربانی کا برتاؤ ہونا ضروری ہے۔

حمل یا حیض کی اطلاع

عدت کے دوران بیوی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اگر اسے حمل ہے تو اسے ظاہر کر دے نیز اگر حمل نہیں ہے اور اسے ماہواری ہو رہی ہے تو اس کی بھی شوہر کو اطلاع کر دے۔ کیونکہ طلاق کی صورت میں شوہر کو پہلی اور دوسری مرتبہ رجوع کر لینے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا شوہر کو معلوم ہوتے رہنا چاہیئے۔ کہ عدت کتنے عرصہ چلے گی۔ چونکہ ماہواری کی صورت میں تین ماہواری ایام ہو لینے تک اور حمل کی صورت میں وضع حمل تک عدت ہوتی ہے اور دونوں صورتوں میں عدت کا وقفہ یقیناً مختلف ہو گا۔ اس لئے اس کی اطلاع ضروری ہے چنانچہ سورۂ بقرہ ہی میں ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ (۲/۲۲۸)

ترجمہ:۔ اور عورتوں کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اسے چھپائیں اگر وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہوں۔ اور اس سلسلہ میں ان کے شوہر ان کو واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح احوال کا ارادہ رکھتے ہوں۔

لہٰذا بیویوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے حمل یا اپنے ماہواری ایام کے

متعلق شوہر کو اطلاع دیتی رہیں۔

رجوع صرف اصلاح کے لئے
پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ طلاق دینے کی صورت میں

شریعت نے شوہر کو رجوع کر لینے کا حق دیا ہے۔ لیکن رجوع کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اصلاحِ احوال کی نیت سے ہونا چاہیئے۔ اگر بیوی کو پریشان کرنے اور اس سے بدلے چکانے کی نیّت سے رجوع کیا جائے تو یہ رجوع قطعًا ناجائز ہے اور شوہر اس کے لئے سخت گنہگار اور حق تعالیٰ کے حضور جواب دِہ ہوگا۔

سورۂ بقرہ ہی میں ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ز وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (۲/۲۳۱)

ترجمہ: اور تم بیویوں کو نقصان پہنچانے کے لئے نہ روک لو تاکہ تم زیادتی کر سکو اور جو شخص بھی ایسا کرے گا تو وہ خود اپنے اوپر ہی ظلم کرے گا اور اللہ کے احکام اور اس کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ اور اپنے اوپر اللہ کے انعام کو اور اس بات کو کہ اس نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے ہر دم پیش نظر رکھو وہ اس کے ذریعہ سے تمہیں نصیحت فرماتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ رجوع کا مقصد حالات کی درستگی اور

احوال کی اصلاح ہو۔ بیوی کو اذیت اور تکلیف پہنچانا نہ ہو۔

سابق شوہر کے ساتھ نکاح ثانی سے روکنا بھی جائز نہیں

طلاق اور عدت کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک مسئلہ یہ بھی بیان فرمایا ہے جس کا تعلق براہِ راست اگرچہ عدت سے نہیں ہے۔ لیکن قرآن کریم نے چونکہ اسی سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی بیان فرما دیا ہے اس لئے ہم بھی یہاں بیان کر دیتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دیدی ہے اور عدت گذر چکی ہے لیکن عدت گذر جانے کے بعد شوہر اپنی اس سابقہ بیوی سے نکاح ثانی کرنا چاہتا ہے اور بیوی بھی اس پر راضی ہے تو عورت کے خاندان والوں کو یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ نکاح ثانی ہونے سے طرفین کو روکیں۔ عام طور پر لڑکی کے خاندان والے اپنی بچی کو طلاق دیدینے میں خاندان کی سُبکی سمجھتے ہیں اور داماد کے اس فعل کو اپنی توہین سمجھتے ہیں اس لئے وہ دوبارہ نکاح میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اور لڑکی کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس درخواست کو قبول نہ کرے۔ قرآن کریم نے خاندان والوں کو اس میں رکاوٹ ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۤءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا

تَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۲ ـــ ۲۳۲)

ترجمہ:- اور جب تم بیویوں کو طلاق دیدو۔ پھر وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو تم انہیں اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کرلیں جبکہ وہ دستور کے مطابق آپس میں اس کے لئے باہم راضی ہوجائیں۔ اس امر کی نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہی بات تمہارے لئے پاکیزہ تر اور صاف تر ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

غیرت اور شرم وحیا ہی عورتوں کے لئے سب سے زیادہ قیمتی زیور ہوتا ہے۔ نت نئے مردوں کے حبالۂ عقد میں جانے سے عورتوں کے جذبات شرم وحیا کو غیر محسوس طریقہ پر ٹھیس لگتی ہے جس سے جہاں تک ممکن ہو سکے احتراز ہی بہتر ہے۔ لہٰذا اگر سابق شوہر ہی اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور لڑکی بھی اس کے لئے راضی ہے تو لڑکی کا اپنے پہلے شوہر کی طرف لوٹ جانا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ اسے کسی دوسرے مرد کا منہ دیکھنا پڑے۔ لہٰذا لڑکی کے خاندان والوں کو اس میں ہرگز رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیئے۔

عدت کی صحیح شمار ضروری ہے

عدت کی صحیح صحیح شمار ہونی ضروری ہے۔ لہٰذا شوہر کو طلاق ایسے موقعہ پر دینی چاہیئے کہ عدت کے شمار کرنے میں کوئی گڑبڑ واقع نہ ہو۔ طلاق کی عدت تین حیض مقرر کی گئی ہے۔ لہٰذا طلاق اندرون ماہواری ہرگز نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ حیض کا کچھ عرصہ گذر چکا ہوگا لہٰذا تین حیض پورے نہیں ہوں گے۔ اور اگر اس حیض کو جس میں طلاق

دی گئی ہے شمار نہ کیا جائے اور اس کے بعد والے تین حیض شمار کئے جائیں تو اس میں عدت کی تطویل ہے جس سے عورت پر ایک طرح کی زیادتی ہوگی۔ لہٰذا حیض سے پہلے طُہر کی حالت میں طلاق دینی چاہیئے۔ سورۂ الطلاق میں ہے۔

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ (۶۵/۱)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! (مسلمانوں کو تاکید فرما دیجئے کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے شروع میں (پہلا حیض آنے سے پہلے پہلے) طلاق دیا کرو اور عدت کو شمار کرتے رہا کرو۔ اور اللہ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرتے رہو۔

چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو ماہواری ایام کے دوران طلاق دیدی تھی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ سخت ناراض ہوئے تھے اور حضرت عبداللہؓ کو آپؐ نے رجوع کرنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جب وہ ماہواری ایام سے پاک ہو جائے تب اسے اگر طلاق دینی ہی ہو تو طلاق دے سکتے ہو۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور تمام صحاح کی کتابوں میں اس کی روایت کی گئی ہے۔

اس آیت کریمہ سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ عدت کے سلسلہ میں ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ سے تین حیض ہی مراد ہیں اور جن حضرات نے اس سے تین طُہر مراد لئے ہیں وہ محل نظر ہے۔ واللہ اعلم

اگر عورت کو ماہواری نہ ہو عدت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر کسی جوان عورت کو طلاق ہو گئی ہو، وہ اپنی عمر کے لحاظ سے ان عورتوں میں سے ہے جنہیں ماہواری آنی چاہیئے۔ یعنی ابھی وہ سن یاس تک نہیں پہنچی۔ اور نہ ہی اسے حمل کا کوئی شبہ ہے۔ لیکن اسے ماہواری ایام نہیں ہوتے۔ مثلاً وہ کسی بچہ کو دودھ پلا رہی ہے۔ یا اسے کوئی ایسی بیماری ہے جس کی بنا پر ایام نہیں آ رہے تو وہ کس طرح عدت پوری کرے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وہ نو ماہ تک انتظار کرے۔ شاید اس عرصہ میں حمل کے کچھ آثار ظاہر ہو جائیں۔ اگر نو ماہ تک حمل کے آثار ظاہر نہ ہوں تو پھر وہ تین مہینے (مہینوں کے حساب سے) عدت کے دن پورے کرے اور ایک سال گذر جانے پر کہا جائے گا کہ اس کی عدت پوری ہو گئی۔

امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ وہ مسلسل انتظار کرتی رہے گی تا آنکہ وہ سنِ یاس میں داخل ہو جائے۔ اس انتظار میں دس سال، بیس سال، پچیس سال کتنا ہی عرصہ گذر جائے۔ البتہ سنِ یاس میں داخل ہو جانے کے بعد اس سے کہا جائے گا کہ اب وہ مہینوں کے حساب سے تین ماہ عدت کے پورے کرلے۔ تین ماہ پورے کر لینے کے بعد اس کی عدت پوری ہو گی۔ اس تمام عرصہ میں وہ برابر انتظار کرتی رہے گی وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی اور اس پورے عرصہ میں شوہر کے ذمہ اس کا نان و نفقہ واجب

ہو گا۔ شوہر اسے اپنے گھر سے الگ نہیں کر سکتا نیز اس پورے عرصہ میں شوہر کو رجوع کر لینے کا بھی حق ہو گا۔ کیونکہ سن یاس میں داخل ہو جانے کے بعد تین ماہ پورے کر لینے تک وہ برابر عدت ہی میں ہے۔

(بدایۃ المجتہد صہ ۹۱ ج ۲)

اس سلسلہ میں نہایت ہی عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اگر وہ عارض بھی معلوم ہو جائے جس کی وجہ سے اسے ماہواری ایام نہیں ہو رہے ہیں مثلاً وہ بچہ کو دودھ پلا رہی ہے یا اسے کوئی بیماری لاحق ہے یا اسے نفاس کا خون آرہا ہے وغیر ذلک۔ تو اس عارض کے دور ہونے کا انتظار کرنا ہو گا۔ خواہ اس میں کتنا ہی عرصہ کیوں نہ گذر جائے۔ البتہ اگر انتظار کرتے کرتے وہ سن یاس میں داخل ہو جائے تو اب وہ مہینوں کے حساب سے تین مہینے عدت کے پورے کرے گی۔

(المغنی لابن قدامۃ صہ ۴۶۵ ج ۷)

حبّان بن منقذؓ کی روایت

اس سلسلہ میں ایک روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنی مسند میں اپنی سند کے ساتھ حبان بن منقذ انصاریؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاق دیدی تھی جس کے پاس انہی سے ایک چھوٹی بچی بھی تھی جسے وہ دودھ پلا رہی تھی۔ اسے ماہواری ایام نہیں ہو رہے تھے کہ اس کی عدت گذر سکتی۔ اسی عرصہ میں حبانؓ بیمار ہو گئے۔ لوگوں نے حبان سے کہا کہ اگر تم اس بیماری میں مر گئے تو عورت تمہاری وارث ہو جائے گی حالانکہ تم اسے طلاق دے چکے ہو۔ حبانؓ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے جہاں اس

وقت حضرت علیؓ اور حضرت زید ابن ثابتؓ تھے۔ حضرت عثمانؓ نے ان دونوں حضرات سے پوچھا کہ اس مسئلہ میں آپ دونوں حضرات کی کیا رائے ہے ؟ دونوں حضرات نے فرمایا کہ اگر عورت مرجائے تو حبانؓ اس کے وارث ہوں گے۔ اور اگر حبانؓ مر گئے تو عورت ان کی وارث ہوگی۔ کیونکہ یہ عورت نہ ان عورتوں میں سے ہے جو سن یاس میں داخل ہو گئی ہوں نہ وہ ان کنواری لڑکیوں میں سے ہے جو ابھی سنِ حیض کو نہ پہنچی ہوں۔ یہ سن کر حبانؓ اپنے گھر گئے اور بچی کو اس سے چھین لیا۔ اس کے بعد عورت کو ماہواری ایام جاری ہو گئے۔ لیکن اِسے دو ماہواریاں ہی آئی تھیں کہ حبانؓ کا انتقال ہو گیا اور اس کے تین حیض پورے نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے بیوی کو حبانؓ کا وارث قرار دیدیا۔

نیز اثرم نے اپنی سند سے محمد ابن یحییٰ ابن حبانؓ سے روایت کی ہے کہ میرے دادا کی دو بیویاں تھیں ایک ہاشمی تھی اور دوسری انصاری تھی، انصاری بیوی جسے طلاق دی گئی تھی وہ بچی کو دودھ پلا رہی تھی اسے سال بھر تک ماہواری نہیں آئی۔ حتیٰ کہ حبانؓ کا انتقال ہو گیا۔ انصاری بیوی نے کہا کہ مجھے ماہواری ایام نہیں ہوتے۔ مقدمہ حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش ہوا، انہوں نے انصاریہ کے حق میں میراث کا فیصلہ دیدیا۔ اس پر ہاشمی بیوی نے حضرت عثمانؓ کو ملامت کی تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ یہ فیصلہ تمہارے ہی چچازاد بھائی یعنی حضرت علیؓ کا ہے کہ انہوں نے ہی ہمیں یہ مشورہ دیا ہے۔

(ایضاً المغنی لابن قدامہ صفحہ ۴۶۵-۴۶۶ ج ۷)

نفس مسئلہ پر بحث

اس سلسلہ میں روایت پر تو ہم بعد میں بحث کریں گے پہلے ہم نفس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے فقہائے کرام نے اس ضمن میں جو فیصلہ فرمایا ہے وہ نہ شوہر کے مفاد میں ہے نہ بیوی کے۔ شوہر عرصۂ دراز تک بیوی کو طلاق دیدینے کے باوجود اس کا نان و نفقہ برداشت کرتا رہے اور گھر سے رخصت نہ کر سکے یہ اس کے لئے ایک ایسی تکلیف ہے جو عام حالات میں اس کی برداشت سے باہر ہے کیونکہ یہ بیوی اس کے لئے ناپسندیدہ ہو چکی ہے اسی بنا پر اس نے اسے طلاق دی ہے ورنہ وہ یہ اقدام ہی کیوں کرتا۔ بیوی کے لئے بھی یہ فیصلہ کسی حالت میں خوش آئند نہیں کہا جا سکتا کہ وہ غیر معینہ عرصہ تک انتظار کرتی رہے تاآنکہ وہ سنِ یاس کو پہنچ جائے۔ اس کے بعد وہ مہینوں کے حساب سے تین مہینے عدت کے پورے کرکے نجات حاصل کرے۔

ہمارے فقہائے کرام نے اس پر بھی غور نہیں فرمایا کہ سنِ یاس کو پہنچ جانے کے بعد وہ غریب کہاں جائے گی اب اس سے کون شادی کرے گا۔ اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ طلاق واقع ہی نہ ہوتی۔

قرآن کریم نے ایسی عورتوں کی عدت کے لئے جنہیں ماہواری ایام نہ ہوتے ہوں وضاحت کے ساتھ فرما دیا تھا کہ۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ ؕ (۶۵/۴)

ترجمہ: اور تمہاری بیویوں میں سے جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور ان عورتوں کی بھی جنہیں (کسی وجہ سے) حیض نہیں آسکا اور حمل والی عورتوں کی (عدت کے لئے) مقررہ مدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کریں۔

اس آیت کریمہ میں ان عورتوں کی جنہیں ماہواری ایام نہ ہوتے ہوں تین اقسام بیان فرمائی گئی ہیں۔

① وہ عورتیں جو سن یاس کو پہنچ چکی ہیں اور ان کے ماہواری ایام بند ہو چکے ہیں۔

② وہ عورتیں جن کے سن کا تقاضا تو یہ ہے کہ اُنہیں ماہواری ایام ہونے چاہئیں مگر کسی عذر کی وجہ سے مثلاً وہ بچہ کو دُودھ پلا رہی ہیں۔ یا زچگی میں ہیں یا کسی بیماری کی وجہ سے اُنہیں ماہواری ایام نہیں ہو رہے ہیں۔

③ وہ عورتیں جو حمل سے ہیں اور اس وجہ سے اُنہیں ماہواری ایام نہیں ہو رہے ہیں۔

پہلی دونوں صورتوں میں عدت تین مہینے مقرر کی گئی ہے اور تیسری صورت میں عدت وضع حمل مقرر کی گئی ہے۔ ہم کتاب النکاح میں "نابالغ کا نکاح" کے باب میں تفصیل کے ساتھ بتلا چکے ہیں کہ عربی زبان میں صرف سادہ نفی کے لئے "ما" اور "لا" کے الفاظ آتے ہیں اور۔

نفی جحد "لم" کا لفظ نفی جحد کے لئے آتا ہے یعنی ایسی نفی کیلئے جو انکار اور جحود پر مشتمل ہو۔ یعنی لَمْ کے لئے ضروری

ہے کہ اس کے مقابلہ میں واقعی طور پر یا اقتضائے حال کے طور پر اس کے خلاف ادّعا یا تقاضہ پایا جاتا ہو جس کا انکار کرنا مقصود ہو۔" مَا حِضْنَ " اور لَمْ یَحِضْنَ میں فرق ہی یہ ہے کہ ۔ مَاحِضْنَ کے معنے ہیں کہ ۔

"انہیں حیض نہیں آیا"

لہٰذا جہاں کہیں آپ کو صرف حیض آنے کی نفی کرنی مقصود ہو وہاں آپ مَا حِضْنَ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن لَمْ یَحِضْنَ صرف اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب آپ کا مخاطب یہ دعویٰ کر رہا ہو کہ حیض آچکا ہے یا اقتضائے حال کا یہ تقاضا ہو کہ حیض آنا چاہیئے لیکن آپ اس دعوے اور تقاضے کی تردید اور انکار کرنا چاہتے ہوں۔ اسے انکار وجود کی نفی کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک مثال | یہ معلوم و مشہور بات ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ موافق اور مخالف سب لوگوں کو اس کا اقرار و اعتراف تھا کہ آپ کے نرینہ اولاد نہیں ہے۔ چنانچہ مخالفین کی طرف سے آپ کو اس کا طعنہ بھی دیا جاتا تھا کہ آپ کے نرینہ اولاد نہیں ہے اس لئے آپ نعوذ باللہ" اَبْتَرْ" ہیں۔ یعنی آپ کی تو نسل ہی نہیں چلے گی۔ قرآن کریم کو ایک موقعہ پر یہ کہنے کی ضرورت لاحق ہوئی کہ آپ کسی لڑکے کے باپ نہیں ہیں اور آپ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ چونکہ اس کے خلاف کوئی دعویٰ موجود نہیں تھا۔ نہ اقتضائے حال کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کے نرینہ اولاد ہو اس لئے قرآن کریم نے فرمادیا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ ؕ (۳۳/۴۰)

ترجمہ: محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔

یہاں مَا كَانَ فرمادینا کافی تھا لَمْ يَكُنْ کی ضرورت نہیں تھی۔
لیکن دوسری طرف مسیحیت کا یہ دعویٰ تھا کہ مسیح علیہ السلام باوجودیکہ حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے تھے مگر پھر بھی وہ اِلٰہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے باوجودیکہ اپنا ایک بیٹا (مسیح علیہ السلام) پیدا کیا تھا اور وہ ایک بیٹے کے باپ تھے مگر پھر بھی وہ دوسرے اِلٰہ تھے اسی طرح روح القدس بھی اِلٰہ تھے اور وہ اور مسیح اللہ تعالیٰ کے مثل ہی اِلٰہ تھے۔ تینوں کی الوہیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس دعوے کی تردید اور انکار کے لئے قرآن کریم کو نفی کا صیغہ استعمال کرنا تھا تو اس نے "ما" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا بلکہ اس نے اعلان کیا کہ۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲/۱-۴)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تو ایک ہی ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اللہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، اللہ کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔

یہاں چونکہ مخالف دعویٰ موجود تھا اس لئے مَا وَلَدَ اور مَا وُلِدَ اور مَا كَانَ لَهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔) نہیں فرمایا گیا اور اگر فرمایا جاتا تو قطعاً کافی نہ ہوتا۔ حالانکہ نفی دونوں صورتوں میں ہے

لیکن چونکہ یہاں تردید وانکار (یعنی جحود) کی نفی کی ضرورت تھی اس لئے "ما" کے ساتھ نفی کافی نہیں سمجھی جا سکتی تھی، اس لئے "لَمْ" کے ساتھ نفی فرمائی گئی۔

لَمْ یَحِضْنَ کا لفظ نابالغ لڑکیوں کے متعلق نہیں بولا جا سکتا جنہیں حیض نہ آنا ایک مسلّم بات ہے۔ اقتضائے حال کا تقاضا ولِمن یہی ہے کہ انہیں حیض نہ آئے۔ اس میں انکار وجحود کی قطعًا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نابالغ لڑکیوں کے معاملہ میں صورت حال یہ ہے کہ انہیں ابھی تک حیض نہیں آیا۔ البتہ بالغ ہوجانے کے بعد انہیں حیض آنا ہے۔ کیونکہ انہیں بالغ تو ہونا ہے اور بالغ ہو جانے کے بعد حیض بھی آتا ہے۔ ان کے سلسلہ میں نفی تاحال ہی کی جا سکتی ہے کہ انہیں ابھی تک حیض نہیں آیا ہے۔ ایسی نفی کے لئے جو صرف موجودہ وقت تک کے لئے کی جائے اور آئندہ کے لئے نفی کرنا مقصود نہ ہو عربی زبان میں نہ ما آتا ہے نہ لَمْ آتا ہے بلکہ لَمَّا آتا ہے۔

لہٰذا اگر بالغ بچیوں کی بات ہوتی تو قرآن کریم کو یہاں لَمَّا یَحِضْنَ کہنا چاہیئے تھا۔ مگر قرآن کریم نے اس موقعہ پر نہ مَاحِضْنَ فرمایا ہے نہ لَمَّا یَحِضْنَ فرمایا ہے۔ بلکہ لَمْ یَحِضْنَ فرمایا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ یہاں نابالغ لڑکیوں کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ ان عورتوں کی بات ہو رہی ہے جنہیں حیض آنا چاہیئے۔ ان کے سِن کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں حیض آئے۔ لیکن کسی عذر اور کسی رکاوٹ کی وجہ سے حیض نہیں آرہا ہے۔ مثلاً وہ بچہ کو دودھ پلا رہی ہیں۔ یا انہیں کوئی ایسی بیماری لاحق ہے کہ اس کی بنا پر انہیں ماہواری ایام نہیں ہو رہے ہیں۔

یا وہ نفاس میں ہیں یا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہے۔ یہ وجوہ بہت سی ہو سکتی ہیں۔ ذیل میں ہم ڈاکٹر کاشی رام کی شہرۂ آفاق کتاب "امراضِ نسواں" کا طویل اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ جس سے اصل مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ کتابیں تو بہت ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس بحث کو جس عمدگی سے یکجائی طور پر لکھ دیا ہے وہ مجھے دوسری تمام دستیاب کتابوں میں نہیں ملا۔

اس بیان سے آپ سمجھ سکیں گے کہ لڑکی کے جوان ہو جانے کے باوجود اسے حیض نہ آسکنے کی کس قدر ان گنت وجوہات ہوتی ہیں اور یہ شکایات عورتوں میں کس قدر عام ہیں۔ فن طب میں "احتباس الطمث" یعنی بندش حیض ایک مستقل باب ہے۔ ہم کتاب کا یہی باب پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹری تصریحات

ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ۔

حیض کے بند ہونے کی مختلف وجوہات ہیں۔ اور حیض عورت کی زندگی میں ایک یا کئی صورتوں میں بند ہو سکتا ہے۔ حیض کے بند ہونے کی ان مختلف شکلوں کو ہم تین حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔

(۱) جب حیض کبھی ظاہر ہی نہ ہوا ہو۔

(۲) جب حیض ظاہر ہو کر رک چکا ہو۔

(۳) جب حیض کئی مہینوں تک جاری رہا ہو۔ لیکن کبھی کبھی رک جاتا ہو، یا کبھی کبھی صرف جاری ہوتا ہو۔ اور اس کا کورس نہایت بے قاعدہ ہو۔

حیض کے رک جانے کی ہر قسم کو نہایت احتیاط سے دیکھنا چاہیئے، تاکہ اس کی کیفیت، وجوہات اور علامات کو سمجھا جاسکے اور ان کے ذریعہ

علاج کیا جا سکے۔

(۱) **جب حیض کبھی ظاہر ہی نہ ہوا ہو** ان مستورات میں جن کو جوانی کے زمانہ میں حیض بالکل نہیں ہوا یا جن کا عالم شباب کا بہت بڑا حصہ بغیر حیض کے گذر گیا۔ اس قسم کی کیفیت محض یہ کیفیت نہیں ہے۔ کہ پہلے حیض کے ظاہر ہونے میں دیر ہو رہی ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا کیس ہے جو عورت کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی حالت کو سدھارنا ہماری طاقت سے بالکل باہر ہوتا ہے۔ اور بعض وقت یہ ضروری ہوتا ہے کہ قدرت کے اس فعل میں دخل اندازی نہ کی جائے اور بعض وقت دوا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا کیفیتوں میں پہلے ہم اس کیفیت کا ذکر کرتے ہیں۔ جس میں عورت کے آلات تناسل مکمل طور پر نشو و نما یافتہ نہیں ہوتے ان مستورات میں خصیۃ الرحم یا تو ہوتے ہی نہیں یا اگر ہوتے ہیں تو کافی نشو و نما یافتہ نہیں ہوتے، یا سوکھے ہوئے اور چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے ایسے کیس بھی ہم کو ملتے ہیں جن کے متذکرہ آلات بچپن کے زمانہ میں کسی حادثہ یا چوٹ کی وجہ سے مضروب ہو کر ناکارہ ہو چکے ہیں۔ مریضہ کی باقی جسمانی کیفیتیں بالکل درست ہوتی ہیں۔ جسم کا ہر دوسرا فعل اور نشو و نما بالکل ٹھیک اور باقاعدہ ہوتی ہے مگر صرف ایک ہی چیز میں کمی ہوتی ہے۔ اور وہ ہے آلات تناسل کی نشو و نما۔ چھاتیاں پورے طور پر نہیں اُبھرتیں۔ آلات تناسل میں حس نہیں ہوتی۔ آواز کسی قدر مردانی ہوتی ہے اور اوپر کے ہونٹ پر مونچھوں

کی طرح سے بال اُگ آتے ہیں یہ ہے زنانہ اور مردانہ ایک عجیب و غریب مکسچر ایسے کیس ہمارے احاطہ علاج سے قطعی طور پر باہر ہیں۔ کیونکہ ہم ان کے متعلق کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

کچھ کیس ہمیں ایسے بھی ملتے ہیں۔ جن میں آلات تناسل کی بناوٹ کا کچھ تھوڑا نقص ہوتا ہے اور وہ نقص علاج کے ذریعہ سے درست ہو سکتا ہے۔ ایسی مثالیں ہمیں ان مستورات میں ملتی ہیں جن میں پردۂ بکارت بالکل سخت اور شرمگاہ کا منہ روکے ہوئے ہوتا ہے۔ یا شرمگاہ کے لب آپس میں مکمل طور پر ملے ہوئے ہوتے ہیں یا رحم کا منہ قطعی طور پر بند ہوتا ہے۔ ان حالتوں میں حیض ہوتے ضرور ہیں مگر چونکہ ان کو باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اس لئے وہ اندر ہی اندر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ہر حیض کے وقت مریضہ کو سخت ترین تکلیف ہوتی ہے۔ رحم کی دیواروں میں درد۔ آلات تناسل میں درد کے شدید دورے ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت اگر اس تکلیف کا علاج نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ خون حیض شکم کی طرف راغب ہو کر پردۂ باریطون کو ماؤف کر دیتا ہے اور اس کے اندر ورم پیدا ہو کر مہلک صورت اختیار کر لیتا ہے، یا اس سے دن بدن شکم بڑھتا جاتا ہے اور درد کا موجب بنتا ہے۔ یا مریضہ رکے ہوئے حیض کے زہر نظام کے اندر جذب ہوتے رہنے کی وجہ سے دن بدن کمزور ہوتی جاتی ہے اور آخر کار سوکھ کر ختم ہو جاتی ہے۔

اس کیفیت کا نہایت سہل طریقہ یہ ہے۔ کہ پردۂ بکارت، لب ہائے دہن شرمگاہ، یا رحم کے منہ کو کھول دیا جائے تو خونِ حیض

راستہ مل جانے سے اپنے آپ قدرتی طور پہ باہر نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور مریضہ کی تمام تر تکلیفات رفع ہو جاتی ہیں۔

ایسی مستورات بھی دنیا میں موجود ہیں۔ جن کو حیض ہوتا ہی نہیں تاہم ان کو کسی قسم کی علاج کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر اس قسم کی مستورات میں علاج کیا گیا اور دوائیں دی گئیں تو بجائے فائدے کے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔ اس قسم کی مستورات میں خصیۃ الرحم ہوتے ہیں وہ اپنا فعل بھی کرتے ہیں لیکن تاہم کسی قسم کا حیض یا سیلان حیض ظاہر نہیں ہوتا۔ آج تک دنیا کی سائنس یہ نہیں معلوم کر سکی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں۔ کہ اس قسم کی مستورات موجود ہیں جو نہایت تندرست ہیں۔ جن کے حمل ہوتے ہیں اور بچے بھی پیدا ہوتے ہیں، ایسی عورتیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ جن کی نسل در نسل حیض نہیں ہوتا تاہم بچے ہوتے ہیں۔

ایسے بھی خاندان اور عورتیں موجود ہوتی ہیں جن میں پہلا حیض بہت دیر کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ بعض وقت ۲۰ اور ۲۲ برس کی عمر میں جاکر پہلا حیض شروع ہوتا ہے۔ تاہم یہ عورتیں نہایت تندرست رہتی ہیں ان کے بچے بھی ہوتے ہیں اور کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ایسی عورتیں عموماً زیادہ عمر تک زندہ رہتی ہیں۔ ان کا سن یاس (حیض کا بند ہونا) بہت بڑی عمر میں ہوتا ہے، ایسی عورتوں کا بھی حیض جاری ہونے کے لئے علاج کرنا بجائے فائدے کے نقصان دہ ہوتا ہے۔

میں نے متذکرہ بالا مستثنیات کا ذکر اس لئے کیا ہے تاکہ معالجین

کو یہ سمجھ آ جائے کہ اس قسم کی عورتیں دنیا میں موجود ہیں اور وہ کبھی غلطی سے ان کا علاج والدین کے کہنے پر یا خود عورت کے کہنے پر شروع نہ کر دیں۔ علاج اس وقت تک شروع نہ کرنا چاہیئے جب تک اس علامت کے ساتھ ساتھ علامات تکلیف موجود نہ ہوں۔

اب ایسی عورتیں بھی دنیا میں موجود ہیں جن کو درحقیقت علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ان عورتوں کا اوپر ذکر کیا ہے کہ کچھ عورتیں ایسی ہیں جن کے اعضاء تناسل ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوتے ہیں تو ان میں افعال کا اجراء نہیں ہو سکتا۔ ایسی مستورات بھی موجود ہیں کہ جنکو حیض اپنی طبیعت کی وجہ سے ہوتا ہی نہیں تاہم ان کے اولاد اور بچے ہوتے ہیں۔ ایسی عورتوں کا ذکر بھی میں نے کیا ہے۔ جن کو پہلا حیض بہت دیر میں ہوتا ہے اور جن کے علاج کی کبھی ضرورت نہیں ہوا کرتی ہے، لیکن موجودہ حالت میں ان عورتوں کا ذکر کرتا ہوں جن میں حیض رکا ہوا ہو ان کے اندر آلات تناسل کی نشوونما پورے طور پر ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ یہ ایک غیر طبعی اور غیر قدرتی حالت ہے۔ جن کا علاج ہومیوپیتھک ادویہ سے نہایت آسانی اور کامیابی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس علاج میں ہومیوپیتھی نے دنیا کے اندر نام حاصل کیا ہے۔

پہلے حصہ میں میں نے بتایا تھا کہ خصیۃ الرحم میں پہلے انڈا پکتا ہے اور اس کے بعد خونِ حیض کا اجراء ہوتا ہے ان مستورات میں جن میں خصیۃ الرحم غیر نشوونما یافتہ ہوتے ہیں، یا ہوتے ہی نہیں چونکہ ان میں انڈا نہیں پکتا اس لئے حیض نہیں ہوتا۔ جن مستورات میں

میں خصیۃ الرحم کے ہوتے ہوئے بھی انڈا نہیں پکتا، یا حیض نہیں ہوتا ان کی علامات مفصلہ ذیل ہوتی ہے۔ ان مستورات کا علاج کرنا اور علاج کرکے درست کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔

علامات۔ نوجوان عورتوں میں جب حیض کی رکاوٹ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی درد یا دوسری تکلیفات نہیں ہوتیں تو یہ رکاوٹ خصیۃ الرحم کی نامکمل نشو ونما کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن جن حالتوں میں کہ حیض کی رکاوٹ کے ساتھ درد ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دردوں کے ساتھ حیض ہوگا اور عام صحت خراب ہوجاتی ہے یا خراب رہتی ہے تو اس کی وجہ عموماً یہ ہوتی ہے کہ گو خصیۃ الرحم کافی نشو ونما یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں فعل کے اجراء کی طاقت نہیں ہوتی۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب خصیۃ الرحم کی نشو ونما بہت دیر میں ہوئی ہے۔ اور اسی واسطے حیض دیر میں نمودار ہوتے ہیں تو ان حیضوں کے ساتھ کسی قسم کا درد وغیرہ نہیں ہوتا، بلکہ طاقت اور صحت پہلے سے بھی زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ یہ حیض کی رکاوٹ کی دوسری شکل ہے۔ جس میں علاج کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔

مقدم الذکر حالتوں میں مریضہ کمزور، پیلی ہوتی ہے اور اس کی صحت بھی خراب ہوتی ہے۔ یا مریضہ دبلی پتلی، اور دموی مزاج ہوتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دوران خون میں کمزوری ہوتی ہے، اسی لئے ان مریضاؤں میں سردی سے ذکی الحسی ہوتی ہے۔ جاذبیت میں کمی، غذا سے نفرت، یا بے پرواہی اس کے برعکس ایسی بھی مریضائیں ہیں جن کی ظاہراً

شکل و شباہت سے صحت اور موٹاپہ ٹپکتا ہے۔ اُن کے رخسار سرخ ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کی مستورات میں حیض کی رکاوٹ ہمیشہ قریب قریب دیرینہ ہوتی ہے اور ان کے تمام نظام کو ماؤف کئے رہتی ہے۔ مؤخر الذکر حالت میں تکلیف حاد اور شدید ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ مقامی ہوتی ہے۔ ان دونوں قسم کی مریضاؤں میں حیض کے نشان ہر ماہ ہوتے ہیں، ان کے ساتھ لرزہ، کمر اور رانوں میں درد، شکم کے نچلے حصّہ میں بوجھ، عام سستی، بے آرامی ہوتی ہے۔ یہ علامات چند گھنٹے یا ایک دو دن رہنے کے بعد بغیر حیض نمودار ہوئے ہی ختم ہو جاتی ہے، یا حیض کے بجائے لیکوریا آتا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ حیض کی نمود کی یہ قدرتی کوشش ہمیشہ عارضی نہیں ہوتی۔ بلکہ گاہے گاہے شدید درد سر ہوتا ہے۔ روشنی اور آواز بعض اوقات ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ سر میں بھاری پن اور تپکن کی شکایت معدہ اور آنتوں کے فعل میں بے قاعدگی، چہرے پہ پیلاپن اور طاقت میں نمایاں کمی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ سانس میں رکاوٹ کے دورے، ہسٹریا کے دورے بھی ہوتے ہیں، اور ظاہراً طور پر مریضہ کی صحت بہت گری معلوم ہوتی ہے۔ بخار، سینہ میں درد، یا بعض وقت دق کی رغبت بھی ہو سکتی ہے۔

اس تکلیف کے لئے جو دوائیں آخر میں دی گئی ہیں، ان میں سے کوئی ایک مریضہ کے لئے موافق حال ہو سکتی ہے۔

حیض کا رک جانا

یہ دوسری نمود ہے، اس نمود میں پہلے حیض دکھائی دیتے ہیں مگر بعد میں

رک جاتے ہیں۔

ان کی بندش یکایک ہو سکتی ہے یا آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ مقدم الذکر حالت میں فوراً شدید اور خطرناک صورت بیماری اختیار کر سکتی ہے لیکن موٴخر الذکر میں یہ حالت طبعی خرابی کی پیش خیمہ ہوتی ہے مثلاً دق یا یہ رحم یا خصیۃ الرحم کی عضوی خرابیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

حیض کی یکایک بندش سردی لگ جانے سے جسم کے بھیگ جانے سے ہو سکتی ہے۔ جب سیلانِ حیض شروع ہوتا ہے۔ تو یکایک سردی لگ جانے یا بھیگ جانے سے حیض رُک جاتا ہے، نظامِ عصبی پر صدمہ مثلاً ڈر، یا یکایک اور فوری دماغی پریشانی یا جسمانی یا دماغی ابتری سے حیض کا سیلان دورانِ حیض رُک سکتا ہے۔

حیض کی دیرینہ رکاوٹ کی وجوہات مفصلہ ذیل ہو سکتی ہے۔ جسم میں کمزور کرنے والے اور آہستہ آہستہ ظاہر ہونے والے اثرات نوجوان لڑکیوں کا گھر میں بند رہنا۔ اور سستی کی زندگی بسر کرنا سخت دماغی محنت غذائیت کی کمی۔ لیکوریا۔ کوئی طبعی خرابی مثلاً دق وغیرہ یا رحم، خصیۃ الرحم، یا رحم کی جھلی کی نشو ونما میں خرابی۔ بعض اوقات اس تکلیف کے ساتھ حاد ورمی کیفیتیں اور بخار بھی ہوتا ہے۔

علامات:۔ رکاوٹ یا بندش حیض جس قدر اچانک ہوگی اسی قدر اس کی علامات اور نتائج زیادہ شدید ہوں گے۔ اس کے ساتھ زیادہ تر بخار، درد سر، نبض میں تیزی، پیاس، متلی اور طبعی ابتری کی دیگر علامات ہوتی ہیں۔ یا حیض کے یکایک بند

ہو جانے سے مقامی ورم مثلاً پھیپھڑوں میں، رحم میں یا خصیۃ الرحم میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں مریضہ میں اعصابی مزاج ہو۔ وہاں دماغ میں ورم اور دیگر دماغی تکلیفات بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ دماغی علامات ہمیشہ اسی وقت کم ہوتی ہیں۔ جب حیض عود کر آتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ جہاں حیض میں پہلے رکاوٹ نہ ہو اور مریضہ سخت بیمار ہو۔ تو اس شدت کی بیماری میں حیض کا آنا خطرے کی علامت ہے۔

حیض کی رکاوٹ سے ہسٹریا کی تکلیفات یا اعصابی دردوں کی نمود بھی بعض اوقات ہوتی ہے اور یہ تکلیف بڑھ کر سر پھیپھڑوں اور معدے کو ماؤف کر سکتی ہے۔ بعض وقت حیض کے بند ہونے کے سخت ترین نتائج اعصابی کمزوری، اعصابی تکلیفات مثلاً غشی نابینائی، کانوں میں آوازیں، سکتہ اور فالج بھی ہو سکتے ہیں۔

(VICARIOUS MENSTURAION) یعنی حیض کا شرمگاہ کی نالی کی بجائے کسی دوسرے مخرج سے آنا۔ یہ بھی ایک قسم کا سیلان خون ہے مگر اس کی کیفیت اتنی خطرناک اور مہلک نہیں ہوتی، جتنی دوسرے سیلان خون کی مثلاً اس قسم کا خون اگر پھیپھڑوں سے آئے تو پھیپھڑوں میں کسی قسم کی دق یا سل کی علامات نہیں ہوتی۔ لیکن ہو سکتا ہے۔ کہ کچھ مدت کے بعد (اگر مندرجہ بالا کیفیت کا علاج نہ کیا جائے) دق یا سل کی نمودیں ہو جائیں۔

حیض یا تو یکایک بند ہو جاتا ہے یا آہستہ آہستہ ماہ بماہ اس میں بے قاعدگی ہو کر بند ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خون کی مقدار کم

ہو تی جائے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خون کی مقدار رہے تو اتنی ہی مگر اس کی رنگت پھیکی پڑتی جائے اور آخر کار خون حیض کی بجائے پانی کی سی بے رنگ کی رطوبت رہ جائے، یا بے رنگ کی رطوبت ایک آدھ مہینہ آتی رہے اور اس کے بعد پھر ایک مہینہ اصلی خون حیض ہو اور اس کے بعد پھر وہی رطوبت لیکوریا کی زیادتی ہمیشہ حیض کے رک جانے کی موجب بنتی ہے۔

اسی قسم کی آہستہ آہستہ کمی حیض کو قطعی طور پر روک بھی دیتی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ وقت سن یاس (جب حیض بند ہو جاتے ہیں) کا ہو۔ چند سال تک سن یاس کے زمانہ میں حیض بند رہ کر آلات تناسل میں پھرتی، اور چالاکی آسکتی ہے اور عورت کو پھر باقاعدہ حیض کچھ مدت کے لئے جاری ہو سکتے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیض میں کمی اور رکاوٹ دراصل بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ یہ تمام نظام جسم کی خرابی کی ایک کیفیت ہے۔ اور جب تک نظام جسم کی ان خرابیوں کو درست نہ کیا جائے یہ ظاہراً خرابی درست نہیں ہو سکتی۔

معالجہ :- معالجہ، وجوہات جن کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کی بنا پر کرنا چاہیئے، یا عام صحت جسمانی کو درست کرنا چاہیئے وجوہات سے میرا مطلب فوری وجوہات ہیں۔ مثلاً پاؤں بھیگنے، سردی لگنے وغیرہ سے حیض کا رک جانا یا بند ہو جانا اور جسمانی کیفیتوں سے میرا مطلب طبعی کمزوریاں، اور طبعی تکلیفات ہیں یاد رہے کہ جب تکلیف فوری یا حاد ہو۔ تو اس کا علاج بالمثل دوا سے کرنا چاہیئے۔ اور

علاج کے دوران میں دواؤں کو جلد جلد دہرانا چاہیئے لیکن دیرینہ تکلیفات اور نظام جسم کی مزمن تکلیفات کو اونچی طاقتوں سے درست کرنا چاہیئے۔ مگران طاقتوں کو جلد جلد نہ دہرانا چاہیئے۔ بعض وقت ان دواؤں کا اثر ہفتوں اور مہینوں تک رہتا ہے۔ جب تک ان دواؤں کا اثر جاری رہے، دوسری دوا نہ دینی چاہیئے۔ اس علاج سے نہ صرف حیض ہی جاری ہو جائے گا بلکہ باقی جسمانی خرابیاں بھی رفع ہو کر مریضہ مکمل تندرست اور صحت یاب ہو جائے گی۔ اسی طرح سے مقامی اور آلات تناسل کی عضوی تکلیفات میں مندرجہ صدر طریقہ سے علاج کامیاب ہو سکتا ہے۔ جہاں لیکوریا، خون کی قے اور دوسری شدید قسم کی تکلیفات حیض کے رُک جانے کے ساتھ ساتھ موجود ہوں وہاں بھی اسی طریقہ سے علاج کیا جاتا ہے۔

جزوی حیض کی رکاوٹ

اس میں حیض مسلسل مہینوں تک بند رہتے ہیں مگر کبھی کبھی اور بے قاعدگی سے ظاہر ہوتے ہیں ان کو بھی بے قاعدہ حیض کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ان میں بھی گو مکمل طور پر حیض بند نہیں ہوتے، تاہم یہ نہایت بے قاعدہ ہوتے ہیں اور خون کی مقدار بھی بالکل بے قاعدہ ہوتی ہے۔

بعض حالتوں میں اس بے قاعدگی کی وجہ سے عورتوں کے نظام میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم اور بعض حالتوں میں حیض کی اس بے قاعدگی کے ساتھ حیض کے ساتھ

درد ہوتا ہے۔ اس درد کی کمی یا زیادتی مختلف عورتوں میں مختلف ہوتی ہے۔

اس بے قاعدگی میں ہو سکتا ہے۔ کہ حیض کا وقت کم ہو جائے یعنی دو حیضوں کے درمیان ایک اور حیض ہو جائے۔ اس حیض میں خون زیادہ بھی ہو سکتا ہے یا اس بے قاعدگی کے زمانہ میں بہت مدت تک حیض نہ ہو، یا اگر حیض ہو تو بجائے اٹھائیس دن کے بہت زیادہ دنوں کے بعد ہو۔ اور جب ہو۔ خون حیض بالکل ٹھیک مقدار میں اور ٹھیک طریق پر ہے۔

اس جزوی حیض کی رکاوٹ کے قریب قریب وہی وجوہات ہیں جن کا بیان اوپر کیا گیا ہے۔

معالجہ:۔ اس کے علاج کے لئے یہ ضروری ہے کہ مریضہ کے تمام نظام کو بغور دیکھا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ مرض کی بنیاد کہاں موجود ہے اور اس بنیاد کو بالمثل ہومیو پیتھک ادویہ سے درست کرنا چاہیئے۔

("امراض نسواں" ص۲۳۲ تا ص۲۳۷ مؤلفہ ڈاکٹر کاشی رام، مطبوعہ کامیاب بکڈپو۔ نزد اُردو بازار لاہور ۲)

(مملوکہ "ہمدرد" لائبریری)

اس پوری تفصیل سے آپ پر یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ عورتوں کو حیض نہ آنے کی عموماً تین صورتیں ہوتی ہیں۔

اوّل صورت تو یہ ہوتی ہے کہ عورتوں کے اعضاء تناسل صحیح طور پر نشوونما نہیں پاتے اس لئے اُنہیں حیض نہیں آتا۔ یا ان میں کوئی

نقص رہ جاتا ہے اور وہ حیض آنے کے قابل نہیں ہو پاتے۔ یا ان عورتوں کی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اُنہیں حیض آتے ہی نہیں ان کے لئے یہ کوئی نقص یا مرض نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ حیض آئے بغیر ہی حمل سے رہ جاتی ہیں ان کے بچے بھی ہوتے ہیں اور وہ ہر اعتبار سے بالکل نارمل عورت ہوتی ہیں بجز اس کے کہ ان کو حیض نہیں آتا۔

دوسری قسم کی وہ عورتیں ہوتی ہیں جنہیں شروع میں حیض آیا لیکن پھر بند ہو گیا۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایام حیض میں بھیگ جانا، سردی کھا جانا، کمزور کرنے والے آہستہ آہستہ ظاہر ہونے والے اثرات صدمہ، ڈر، خوف، دماغی پریشانی، جسمانی یا دماغی ابتری، گھروں میں بند رہنا، غذائیت کی کمی، لیکوریا، کوئی طبعی خرابی، مثلاً دق اور سل وغیرہ، رحم خصیۃ الرحم یا رحم کی جبلی کی نشوونما میں خرابی، ذیابیطس، کینسر وغیرہ سے عام طور پر ایام بند ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے کیس عام ہیں۔ کسی اچھے ڈاکٹر اور طبیب کے مطب میں جا کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس کے زیر علاج کتنی مریضائیں اس مرض کی شکار ہیں۔

تیسری قسم کی وہ عورتیں ہوتی ہیں جنہیں حیض کی جزوی رکاوٹ کا عارضہ ہوتا ہے۔ حیض آتا ہے پھر یکایک کئی کئی مہینوں کے لئے حیض بند ہو جاتا ہے۔ حیض میں کوئی باقاعدگی نہیں ہوتی۔ اس قسم کے کیس بھی بہت کافی ہوتے ہیں۔

یہ موٹی موٹی تین اقسام ہیں جن کی تفصیل ڈاکٹر صاحب نے دے دی ہے اور جسے آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس ساری تفصیل سے آپ

نے دیکھ لیا کہ وہ عورتیں جن کی عمر کا تقاضا ہے کہ انہیں حیض آنا چاہیئے۔ لیکن اُنہیں اس تقاضے کے برعکس حیض نہیں آتا، ہر معاشرہ میں کس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ، وہ نارمل عورتیں الگ رہیں جو کسی واقعی اور صحیح عذر کی بناء پر مثلاً دودھ پلانے کی وجہ سے جنہیں حیض نہیں آتا یا وہ بانجھ ہیں اور بانجھ پن کی وجہ سے انہیں ایام نہیں آتے، لہٰذا عورتوں میں خاصی بڑی تعداد ایسی عورتوں کی ہوتی ہے۔ جنہیں حیض آنا چاہیئے مگر کسی وجہ سے حیض نہیں آتا۔ اگر ایسی عورتوں کو طلاق دے دی جائے تو وہ اپنی عدت کس طرح گذاریں گی؟

امام مالکؒ نے تو فرما دیا کہ وہ نو ماہ تک انتظار کرتی رہے اور نو ماہ گذر جانے کے بعد ہم یہ فتویٰ دیں گے کہ وہ حاملہ نہیں ہے لہٰذا نو ماہ گذار کر اب وہ مہینوں کے حساب سے عدت گذارے۔ اس طرح ایک سال کے بعد وہ عدت سے باہر ہو سکے گی۔ اب شوہر کو اس کے نان و نفقہ اور سکنیٰ مہیّا کرنے کی فریضہ سے نجات مل سکے گی۔ اس سے پہلے نہیں۔ نیز وہ عورت بھی درمیان میں لٹک کر رہ گئی ہے۔ نہ وہ شوہر کا گھر چھوڑ سکتی ہے نہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔ ازیں سو رانده اوراز آں سو درمانده کی ناقابل برداشت اذیت میں وہ ایک سال گذارے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے منقول روایات نے تو اور بھی کمال کیا ہے کہ ایسی عورت سن یاس میں داخل ہو جانے تک برابر انتظار ہی کرتی رہے۔ اس میں دس سال گذر جائیں۔ بیس سال گذر

جائیں، تیس چالیس سال گذر جائیں۔ بہر حال جبتک سن یاس میں وہ داخل نہ ہو جائے وہ عدت ہی گذارتی رہے۔ اس کا شوہر طلاق دے کر یہ سزا بھگتے کہ غیر معینہ عرصہ تک اس کا نان ونفقہ برداشت کرے۔ اسے گھر سے نہ نکالے اور وہ عورت بھی قید ہو کر رہ جائے وہ نہ شوہر کا گھر چھوڑے نہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرے۔ ان حضرات نے یہ نہیں بتایا کہ سن یاس کا فیصلہ وہ کس طرح فرمائیں گے سن یاس تو اسے ہی کہتے ہیں کہ عورت کو ماہواری ایام آرہے تھے۔ اور آتے آتے رفتہ رفتہ بند ہو گئے۔ لیکن یہاں تو وہ شروع سے ہی بند ہیں۔ تو کیا سالوں کے حساب سے کہ عورت چالیس پنتالیس، یا بچاس سال کی ہو گئی ہے۔ لہٰذا فیصلہ کر دیا جائے گا کہ وہ سن یاس کو پہنچ گئی ہے یا کوئی اور ناقابل عمل چکر چلایا جائے گا۔ بہر حال اس عورت کی زندگی قطعًا برباد ہو گئی۔ پچاس سال کی یہ بڑھیا۔ کہاں جائے گی۔ اس کے ماں باپ مر چکے ہوں گے۔ کوئی اس سے اس عمر میں شادی نہیں کرے گا۔ وہ باقی عمر کاسۂ گدائی لئے دردر کی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔

ملاحظہ تو فرمائیے کہ محض ایک ذرا سی مسامحت سے کس قدر ہولناک نتائج معاشرہ کو بھگتنا پڑے حالانکہ قرآن کریم نے ایسی تمام عورتوں کے لئے مہینوں کے حساب سے (تین ماہ) عدت مقرر فرمادی تھی اور لَمْ يَحِضْنَ میں لَمْ (نفی جحد) سے بتادیا تھا کہ یہ وہ عورتیں ہیں جن کی عمر کا تقاضا ماہواری ایام آنے کا ہے لیکن انہیں کسی عذر، بیماری، نقص، یا فطری طور پر حیض نہیں آرہا ہے تو

وہ تین مہینے انتظار کر کے عدت سے باہر ہو جائیں۔

لیکن یہ دشواری عام فقہاء کو محض اس لئے پیش آئی کہ لَمۡ یَحِضۡنَ کو انہوں نے نابالغ لڑکیوں پر محمول فرمالیا۔ اور مَا حِضۡنَ اور لَمۡ یَحِضۡنَ کا فرق اس لئے نظر انداز کر دینا پڑا۔ کیونکہ نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو وہ جائز قرار دے چکے تھے جس کی وجہ محض وہ روایت تھی جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح چھ سال کی عمر میں اور رخصتی نو سال کی عمر میں بتائی گئی ہے۔ ہم کتاب النکاح میں اس روایت پر بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ یہ روایت واقعات کے خلاف ہے لہٰذا غلط ہے۔

غیر مدخولہ عورت کی عدت نہیں ہوتی

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہیں قرآن کریم کا یہ صریح حکم بھی نظر انداز فرمانا پڑا کہ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ (۳۳/۴۹)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تم مؤمن عورتوں سے نکاح کرو، پھر اس سے پہلے ہی کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ تم انہیں طلاق دیدو تو تمہارے لئے ان کے ذمہ کوئی عدت نہیں ہے جسے وہ شمار کریں لہٰذا تم انہیں کچھ سامان دیدو اور خوبصورتی کے ساتھ انہیں رخصت کر دو۔

ظاہر ہے کہ نابالغ لڑکی سے اگر نکاح جائز بھی ہو تو نابالغی کی حالت میں ان سے جنسی تعلق تو قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر انہیں طلاق

دی جائے گی تو انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دی جائے گی قرآن کریم کی رو سے ان پر عدت واجب ہی نہیں ہوتی ہے کہ قرآن کریم اس کا حکم بیان فرمائے۔ ان کے حق میں تو عدت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا وَاللّٰٓئِیۡ لَمۡ یَحِضۡنَ کو نابالغ لڑکیوں پر محمول کرنا اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔

کچھ عرصہ ہوا۔ میں نے لکھا تھا کہ۔

عدتِ طلاق کا سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ان کم سن اور نابالغ لڑکیوں کے شوہر ان سے نکاح کرنے کے بعد اپنی جنسی تسکین حاصل کرتے ہوئے ان سے مقاربت بھی کرتے رہے ہوں۔ کیونکہ عدت کے لئے جہاں نکاح ضروری ہے وہیں نکاح کے بعد مقاربت بھی ضروری ہے تو اس طرح قرآن کریم صریح طور پر کمسن اور نابالغ لڑکیوں کے ساتھ اگر نکاح کو جائز قرار دیتا ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اس کے ساتھ ہی ان معصوم بچیوں کے ساتھ جنسی کھیل کھیلتے رہنے کی بھی اجازت دیتا ہے جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا کی کسی تہذیب نے آج تک اس وحشیانہ اور بہیمانہ بوالہوسی کو جائز قرار نہیں دیا۔ تو کیا قرآن اسے جائز قرار دے سکتا ہے ؟ ہرگز نہیں۔ یہ قرآن کریم پر اتہام ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہمارے بلند مرتبت علمائے کرام جوش مخالفت میں اتنا بھی تو نہیں سوچتے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں اس کی زد

کہاں پڑتی ہے۔

اس پر میرے خلاف جو شور وغوغا ہوا وہ تو اپنی جگہ، لیکن بعض علمائے کرام کی طرف سے میری تردید میں یہ بھی فرمایا گیا تھا کہ نابالغ لڑکی اگر بلوغت کے قریب ہو تو اس سے مقاربت کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ ایسی لڑکیوں سے مقاربت ہو سکتی ہے۔ استغفراللہ!

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئیے

لیکن بر سبیل تسلیم یہ جواب بھی اسی وقت کام دے سکتا تھا۔ جبکہ وہ صرف قریب البلوغ لڑکیوں ہی کے نکاح کے جواز کے قائل ہوتے۔ غضب تو یہ ہے کہ وہ تو دودھ پیتی بچیوں تک کے نکاح کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ کیا ان کے ساتھ بھی مقاربت کو جائز کہہ دیا جائے گا؟

آپ تسلیم فرمائیں گے کہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق حدیث سے شروع ہوئی تھی کہ ان سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے چھ سال کی عمر میں نکاح فرمالیا تھا۔ اس بات کو صحیح ثابت فرمانے کے لئے وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ سے استدلال فرمایا گیا تھا کہ وہ لڑکیاں جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو، ان کی عدت قرآن کریم نے تین حیض مقرر فرمائی ہے۔ لہٰذا اس سے نابالغ لڑکیوں کے نکاح کا جواز ثابت ہوگیا۔ اس استدلال کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا کہ۔

نابالغ لڑکیاں اس آیت سے اس وقت مراد ہو سکتی ہیں جبکہ ان کے ساتھ جنسی عمل بروئے کار لانے کی اجازت بھی دی جائے۔

کیونکہ غیر مدخولہ عورت کی تو قرآن کریم کی رو سے عدت ہی نہیں ہوتی آپ تو چھوٹی سے چھوٹی بچی کے نکاح کو جائز فرماتے ہیں خواہ وہ دو دن کی دودھ پیتی بچی ہی کیوں نہ ہو۔ تو جب تک آپ اس کی اجازت نہ دیں کہ دو دن کی دودھ پیتی بچی سے بھی جماع کر لینا جائز ہے۔ آپ اس آیت کریمہ سے دو دن کی دودھ پیتی بچی کے نکاح کے جواز کا ثبوت کس طرح دے سکتے ہیں۔ ہمارا نزاع صرف قریب البلوغ لڑکی کے نکاح کے جواز اور عدم جواز میں تو نہیں ہے بلکہ مطلق کم سن، نابالغ، چھوٹی سے چھوٹی بچی سے لے کر قریب البلوغ لڑکیوں تک کے نکاح کے جواز و عدم جواز میں ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ حضرات خود بات کو سمجھتے ہی نہیں یا خود تو سمجھتے ہیں مگر اپنے قارئین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

ایک دوسرے عزیز فاضل نے بھی اسی بات کو مع ایک اضافہ کے دہرایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"اسلامی شریعت کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ عدت کے لئے صرف خلوتِ صحیحہ کافی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ باقاعدہ مقاربت بھی کی جائے۔ پھر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ان حضرات نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ ایک قریب البلوغ لڑکی مقاربت کے قابل نہیں ہوتی اور نہ اسے اس کی خواہش ہوتی ہے۔"

(ہمارے عائلی مسائل صفحہ ۲۴۶-۲۴۷۔ مؤلفہ مولانا تقی عثمانی۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی)

ان فاضل عزیز نے تو کمال ہی فرمایا ہے۔ انہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ خلوتِ صحیحہ کہتے کسے ہیں۔ اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ میرے ان عزیز کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خلوتِ صحیحہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ اسے مجامعت کے امکان کی وجہ سے مجامعت کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں مجامعت کا امکان ہی نہ ہو وہاں خلوتِ صحیحہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے ایک دودھ پیتی بچی کو گود میں لے کر آپ ایک کمرہ میں بند ہو جائیں تو اسے خلوتِ صحیحہ نہیں کہا جا سکتا۔

فقہ حنفی کی مشہور و متداول کتاب ہدایہ ہی کو دیکھ لیا ہوتا جہاں لکھا ہے۔

"جب کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ خلوت کرے (خلوتِ صحیحہ) اور وہاں مجامعت سے کوئی مانع موجود نہ ہو (وہ مانع حسّی ہو یا طبعی ہو یا شرعی ہو، حاشیہ از مولانا عبدالحی لکھنوی) پھر وہ اسے طلاق دیدے تو وہ پورے مہر کی حقدار ہو گی۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اسے نصف مہر ملے گا (کیونکہ وہ چھونے سے پہلے طلاق دیتا ہے۔ لہٰذا نص قرآنی کے مطابق آدھا مہر ہونا چاہیئے۔ از محشی) کیونکہ جو عقدِ نکاح ہوا تھا وہ عمل جماع کے ساتھ ہی مکمل اور پورا ہوتا ہے۔ لہٰذا جماع کے بغیر مہر مؤکد نہیں ہو سکتا۔ ہماری (حنفیہ کی) دلیل یہ ہے کہ عورت نے وہ گوہر عصمت حوالہ کر دیا جس کا بدل مہر تھا۔ چنانچہ اس نے ان تمام موانع کو اٹھا دیا جو حائل ہو سکتے تھے عورت کی استطاعت میں یہی تھا

لہٰذا عصمت کا بدل یعنی مہر مؤکد ہو گیا جیسا کہ بیع میں ہوا کرتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک بیمار ہو یا رمضان میں روزہ سے ہو یا فرض حج کا احرام باندھے ہوئے ہو یا نفل حج یا عمرہ کا احرام باندھے ہو یا عورت کو حیض آ رہا ہو تو یہ خلوتِ صحیحہ نہیں ہو گی حتیٰ کہ اگر اس نے بیوی کو طلاق دیدی تو اسے نصف مہر ملے گا۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں موانع ہیں۔ رہا مرض تو اس سے ایسی بیماری مراد ہو گی جو مجامعت سے مانع ہو یا جس کی وجہ سے مرد کو نقصان پہنچ سکتا ہو (یعنی مریض کو، وہ مرد ہو یا عورت ہو از محشی) کہا گیا ہے کہ شوہر کا مرض عدم نشاط اور شکستگی اور سستی سے کسی حال میں خالی نہیں ہوتا اور یہی تفصیل عورت کی بیماری میں بھی ہے۔ رہ گئے رمضان کے روزے تو چونکہ روزہ میں جماع کرنے سے قضا اور کفارہ لازم آتا ہے۔ اور احرام میں جماع کرنے سے قربانی دینی پڑتی ہے۔ حج فاسد ہوتا ہے اور پھر حج کی قضا بھی کرنی پڑتی ہے اور عورت کو حیض آ رہا ہو تو وہ طبعاً اور شرعاً جماع سے مانع ہوتا ہے (لہٰذا ان موانع کے ساتھ خلوت ہو بھی تو وہ خلوتِ صحیحہ نہیں ہو گی) (ہدایہ صفحہ ۳۲۵-۳۲۶ ج ۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

اس تصریح سے ظاہر ہے کہ خود فقہائے حنفیہ کے نزدیک خلوتِ صحیحہ اسے کہتے ہیں کہ عورت اپنا گوہرِ عصمت مرد کو پیش کر دے تمام رکاوٹیں دور کر دے۔ اپنے نفس پر مرد کو پوری قدرت

دیدے وہاں مجامعت کرنے میں کوئی حسی، طبعی اور شرعی مانع موجود نہ ہو۔ اس صورت میں چونکہ عین ممکن ہے کہ مرد نے ضرور جماع کر لیا ہوگا۔ لہٰذا ایسی خلوت کو جماع کا قائم مقام سمجھا جائے گا۔ ایک کمسن، نابالغ دو چار سال یا چھ سال کی بچی نہ اپنا گوہرِ عصمت مرد کو پیش کرتی ہے۔ نہ وہ تمام رکاوٹیں دور کرتی ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے نفس پر برضا و رغبت مرد کو پوری پوری قدرت دیدی ہے نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مرد تنہائی میں اس کے ساتھ رہا ہے تو اس نے اس سے ضرور ہی جماع کر لیا ہوگا۔ ([illegible] لوگوں کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا لیکن) عام مہذب پڑھے لکھے لوگوں کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ انہیں ایک کمسن، خورد سال بچی کے ساتھ جماع کرنے میں حسی، عقلی، طبعی اور شرعی ہر طرح کے موانع موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی مرد ایسی بچی کے ساتھ تنہائی میں رہا بھی ہو تو یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اس کے ساتھ یہ نازیبا اور شرمناک حرکت کی ہوگی۔ لہٰذا اسے خلوتِ صحیحہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ اس خلوت کو جماع کا قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک کم سن اور خورد سال بچی کے ساتھ مجامعت کرنا انتہائی بربریت، وحشت اور درندگی کی مثال ہے جو بچی کی صحت اور اس کی زندگی کو تباہ کر دینے کے مرادف ہے۔

عزیز موصوف نے آخر میں وہی بات پھر دہرائی ہے کہ۔

"پھر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ان حضرات نے یہ دعویٰ کیسے کر دیا کہ ایک قریب البلوغ لڑکی مقاربت کے قابل

نہیں ہوتی اور نہ اسے اس کی خواہش ہوتی ہے۔"

اس کے جواب میں مجھے پھر وہی بات دہرانی پڑتی ہے جو اس سے پہلے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان مابہ النزاع قریب البلوغ لڑکی کے نکاح کا جواز یا عدم جواز نہیں ہے۔ بلکہ تمام صغر سنی کی شادیوں کا جواز و عدم جواز ہے۔ صغیر السن لڑکیاں دو دن کی، چار دن کی، چھ ماہ کی، دس ماہ کی، پانچ سال کی اور چھ سال کی، آٹھ اور نو سال کی، گیارہ اور بارہ سال کی سب ہوتی ہیں۔ اور آپ ان سب کے نکاح کر دینے کے قائل ہیں۔ آپ کے سامنے قرآنی دلیل پیش کی جاتی ہے تو آپ سب کو چھوڑ کر صرف قریب البلوغ لڑکیوں کو پکڑ لیتے ہیں کہ ان سے تو مقاربت ہو سکتی ہے آپ سیدھی سیدھی طرح یہ فرمائیے کہ کمسن اور صغیر السن لڑکیوں کی شادی کرنا تو جائز نہیں ہے۔ البتہ قریب البلوغ لڑکیوں کی شادی کو ہم جائز سمجھتے ہیں تو پھر ہم اس کا جواب دیں گے۔ لیکن جب تک آپ ہر کمسن اور صغیر السن لڑکے اور لڑکی کے نکاح کے جواز کے قائل ہیں اس وقت تک آپ قریب البلوغ لڑکیوں کی آڑ میں دو دو دن کی لڑکیوں کے نکاح کو جائز قرار نہیں دے سکتے۔

بہر حال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے متعلق مذکورہ بالا روایت کو صحیح تسلیم کر لینے کی بنا پر ہمارے فقہائے کرام کو وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ کی غلط تفسیر پر مجبور ہونا پڑا اور ساتھ ہی سورۂ احزاب کی آیت کریمہ (۳۳/۴۹) کو نظر انداز فرمانا پڑا جس میں غیر مدخولہ عورتوں کے لئے کوئی عدت نہ ہونے کو بیان فرمایا

گیا ہے۔ نیز اس قسم کے دور از کار نامناسب فیصلے فرمانے پڑے کہ جن عورتوں کو ماہواری ایام نہ ہو رہے ہوں، انہیں بقول امام مالکؒ ایک سال تک اور بقول جمہور فقہاء و ائمہ کے غیر معینہ مدت تک انتظار کرتے رہنا چاہیئے تاآنکہ وہ سنِ یاس کو پہنچ جائیں۔

فقہائے کرام کا عذر ایک غلط بات کو صحیح تسلیم کر لینے سے آدمی کو کس قدر لامتناہی غلط باتیں ماننا پڑتی ہیں، اس کی غالباً اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔ لیکن ہم حضرات فقہائے کرام پر قطعاً کوئی طعن نہیں کر سکتے۔ محمد ابن شہاب زہری کی اس روایت میں چونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بلند شخصیت ہی نہیں بلکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اتنی بلند ترین شخصیت کو جن سے بلند تر شخصیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ملوث کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہمارے فقہائے کرام اس کے سوا اور کرتے بھی کیا۔ اُنہیں اس بات کو صحیح اور درست ثابت کرنے کے لئے یہ سارے پاپڑ بیلنے پڑے۔ ان حضرات کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ اس روایت میں جو کچھ بیان کیا گیا تھا وہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ کیونکہ محمد ابن شہاب زہری کی شخصیت محدثین کے نزدیک اتنی اونچی مانی جاتی تھی کہ اس طرف ذہن نہ جانا مستبعد نہیں کہا جا سکتا۔

اس پوری تفصیل کے بعد بات سمجھ میں آگئی ہو گی کہ ہمارے فقہائے کرام نے مذکورہ بالا مسئلہ میں جو فیصلے فرمائے ہیں وہ قرآن کریم سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اگر عورتوں کو ماہواری ایام کسی وجہ

سے نہیں ہو رہے ہیں تو قرآن کریم کی رو سے ان کی عدت تین ماہ ہے انہیں ایک سال تک یا غیر متعینہ عرصہ تک انتظار کرتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ مہینوں کے حساب سے عدت کے تین ماہ پورے کرلیں اور عدت سے باہر ہو جائیں۔

حمل کا علم

رہ گئی یہ بات کہ یہ امر کیسے معلوم ہو گا کہ عورت کو حمل نہیں ہے جبکہ قرآن کریم نے حاملہ کی عدت وضع حمل مقرر فرمائی ہے۔ تین ماہ کی عدت تو اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ عورت کو حمل نہیں ہے۔ امام مالکؒ نے ایک سال تک انتظار کرنے کے لئے اسی وجہ سے فرمایا ہے کہ نو ماہ گذر جانے کے بعد یہ معلوم ہو جائے گا کہ حمل نہیں ہے۔ اس کے بعد عورت سے کہا جائیگا کہ اب وہ تین ماہ پورے کر کے عدت سے باہر ہو جائے۔

ہمارے فقہائے کرام کے زمانہ میں ممکن ہے کہ ایسے طریقے دریافت نہ ہو سکے ہوں جن سے فیصلہ کیا جا سکے کہ حمل ہے یا نہیں ہے لیکن آج میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ اس امر کا یقینی علم حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں رہا۔ آج تو چھ ہفتے کے بعد عورت کا پیشاب ہی ٹسٹ کر لینے سے یہ بات حتمی طور پر معلوم کی جا سکتی ہے کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں ہے۔ جب چھ ہفتے کے بعد یہ معلوم کر لینا ممکن ہے تو تین ماہ میں تو اور بھی یقینی علم حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اب یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ اگر میڈیکل رپورٹ سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ عورت کو حمل ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہو گی اور اگر یہ ثابت

ہوجائے کہ حمل نہیں ہے تو اس کی عدت تین ماہ گذرنے کے ساتھ پوری ہوجائے گی۔ اسے خواہ مخواہ انتظار کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حمل کی اکثر مدت یہاں یہ سوال اُٹھایا جائے گا کہ میڈیکل رپورٹ اس سلسلہ میں یقینی نہیں مانی جا سکتی کہ عورت کو حمل نہیں ہے۔ حمل کی مدت عام طور پر نو ماہ ہوتی ہے اس لئے عام طور پر چھ ہفتہ کے بعد میڈیکل رپورٹ سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں۔ لیکن اسے یقینی اور حتمی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حمل کی مدت نو مہینے ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس سے بہت زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ اگر نو مہینے میں وضع حمل ہونا ہو تب تو چھ ہفتے کے بعد پیشاب کو ٹسٹ کر کے پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر وضع حمل دو سال، چار سال یا سات سال میں ہونا ہو یا اس کی کوئی حد ہی متعین نہ ہو تو چھ ہفتے میں اس کا پتہ چلا لینا قطعاً ممکن نہیں ہو سکتا۔ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کے سلسلہ میں ہمارے فقہاء سے مختلف اقوال منقول ہیں چنانچہ امام محمد بن قدامہ مقدسی رقم طراز ہیں۔

"ظاہر مذہب یہی ہے کہ حمل کی انتہائی مدت چار سال ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ کا قول یہی ہے اور امام مالکؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے روایت کیا جاتا ہے کہ حمل کی انتہائی مدت دو سال ہوتی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے ایسا ہی نقل کیا گیا ہے۔ سفیان ثوریؒ اور امام ابوحنیفہؒ

کا مذہب یہی ہے کیونکہ جمیلہ بنت سعد نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ عورت حمل کو دو سال سے زیادہ نہیں رکھ سکتی۔ اس قسم کا قطعی اندازہ یا توتوقیفی طور پر (بذریعہ وحی کے) ہو سکتا تھا۔ یا اتفاق کے طور پر (کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہو) لیکن یہاں دونوں باتیں موجود نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کی۔ واقعات میں بھی ایسا ہی پایا گیا ہے کیونکہ ضحاک بن مزاحم اور ہرا ابن حبان دونوں کی ماؤں نے اُنہیں دو سال تک پیٹ میں رکھا تھا۔ لیث نے کہا ہے کہ حمل کی انتہائی مدت تین سال ہے۔ چنانچہ عمر بن عبداللہ کی باندی نے تین سال بعد ولادت کی تھی۔ عباد ابن عوام نے کہا ہے کہ حمل کی انتہائی مدت پانچ سال ہے۔ زہری نے کہا ہے کہ عورت بعض اوقات حمل کو چھ سال اور سات سال تک رکھتی ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ حمل کا کوئی انتہائی وقت نہیں ہے جسے مقرر کیا جا سکے۔

ہم (یعنی شافعیہ) کہتے ہیں کہ جہاں نص موجود نہ ہو وہاں واقعات کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ حمل چار سال تک پایا گیا ہے چنانچہ ولید بن مسلم کی روایت ہے کہ میں نے امام مالک ابن انسؒ کی خدمت میں حضرت عائشہؓ سے جمیلہ بنت سعد کی روایت نقل کی کہ عورت دو سال سے زیادہ حمل کو نہیں رکھ سکتی تو امام مالکؒ نے فرمایا

سبحان اللہ! یہ کون کہتا ہے؟ یہ ہماری پڑوسن، محمد بن عجلان کی بیوی زچگی سے پہلے چار سال تک حمل سے رہتی ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ خود محمد ابن عجلان بھی اپنے ماں کے شکم میں چار سال تک رہے تھے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بنو عجلان قبیلہ کی عورتیں چار سال تک حمل سے رہتی ہیں۔ عجلان کی بیوی نے تین بطن جنے اور ہر دفعہ چار سال میں ولادت ہوئی محمد ابن عبداللہ بن الحسن ابن الحسن ابن علی اپنی ماں کے شکم میں چار سال تک رہے۔ اسی طرح ابراہیم ابن نجیح عقیلی بھی چار سال میں پیدا ہوئے۔ یہ ابوالخطاب نے بیان کیا ہے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ چار سال تک حمل رہتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔"

(المغنی لابن قدامہ ص ۴۷۷-۴۷۸ ج ۷)

لہٰذا اگر یہ بات مان لی جائے کہ حمل دو سال تک رہ سکتا ہے۔ یا چار سال تک یا پانچ، چھ، سات سال تک رہ سکتا ہے یا حمل کی کوئی انتہائی حد ہی نہیں ہے (جیسا کہ ابھی نقل ہوا ہے) تو چھ ہفتے میں حمل کا اندیشہ کس طرح یقینی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے؟

موجودہ میڈیکل سائنس بتاتی ہے کہ حمل کی صحیح مدت دو سو اسی دن ہوتی ہے۔ حساب میں غلطی ہو سکتی ہے، کیونکہ عام طور پر عورتیں حساب کو صحیح طور پر یاد نہیں رکھ پاتیں اس لئے دس دن کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر دو سو نوے دن گذر جائیں اور وضع

حمل نہ ہو سکے تو فوراً مصنوعی ذرائع سے وضع حمل کی کوشش لازم ہے۔ کیونکہ اگر پورے تین سو دن گذر جائیں اور وضع حمل نہ ہو پائے تو خون میں اس قسم کی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں کہ بچہ کی موت واقع ہو جاتی ہے اور ماں کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میڈیکل سائنس کی رو سے تین سو دن سے زیادہ حمل نہیں رہ سکتا۔ تقریباً دو سو سال سے ایسا کوئی کیس رپورٹ نہیں ہو سکا کہ تین سو دن سے زیادہ کسی بھی عورت کو حمل رہا ہو۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے یونیورسٹی میں ایم بی بی ایس کے کورس کے لئے پروفیسر ڈاکٹر سر کامنز برکلے، جے ایس فیربرین، کلفورڈ وائٹ کے زیرادارت دس چوٹی کے ڈاکٹروں سے علم الولادت کے نام سے جو کتاب مرتب کرائی تھی اور جس کا ڈاکٹر خلیل الرحمٰن ایم بی بی ایس اور ڈاکٹر محمد حسین صاحب ایم بی بی ایس سے اُردو میں ترجمہ کرایا گیا تھا۔ اس کے صفحہ ۸۷-۸۹ ج۱ پر یہ تصریحات موجود ہیں۔

"یوٹروجسٹیشن (UTEROGESTATION) یعنی رحمی حمل کی اوسط مدت ۲۷۳ دن ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ایسی مثالوں سے لگایا گیا ہے جن میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ صرف ایک بار جماع ہوا ہے۔ اس عدد (۲۷۳ دن) کو مختلف مشاہدین نے قریبی طور پر تصدیق کیا ہے۔ تاہم اسے انسانی یوٹروجسٹیشن (رحمی حمل) کی حقیقی مدت کا مظہر نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ تو صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک واحد بار جماع سے لے کر وضع حمل کے وقت تک کتنے ایام گذرتے ہیں۔ اس سے اووم (بیضہ)

کی بار وری کی تاریخ، یا استقرارِ حمل کا اصل وقت معلوم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ یہ امر بخوبی معلوم ہے کہ سپر میٹا زوا (SPERMATA ZOA) یعنی حیوانات منویہ جسم کے باہر موافق حالات میں تقریباً دس یوم اور جسم کے اندر نہایت موافق حالات کے تحت تقریباً اٹھارہ سے اکیس روز زندہ رہتے ہیں۔ لہٰذا نظری طور پر ایک بار جماع ہو چکنے کے چودہ روز بعد بھی بارآوری واقع ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ امر غالب تر ہے کہ استقرارِ حمل ایک معلوم واحد جماع کے بعد اوسطاً چار یوم کے اندر واقع ہوتا ہے۔

یہ امر کہ حمل ۳۰۰ دن تک یا زیادہ طول کھینچ سکتا ہے، طبی قانونی نگاہ سے بہت دلچسپ ہے۔ کیونکہ اس پر بچہ کی لیجیٹی میسی (LAGITIMACY) یعنی صحیح النسبی منحصر ہو سکتی ہے۔ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قانون نے یوٹرو جسٹیشن (رحمی حمل) کا کوئی معین زمانہ مقرر نہیں کیا ہے۔ اسکاٹ لینڈ (SCOTLAND) فرانس (FRANCE) اور آسٹریا (AUSTERIA) میں ۳۰۰ دن حد مقرر ہے۔ یہ ۳۰۰ دن جو آخر قدرتی "ایامِ حیض" کے پہلے دن سے شمار کئے جاتے ہیں، رحمی حمل کے زمانہ سے اوسطاً تئیس ۲۳ دن کی زیادتی ظاہر کرتے ہیں۔ اور بداہتہً ان کی توجیہہ خالصتہً فعلیاتی اسباب کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ سپر میٹوزوا (SPERMATAZOA) یعنی حیوانات منویہ کا جنٹل ٹریکٹ (GENTAL-TRACT) میں تین ہفتہ تک زندہ رہ سکنا یہ معنی رکھ سکتا ہے کہ جماع کے بعد بارآوری میں اتنی ہی مدت کی تاخیر ہو سکتی ہے (کم سے کم نظری طور پر) جب

کوئی بچہ ایام حیض کے اول دن سے ۳۰۰ دن بعد پیدا ہوتا ہے تو یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ استقرار حمل تین ہفتے بعد ہوا ہوگا۔ اور حقیقۃً یوٹرو جسٹیشن (UTEROGESTA-TION) یعنی رحمی حمل کے زمانہ کی اطالت کی مثال نہ ہوگی۔

بخلاف اس کے ایسی سریری شہادت بھی موجود ہے جو ظاہر کرتی ہے کہ حمل رحمی کے زمانہ میں اطالت حقیقۃً واقع ہوتی ہے۔ اس امر کا بہترین ثبوت طفل کی غیر طبعی لمبائی اور وزن ہوتا ہے۔ لیکن اول الذکر نشان زیادہ اہم ہے۔ اب کثرت سے ایسی شہادت پائی جاتی ہے جو قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کہ اگر حمل (آخری ایام حیض سے شمار کرتے ہوئے) اطالت پذیر ہو جائے تو بچہ ہمیشہ اوسط وزن اور جسامت سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ پوسٹ میچیور (POSTMATURE) یعنی زائد از میعاد اطفال کہلاتے ہیں۔ اور علاوہ اطالت پذیر یوٹرو جسٹیشن (حمل رحمی) کے فعلیاتی دلچسپی کے، بہت کافی سریری اہمیت رکھتے ہیں۔

ان اطفال کے سروں کی غیر طبعی جسامت اور غیر معمولی سختی عسیر وضع حمل (DIFFICULT-LABOUR) کا سبب ہوتی ہے لہذا ان میں سے بعض بچے دورانِ ولادت ضائع ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک اہم زیادہ خطرہ یہ ہے کہ بچہ وضع حمل شروع ہونے سے قبل، یعنی اول مرحلۂ وضع حمل کے دوران ہی میں مر جائے۔ اس قسم کے واقعات کی اب اس کثرت سے اطلاع دی گئی ہے کہ یہ یقین کرنے کی ضرورت ہے کہ رحم میں زیادہ عرصہ تک رہنے سے بچہ کی حیویت کو

مضرت پہنچتی ہے۔ (غالباً پلیسنٹا شیمہ کے انحطاط کی وجہ سے) تاہم بچہ کے وزن سے ثابت ہے کہ اس کے تغذیہ کو نقصان نہیں پہنچتا۔ جب انقباضات حمل شروع ہو جاتے ہیں تو یہ دموی رسد ایک لمحہ کے لئے بند کر دیتے ہیں اور چونکہ بچہ کی حیویت گھٹی ہوئی یا کمزور ہوتی ہے لہٰذا وہ مر جاتا ہے۔

بہر حال اس سے ایک یقینی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر حساب لگانے پر پوسٹ ٹرو جیسٹیشن (حمل رحمی) کے زمانہ کی غیر معمولی اطالت پائی جائے تو بچہ کے مفاد کے مد نظر وضع حمل کا امالہ کر دینا چاہیئے۔

(علم الولادت مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد دکن)

علاوہ ازیں ڈاکٹر مس شمیم خواجہ ایم بی بی ایس۔ پی اے ایم سی اور ڈاکٹر اختر حسین اعوان ایم بی بی ایس۔ ٹی ڈی ڈی پی ایچ ایس لکھتے ہیں کہ۔

"اوسط مدت حمل کیا ہے؟ اس بات کو بتلانے کے دو طریقے ہیں۔ اولاً اس عرصہ کا شمار کرنا جو حیض موقوف ہونے اور وضع حمل ہونے کے درمیان ہوتا ہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں بہت اختلاف ہوتا ہے۔ پھر بھی اکثر حمل حیض کے موقوف ہو جانے کے دو سو چوہتر ویں (۲۷۴) دن سے لے کر دو سو اسیویں (۲۸۰) دن وضع ہو جاتا ہے۔ اس کا اوسط دو سو اٹھتر واں دن ہے۔"

(صفحہ ۸۵ مڈ وائفری مطبوعہ کتب خانہ لطفِ زندگی لاہور)

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ حمل کی مدت تین سو دن سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ فقہاء کے حوالے سے جو کچھ بیان ہوا ہے ہم اس کی تردید تو نہیں کرتے البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ موجودہ میڈیکل سائنس اس کی تائید نہیں کرتی۔ حمل کی صحیح مدت (۲۷۳) دن ہوتی ہے۔ لیکن منوی جراثیم اگر اندرون رحم تک نہ پہنچ پائیں اور رحم کی نالی میں رک جائیں تو وہ وہاں تین ہفتے تک زندہ رہ سکتے ہیں اور تین ہفتوں کے درمیان وہ آہستہ آہستہ رحم کی نالی سے اندرونِ رحم پہنچ کر بیضۂ حمل کو بارور کر سکتے ہیں۔ اس طرح دو سو چورانوے دن (۲۹۴) میں وضع حمل ہو سکتا ہے حساب وغیرہ کی غلطی کے امکانات سے چھ دن کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن (۳۰۰) دن پورے ہو جانے کے بعد اگر وضع حمل نہیں ہوتا تو لازم ہے کہ آپریشن کے ذریعہ سے وضع حمل کرا دیا جائے۔ ورنہ زچہ و بچہ کی جانوں کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔

دو سو چورانوے (۲۹۴) دن میں وضع حمل ہوتا ہے تو در اصل حمل (۲۹۴) دن کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ (۲۷۳) دن ہی کا ہوتا ہے۔ لیکن منوی جرثومہ، بیضۂ رحم سے اکیس دن کے بعد ملتا اور اسے بارور کرتا ہے۔ لہٰذا یوں سمجھنا چاہیئے کہ عورت جماع کا عمل صادر ہونے کے تین ہفتے کے بعد حاملہ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ حاملہ تھی ہی نہیں۔

تین سو دن مکمل ہونے کے بعد اگر وضع حمل نہ ہو سکے تو یہ زائد از میعاد حمل (اطالت) کا کیس ہو گا۔ اس میں جنین کا سر بڑا اور سخت

ہو جاتا ہے۔ جسامت زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور وضع حمل آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ زچہ وبچہ دونوں کی جان کو خطرہ ہوتا ہے۔ بچہ وضع حمل کے فوراً بعد بلکہ وضع حمل کے درد شروع ہوتے ہی شکم مادر میں مر جاتا ہے۔ علم الولادت کے بیان کے مطابق پلیسنٹا شیما کے انحطاط کی وجہ سے، یا انقباضات حمل شروع ہونے کے بعد بچہ کے لئے خون کی رسد بند ہو جانے کی وجہ سے۔ یا بچہ کی حیویت کی کمزوری کی وجہ سے، یا جدید تحقیقات کی بناء پر خون میں ایسی کیمیائی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ جنین کے لئے مضرت رساں ہوتی ہیں اس بناء پر بچہ کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا حمل کے سلسلہ میں (۳۰۰) دن سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے نزدیک موجودہ میڈیکل سائنس کا یہ بیان ہی صحیح ہے کیونکہ قرآن کریم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کتاب الرضاع میں ہم بتا چکے ہیں کہ سورۂ احقاف کی آیت ($\frac{۴۶}{۱۵}$) یعنی۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے (پیٹ میں) بڑی تکلیف کے ساتھ اٹھائے رکھا ہے اور تکلیف کے ساتھ ہی وضع حمل کیا ہے۔ اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانا پورے تیس مہینوں تک رہا ہے۔

اس آیت کریمہ میں حمل اور دودھ چھڑانے کی مجموعی مدت تیس مہینے بیان کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل اور دودھ پلانے

کی مجموعی مدت تیس ماہ اور ان کی الگ الگ مدت یوں ہونی چاہیئے
حمل چھ ماہ، رضاعت چوبیس ماہ۔ حمل سات ماہ اور رضاعت تیئیس ماہ۔ حمل آٹھ ماہ اور رضاعت بائیس ماہ اور حمل نو ماہ اور رضاعت اکیس ماہ اس طرح دونوں کی مجموعی مدت تیس ماہ ہونی چاہیئے۔
وضع حمل چھ ماہ سے لے کر نو ماہ تک ہو سکتا ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل دو سو اسی دن ہوگی۔

جن حضرات نے اس آیتِ کریمہ کا یہ مطلب لیا ہے کہ حمل کی مدت بھی تیس ماہ اور رضاعت کی مدت بھی تیس ماہ ہے اور قرآن کریم نے اس آیت میں حمل اور رضاعت کی مجموعی مدت بیان نہیں فرمائی ہے بلکہ دونوں کی الگ الگ مدت بیان فرمائی ہے وہ محل تامل ہے۔ کیونکہ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ لقمان میں بھی بیان فرمایا گیا ہے اور وہاں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝

(۳۱/۱۴)

ترجمہ:- اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارہ میں تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے ضعف پر ضعف برداشت کر کے (پیٹ میں) اٹھائے رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا (یعنی دو سال تک دودھ پلاتی رہی)، کہ میرے اور اپنے والدین کے شکر گذار بنے رہو اور میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔

اس آیت کریمہ میں بھی بعینہٖ وہی مضمون بیان ہوا ہے جو سورۂ

احقاف کی آیت میں تھا۔ لیکن وہاں حمل اور دودھ چھڑانے کی مجموعی مدت تیس ماہ بیان ہوئی تھی اور یہاں صرف دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بیان فرمائی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت میں دودھ پلانے کی اور حمل کی مدت ہر ایک کی الگ الگ تیس ماہ نہیں ہے بلکہ دودھ پلانے اور حمل میں رکھنے کی، دونوں کی مجموعی مدت بیان فرمائی گئی ہے۔ ورنہ قرآن کے بیان میں تضاد اور اختلاف لازم آئے گا جو قطعاً جائز نہیں ہے نیز سورۂ بقرہ کی آیت میں یہ بھی وضاحت فرمادی گئی ہے کہ بچے کو دو سال دودھ پلانے کی مدت انتہائی مدت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ (۲/۲۳۳)

ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ یہ اس کے لئے حکم ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہے۔

ان تمام آیات کو سامنے رکھنے کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حمل اور دودھ پلانے کی مدت مجموعی طور پر تیس مہینے ہے۔ نو مہینے حمل کے اور اکیس مہینے یعنی پونے دو سال دودھ پلانے کے۔ لیکن بچہ اگر نو مہینے سے پہلے پیدا ہو جائے تو جتنی جلدی وہ پیدا ہو گیا ہے اتنی ہی مدت کا دودھ پلانے میں اضافہ کر لیا جائے۔ چھ مہینے سے کم کا بچہ زندہ نہیں رہتا۔ چنانچہ کم سے کم مدت چھ مہینے مانی گئی ہے۔ اگر بچہ چھ مہینے میں پیدا ہو گیا ہے تو اس کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہو جائے گی اور یہ دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ

یعنی انتہائی مدت ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت قرآن کریم کی رو سے بھی نو مہینے چند دن یعنی وہی دو سو اسی دن یا دو سو نوے دن ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس ضمن میں ہمارے فقہائے کرام کے ارشادات محل نظر ہیں۔ واللہ اعلم۔

البتہ حضرات فقہائے کرام کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ جن مثالوں کا انہوں نے حوالہ دیا ہے یقیناً استثنائی صورتیں ہیں یا خرق عادت پر محمول ہو سکتی ہیں لیکن استثنائی صورتوں اور خرق عادت کی مثالوں کو قانون کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ قانون کی بنیاد وہی چیز ہو سکتی ہے جو عام طور پر مسلم مانی جاتی ہو۔

عدت وفات اگر شوہر کا انتقال ہو گیا ہو۔ اور بیوی شوہر کے ساتھ رہ چکی ہو تو بیوی کو چار ماہ دس دن تک عدت گذارنی چاہیئے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ (۲/۲۳۴)

ترجمہ:۔ اور تم میں جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے نفسوں کے ساتھ چار مہینے دس دن تک انتظار کریں۔ اس عرصہ میں وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتیں مردوں کو بھی احتیاط لازم ہے۔ اس عرصہ میں اُنہیں نکاح کے پیغام

نہ دیں۔ البتہ اشارۃً کنایۃً کچھ کہہ دینے میں یا دل میں ارادہ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

عدت میں پیغام دینا | سورۂ بقرہ ہی میں مذکورہ بالا آیت کے بعد ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّكَاحِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ط (۲/۲۳۵)

ترجمہ: اور تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم پیغامِ نکاح سے متعلق کچھ کنایۃً اشارہ کر دو۔ یا اپنے دلوں میں پوشیدہ ارادہ رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان سے کچھ نہ کچھ ضرور کہو گے۔ لیکن پوشیدہ طور پر وعدے نہ کرو۔ بجز اس کے کہ دستور کے مطابق کچھ کہہ دو۔ لیکن جبتک عدت کی مدت پوری نہ ہو جائے نکاح کا بندھن باندھنے کا (قطعاً) ارادہ نہ کرو۔

نکاح بیوگان | مذکورہ بالا آیت میں قرآن کریم کے اندازِ بیان سے ظاہر ہے کہ وہ نکاح بیوگان کو استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے صراحۃً بھی فرمادیا ہے کہ۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط (۲/۲۳۴)

ترجمہ: پھر جب وہ اپنی مدت (عدت) کو پہنچ جائیں تو تم پر کوئی مضائقہ نہیں وہ اپنے نفسوں کے بارہ میں دستور کے مطابق اگر کچھ کرلیں۔

یعنی نکاح ثانی کریں۔ میت کے ورثاء کو انہیں نکاح ثانی سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بلکہ سورۂ نور میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ کہ

وَاَنۡكِحُوا الۡاَيَامٰى مِنۡكُمۡ (۲۴/۳۲)

ترجمہ :۔ اور اپنی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو۔

بیوہ عورتوں کو گھروں میں بٹھائے رکھنا قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں ہے۔ اس سے معاشرہ میں ہزار قسم کے بگاڑ پیدا ہو سکتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت ہو جنسی خواہش ایک فطری جذبہ ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اس کی تسکین کا سامان کرنا ضروری ہے۔

عدت میں زینت و آرائش

رجعی طلاق کی صورت میں عورت کو عدت کے زمانہ میں زینت و آرائش ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ اسے زینت و آرائش کرنی چاہیئے کیونکہ جیسا کہ ہم طلاق کے سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ جو طلاق دی جاتی ہے، وہ طلاق رجعی ہوتی ہے اور ان دونوں مرتبہ طلاقوں میں اسلام کا منشاء یہی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو شوہر طلاق سے رجوع کر لے اور پھر دونوں میاں بیوی حسب سابق سلوک و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کریں اسلام اتصال چاہتا ہے افتراق نہیں چاہتا۔ قرآن کریم حتی الامکان رجوع ہی کو مستحسن قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ عورت کی زینت و آرائش رجوع کے لئے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

البتہ اگر طلاق بائن ہو چکی ہو، یعنی شوہر نے دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تیسری مرتبہ طلاق دیدی ہے۔ یا شوہر کا انتقال ہو گیا

ہوگیا ہے۔ تو ہمارے فقہاء نے فرمایا ہے کہ عورت کو اب زینت و آرائش سے دور رہنا چاہیئے۔ سرمہ لگانا، بالوں میں خوشبودار تیل لگانا، مانگ پٹی کرنا، عطر لگانا ممنوع ہے۔ مگر یہ حکم ہمارے فقہا نے سنت سے لیا ہے۔ قرآن نے ترکِ زینت کا کوئی حکم نہیں دیا ہے۔

نفقہ اور گھر میں رہنے کا حق

عدت کے زمانہ میں عورت کا نان و نفقہ اور سکونت کا انتظام مرد کے ذمہ ہے۔ خواہ طلاق رجعی ہو یا مغلظہ ہو، یعنی پہلی مرتبہ اور دوسری مرتبہ طلاق دی گئی ہو یا تیسری مرتبہ کیونکہ عدت، دراصل شوہر ہی کی مصلحت کی خاطر واجب کی گئی ہے کہ یقین کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے اور نسب میں کسی قسم کا اختلاط نہ ہو سکے۔ اگر عورت حاملہ ہے تو چونکہ حمل شوہر ہی کا ہے۔ لہٰذا وضع حمل تک عدت گذارنا محض شوہر ہی کی مصلحت پر مبنی ہے۔ اس لئے نان و نفقہ اور سکونت کا انتظام شوہر ہی کا فریضہ ہے۔ سورۂ طلاق کی ابتداء ہی ان احکام کے ساتھ ہوئی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ۖ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ (۶۵/۱)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے حساب سے (یعنی طہر میں) طلاق دو اور عدت کو شمار کرتے

رہو اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور انہیں ان کے گھروں سے (جہاں وہ رہتی آرہی ہیں) مت نکال دو۔ اور وہ خود بھی نہ نکلیں بجز اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوچکی ہوں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ اور جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے تو اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

نیز اس سے ذرا آگے اسی سورۂ طلاق ہی میں ارشاد ہوا ہے۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ (۶۵/۶)

ترجمہ: اور مطلقہ عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو اپنے مقدور کے مطابق اور انہیں تنگ کرنے کے لئے ایذا نہ دو اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہوجائے۔

اس کے بعد ذرا اور آگے چل کر ارشاد ہے۔

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۚ (۶۵/۷)

ترجمہ: صاحبِ وسعت آدمی اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی روزی اس پر تنگ ہوگئی ہو تو اللہ نے اسے جتنا کچھ دیا ہو اس میں سے خرچ کرے۔ خدا کسی نفس کو اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جتنا اللہ نے اسے دیا ہے۔ اور اللہ جلد ہی تنگی کے بعد فراخی فرمادیں گے۔

طلاق رجعی کی صورت میں تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت

کو عدت کے زمانہ میں نفقہ اور سکنیٰ کا حق ہے۔ لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق دیدی گئی ہے اور عورت شوہر سے حتمی طور پر الگ ہوگئی ہے اور وہ حاملہ بھی نہیں ہے تو فقہاء کرام کے تین قول نقل کئے گئے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ اور دیگر فقہائے کوفہ کی رائے ہے کہ اسے نفقہ اور سکنیٰ کا حق حاصل ہوگا۔

امام احمد ابن حنبلؒ، داؤدؒ، ابو ثورؒ، اسحٰقؒ اور ایک جماعت کی رائے ہے کہ اسے نہ نفقہ کا حق حاصل ہے نہ سکنیٰ کا۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ایک جماعت کی رائے ہے کہ اسے سکنیٰ کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن نفقہ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

(بدایۃ المجتہد صفحہ ۹۵/۲)

ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہؒ اور فقہائے کوفہ کی رائے قرآن سے قریب تر ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا ہے۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ ط

ترجمہ:- اپنے مقدور کے مطابق (مطلقہ عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو۔

اور شرعاً جہاں سکنیٰ کا حق ہوتا ہے وہاں نفقہ کا حکم بھی ہوتا ہے نیز جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے عدت کا حکم شوہر کی مصلحت پر مبنی ہے۔ لہٰذا اسی کو اصولاً یہ بار برداشت کرنا چاہیئے۔

عدت وفات میں سال بھر تک نفقہ اور سکنیٰ کا حق | جس عورت کا شوہر مرگیا

ہو اور وہ عدت گذار رہی ہو، حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو، عدت کے زمانہ تک تو اسے نفقہ اور سکنیٰ کا حق ہو گا ہی۔ لیکن اس کے بعد بھی اسے پورے ایک سال تک نفقہ اور سکنیٰ کا حق ہونا چاہیئے۔ البتہ اگر وہ عدت گذارنے کے بعد خود ہی گھر سے چلی جائے جس کا اسے حق ہے تو پھر نفقہ نہیں رہے گا۔ میت کے ورثاء اسے عدت کے بعد مزید رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر وہ مزید رہنا چاہے تو اسے سال بھر تک نکال بھی نہیں سکتے۔ سورہ بقرہ میں ہے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۲/۲۴۰)

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو انہیں بیویوں کے لئے وصیت کر جانی چاہیئے کہ وہ ایک سال تک (نفقہ و سکنیٰ کا) فائدہ حاصل کرتی رہیں اور انہیں گھروں سے نہ نکالا جائے پھر اگر وہ خود ہی چلی جائیں تو تم پر اس میں کہ وہ دستور کے مطابق اپنے نفسوں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرلیں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔ اور اللہ بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔

اس ضمن میں بھی امام ابو حنیفہؒ اور دیگر فقہائے کوفہ کی رائے ہے کہ عدت کی حد تک یعنی اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک اور وہ حاملہ نہ ہو تو چار مہینے دس دن تک اسے صرف سکنیٰ کا حق ہو گا۔

امام احمد بن حنبلؒ، داؤدؒ، ابو ثورؒ، اسحٰقؒ، اور ایک جماعت کی

رائے وہی ہے کہ نہ اسے نفقہ کا حق ہو گا اور نہ سکنیٰ کا۔

امام مالکؒ، شافعیؒ، ثوریؒ، اوزاعیؒ، ابن عبد البرؒ، اور دیگر فقہاء بھی امام ابو حنیفہؒ اور فقہائے کوفہ ہی کے ہم خیال ہیں کہ اسے سکنیٰ کا حق ہو گا لیکن نفقہ کا حق حاصل نہیں ہو گا۔ ان کی دلیل حضرت ابو سعید خدریؓ کی بہن فریعہ بنت مالک ابن سنان کی یہ روایت ہے کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ کو بتایا کہ ان کے شوہر اپنے غلاموں کی تلاش میں گئے تھے (جو بھاگ گئے تھے) غلاموں نے انہیں قتل کر دیا۔ انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اپنے میکے چلی جاؤں۔ کیونکہ شوہر نے ان کے لئے نہ کوئی مکان چھوڑا ہے جو ان کی ملکیت ہو نہ نفقہ چھوڑا ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ ہاں چلی جاؤ۔ میں وہاں سے چلی۔ لیکن ابھی حجرہ ہی میں یا مسجد ہی میں تھی کہ آپ نے مجھے دوبارہ بلوایا اور فرمایا کہ تم نے کیا کہا تھا؟ اسے دوبارہ بیان کرو۔ میں نے سارا واقعہ دوبارہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنے گھر ہی میں رہو تا آنکہ تمہاری عدت پوری ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اسی مکان میں چار مہینے دس دن پورے کئے پھر جب حضرت عثمانؓ ابن عفان کا زمانہ آیا تو انہوں نے مجھے بلوایا اور مجھ سے اس بارہ میں دریافت کیا۔ میں نے انہیں پورا واقعہ بتایا۔ چنانچہ انہوں نے اس کی پیروی فرمائی اور اسی کے مطابق فیصلہ دیا اس روایت کو امام مالکؒ نے اپنی مؤطا میں اور اثرم نے نقل کیا ہے اور یہ صحیح حدیث ہے۔ صحابہ کی پوری جماعت کے سامنے حضرت عثمانؓ نے اس کے مطابق فیصلہ فرمایا اور کسی نے انکار نہیں کیا۔

ان تمام حضرات کے نزدیک آیت مندرجہ بالا یعنی (۲/۲۴۲) منسوخ ہے وہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے شوہر کی وفات کی صورت میں بیوی کے لئے ترکہ کا آٹھواں حصہ یا چوتھائی حصہ مقرر فرما دیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ باقی بچتا ہے۔ وہ دیگر ورثا کو ملتا ہے۔ مکان بھی ترکہ ہی میں شامل ہے۔ لہٰذا اب اس حکم کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ عورت کو سال بھر تک مکان سے نہ نکالا جائے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اسے اپنے ترکہ سے زیادہ کا حقدار قرار نہ دیا جائے۔ لہٰذا وہ حکم وراثت کی آیت سے منسوخ ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فریعہ بنت مالک کو عدت کے زمانہ تک شوہر کے مکان میں سکونت کا حق عطا فرمایا ہے اس لئے عدت کے زمانہ تک سکنیٰ کا حق عورت کو دیا جائے گا۔ البتہ نفقہ کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ نیز عدت کے بعد سکنیٰ کا حق بھی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ یعنی (۲/۲۴۲) کا حکم سکنیٰ کے بارے میں عدت کی حد تک باقی ہے۔ اور عدت کے بعد کے لئے وہ حکم منسوخ ہے۔

(ماخوذ از المغنی لابن قدامہ ج ۷ ص ۵۲۱-۵۲۳)

ناسخ ومنسوخ

افسوس ہے ہم اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کر سکتے اول تو فیصلہ کا یہ جز وہی ناقابلِ فہم ہے کہ قرآن کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور وہ قرآن کریم میں اتباع اور پیروی کے لئے نہیں محض تلاوت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے باقی چھوڑ دی گئی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ہر حکم اتباع کے لئے ہے اور ہمیں ہر حکم کی پیروی کرنا لازم ہے

یقیناً قرآن کریم کی بعض آیات منسوخ ہوئی ہوں گی اور مصلحت وقت کے مطابق ان کا حکم باقی نہیں رکھا گیا ہوگا۔ لیکن وہ تمام منسوخ آیتیں اب قرآن کریم میں موجود نہیں ہیں۔ اب جتنی آیات قرآن کریم میں موجود ہیں وہ از ابتدار تا انتہار سب کی سب معمول بہا اور قابل اتباع ہیں۔ بعض مواقع پر ہمارے فقہار اور علمار کو نسخ کا اشتباہ ہوتا ہے لیکن وہ صحیح نہیں ہے۔ انسانی حالات مختلف ہوتے ہیں اور مختلف حالات میں مختلف احکام صادر کرنے ہوتے ہیں۔ اگر غور وفکر سے کام لیا جائے اور مختلف احکام کو مختلف حالات پر محمول کیا جائے تو نسخ کا اشتباہ خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بابرکت عہد میں مسلمانوں کو مختلف حالات پیش آئے ہیں اور ان حالات کے مطابق مناسب احکام صادر فرمائے گئے ہیں۔ اس کی قطعاً کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اسلامی معاشرہ اب ایک حالت پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جامد ہو چکا ہے اور وہ آئندہ کبھی بھی تغیر حالات سے آشنا نہیں ہوگا۔ قرآن کریم کا ہر حکم اپنے حالات کے مطابق قابل عمل اور قابل اتباع ہے۔ قرآن کریم کے دفتین میں ان کو محفوظ رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ پھر وہی حالات پیش آئیں تو ان کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

بہت کچھ غور وفکر کے باوجود ہمیں آیت میراث اور آیت نمبر ($\frac{۲}{۲۴۲}$) میں ایسا کوئی تضاد نظر نہیں آیا کہ ایک آیت کی وجہ سے دوسری آیت کو منسوخ قرار دینا پڑے۔ ہمارے نزدیک آیت نمبر ($\frac{۲}{۲۴۲}$) کا حکم اس روح کے عین مطابق ہے جو اسلامی حسن معاشرت

کا حصہ ہے۔

عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۴/۱۹)

ترجمہ: عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا سلوک کرو۔

اور۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (۲/۲۳۷)

ترجمہ: اور آپس میں احسان اور فضل کرنے کو نہ بھولو۔

بیویوں کی عمر بھر کی قربانیوں اور اطاعت گذاریوں کا بھی تو کچھ تقاضا ہے۔

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ (۴/۲۲)

ترجمہ: اور تم ایک دوسرے کے تنہائیوں کے شریک رہ چکے ہو اور انہوں نے تم سے نہایت ہی سخت قسم کا عہد لیا ہوا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس روح اسلامی کے مطابق حسن سلوک کی یہ بھی ایک کڑی ہے کہ شوہر کی وفات سے جبکہ اس کا سارا امن و سکون، ناز برداری اور خوش حالی خاک میں مل گئی ہے اور وہ اس بھری دنیا میں اکیلی اور بے سہارا رہ گئی ہے۔ میت اپنے ورثار کو اس کا پابند کر جائے کہ وہ ایک سال تک بیوی کو گھر سے نہ نکالیں ان حالات میں یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جبتک اس کا کوئی دوسرا سہارا نہ ہو جائے۔ یعنی وہ نکاح ثانی نہ کرے اس وقت تک وہ اس حسن سلوک کی یقیناً مستحق ہونی چاہیئے۔ نکاح ثانی کے لئے کسی دوسرے مناسب اور موزوں شخص کا مل جانا اتنا آسان کام تو نہیں

ہے کہ عدت گذرتے ہی اسے اس قسم کا سہارا فورًا میسر آجائے گا۔ لہٰذا اسے فورًا ہی گھر سے بیدخل کردیا جائے۔ یہ سلوک نہایت غیر شریفانہ اور ظالمانہ شمار ہوگا۔ لہٰذا بلاضرورت اس حکم کو منسوخ ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے آیت نمبر (۲/۲۴۲) میں دو مستقل حکم صادر فرمائے ہیں۔

وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ

ترجمہ:۔ شوہروں کو اپنی بیویوں کے لئے وصیت کرجانی چاہیئے کہ وہ ایک سال تک فائدہ حاصل کرتی رہیں، انہیں گھروں سے نہ نکالا جائے۔

اس آیت کریمہ میں ایک حکم تو مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ (سال بھر تک فائدہ حاصل کرنا) اور دوسرا حکم غَيْرَ إِخْرَاجٍ (گھروں سے نہ نکالنا) تو اگر سال بھر تک صرف سکنیٰ ہی کا حق دینا تھا تو وہ تو غَيْرَ إِخْرَاجٍ سے پورا ہوگیا۔ اس سے پہلے مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ سے قرآن نے کیا چیز بتائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے نفقہ ہی مراد ہوسکتا ہے۔ صرف سکنیٰ تو نہیں ہو سکتا۔ صرف سکنیٰ کا حق تو غَيْرَ إِخْرَاجٍ سے بھی معلوم ہو رہا ہے۔

یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آیت نمبر (۲/۲۴۲) آیت میراث سے منسوخ ہے۔ کیونکہ بیوی کو متوفی کے ترکہ سے آٹھواں یا چوتھائی حصہ مل چکا ہے۔ لہٰذا اس حکم کی ضرورت نہیں رہی۔ جبکہ تمام فقہاء چار ماہ دس دن تک (عدت میں) نفقہ اور سکنیٰ کا حق

تسلیم فرماتے ہیں تو باقی سات مہینہ بیس دن کے لئے خصوصیت سے عورت کو محروم کر دینے اور دونوں مدتوں میں امتیاز برتنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ ترکہ میں حصہ ملنے کی وجہ سے عدت کے زمانہ میں بھی بیوی کو ان حقوق سے محروم ہو جانا چاہیئے۔

اُجرت رضاعت عورت اگر حاملہ تھی اور اس کو طلاق دیدی گئی ہے تو اس کی عدت وضع حمل مقرر کی گئی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن وضع حمل کے بعد اگر وہ بچہ کو دودھ پلا رہی ہے تو چونکہ بچہ شوہر کا ہے اور وضع حمل کے بعد عورت کا اس شوہر سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا تو وہ دودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ کر سکتی ہے اور یہ اس کا حق ہے۔ ایسے ہی اگر عورت حاملہ نہیں تھی لیکن وہ بچہ کو دودھ پلا رہی ہے اور عدت گذر جانے کے بعد بھی بچہ کی عمر دو سال نہیں ہوئی اور بچہ دودھ پی رہا ہے تو اسے دودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔ ساتھ ہی اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کر دے۔ ایسی صورت میں شوہر کو بچہ کو دودھ پلانے کے لئے کسی دوسری عورت کا انتظام کرنا ہوگا۔ سورۂ طلاق میں ہے۔

وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۝ لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ

ترجمہ:۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو وضع حمل تک ان کا خرچہ برداشت کرو۔ پھر اگر وضع حمل کے بعد وہ تمہارے لئے بچہ کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت ادا کرو۔ اور آپس میں دستور کے مطابق باہم مشورہ کرلو اور اگر تم تنگدست ہو (اور اجرت ادا نہ کرسکو) تو بچہ کو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی (تم بیوی کو مجبور نہیں کرسکتے) ذی استطاعت آدمی کو اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیئے اور جس پر رزق کی تنگی ہو وہ اتنا ہی خرچ کرے جتنا اسے خدا نے دیا ہے۔ اللہ اس سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا جتنا اسے خدا نے دیا ہے۔ اللہ عنقریب تنگی کے بعد فراخی بھی کردیگا۔

رضاعت کا پہلا حق ماں کا ہے

اس آیت سے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ دودھ پلانے کا پہلا حق ماں کا ہے۔ شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچہ کو اس سے بلا وجہ چھین لے۔ کیونکہ آیت کریمہ میں بچہ کو دودھ پلانے کا حق ماں ہی کو دیا گیا ہے۔ البتہ شوہر کو یعنی باپ کو دودھ پلانے کی اجرت ادا کرنی چاہیئے۔ کیونکہ باپ کو اب بچہ کی ماں پر جبر کرنے کا حق باقی نہیں رہا۔ اس کا تعلق شوہر سے منقطع ہوچکا ہے۔ چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ اب آپس میں مشورہ اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کو سلجھاؤ (وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ)۔

البتہ اگر شوہر تنگدست ہو اور وہ اجرت ادا نہ کرسکتا ہو اور ماں بچہ کو بلا اجرت دودھ پلانے پر راضی نہ ہو تو پھر شوہر بچہ کو دودھ پلانے کے لئے کوئی دوسرا انتظام کرسکتا ہے۔ نیز یہ اجرت شوہر

کے مالی حالات کو پیش نظر رکھ کر طے کی جائے گی۔ اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو اسے اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرنا ہوگا اور اگر تنگدست ہے تو اس کی حیثیت کے مطابق اسے خرچ کرنا ہوگا۔ حیثیت سے زیادہ حق تعالیٰ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتے۔

زمانۂ عدت میں عورت گھر سے نہ نکلے

عدت کے زمانہ میں عورت کو شوہر کے گھر ہی میں رہنا چاہیئے۔ اسے شوہر کا گھر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل نہ ہونا چاہیئے۔

سورۂ طلاق میں ہے:

وَلَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ (۶۵/۱)

ترجمہ: اور انہیں ان کے گھروں سے (جہاں وہ رہتی آرہی ہیں) نہ نکالو اور وہ خود بھی نہ نکلیں بجز اس کے کہ وہ کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہوں۔ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے تو اس نے خود اپنے نفس پر ہی ظلم کیا ہے۔

لہٰذا عدت کے زمانہ میں عورتوں کو شوہروں کے گھروں سے کہیں اور منتقل ہو جانا جائز نہیں ہے۔ لیکن گھر سے نہ نکلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی ضرورت سے بھی یا تھوڑی دیر کے لئے بھی گھر سے نہ نکلیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شوہر کا گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی

نہ جائیں۔ تاہم اگر کوئی مجبوری ہو کہ گھر ناقابل رہائش ہو یا گھر کرایہ پر ہو اور مالک مکان گھر خالی کرنے پر مجبور کر رہا ہو یا اور کوئی معقول وجہ ہو تو اس گھر سے منتقل ہو جانے میں بھی مضائقہ نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ حکم ہر عدت گذارنے والی عورت کا ہے۔ خواہ اسے طلاق رجعی ہوئی ہو یا طلاق بائن (یعنی تیسری مرتبہ کی طلاق) ہوئی ہو یا شوہر کی وفات ہو چکی ہو۔ عورت حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو۔ کوئی صورت بھی ہو۔ ہر عدت کے لئے یہی حکم ہے۔

(باب ثبوت النسب)

نسب کے سلسلہ میں ہمارے فقہائے کرام کی بیشتر تفصیلات اسی فیصلہ پر مبنی ہیں کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کیا ہوتی ہے؟ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ کے نزدیک حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے۔

لیثؒ کا قول ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سال ہے۔

عباد ابن عوامؒ کا ارشاد ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت پانچ سال ہے۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ حمل چھ سال اور سات سال تک رہ سکتا ہے۔

ابو عبیدؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ حمل کی کوئی انتہائی مدت نہیں ہے۔ حمل غیر معینہ عرصہ تک رہ سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت ہمارے فقہاء کے ہاں چھ ماہ ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔

ان دونوں فیصلوں پر ہی ثبوتِ نسب کا مدار ہے۔ چنانچہ جس نے کسی عورت سے نکاح کیا ہو اور وہ عورت چھ ماہ بعد کسی بچہ کو جنم دے دے تو بچہ اسی شوہر کا ہوگا۔ اس کا نسب اس سے ثابت ہوگا اور وہ اس کا وارث ہوگا۔

اسی طرح کسی مرد نے کسی عورت کو طلاق دیدی ہے یا مرد وفات پاگیا ہے اور وہ دو سال کے بعد، تین سال کے بعد، چار سال کے بعد، پانچ، چھ سات سال کے بعد کسی بچہ کو جنم دیتی ہے، یا کبھی بھی (غیر معینہ عرصہ کے بعد) بچہ کی ولادت کر دیتی ہے اور دعویٰ کردیتی ہے کہ وہ بچہ اس کے شوہر کا ہے تو بچہ کا نسب (مختلف اقوال کے مطابق جن کی تفصیل اوپر دے دی گئی ہے)۔ عورت کے شوہر سے ثابت ہوگا اور بچہ اس کا وارث ہوگا مذکورہ بالا مذاہب میں سے جو مذاہب اہم ہیں ان کے مطابق امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کے نزدیک دو سال تک اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک چار سال تک بچہ اسی شوہر کا مانا جائیگا۔ اور وہ اس کا وارث بھی ہوگا۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کے مطابق ان کی بیان کردہ مدت حمل تک بچہ اگر پیدا ہوجائے تو شوہر کا مانا جائیگا اور وہ اس کا وارث ہوگا۔ البتہ اگر شوہر اس بچہ کا انکار کر دے اور دعویٰ کرے کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے بلکہ زنا سے پیدا ہوا ہے تو یا تو وہ زنا کا ثبوت دے ورنہ لعان کرے (لعان کا بیان پہلے گذر چکا ہے) لیکن شوہر کی وفات کی صورت میں لعان کا بھی امکان نہیں ہے۔ بچہ مقررہ مدت کے اندر اندر شوہر کا تسلیم کیا جائیگا اور اسے اس کا وارث مانا جائے گا۔ میت کے ورثاء اگر بچہ کا انکار کریں کہ وہ میت کا نہیں ہے، بلکہ زنا کا ہے تو ان کے لئے ایک ہی سبیل ہے کہ وہ زنا کا ثبوت دیں ورنہ حد قذف کا نشانہ بنیں۔ یہ صورتِ حالات انتہائی مشکل ہے۔

حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت کے سلسلہ میں ہم اپنا خیال پہلے واضح کر چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سو دن ہو سکتی ہے اور اگر تین سو دن کے بعد بچہ پیدا ہوا ہے تو ظاہر ہی ہے

کہ وہ بچہ اپنے شوہر کا نہیں ہے۔ اور اس سلسلہ میں بچہ کا اس سے نسب ثابت کرنا اور اسے اس کا وارث قرار دینا اور انکار کی صورت میں اس سے زنا کا ثبوت مانگنا اور وہ اگر زنا کا ثبوت نہ دے سکے تو اسے لعان پر مجبور کرنا یا حد قذف کا نشانہ بنانا۔ اور وفات کی صورت میں میت کے ورثاء کو قذف کا نشانہ بنانا یا جبراً و قہراً ایسے بچہ کو میت کا بچہ تسلیم کرنا اور اسے اس کا وارث قرار دینا انتہائی غیر معقول بات ہے۔ جس کی ہم تائید نہیں کر سکتے۔

اس ضمن میں جس قدر جزئیات فقہ کی کتابوں میں ثبوتِ نسب کے بارے میں بیان کی گئی ہیں ان پر فرداً فرداً بحث کرنے کی غالباً ضرورت نہیں ہے۔

نسب باپ سے چلتا ہے

اس باب میں ایک اہم بحث یہ بھی ہے کہ نسب کا تعلق باپ سے ہے یا ماں سے۔ اس پر تقریباً پوری امت کا اتفاق ہے کہ نسب کا تعلق باپ سے ہوتا ہے ماں سے نہیں ہوتا۔ بجز اس صورت کے کہ باپ بچہ کے سلسلہ میں انکار کر دے کہ وہ میرا نہیں ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ لعان کرے تو ایسی صورت میں بچہ زنا کا شمار کیا جائیگا اور وہ بجائے باپ کے اپنی ماں کی طرف منسوب ہو گا۔

سورۂ احزاب میں ہے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (۳۳/۵)

ترجمہ: تم لوگوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ اللہ کے نزدیک یہی زیادہ انصاف کی بات ہے پھر اگر تمہیں ان کے باپوں کے متعلق علم ہی نہ ہو تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔

یعنی زبردستی باپ کی نسبت کو چھوڑ کر اور کسی نسبت سے کسی کو پکارنا جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ ماں ہو یا کوئی اور شخص ہو۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے کسی بچہ کو اپنا منہ بولا بیٹا (متبنیٰ) بنا لیا ہے تب بھی اسے اپنی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اسے اس کے باپ ہی کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے۔ سورۂ احزاب ہی میں مذکورہ بالا آیت کریمہ سے ذرا پہلے ہے۔

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۝ (۳۳/۴)

ترجمہ: اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا۔ یہ اپنے منہ سے کہی ہوئی تمہاری باتیں ہیں اللہ تو حق بات کہتا ہے اور صحیح راہ دکھاتا ہے۔

حتیٰ کہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید ابن حارثہؓ کو نبوت سے پہلے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اور وہ قریش میں زید ابن محمد ہی کے نام سے متعارف تھے۔ لیکن حق تعالیٰ نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا اور قرآن کریم میں صاف صاف اعلان فرما دیا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝ (۳۳/۴۰)

ترجمہ: محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا ہے۔

چنانچہ اس حکم کے بعد حضرت زیدؓ کو بجائے زیدؓ ابن محمد کے زیدؓ ابن حارثہ کہا جانے لگا تھا۔ حالانکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ان

سے انتہائی محبت تھی۔ اور وہ آپ کو انتہائی محبوب تھے۔ جنگ موتہ میں اسلامی افواج کی قیادت فرماتے ہوئے جب آپ نے جامِ شہادت نوش فرمالیا تو ان کے بعد حضرت زید کے صاحبزادہ حضرت اسامہ ابن زید نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت و شفقت کا وہی مقام حاصل کر لیا جو حضرت زید کو حاصل تھا۔ چنانچہ حضرت اسامہؓ کا لقب ہی حِبُّ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پڑ گیا تھا۔ باوجود اس محبت و شفقت کے نہ باپ کو ابن رسول اللہ کہا گیا نہ بیٹے کو۔

باب حضانۃ الولد

بچہ کی حضانت اور کفالت ضروری ہے۔ کیونکہ حضانت اور کفالت کے بغیر بچہ کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔ یہ قرابت کا حق ہے جسے قرآن کریم نے فرض قرار دیا ہے۔

سورۂ اسراء میں ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا

(۱۷/۲۶)

ترجمہ: اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی نہ کرو۔

نیز جان کی حفاظت ضروری ہے۔ اور حضانت و کفالت نہ کرنے میں بچہ کی ہلاکت کا خطرہ یقینی ہے۔

سورۂ انعام میں ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)

ترجمہ: اور مفلسی کی وجہ سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

نیز سورۂ اسراء میں ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (۱۷/۳۱)

ترجمہ: اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی انہیں بھی رزق دیتے ہیں۔ اور خود تمہیں بھی۔ یقیناً انہیں مار ڈالنا بہت ہی بڑا جرم ہے۔

بچوں کی حضانت وکفالت سے پہلوتہی کرنا اور ان کی زندگی کی حفاظت نہ کرنا انہیں مار ڈالنا بلکہ قتل کر دینا ہی ہے۔ ایک مسلمان پر ہر نفسِ انسانی کی حفاظت کرنا واجب ہے۔ اپنے بچے تو اپنے بچے ہوتے ہیں۔ غیروں کو بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔

سورۂ اسراء ہی میں ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ (۱۷/۳۳)

ترجمہ: ناحق کسی نفسِ انسانی کو بھی جسے اللہ نے عزت وحرمت عطا کی ہے قتل نہ کر ڈالو۔

بچوں کی حفاظت وصیانت ماں باپ ہی کرتے ہیں۔ ایک معمولی سے معمولی حیوان بھی بچوں کو جنم دے کر بے حفاظت وصیانت نہیں چھوڑ دیتا۔ ان کی پرورش اور غور وپرداخت ماں باپ ہی کرتے ہیں تاآنکہ بچے اس قابل نہ ہو جائیں کہ وہ خود اپنی حفاظت وصیانت کر سکیں انسانوں پر تو یہ فریضہ اور بھی عائد ہوتا ہے۔ یہ انسانیت

بلکہ حیوانیت کا بھی جبلّی اور فطری تقاضا ہے جس سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ حضانت اور کفالت ماں اور باپ دونوں کا فریضہ ہے۔

البتہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ماں اور باپ جدا ہو جائیں اور ایک دوسرے سے (طلاق کے ذریعے سے) قطع تعلق کر لیں ایسی صورت میں بچہ کی غور و پرداخت اور پرورش یعنی حضانت کس کا حق ہو گا۔ یہ حق ماں کو حاصل ہو گا یا باپ کو؟

تمام ائمہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ حضانت کا حق ماں کو حاصل ہو گا۔ بچہ، لڑکا ہو یا لڑکی ہو، ہر صورت میں ماں ہی حضانت کی حقدار ہو گی۔ کیونکہ چھوٹے بچوں کی پرورش اور غور و پرداخت مرد خود تو کر نہیں سکتا۔ وہ لامحالہ اسے کسی عورت ہی کے حوالہ کرے گا۔ اپنی دوسری بیوی ہو یا اپنی ماں اور بہن ہو۔ جب کسی عورت ہی کے حوالہ کرنا ہوا تو بچہ کی ماں سب سے اولیٰ اور احق ہے۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں اگرچہ کوئی صریح حکم صادر نہیں فرمایا لیکن قرآن کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضانت کا حق بچہ کی ماں ہی کو ہونا چاہیئے۔ باپ کو ماں کی موجودگی میں بچہ کو اس سے چھین لینے کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں تک مالی کفالت کا تعلق ہے وہ اسلام نے مرد کی ذمہ داری قرار دی ہے اور جہاں تک عملی کفالت اور نگہداشت اور غور و پرداخت کا تعلق ہے وہ عورت کی ذمہ داری شمار کی ہے۔ حتیٰ کہ خود عورت کی مالی کفالت بھی مرد ہی کے ذمہ رکھی ہے۔ چنانچہ طلاق دینے کے بعد بھی حکم ہے۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ وَلَا تُضَارُّوهُنَّ

لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ ۚ وَإِن كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۝ لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ۝ (۶۵/۷-۶)

ترجمہ: جہاں تم خود رہتے ہو اپنے مقدور کے مطابق اپنی مطلقہ بیویوں کو بھی وہیں رکھو اور انہیں ایذاء نہ دو تاکہ تم انہیں تنگ کرو۔ اور اگر وہ حمل سے ہوں تو جبتک وہ وضع حمل نہ کرلیں ان پر خرچ کرتے رہو، پھر اگر وہ تمہارے لئے بچہ کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کردو اور (معاوضہ کی مقدار کے متعلق) دستور کے مطابق آپس میں مشورہ (کرکے طے) کرلو۔ اور تم آپس میں کوئی تنگی محسوس کرو تو پھر بچہ کو کوئی دوسری عورت دودھ پلا سکتی ہے۔ وسعت رکھنے والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر رزق میں تنگی ہو وہ اسی کے مطابق خرچ کرے جتنا اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی شخص کو اس سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا جتنا اسے اللہ نے دیا ہے۔ تنگی کے بعد اللہ جلد ہی فراخی بھی کردے گا۔

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ جہاں تک مالی کفالت کا تعلق ہے وہ مرد ہی کے ذمہ ہے۔ اگر عورت حاملہ ہو تو چونکہ حمل مرد کا ہے۔ اور وہ اس کی وجہ سے وضع حمل تک اپنا کوئی دوسرا سہارا تلاش نہیں کرسکتی تو مرد کے ذمہ اس کا نفقہ اور سکنیٰ ہے اور وضع حمل ہوجانے کے بعد اگر ماں بچہ کو دودھ پلا رہی ہے تو اگرچہ ماں کا اس میں کوئی

مالی خرچ نہیں ہو رہا ہے لیکن دُودھ پلانے کی اُجرت شوہر کے ذمہ ہوگی
اس سے ظاہر ہے کہ دودھ پلا چکنے کے بعد جبکہ بچہ پر مالی خرچ بھی ہوگا۔
وہ بھی بچے کے باپ ہی کے ذمہ ہوگا۔ لیکن جہاں تک بچہ کی نگہداشت،
پرورش اور غور و پرداخت کا تعلق ہے وہ عورت کے ذمہ رکھا گیا
ہے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد سب سے پہلی نگہداشت اور غور و پرداخت
اس کو دودھ پلانے سے تعلق رکھتی ہے وہ ماں کے ذمہ رکھی گئی ہے۔
البتہ اگر ماں اس میں کوئی تنگی محسوس کرے۔ وہ دودھ نہ پلانا چاہے
یا اس کا دودھ بچہ کے لئے مفید نہ ہو وغیر ذلک تو پھر اجازت ہے کہ کوئی
دوسری عورت دودھ پلا دے۔ لیکن اگر وہ خود دودھ پلانے کے لئے
تیار ہو تو یہ اسی کا حق ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ
أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ط وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوفِ ط لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ج لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا
وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ق وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ج ($\frac{۲}{۲۳۳}$)

ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دُودھ پلائیں
گی۔ یہ حکم ان کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں اور جس مرد
کا بچہ ہے اس کے ذمہ ان ماؤں کا کھانا پینا اور کپڑے دینا دستور کے مطابق
ضروری ہو گا۔ خدا کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا
ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے اور نہ باپ کو اپنے بچہ کی
وجہ سے تکلیف دی جائے اور (اگر باپ مر گیا ہو تو) وارث کے ذمہ بھی اسی

طرح کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

اس آیتِ کریمہ میں صراحت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ دودھ پلانا ماں کی ذمہ داری اور اس کا حق ہے۔ لیکن نہ مرد پر کسی قسم کی تنگی عائد کی جائے اور نہ عورت پر۔ باہمی رضامندی سے معاملات کو طئے کرلیا جائے۔

اگر ماں نہ ہو لیکن اگر ماں نہ ہو تو حضانت کا حق اس عورت کو ہوگا جو بچے کے حق میں زیادہ سے زیادہ شفیق ہوسکتی ہو۔

ہمارے فقہاء نے بچہ کی نانی کو حضانت کا حقدار قرار دیا ہے اور اگر نانی موجود نہ ہو تو پڑنانی کو اور وہ بھی موجود نہ ہو تو پھر دادی کو حضانت کا حق دیا ہے۔ اگر دادی بھی موجود نہ ہو تو بڑی بہن کو حضانت کا حق دیا ہے۔ خالائیں اور پھوپھیاں اس کے بعد حقدار ہوتی ہیں۔ بہرحال ماں کی قرابت دار عورتیں باپ کی قرابت دار عورتوں سے مقدم رکھی گئی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ تفصیل مناسب ہے۔ کیونکہ اصل مدار بچہ کی مصلحت اور خیرخواہی پر ہے اور بچہ کے لئے شفقت اور خیرخواہی کی فطری ترتیب یہی ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے سلسلہ میں تفصیلی احکام صادر نہیں فرمائے۔ اسے خود معاشرہ کی صوابدید پر چھوڑا ہے۔ بچہ کی مصالح کے پیش نظر ہم خود ہی اس کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔

مدتِ حضانت

حضانت کی مدت کے متعلق بھی قرآن کریم نے کوئی صراحت نہیں فرمائی بچہ کی مصلحت کے ماتحت ہی معاشرہ کو اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے ہمارے فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ لڑکے کے سلسلہ میں حضانت کا حق اس وقت تک ہونا چاہیئے جبتک وہ اپنے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینے کے قابل نہ ہو جائے۔ یعنی کھانے، پینے، کپڑے پہننے، استنجار کرنے وغیرہ میں کسی دوسرے کا محتاج نہ رہے۔ اس کے بعد بچہ کی تعلیم و تربیت کا مرحلہ آجاتا ہے۔ اسے بہ نسبت ماں کے باپ زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد حضانت کا حق باپ کی طرف منتقل ہو جانا چاہیئے۔

لڑکی کے سلسلہ میں فقہائے کرام کا خیال ہے کہ جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے اسے ماں کی نگہداشت اور کفالت کی ضرورت رہتی ہے کیونکہ یہی زمانہ اس کی خانہ داری کی تربیت حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، گھر کا انتظام کرنا وغیرہ۔ یہ تعلیم و تربیت ماں یا نانی وغیرہ عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ لہٰذا باپ کی طرف حضانت کا حق منتقل نہ ہونا چاہیئے۔ بالغ ہو جانے کے بعد اس کی شادی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے اس کے لئے مناسب بر کو تلاش کرنا انتہائی اہم ضرورت ہے۔ اسے ظاہر ہے کہ باپ بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا بالغ ہو جانے کے بعد حضانت کا حق باپ کی طرف منتقل ہو جانا چاہیئے۔

ہمارا خیال ہے کہ ہمارے فقہائے کرام کا یہ ارشاد حق بجانب ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا کہ حضانت کا مدار بچہ کی مصلحت اور اس کی خیر خواہی پر ہے، اور خیر خواہی اور مصلحت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے جو ہمارے فقہائے کرام نے بتائی ہے۔ لہٰذا ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔

(باب النفقہ)

نفقہ کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بیوی کا نان نفقہ اور سکنیٰ اور لباس وغیرہ کی ذمہ داری شوہر کے ذمہ ڈالی ہے خواہ بیوی مسلمان ہو یا مسلمان نہ ہو (اہل کتاب میں سے ہو) قانون یہ ہے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کی خاطر خود کو محبوس کرے تو اس کا نفقہ اس آدمی کے ذمہ ہوتا ہے جس کے لئے وہ محبوس ہو۔ اس کے لئے ہمارے فقہائے کرام نے بنیادی حکم قرآن کریم کا وہی قرار دیا ہے جس پر ہم عدت کے سلسلہ میں گفتگو کر چکے ہیں یعنی۔

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ (۶۵/۷)

ترجمہ:- ذی استطاعت آدمی اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے۔

اور۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (۲/۲۳۳)

ترجمہ:- اور جس کا بچہ ہو اس کے ذمہ ان کی ماؤں کا نان نفقہ اور ان کا لباس ہے دستور کے مطابق۔

یہ دونوں آیات کریمہ طلاق کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر بیوی کو طلاق دینے کے بعد جبکہ زوجیت کا باہمی تعلق بھی باقی نہیں رہا ہے ان کا نان و نفقہ عدت کے زمانہ میں یا حمل کے زمانہ میں یا بچہ کو دودھ پلانے کے زمانہ میں شوہر کے ذمہ واجب ہوتا ہے تو موافقت اور زوجیت کے زمانہ میں بطریق اولیٰ واجب ہوگا۔ لیکن اس کے علاوہ سورۂ نساء میں زمانۂ زوجیت میں بھی صراحت کے ساتھ مردوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ (۴/۳۴)

ترجمہ: مرد، عورتوں کے سامان رزق کے کفیل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو (بعض کاموں میں) دوسرے آدمیوں پر برتری بخشی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے رہے ہیں۔

عربی زبان میں قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ اور قَامَ عَلَیْھَا کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ مرد نے عورت کی کفالت کی، اس کی ضروریات کو پورا کیا اور اس کا ذمہ دار ہوا اور اس کے لئے رسد لایا۔ قَوَّامٌ سامان رزق مہیا کرنے والا۔ (تاج العروس)

حمل، رضاعت، امور خانہ داری، بچوں کی پرورش اور تربیت ایسے فرائض ہیں جو مرد انجام نہیں دے سکتا۔ یہ کام عورت ہی کر سکتی ہے اور ان فرائض کے ساتھ وہ اکتساب رزق کے لئے خود کو فارغ نہیں

کر سکتی۔ البتہ مرد کو یہ کٹھن فرائض انجام دینے نہیں پڑتے۔ اس کے پاس اکتساب رزق کے لیے وقت بھی ہے اور فرصت بھی جسمانی قویٰ بھی مرد و عورت کو اپنے اپنے فرائض و واجبات کے تناسب ہی سے عطا فرمائے گئے ہیں۔ مرد کے قویٰ مضبوط بنائے گئے ہیں کیونکہ اِسے جگر پاش محنت و مشقت سے سابقہ پڑتا ہے اور عورت کے قویٰ نرم و نازک بنائے گئے ہیں کیونکہ اسے جن فرائض سے سبکدوش ہونا ہے ان کیلئے نرمی اور نزاکت ہی درکار ہے۔ یہ مطلب ہے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ کا کہ اللہ نے کچھ انسانوں کو دوسرے انسانوں پر (قویٰ کے اعتبار سے) برتری بخشی ہے بہرحال وظائف زندگی کی یہ فطری تقسیم ہے اسی بناء پر قرآن کریم نے مرد کو عورت کے سامانِ رزق کا کفیل اور ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ آگے اس کی کھلے الفاظ میں تشریح فرما دی ہے وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ یعنی ذمہ داری اور کفالت محض نام ہی کی نہیں ہے بلکہ عملی طور پر اپنے مال خرچ بھی کرتے رہے ہیں۔ قرآن کریم کے اس فقرہ نے قَوَّامُ کا مفہوم مزید واضح کر دیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوگیا کہ مرد، عورت کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ دار اور کفیل ہوتا ہے۔ اس میں سامانِ رزق، سامانِ لباس، رہائشی سہولت اور تمام ضروریات شامل ہوگئیں، حتیٰ کہ سامانِ آرائش و زیبائش بھی اسی میں داخل ہے۔ کیونکہ آرائش و زیبائش عورت کا فطری حق ہے جسے قرآن کریم نے تسلیم فرمایا ہے۔

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝ (۴۳/۱۸)

ترجمہ: کیا وہ جو پرورش ہی زیورات میں پاتی ہے اور وہ بحث و گفتگو میں غیر واضح ہوتی ہے۔

حِلْيَةٌ میں زیبائش و آرائش کی تمام چیزیں آجاتی ہیں۔ زیور، تیل، پھلیل، عطر، صابون وغیرہ ذالک۔ لیکن اس کے لئے مرد کی مالی استطاعت کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهٖ ط وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ ط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا ط

(۶۵/۷)

ترجمہ: صاحب استطاعت اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی روزی نپی تلی ہو وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی جان کو اس سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا جو اللہ نے اسے دیا ہے۔

لہٰذا مرد کی استطاعت اور عورت کے مرتبہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ناشزہ کا نفقہ البتہ اگر بیوی ناشزہ ہو یعنی وہ حقوقِ زوجیت ادا نہ کرتی ہو، وہ اپنے میکے جا کر بیٹھ گئی ہو اور امورِ خانہ داری انجام نہ دیتی ہو۔ اسے شوہر کی طرف رغبت نہ ہو، وہ طلاق لے کر کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہو (نشوز کی تفصیلی بحث کتاب الطلاق میں گذر چکی ہے) تو ایسی صورت میں وہ نان و نفقہ وغیرہ کی حقدار نہ ہوگی۔ سورۂ طلاق ہی میں ہے۔

وَلَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ يَّاْتِيْنَ

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ط (۶۵/۱)

ترجمہ۔ اور انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود بھی نہ نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو چکی ہوں۔

کھلی بے حیائی کا ارتکاب حقوقِ زوجیت سے انحراف ہی ہوتا ہے جس میں عورت کو سکنیٰ سے محروم کر دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا حقوقِ زوجیت سے انحراف کی دیگر صورتوں میں بھی یہی حکم ہو گا۔ اور جہاں سکنیٰ سے محروم کر دیا گیا ہے وہاں نان و نفقہ سے محرومی لازمی چیز ہے۔ جب شوہر اُسے اپنے گھر میں ہی نہیں رکھے گا تو نان و نفقہ کیسے دے گا۔ لہٰذا نشوز کی تمام صورتوں میں وہ اپنے تمام حقوق سے محروم ہو جائے گی۔

ایک خادمہ کا نفقہ

اگر شوہر مالدار ہو اور بیوی بھی با وجاہت خاندان سے تعلق رکھتی ہو تو ہمارے فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ اسے ایک خادم یا خادمہ کا مطالبہ کرنے کا حق ہو گا۔ شوہر اس کی تنخواہ ادا کرے اور اس کے لئے نان و نفقہ بھی مہیا کرے۔ یہ امام ابو حنیفہ رح اور امام محمد رح کا قول ہے۔ امام ابو یوسف رح فرماتے ہیں کہ شوہر کے ذمہ دو خادموں کا نفقہ اور تنخواہ واجب ہو گی۔ ایک خادم اندرونِ خانہ خدمت کے لئے اور دوسرا خادم بیرونِ خانہ کام کاج کے لئے۔

قرآنِ کریم نے اس کے لئے کوئی حکم صادر نہیں فرمایا۔ اس لئے ہمارے نزدیک اس کا مدار معاشرتی حالات پر ہونا چاہیئے۔ اگر کسی معاشرہ میں یہ ضروری سمجھا جاتا ہو تو شوہر کو اس کا پابند کیا جا سکتا ہے۔

ورنہ نہیں۔

اگرشوہر نفقہ نہ دے

اگر شوہر تنگدست ہوجائے اور وہ بیوی کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت نہ کرسکے تو بیوی کو اختیار ہوگا کہ خواہ وہ اس صورتِ حال پہ صبر کرے اور شوہر کے ساتھ اس کی تنگدستی میں بھی گذارہ کرتی رہے اور اگر وہ چاہے تو عدالت سے نکاح فسخ کرالے اور عدت گذار کر وہ اپنا کوئی دوسرا سہارا تلاش کرے۔ حضرت عمرؓ، علیؓ، ابوہریرہؓ، سعیدؒ بن المسیب، حسن بصریؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ربیعہؒ، حمادؒ، مالکؒ یحییٰ القطانؒ، عبدالرحمٰن ابن مہدی، شافعیؒ، اسحٰقؒ، ابوعبیدؒ اور ابوثورؒ سے ایسا ہی نقل کیا گیا ہے۔

لیکن عطاءؒ، زہریؒ، ابن شبرمہؒ، ابوحنیفہؒ، محمد ابن الحسنؒ، ابویوسفؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے عورت کو فسخِ نکاح کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ البتہ شوہر سے کہا جائے گا کہ وہ عورت کو کسبِ معاش اور محنت مزدوری کرنے کی اجازت دے۔

(المغنی لابن قدامہ صفحہ ۵۷۳ ج ۷)

صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہؒ، محمد ابن الحسنؒ اور ابویوسفؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اس صورت میں عورت کو فسخِ نکاح کی کارروائی کرنے کی تو اجازت نہیں دی جائے گی البتہ اِسے کہا جائے گا کہ وہ شوہر کے نام پر کہیں سے قرض حاصل کرے اور اس سے اپنی ضروریات نان ونفقہ وغیرہ کی پوری کرے۔

(ہدایہ صفحہ ۴۲۹ ج ۲)

جمہور فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے شوہر کو دو باتوں کا اختیار دیا ہوا ہے۔

فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۝ (۲/۲۲۹)

ترجمہ: یا تو بیوی کو دستور کے مطابق رکھے یا اسے خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دے۔

بیوی کو رکھنا اور اس کو نان و نفقہ نہ دینا اِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ (دستور کے مطابق رکھنا) نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا بیوی کو فسخ نکاح کا اختیار ہونا چاہیئے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نامردی اور مقطوع الذکر ہونے کی صورت میں عورت کو بالاتفاق فسخ نکاح کا اختیار ہوتا ہے حالانکہ اس صورت میں شوہر صرف خواہش نفسانی کو پورا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے اور نان و نفقہ نہ دے سکنے کی صورت میں وہ عورت کی زندگی کی حفاظت ہی کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے دوسری صورت میں ضرر پہلی صورت کی بہ نسبت شدید تر ہے۔ لہٰذا جب نامردی وغیرہ کی صورت میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار حاصل ہے تو ایسی تنگدستی کی صورت میں بدرجۂ اولیٰ حاصل ہوگا۔ ہمارے خیال میں جمہور ائمۂ فقہاء کا مسلک قرآن سے قریب تر اور دلیل کے اعتبار سے قوی تر ہے۔ لہٰذا ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ ہمیں فقہائے حنفیہ کی اس تجویز میں کوئی وزن نظر نہیں آتا کہ عورت کو کسب معاش کی اجازت دی جائے یا وہ شوہر کے نام پر کہیں سے قرض حاصل کرتی رہے۔ ان حضرات کے بابرکت عہد میں شاید اس طرح لوگ قرض دیدیتے ہوں، مگر آجکل ہمارے موجودہ معاشرہ میں تو یہ

حل قابلِ عمل نظر نہیں آتا۔

اس سلسلہ میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب شوہر کی تنگدستی ثابت ہوجائے تو بیوی کو فوراً فسخِ نکاح کے مطالبہ کا حق حاصل ہو جائے گا۔ لیکن حماد ابن ابی سلیمانؒ کی رائے یہ ہے کہ شوہر کو ایک سال کی مہلت دی جانی چاہیئے اگر وہ سال بھر گذر جانے کے بعد بھی نان و نفقہ برداشت نہ کر سکے تو نکاح فسخ کر دیا جائے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کا خیال ہے کہ شوہر کو ایک دو ماہ کی مہلت دی جانی چاہیئے۔ امام مالکؒ صرف ایک ماہ کی مہلت دینے کے حق میں ہیں۔ امام شافعیؒ سے ایک دوسری روایت تین ماہ کی مہلت دینے کی بھی نقل کی گئی ہے۔

(المغنی لابن قدامہ صـ۵۷۴ جـ۷)

ہمارے خیال میں اس کے لئے کوئی مدت متعین کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِسے حاکم مجازہی کی صوابدید پر چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اگر وہ کوئی مہلت مناسب سمجھتا ہے تو وہ مہلت دیدے۔ اور مناسب نہیں سمجھتا ہے تو مہلت دینا کوئی ضروری نہیں ہے۔

ہمارے معاشرہ میں اس قسم کی شکایات عام ہیں کہ اکثر شوہر احساس ذمہ داری کے فقدان کی وجہ سے غفلت برتتے ہیں اور عورتوں کو نان و نفقہ نہیں دیتے وہ برسہا برس اپنے میکے کے ٹکڑوں پر پڑی رہتی ہیں۔ شوہر کسب معاش کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں ایسے نکمے اور نکھٹو لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے سلسلہ میں ہماری حتمی رائے یہی ہے کہ ان کی بیویوں کو فسخ نکاح کا اختیار دیا جانا چاہیئے اور ان کو کسی مہلت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

واضح رہے کہ عورت کو فسخ نکاح کا اختیار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حاکم مجاز کی عدالت میں مرافعہ کرے اور حاکم اس عورت کا نکاح فسخ کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ عورت خود ہی نکاح فسخ کر کے بیٹھ جائے۔

سکنیٰ کا مطلب

فقہائے حنفیہ کا خیال ہے کہ شوہر کے ذمہ عورت کے لئے الگ مکان کا انتظام کرنا ضروری ہے جس میں شوہر کے عزیز و اقارب کا کوئی دخل نہ ہو شوہر کا کوئی عزیز اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا بجز اس صورت کے کہ بیوی خود اپنی رضامندی سے اس کی اجازت دیدے ورنہ اسے مکان میں تنہا رہنے کا حق ہے۔

عربوں میں مشترک خاندان کا سسٹم رائج نہیں تھا۔ اور آج بھی نہیں ہے۔ لڑکے کی شادی کرنے کے بعد ماں باپ خود ہی لڑکے اور اس کی بیوی کو الگ کر دیا کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رواج نہایت ہی مناسب تھا اور اس کی وجہ سے وہ مفاسد پیدا نہیں ہوتے تھے جو ہمارے معاشرہ میں ساس بہو اور نند بھاوج وغیرہ کی چپقلش سے گھروں کا امن و سکون غارت کر دیتے ہیں۔ فقہائے حنفیہ کا مذکورہ بالا فیصلہ اس عہد کے عربوں کے رواج پر ہی مبنی ہے لیکن ہمارے معاشرہ میں یہ رواج نہیں ہے۔ ہمارے ہاں مشترک خاندان (JOENT FAMILY SYSTEM) کا طریقہ رائج ہے۔ رہائشی سہولتوں کا بھی فقدان ہے۔ ہمارے معاشرہ میں شوہر پر یہ پابندی عائد کرنا بڑی دشواریوں کا موجب ہوگی۔ قرآن کریم نے

بھی۔

وَاَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ ط (۶۵)

ترجمہ: اور انہیں وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو، اپنے مقدور کے مطابق۔

فرمایا ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں تم خود رہتے ہو، انہیں اپنے ساتھ رکھو۔ یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انہیں الگ مکان میں رکھو حتیٰ کہ ہمارے فقہاء نے فرما دیا ہے کہ اگر شوہر کا دوسری بیوی سے کوئی بچہ ہو تو اس کو بھی ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ شوہر کے خاندان کا کوئی فرد بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اِلّا یہ کہ بیوی ہی اپنی رضامندی سے اس کی اجازت دیدے۔ ہمارے خیال میں، ہمارے معاشرہ کے جو حالات ہیں ان میں یہ پابندیاں بالکل مناسب لیکن دشوار ہیں البتہ یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ اگر شوہر بیوی کے لئے الگ مکان کا انتظام کر سکتا ہے تو ضرور کرے اور اس میں سستی نہ کرے لیکن اگر اس میں اتنی وسعت نہ ہو تو کم از کم مشترک مکان ہی میں بیوی کے لئے ایک خاص کمرہ مخصوص کر دیا جائے جس میں وہ اپنے سامان کو محفوظ طور پر رکھ سکے اور کہیں جائے تو اس کمرہ کو بند کر کے قفل وغیرہ لگا سکے۔ یہ پابندی ہمارے معاشرہ میں پہلے ہی سے موجود ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اتنی پابندی تو ضرور ہی ہونی چاہیئے۔

دوسری پابندیاں

ہمارے فقہائے کرام نے بیوی پر کچھ دوسری پابندیاں بھی عائد فرمائی ہیں کہ شوہر کو یہ حق بھی ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں بیوی کے والدین نیز دوسرے

رشتہ داروں حتیٰ کہ خود بیوی کی اولاد کو جو اس کے پہلے شوہر سے ہو آنے اور بیوی سے ملنے سے منع کر سکتا ہے۔ البتہ اُنہیں صرف اتنا حق ہوگا کہ اس کی بیوی کو دیکھ لیں اور اس سے بات کر لیں۔ اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ دیکھنے اور بات کرنے سے اس لئے منع نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے قرابت داروں کے ساتھ قطع رحمی لازم آتی ہے۔ لہٰذا شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بیوی کے رشتہ داروں کو اسے دیکھنے اور بات کرنے سے بھی منع کر دے۔

(ہدایہ ص۴۴۱ ج ۲)

ہم نہیں سمجھ سکے کہ دونوں صورتوں میں حدِ فاصل کیا ہے کہ دیکھنے اور بات کرنے سے منع کرنا قطع رحمی میں شمار کیا گیا ہے اور ان کا گھر میں آنے اور بیوی سے ملنے سے منع کر دینا قطع رحمی میں شامل نہیں سمجھا گیا ہمارے نزدیک دونوں باتیں قطع رحمی کے ضمن میں آتی ہیں لہٰذا شوہر کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔

بچہ کو دُودھ پلانا

بچہ کو دُودھ پلانا عورت کے ذمہ ہے۔ البتہ اگر عورت بیمار ہو، کمزور ہو، اس کی صحت خراب ہونے کا اندیشہ ہو، یا اس کا دودھ بچہ کے لئے مفید نہ ہو بلکہ نقصان دِہ ہو تو بیوی بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کر سکتی ہے لیکن بلا وجہ محض فیشن کے طور پر یا صحت خراب ہونے کے وہمی اندیشہ سے اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ کی یہ آیت پہلے گذر چکی ہے کہ۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ

اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ط
(۲/۲۳۳)

ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال تک۔ یہ حکم اُن کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہیں۔

آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ بچوں کو دودھ پلانا ان کی ماؤں کی ذمہ داری ہے ہمارے فقہاء نے فرمادیا ہے کہ بچہ کو دودھ پلانا اس کی ماں کی ذمہ داری نہیں ہے اور انہوں نے اسی آیت کے اگلے حصّہ سے استدلال فرمایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

لَاتُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَامَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ط
(۲/۲۳۳)

ترجمہ: ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے۔

جس سے معلوم ہوا کہ بچہ کو دُودھ پلانا ماں کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ بچہ کو دودھ پلوانا باپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر ماں دودھ نہ پلانا چاہے تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت باپ کسی دُودھ پلانے والی کا انتظام کرے۔ (ہدایہ صفحہ ۴۲۴ ج ۲)

قرآن کریم کے سیاق وسباق سے یہ بات صاف واضح ہے کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ احکام طلاق کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے چنانچہ اسی آیت میں۔

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ کے بعد وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَکِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط

ترجمہ: اور باپ کے ذمہ ان کی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور

کے مطابق واجب ہے۔

جس سے واضح ہو رہا ہے کہ بچہ کی ماں کو طلاق دی جا چکی ہے اور اس کا شوہر سے زوجیت کا تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ ورنہ اگر بچہ کی ماں اس کے باپ کی زوجیت میں داخل ہے تو شوہر پر بچہ کی ماں کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ڈالنے کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ کیونکہ بیوی کا کھانا کپڑا تو پہلے ہی شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر فرمایا گیا ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۔

ترجمہ:۔ اور میت کے وارث کے ذمہ بھی ایسا ہی ہے۔

اگر شوہر مر چکا ہے اور بیوی اس بنا پر اپنے شوہر سے محروم ہو چکی ہے اور وہ بچہ کو دودھ پلا رہی ہے تو میت کے وارث کے ذمہ بھی بچہ کی ماں کا کھانا اور کپڑا ہوگا۔ اسی ضمن میں فرمایا گیا ہے کہ بچہ کی وجہ سے نہ ماں کو تکلیف میں ڈالو اور نہ باپ کو۔ ماں کو تکلیف دینا یہ ہے کہ جب بیوی کو طلاق دے چکے ہو یا شوہر مر چکا ہے تو اب اسے لامحالہ کسی دوسرے سہارے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر وہ نکاح ثانی کرنا چاہے تو تم اسے دوسری شادی نہ کرنے اور بچہ کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ نیز تمہیں یہ بھی حق نہیں کہ اس سے بغیر کسی معاوضہ کے دودھ پلواؤ۔ اور کہدو کہ بچہ میرا ہی تو نہیں ہے۔ تیرا بھی تو ہے۔ لہٰذا تو اسے مفت دودھ پلا۔ اور شوہر کو تکلیف میں ڈالنا یہ ہے کہ عورت دودھ پلانے کا معاوضہ انتہائی گراں طلب کرنے لگے جو شوہر کی مقدرت سے زیادہ ہو۔ یہی مضمون سورۂ طلاق

میں ان الفاظ میں آگیا ہے۔

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ ۖ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ۔ (۶۵)

ترجمہ: پھر اگر وہ تمہارے لئے بچہ کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کا معاوضہ ادا کرو۔ اور دستور کے مطابق آپس میں مشورہ کر کے معاملہ طے کر لو۔ اور اگر تمہیں اس میں کوئی تنگی ہو تو کوئی دوسری عورت دودھ پلا دے گی۔

لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا ط

ترجمہ: ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے۔

طلاق یا شوہر کی وفات کے ضمن میں آیا ہے۔ اِسے عام حالات پر منطبق کر لینا صحیح نہیں ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ تعلق زوجیت کی موجودگی میں بھی بچہ کو دودھ پلانا عورت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ دودھ پلانے سے انکار کر سکتی ہے اور اس کے انکار کی صورت میں بچہ کا باپ بچہ کو دودھ پلوانے کیلئے کوئی دوسرا انتظام کرے۔

آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ طلاق ہو جانے اور شوہر کے وفات پا جانے کے بعد بھی ماں ہی کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچہ کو دودھ پلائے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ ط

ترجمہ: اور مائیں ہی اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔

لہٰذا تعلق زوجیت قائم ہونے کی صورت میں تو بطریق اولیٰ ان کا فریضہ ہو گا کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔

فقہائے حنفیہ نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ عورت اگر زوجیت کے تعلق میں باقی ہو یا اسے طلاق دی جا چکی ہے اور وہ عدت میں ہے تو اسے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ شوہر سے طلب کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر وہ معاوضہ طلب کرے تو یہ ناجائز مطالبہ ہوگا۔ اس کی دلیل انہوں نے یہی دی ہے کہ بچہ کو دودھ پلانا دیانۃً ماں کی ذمہ داری ہے۔ اور استدلال میں وہی آیت یعنی۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ ۔

ترجمہ: مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔

پیش کی ہے۔ (ہدایہ ص ۴۴۴-۴۴۵ ج ۲)

چھوٹے بچوں کا نفقہ

اپنے چھوٹے بچوں کا نفقہ والد کے ذمہ ہے۔ اس سے پہلے رضاعت کے سلسلہ میں قرآن کریم کی وہ آیات پیش کی جا چکی ہیں جن میں بچوں کو دودھ پلانے کے لئے مطلقہ بیوی کو اُجرت ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں کا نفقہ والد کے ذمہ ہوتا ہے۔ دودھ پلانے کی اُجرت ادا کرنا بھی نفقہ ہی کا حصہ ہے۔ یہ نفقہ اس وقت تک واجب ہے جبتک بچے اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو جائیں یعنی اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہو جائیں۔ لڑکی کی صورت میں اس کا نفقہ اس وقت تک واجب ہے۔ جبتک اس کی شادی نہ ہو جائے۔

والدین واجداد کا نفقہ

اسی طرح ضعیف اور ضرورت مند والدین، دادا، دادی وغیرہ کا نفقہ بھی جوان اولاد کے ذمہ واجب ہے بشرطیکہ وہ خود اکتساب رزق کی اہلیّت

سے محروم ہو چکے ہوں اور ضرورت مند ہوں۔ اس کے لئے ان کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ اگر وہ غیر مسلم ہوں تب بھی ان کا نفقہ ادا کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۃ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ٥ (۲/۲۱۵)

ترجمہ: اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تم خرچ کرو اس کے حقدار والدین، قریبی عزیز، یتیم بچے، مسکین لوگ اور مسافر ہیں۔ اور جو کچھ بھی تم نیکی کروگے تو یقیناً اللہ اسے بخوبی جاننے والا ہے۔

نیز سورۂ اسراء میں ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ٥ (۱۷/۲۶)

ترجمہ: اور قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو اور مسکین اور مسافر کو بھی اور کسی قسم کی فضول خرچی نہ کرو۔

علاوہ ازیں قرآن کریم نے جابجا والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان تمام آیات سے واضح ہے کہ والدین اگر ضرورتمند ہوں تو ان کا نفقہ بھی جوان اولاد کے ذمہ ہے۔ والدین کا لفظ دادا اور دادی، نانا اور نانی کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا ان کا نان و نفقہ بھی اولاد ہی کے ذمہ واجب ہو گا۔

ہر ذی رحم محرم کا نفقہ

اسی طرح ہر ذی رحم محرم کا نفقہ اگر وہ بچہ ہے، ضرورت مند ہو، اپاہج ہو، نابینا ہو تو ان کے ذی استطاعت قریب تر عزیز پر واجب ہے۔ اوپر جو آیات بیان ہوئی ہیں ان میں اَلْاَقْرَبِیْنَ اور ذَا الْقُرْبٰی کے الفاظ ہر ذی رحم محرم کو شامل ہیں بشرطیکہ وہ ضرورت مند اور اکتساب رزق کی صلاحیت سے محروم ہوں۔

لاپتہ اولاد کے مال سے نفقہ

اگر اولاد لاپتہ ہو، وہ کہیں چلی گئی ہو اور اس کا کوئی پتہ نہ ہو کہ وہ کہاں ہے لیکن اس کا مال موجود ہے تو والدین اس کے مال میں سے اپنا نفقہ حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں اس خرچہ کا ضمان دینا نہیں پڑے گا کیونکہ انہوں نے اپنا واجب حق وصول کیا ہے جو قرآن کریم نے ان کیلئے مقرر کر دیا ہے۔

کتابُ العتاق

اَلعِتَاقُ کے معنے غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنے کے ہوتے ہیں ہماری فقہ کی کتابوں میں عتاق کا طویل باب ہوا کرتا ہے۔ غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنا اسلام میں انتہائی ثواب کا کام اور پسندیدہ شمار کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مسلمان کسی صاحب ایمان غلام یا باندی کو آزاد کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلہ میں اس آزاد کرنے والے کے تمام اعضاء کو عذاب جہنم سے آزاد فرما دے گا۔ قرآن کریم نے بھی جا بجا غلاموں کو آزاد کرنے پر زور دیا ہے حتیٰ کہ بعض جرائم کا کفارہ بھی غلاموں کو آزاد کرنا قرار دیا ہے۔ اسلام آیا تو عرب معاشرہ میں بے شمار غلام اور باندیاں موجود تھیں۔

اسلام کا رجحان اگرچہ غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرنے کی طرف تھا لیکن معاشرہ ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا تھا کہ ان ہزارہا غلاموں اور باندیوں کو بیک جنبش قلم آزاد کر دیا جائے۔ اس طرح معاشرہ میں بے شمار پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں۔ وہ اب تک اپنے آقاؤں کے ساتھ

رہتے آ رہے تھے۔ وہی ان کی کفالت کرتے تھے۔ نہ ان کے پاس اپنا کوئی مکان تھا نہ اپنا کوئی ذریعۂ معاش تھا۔ وہ آزاد ہو کر کہاں سے کھاتے اور کہاں اپنا سر چھپاتے۔ اسلامی معاشرہ اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ مسلمان خود بھی دولت و ثروت کے مالک نہیں تھے وہ ان ہزارہا غلاموں اور باندیوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے کچھ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھے۔ کفار و مشرکین سے آئے دن جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہیں اپنے معاشرہ کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت سے بھی عہدہ برآ ہونا تھا یہ مشکل مسئلہ ان کی توجہات کا پہلے ہی مرکز بنا ہوا تھا۔ اسلام تعدد ازدواج کا فی نفسہٖ حامی نہیں تھا۔ لیکن اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اسے تعدد ازدواج کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اس طرح ہر مسلمان مرد پر کئی گنا ذمہ داریوں کا بوجھ پہلے ہی پڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں بیک جنبش ابرو ایک نیا مشکل مسئلہ نہیں چھیڑا جا سکتا تھا کہ ان ہزارہا غلاموں اور باندیوں کی رہائش اور معاش کا مسئلہ بھی حل کیا جائے اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کیا جائے۔ ایسا انتہائی قدم اٹھانا عملاً ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اسلام نے تدریجی طور پر اس سوال کو حل کرنے کا طریقہ اپنایا۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ غلاموں کو آزاد کریں۔

مکاتبت جو لوگ ویسے غلاموں کو آزاد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے ان سے کہا گیا کہ وہ غلاموں سے کچھ معاوضہ لے کر انہیں آزاد کر دیں۔ چنانچہ غلام محنت مزدوری کر کے کماتے تھے اور اپنے آقاؤں کو اپنی آزادی کا معاوضہ ادا کرتے تھے۔

سورۂ نور میں ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ فَکَاتِبُوْھُمْ الخ

ترجمہ: اور جو لوگ مکاتبت کرنا چاہیں ان میں سے جو تمہاری مِلک یمین میں ہیں تو تم ان سے کتابت کر لو۔

اور آگے ہے۔

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ ؕ (۲۴/۳۳)

اور اُنہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو خدا نے تمہیں دیا ہے۔

اس حکم کا مخاطب ہر مسلمان تھا اور تمام مسلمانوں پر یہ فرض تھا کہ وہ اپنے غلاموں سے اگر وہ غلام چاہیں تو کتابت کر لیں۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ اور بہت سے فقہاء کا فیصلہ ہے۔ (دیکھئے احکام القرآن للجصاص ج۳ ص۳۲۹)۔ اس طرح معاوضہ لے کر آزاد کرنے کو کتابت یا مکاتبت کہتے تھے۔ ان غلاموں کو آزادی حاصل کرنے کے لئے بیت المال سے بھی امداد دی جاتی تھی اور مسلمانوں کے اموالِ زکوٰۃ میں بھی ان کا حصہ ہوتا تھا۔ کچھ جرائم کا کفارہ ہی غلاموں کو آزاد کرنا مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح غلام آہستہ آہستہ آزاد ہو کر معاشرہ میں کھپتے اور اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے چلے گئے۔ آزاد ہونے کے بعد بھی اُنہیں آزاد کرنے والے کا مَوْلیٰ (دوست، خیر خواہ، مددگار) قرار دیا گیا تاکہ بالکلیہ اپنے آقا سے بے تعلق نہ ہو جائے وہ اس کی مدد کرے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں اس سے تعاون کرتا رہے تاکہ ان کی آزادی کسی پیچیدگی کا سبب نہ بن جائے۔

بہر حال اسلامی معاشرہ میں غلام بھی موجود تھے اور باندیاں بھی موجود تھیں اور کافی تعداد میں تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی

تعداد بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ اسلام کو قبول کرنے میں غربا، مساکین اور پسماندہ لوگوں نے ہی سبقت کی تھی۔ اور غلام اور باندیاں اس زمرہ میں سرفہرست آتے تھے۔ اتنی بڑی تعداد کے معاملات اور مسائل سے صرف نظر نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان کے سلسلہ میں کافی احکام اور مسائل بھی آنے تھے اور آئے۔

غلام اور باندیاں وہ مرد اور عورتیں ہوتی تھیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آتے تھے اور انہیں فاتح قوم اپنے افراد میں تقسیم کر دیا کرتی تھی۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ جنگوں کے نتیجہ میں جو زمانہ نزول قرآن میں مسلسل ہو رہی تھیں کیا قرآن کریم نے لونڈیاں اور غلام بنانے کے عمل کی کہیں توثیق و تائید کی ہے؟ کیونکہ جو کچھ اسلام سے پہلے ہوتا رہا وہ معلوم ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اسلام آیا تو عرب معاشرہ میں غلام بھی موجود تھے اور لونڈیاں بھی موجود تھیں۔ مگر یہ قصۂ ماضی تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس ضمن میں۔ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اور مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ ہی کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جو خود صیغۂ ماضی ہیں، جس سے اسی بات کا اشارہ ملتا ہے کہ یہ قصۂ ماضی ہی تھا۔ جبتک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اسلام نے آئندہ بھی اس کی اجازت دی ہے یا اس کی تائید و توثیق کی ہے اس وقت تک اسلام کو اس کے حق میں نہیں کہا جا سکتا۔

اسیرانِ جنگ کے سلسلہ میں اسلام سے پہلے چار طریقے رائج تھے۔

(۱) اسیرانِ جنگ کو قتل کر دینا۔

(۲) اسیرانِ جنگ کو غلام اور لونڈیاں بنالینا۔
(۳) فدیہ میں ان سے کچھ رقم لے کر ان کو چھوڑ دینا یا اپنے سپاہیوں سے جو دشمن کی قید میں ہوں تبادلہ کرلینا۔
(۴) یوں ہی رحم کھاکر اور احسان رکھ کر چھوڑ دینا۔

ان چار طریقوں کے علاوہ کوئی اور پانچواں طریقہ رائج نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان میں سے کن کن طریقوں کو اپنایا ہے۔ اور کن کن کی تائید و توثیق فرمائی ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں قرآن کریم کی یہ واضح ہدایت ملتی ہے۔

اِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً | سورۂ محمد میں ہے۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۟ۚ ذٰلِكَ ؕ (۴۷)

ترجمہ:- سو جب تمہارا ان لوگوں سے مقابلہ ہو جنہوں نے کفر کیا ہے تو ان کی گردنیں مارو (یعنی انہیں قتل کرو) یہاں تک کہ تم دشمن کو خوب کچل چکو تو پھر ان کی مشکیں کس لو (گرفتار کرلو) پھر یا تو (بعد میں) انہیں احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ تاآنکہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے (یعنی جنگ ختم ہو جائے) یہی قانون ہے۔

اس آیت کریمہ میں صراحت کے ساتھ قانونِ الٰہی بیان فرمادیا گیا ہے کہ جبتک جنگ جاری رہے انہیں خوب مارو۔ ان کی گردنیں اڑاؤ اور جب دشمن کو کچل چکو اور وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں گرفتار کرلو۔ اس کے بعد صرف دو اُمور کی اجازت ہے۔ یا تو انہیں ویسے ہی احسان

رکھ کر چھوڑ دو۔ یا ان سے کچھ معاوضہ لے کر چھوڑ دو۔ معاوضہ لینے کی دو صورتیں ہیں۔ اگر تمہارے آدمی دشمن کی قید میں ہوں تو ان سے تبادلہ کر لو یا کچھ رقم لے کر ان کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ ذٰلِکَ ط (یہی قانون ہے) یعنی تمہیں اسی کی پیروی کرنی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اسیرانِ جنگ کے سلسلہ میں صرف دو امور کی اجازت دیتا ہے۔

(۱) احسان رکھ کر چھوڑ دو یا

(۲) کچھ معاوضہ لے کر چھوڑ دو۔

بہر حال چھوڑ دینا متعین ہے۔ اس طرح چھوڑ و یا اُس طرح چھوڑو باقی دو طریقے کہ۔

(۳) اسیرانِ جنگ کو قتل کر دیا جائے یا

(۴) اُنہیں غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔ قرآن کریم نے ان کی تائید نہیں فرمائی۔

کہا جاتا ہے کہ سورۂ محمد کی یہ آیت سورۂ توبہ کی آیت سے جو اس کے بعد نازل ہوئی ہے منسوخ ہے۔ لہٰذا چونکہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے اس لئے غلام اور لونڈیاں بنانا جائز ہے۔

اوّل تو نسخ کا دعویٰ خود عجیب و غریب ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی ہر آیت معمول بہا اور قابل عمل ہے۔ البتہ چونکہ قوموں کے حالات ادلتے بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہر حکم ہر حالت میں قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ مختلف حالات کے لئے مختلف احکام دیئے گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر حکم پر اس کے مناسب حال میں عمل کریں۔

نماز کے لئے کھڑے ہونے پر وضو کر لینے کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی میسر نہ ہو تو وضو کے بجائے تیمم کر لینے کی اجازت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تیمم کی آیت سے وضو کرنے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ دونوں حکم دو حالتوں کیلئے ہیں۔ اگر پانی میسر ہو تو وضو کرنا ہو گا۔ اگر پانی میسر نہ ہو تو تیمم کرنا ہو گا۔ نہ وضو کی آیت سے تیمم کا حکم منسوخ ہے نہ تیمم کی آیت سے وضو کا حکم منسوخ ہے۔

لیکن بر سبیل تنزل ہم اس دعوائے نسخ کا بھی جائزہ لے لینا چاہتے ہیں۔ ہم یہ بحث شیخ الاسلام ابو بکر جصاص رازی کی مشہور کتاب احکام القرآن سے نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"ابن عباس رضؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ

(۸/۶۷)

ترجمہ: نبی کے لئے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاآنکہ وہ میدانِ جنگ میں دشمن کو کچل نہ دے زمین میں خوب خون نہ بہا لے۔

یہ آیت جنگِ بدر کے بارہ میں نازل ہوئی تھی جبکہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر جب مسلمان بکثرت ہو گئے اور ان کا غلبہ و تسلط مستحکم ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اس کے بعد یہ حکم نازل فرمادیا

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷/۴)

ترجمہ: پھر یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

تو حق تعالیٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو

یہ اختیار دے دیا کہ وہ قیدیوں کو چاہیں تو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو انہیں غلام بنالیں اور اگر چاہیں تو ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ ابو عبید راوی کو اس لفظ میں شک ہے کہ۔

"اگر چاہیں تو اُنہیں غلام بنالیں"

ہم سے جعفر بن محمد نے بیان کیا (بسندہ) سفیان سے کہ میں نے سدّی کو کہتے ہوئے سنا کہ حق تعالیٰ کا قول۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً

منسوخ ہے۔ اِسے حق تعالیٰ کے اس قول نے کہ۔

فَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ط

منسوخ کر دیا ہے۔ ابو بکر (یعنی خود امام جصاص رازی) کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط

(۴۷/۴)

اور یہ ارشاد کہ۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ط

(۸/۶۷)

اور یہ ارشاد

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ ط

(۸/۵۷)

ترجمہ: پھر اگر آپ اُنہیں جنگ میں پائیں تو اُنہیں ایسا تتر بتر کیجئے کہ ان کی پشت پر جو لوگ ہوں وہ بھی بھاگ جائیں۔

ہو سکتا ہے کہ ان تمام آیات کے حکم ثابت ہوں اور منسوخ نہ ہوں۔ کیونکہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو قتل کی گرم بازاری کا حکم دیا ہے اور جبتک مشرکین ذلیل نہ ہو جائیں اور ان کا قلع قمع نہ ہو جائے اس وقت تک کفار کو قید کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ امر اس وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور دشمنوں یعنی مشرکین کی تعداد زیادہ تھی۔ لیکن جب مشرکوں کا خون بہا لیا گیا اور قتل اور پراگندہ کر کے اُنہیں ذلیل کر لیا گیا تو اُنہیں زندہ رکھنے کی اجازت دیدی گئی۔ تو یہ ضروری ہوگا کہ یہ حکم ثابت ہو جبکہ ویسی ہی مسلمانوں کی حالت پائی جائے جیسا کہ ابتدا اسلام میں تھی۔

رہ گیا حق تعالیٰ کا ارشاد فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً تو آیت کے ظاہری معنے اسی کو مقتضی ہیں کہ صرف دو چیزوں کو اختیار کرنا جائز ہے۔ احسان رکھ کر چھوڑ دینا یا فدیہ لے کر چھوڑنا۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کو قتل کر دینا جائز نہیں ہے۔ سلف نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے چنانچہ (سند کے ساتھ) حسن بصری سے مروی ہے کہ اُنہوں نے قیدی کے قتل کر دینے کو ناپسند کیا ہے اور فرمایا کہ اس پر احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ نیز (سند کے ساتھ) عطاء سے مروی ہے کہ ان سے قیدی کو قتل کرنے کے بارہ میں سوال کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ اسے احسان رکھ کر چھوڑ

دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اس کے بارہ میں حسن سے پوچھا تھا تو انہوں نے فرمایا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے ساتھ کیا تھا۔ اُن پر احسان کیا جائے یا اُن سے فدیہ لے لیا جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اصطخر کا ایک بلند مرتبہ قیدی ان کے سپرد کیا گیا کہ وہ اسے قتل کر دیں تو انہوں نے اسے قتل کرنے سے انکار فرما دیا اور یہی آیت تلاوت فرمائی فَاِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً۔ مجاہد اور محمد ابن سیرین سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے کہ قیدی کو قتل کر دینا ناپسندیدہ ہے لیکن ہمیں سدی سے یہ بات پہنچی ہے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد فَاِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً منسوخ ہے اور وہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ سے منسوخ ہے۔ اسی کے مثل ابن جریج سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ (سند کے ساتھ) انہوں نے بھی کہا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے اور انہوں نے کہا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کی جنگ میں عقبہ ابن ابی معیط کو نشانہ بنا کر قتل کر دیا تھا۔ ابوبکر (یعنی خود امام جصاصؒ رازی) کہتا ہے کہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ قیدی کو قتل کر دینا جائز ہے۔ ہمیں اس مسئلہ میں کوئی اختلاف معلوم نہیں ہوا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے روایات تواتر کے ساتھ

ثابت ہیں کہ آپ نے قیدیوں کو قتل فرمایا ہے۔ مثلاً عقبہ ابن ابی معیط اور نضر بن الحارث کو بدر میں گرفتار کر کے، ابو عزۃ شاعر کو جنگ احد میں قید کر کے اور بنو قریظہ کو حضرت سعد ابن معاذؓ کے فیصلہ پر اتر آنے کے بعد الخ"

(احکام القرآن صفحہ ۴۸۱ ج ۳)

اس کے بعد امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے مختلف روایات نقل فرمائی ہیں۔ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اسیران جنگ کو قتل فرما دیا ہے اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کو فدیہ لے کر یا تبادلہ میں چھوڑ دیا گیا ہے اور فقہاء کے دونوں طرح کے اقوال نقل فرماتے ہیں۔ کچھ فقہاء فدیہ لے کر یا تبادلہ میں چھوڑ دینے کے حق میں ہیں اور کچھ فقہاء قتل کر دینے کے حق میں ہیں۔ پھر اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"لیکن اس آیت میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے کہ احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، اسی طرح جو کچھ غزوۂ بدر کے اسیرانِ جنگ کے بارہ میں وارد ہوا ہے تو وہ حق تعالیٰ کے ارشاد۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۔ (۹/۵)

ترجمہ: اور مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انہیں پکڑ لو اور انہیں گھیر لو اور ان کی تاک میں ہر گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

سے منسوخ ہے۔ یہ بات ہمیں سدی اور ابن جریج کی روایت سے معلوم ہوئی ہے۔ نیز حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی منسوخ ہے۔
قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ٥ (پ ۹/۲۹)

ترجمہ: ان لوگوں میں جو کتاب دیئے گئے ہیں جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے انہیں حرام نہیں سمجھتے اور سچے دین، (اسلام) پر نہیں چلتے ان سے جنگ کرتے رہو تا آنکہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا نہ کریں۔

ان دونوں آیتوں میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ کفار سے جنگ کرنا فرض ہے حتیٰ کہ وہ اسلام لے آئیں یا جزیہ دیں۔ اور مال کا فدیہ لے کر یا کوئی دوسرا معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دینا ان آیات کے حکم کے منافی ہے۔ اور علمائے تفسیر اور ناقلین آثار کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سورۂ براۃ کا نزول سورۂ محمد کے بعد ہوا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو حکم سورۂ براۃ میں آیا ہے وہ اس حکم کو منسوخ کر دے جو دوسری جگہ فدیہ لینے کے متعلق آیا ہے۔"

(احکام القرآن ص ۴۸۳/۲)

آپ نے فقہ حنفی کے مشہور امام شیخ الاسلام ابو بکر جصاص رازیؒ کی مذکورہ بالا تصریحات ملاحظہ فرما لیں۔ ان تصریحات سے جو نکات

سامنے آتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں۔

(۱) سورۂ محمد کی آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حضرت ابن عباسؓ عبداللہ ابن عمرؓ، حسن بصریؒ، عطاء ابن ابی رباح، مجاہد، محمد ابن سیرین وغیرہ حضرات کے نزدیک منسوخ نہیں ہے بلکہ معمول بہا ہے۔

(۲) سدیؒ اور ابن جریجؒ کا خیال ہے کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اسے سورۂ براۃ کی ان آیات نے منسوخ کر دیا ہے جن میں کفار و مشرکین کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اسیرانِ جنگ کو کسی طرح چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ قتل ہی کیا جائے گا۔

(۳) فقہاء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ کفار و مشرکین کو قتل کرنا چاہیئے یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا بھی جائز ہے۔

اس بحث کا حاصل یہ نکلا کہ جو فقہاء کفار و مشرکین کے اسیرانِ جنگ کو صرف قتل کر دینے کے حق میں ہیں وہ سورۂ محمد کی اس آیت کو منسوخ مانتے ہیں مثلاً سدی اور ابن جریج۔ لیکن جو فقہاء قتل کر دینے کے حق میں نہیں ہیں مثلاً حضرت ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، حسن بصریؒ، عطاءؒ ابن ابی رباح، مجاہد اور محمد ابن سیرین وہ اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ جمہور فقہاء کے مقابلے میں سدی اور ابن جریج کے قول کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ علاوہ ازیں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جو لوگ سورۂ محمد کی آیت کو منسوخ مانتے ہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ جنگی قیدیوں کو قتل ہی کر دینا ہوگا۔ کیونکہ سورۂ براۃ کی آیات کا تقاضا یہی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ان جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے۔ حتیٰ کہ حضرت ابن عباسؓ

کی روایت میں جو ابو عبید نے عبد اللہ ابن صالح سے انہوں نے معاویہ ابن صالح سے، انہوں نے علی ابن طلحہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے نقل کی ہے یہ الفاظ آ گئے تھے کہ (سورۂ محمد کی اس آیت نے) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو جنگی قیدیوں کے بارہ میں یہ اختیار دیدیا کہ وہ چاہیں تو انہیں قتل کر دیں اور چاہیں تو انہیں غلام بنالیں اور چاہیں تو فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیں۔ خود ابو عبید نے اس لفظ میں کہ "چاہیں تو انہیں غلام بنالیں" اپنے شک وشبہ کا اظہار کر کے کہ یہ لفظ روایت میں ہے یا نہیں اس کمزور دلیل پر بھی پانی پھیر دیا۔ حالانکہ یہ روایت اور اس کا مضمون بداہتہً بھی خلافِ واقعہ ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جس سے قتل کر دینے کی ——— اور غلام بنانے کی اجازت نکلتی ہو۔ آیتِ کریمہ میں واضح طور پر صرف دو باتوں کی اجازت دی گئی ہے اور وہ یہ کہ یا تو احسان رکھ کر یوں ہی بلا معاوضہ چھوڑ دو اور یا کچھ معاوضہ لے کر چھوڑ دو۔ نہ انہیں قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے اور نہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے ایک واضح بات کو سمجھنے میں اتنی بڑی لغزش کیسے فرمالی کیونکہ فقہائے حنفیہ نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ سورۂ براءت کی وہ آیات جن کو سورۂ محمد کی آیت مذکورہ بالا کا ناسخ سمجھ لیا گیا ہے وہ درحقیقت عرب کے مشرکین کے متعلق ہیں جن میں سے کچھ کے ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

نے معاہدات کر رکھے تھے اور کچھ کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں تھا جن کے ساتھ آپ کے معاہدات تھے ان میں کچھ اپنے معاہدوں پر قائم تھے اور کچھ معاہدہ شکنی کے مرتکب ہو چکے تھے۔ انہی کے متعلق یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ وہ اس سال (۹ھ) کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔ چنانچہ سورۂ براۃ کی ان آیات کا ۹ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے حج کے موقعہ پر اعلان بھی کرا دیا گیا تھا۔ اس آیت کی ابتداء ہی جسے ناسخ مانا جارہا ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ عرب کے مشرکین کے سلسلہ میں حکم ہے کہ وہ یا اسلام قبول کریں یا قتل ہونا گوارہ کریں۔ انہیں احسان رکھ کر چھوڑنے یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت نہیں ہے کیونکہ جزیرہ نمائے عرب کو اسلام کا مرکز بنانا مقصود تھا اس لئے وہاں کسی مشرک کو رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ فقہائے حنفیہ نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھا ہوا تھا۔

چنانچہ ان کا مسلک یہی ہے کہ۔

"امام کو جنگی قیدیوں کے سلسلہ میں اختیار ہے کہ چاہے انہیں قتل کر دے کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قتل فرمایا ہے۔ نیز اس صورت میں مادۂ فساد کو ختم کرنا ہے۔ اور چاہے تو انہیں غلام بنا لے کیونکہ اس میں ان کے شر سے حفاظت ہے اور مسلمانوں کے لئے پوری پوری منفعت ہے اور چاہے تو انہیں آزاد چھوڑ دے کہ مسلمان ان کی حفاظت کے ذمہ دار رہوں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں

البتہ مشرکین عرب اور مرتدین کو چھوڑ دینا جائز نہیں ہے جیسا کہ ہم آئندہ انشاء اللہ بیان کریں گے۔"

(ہدایہ صفحہ ۵۶۷ ج ۲)

اس کے بعد ہدایہ ہی میں جزیہ کے باب میں ہے کہ۔

"اور عرب کے بُت پرستوں اور مرتد لوگوں پر جزیہ نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ ان کا کفر انتہائی شدید ہے۔ مشرکین کا تو اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُنہی کے درمیان پلے بڑھے اور قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا تو معجزہ ان کے حق میں واضح تر تھا۔ رہ گئے مرتد تو وہ اس لئے کہ اسلام کی ہدایت حاصل ہو جانے اور اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں فریقوں سے اسلام یا تلوار کے علاوہ کوئی تیسری صورت قبول نہیں کی جاسکتی تاکہ اُنہیں زیادہ سزا ملے لیکن امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ عرب کے مشرکین کو غلام بنالیا جائے گا۔ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے اُوپر بیان کر دیا ہے۔"

(ہدایہ صفحہ ۵۹۵ ج ۲)

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حنفی مکتبۂ فکر کے ائمہ فقہاء نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھا ہوا تھا کہ سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیات جزیرۃ العرب کے مشرکین کے بارہ میں ہیں۔ اسی بناء پر انہوں نے صراحت فرمادی تھی کہ مشرکین عرب سے صرف اسلام قبول کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو اُنہیں قتل کر دیا جائے گا۔ اور سورۂ محمد کی

آیت مذکورہ بالا عام کفار کے متعلق ہے۔ لہٰذا سورۂ توبہ کی آیات اور سورۂ محمد کی آیت میں نہ کوئی تعارض ہے نہ تناقض کہ ایک کو دوسری کے لئے ناسخ مانا جائے۔

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سورۂ محمد کی مذکورہ بالا آیت منسوخ نہیں ہے اور جن حضرات نے اس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ فرمایا ہے وہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن کریم نے غلام اور باندیاں بنا لینے کی اجازت نہیں دی ہے اور اسیرانِ جنگ کو رہا کر دینے کا حکم دے کر اس دروازہ کو بالکل بند کر دیا ہے۔ یہ اجازت ضرور دی ہے کہ خواہ انہیں یوں ہی احسان رکھ کر چھوڑ دو یا ان سے کچھ معاوضہ لے کر چھوڑ دو۔ لیکن انہیں غلام بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔[ع]

حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا

اس آیت کریمہ میں حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا کا ٹکڑا نہایت اہم ہے۔ یہ ان احکام کی غایت ہے جو اس سے پہلے بیان فرمائے گئے ہیں۔ یعنی کفار کی گردنیں اڑانا، قتل و خون ریزی کرنا، انہیں مضبوطی کے ساتھ باندھ لینا یعنی گرفتار کر لینا اس وقت تک ہے جب تک جنگ جاری رہے۔ کیونکہ جنگ جاری ہونے کی صورت میں اگر اسیرانِ جنگ کو رہا کر دیا گیا تو وہ پھر مقابلہ پر آئیں گے۔ اس طرح دشمن کی قوت ختم نہیں ہوگی۔ جب تک جنگ جاری ہے انہیں بہر حال گرفتار کر کے قید میں رکھنا ضروری ہے۔ جبکہ دوسری طرف دشمن بھی تمہارے سپاہیوں کو قتل کر رہا ہے، انہیں گرفتار کر رہا ہے بلکہ غلام بنا رہا ہے۔ جنگ میں یہی ہوتا ہے، کبھی ایک فریق غالب

ع یہی تحقیق مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی ہے (ترجمان القرآن طبع اول جلد ۲ سورۂ انفال نوٹ نمبر ۳۷

ہو جاتا ہے، کبھی دوسرا فریق غالب ہو جاتا ہے۔ تم غالب آؤ گے تو تم دشمن کے آدمیوں کو قید کر لو گے، لیکن دشمن غالب آگیا تو وہ تمہارے آدمیوں کو گرفتار کرے گا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک عہد میں اسیرانِ جنگ میں سے کسی کو غلام نہیں بنایا امام محمد ابن احمد قرطبی نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں تحریر فرمایا ہے کہ۔

> "جہاں تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے متعدد موقعوں پر جنگی قیدیوں کو قتل کرایا ہے، اور احسان رکھ کر چھوڑ بھی دیا ہے اور عورتوں کو غلام بنا لیا ہے۔ لیکن ابو عبیدؒ نے بیان کیا ہے کہ آپ نے عرب کے کسی آزاد مرد کو کبھی بھی غلام نہیں بنایا الخ" (صـ ۳۸۲ / ج ۱)

اس طرح ہمارے فقہاء نے خود اعتراف فرما لیا ہے کہ آپ نے عرب کے کسی بھی آزاد آدمی کو غلام نہیں بنایا۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کو غلام بنایا گیا ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں عورتوں کے سلسلہ میں ہمارے فقہاء کرام کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اُنہیں غالباً حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان جیسی کچھ مستورات سے شبہ ہوا ہے۔ حالانکہ ان سے آپ نے خود ان کی مرضی سے نکاح فرما لیا تھا اور وہ امہات المؤمنین میں شامل ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے عرب کے نہ کسی مرد کو غلام بنایا ہے نہ کسی عورت کو۔ اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کی تمام جنگی مہمات جزیرۃ العرب تک ہی محدود رہی ہیں۔ جزیرۃ العرب سے باہر

روما کی سرحد پر آپ تبوک تک فوج لے کر تشریف لے گئے ہیں لیکن وہاں کوئی جنگ پیش نہیں آئی تھی۔ عہ

حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے جو جنگی مہمات کی ابتدا ہوئی ہے تو وہ مسلسل جاری رہی۔ درمیان میں صرف حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے عہد میں آپس کی خانہ جنگی کی وجہ سے کفار کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ معطل رہا ہے ورنہ پورا بنو امیہ کا دور اور بنو عباس کا بھی ابتدائی دور کفار کے ساتھ جنگوں میں گذرا ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا کا سنہری دور آ گیا تھا۔ ان جنگوں میں بے شمار کفار گرفتار ہو کر آئے ہیں۔ اور انہیں مسلمان گھرانوں میں نگرانی، حفاظت، رہائش، پرورش اور غور و پرداخت کے لئے تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لیکن ان کی حیثیت جنگی قیدیوں ہی کی تھی۔ غلاموں اور باندیوں کی نہیں تھی۔ دنیوی تمدن ابھی اس منزل تک نہیں پہنچا تھا کہ ان اسیرانِ جنگ کے لئے باقاعدہ اجتماعی کیمپ (CONCENTRATION CAMPS) قائم کئے جا سکتے۔ اس عہد میں یہی صورت ممکن تھی کہ ان اسیرانِ جنگ کو مسلم گھرانوں میں تقسیم کر دیا جائے جو ان کی حفاظت بھی کریں۔ ان کی غور و پرداخت بھی کریں اور پوری پوری کفالت بھی کریں۔ لیکن ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ان کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا گیا تھا۔ وہ قطعاً اسیرانِ جنگ تھے اور جنگ کے خاتمہ کے بعد ان کو لامحالہ رہا کر دینا تھا۔

حضرات خلفائے راشدین کے عہد میں ان اسیرانِ جنگ کو کس قسم کی

عہ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں یہ آرڈی نینس نافذ کیا کہ عربوں میں سے کسی کو لونڈی غلام نہیں بنایا جا سکتا (الفاروق)

مراعات حاصل تھیں اور ان کے ساتھ کس انداز کا سلوک روا رکھا جاتا تھا وہ آج بھی تاریخ کے اوراق کی زینت ہے۔ اور ہم اسے اپنی تائید میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر بنو امیہ کے آخری عہد میں اور بنو عباس کے پورے دور میں خلفاء، سلاطین اور امراء کی عیش پسندانہ زندگی نے صورتِ حال کو قطعًا تبدیل کر دیا اور اسے دورِ جاہلیت کی جانب پلٹ دیا جنگی مہمات کے سلسلہ میں جنگی قیدی آتے تھے اور انہیں فاتحین میں تقسیم بھی کیا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ ان کی حیثیت تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اسیرانِ جنگ کی حیثیت غلاموں اور باندیوں کی صورت اختیار کرتی چلی گئی اور یوں "حقیقت خرافات میں کھو گئی"۔ لیکن بہر حال بعد میں جو کچھ ہوا اسے اس کی ابتدائی شکل کو مطعون کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضرات خلفائے راشدین قرآن کریم کے صریح احکام کی خلاف ورزی فرما سکتے تھے۔ عباسی دورِ خلافت میں صورتِ حالات اس درجہ مسخ ہو چکی تھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا تھا اسے درست اور صحیح باور کر کے ہمارے فقہاء نے بھی اس بنیاد پر کتاب العتاق کے طول و طویل باب کو ہماری کتب فقہ میں پوری اہمیت کے ساتھ جگہ دیدی۔ حتیٰ کہ ہمارے فقہاء کو یہ فرماتے ہوئے بھی جھجھک محسوس نہیں ہوئی کہ۔

"ابو عبیدؒ نے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عرب کے کسی آزاد مرد کو کبھی غلام نہیں بنایا تھا لیکن آپ کے بعد صحابہ نے اہل کتاب کے کفار کو مردوں

کو بھی اور عورتوں کو بھی غلام بنا لینے پر اجماع کر لیا۔

(بدایۃ المجتہد صفحہ ۳۸۱)

مجھے افسوس ہے کہ ہم اس نظریہ کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ حضرات صحابۂ کرام قرآن کریم کے صریح حکم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مستقل عمل کے خلاف اجماع فرمائیں گے اور ان کے خلاف نیا حکم نافذ فرما دیں گے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

بہرحال ہماری قطعی رائے ٹھوس دلائل پر مبنی ہے کہ اسلام میں غلاموں کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ یہ ادارہ ابتداءً اسلام میں ضرور تھا۔ جسے آہستہ آہستہ بتدریج ختم کر دیا گیا تھا۔ اور آئندہ کے لئے اس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے سلسلہ میں جو احکام آئے ہیں وہ انہی غلاموں اور لونڈیوں کے لئے ہیں جو پہلے سے معاشرہ میں موجود تھے۔ ہمارے فقہائے کرام نے اس سلسلہ میں جو کاوشیں کی ہیں وہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ اور یہ غلط فہمی کوئی عجوبہ نہیں ہے۔ ان حضرات نے جس دَور میں آنکھیں کھولی تھیں وہ سرتاسر غلاموں اور لونڈیوں کی چکاچوند سے اتنا تابناک بنا ہوا تھا کہ اصل حقیقت اس کی چکاچوند میں مستور ہو کر رہ گئی تھی آج ہمیں یہ تصریحات اس لئے نظر آ رہی ہیں کہ ہماری نگاہوں سے وہ جادو اتر چکا ہے اور غلاموں اور لونڈیوں کی چکاچوند ہمیشہ کے لئے ماند پڑ چکی ہے۔ اس میں نہ ان حضرات کی کوئی کوتاہ نظری تھی اور نہ ہماری کوئی بالغ نظری ہے۔ یہ تو حالات کا عین تقاضا ہے۔

اسلام نے غلامی کے ادارہ کو ختم کرنے کے لئے تدریجی طریقہ اختیار کیا اور اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔

(۱) مختلف کفاروں میں لونڈی غلام آزاد کئے جائیں۔

(۲) بطور ثواب ان کو آزاد کیا جائے۔

(۳) جو لونڈی غلام مکاتبت کرنا چاہیں انہیں کتابت کے ذریعہ لازماً آزاد کر دیا جائے جیسا حضرت عمرؓ وغیرہ کے ارشادات ہم نقل کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ لونڈی غلام ہزاروں برس سے لاکھوں کی تعداد میں اور ہر ملک و قوم میں چلے آرہے تھے اس لئے انہیں آزادی حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگنا تھا اور لگا۔ اور جبتک یہ ادارہ بالکلیہ ختم نہیں ہو گیا اسلام نے اس عرصہ کے لئے بھی ضروری اصلاحات کیں، مثلاً حکم دیا۔

اخوانکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم، اطعموھم بما تاکلون والبسوھم بما تلبسون۔ (بخاری و مسلم)

ترجمہ:- وہ تمہارے بھائی ہیں۔ خدا نے انہیں تمہارے ہاتھوں کے نیچے دیدیا ہے انہیں جو خود کھاتے ہو وہی کھلاؤ جو خود پہنتے ہو وہی پہناؤ۔

اسی سلسلہ میں ایک انتہائی اصلاح یہ فرمائی کہ کنیزوں سے بغیر نکاح کے جنسی تمتع کو ممنوع قرار دیدیا جس کا جاہلیت میں عام رواج تھا۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ (۴/۳)

ترجمہ:- تو تم مذکورہ عورتوں سے دو دو، تین تین، چار کی تعداد میں نکاح کر لو۔ پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر پاؤ گے تو ایک ہی عورت یا ملک یمین سے نکاح کر لو۔

اس آیت میں فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ دونوں لفظ فانکحوا کا مفعول ہیں۔

نیز سورۂ نور میں ہے۔

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۚ (۲۴/۳۲)

ترجمہ:- اور اپنی بیوہ عورتوں، نیک بندوں اور اپنی باندیوں کے نکاح کر دیا کرو۔

چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کنیزیں آئیں ان سے آپ نے نکاح فرمایا اور صحابہ کرام نے بھی اسی کے مطابق عمل کیا۔ اس موضوع پر مشہور محقق مولانا تمنا عمادی کی کتاب الدر الثمین لملک الیمین اور مشہور اہل حدیث عالم حافظ عنایت اللہ اثری وزیرآبادی کی کتاب الحق الیقین قابل ملاحظہ ہیں نیز مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ دیکھئے (ترجمان القرآن صفحہ ۵۲۷/۲ سورۂ مؤمنون نوٹ نمبر۲)

کتاب الایمان

ایمانؔ، یمین کی جمع ہے جس کے معنے قسم کے ہوتے ہیں۔
ہمارے فقہاء نے قسم کی تین قسمیں کی ہیں۔

(۱) اوّل یمین غموس۔

(۲) دوم یمین منعقدہ۔

(۳) سوم یمین لغو۔

یمین غموس

یمین غموس اس جھوٹی قسم کو کہتے ہیں جو گذشتہ کے متعلق کسی بات کے بارہ میں کھائی جائے کہ فلاں بات یوں ہوئی تھی یا فلاں بات یوں نہیں ہوئی تھی۔ اس انداز کی قسم کھانے والا جانتا ہے کہ میں جھوٹی قسم کھا رہا ہوں اور جانتے بوجھتے وہ حلف اٹھا لیتا ہے۔ یہ قسم کھانا حرام ہے۔ قرآن کریم میں اس کی شدت کے ساتھ ممانعت آئی ہے۔

سورۂ توبہ میں ہے۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ط فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ط اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ

جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٥ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ٥

(۹ / ۹۵—۹۶)

ترجمہ :۔ اے مسلمانو! تم جب ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگذر کرو۔ تو تم ان سے درگذر ہی کرو یقیناً وہ لوگ گندگی کی پوٹ ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جو کچھ وہ کرتے رہتے ہیں یہ اس کا بدلہ ہوگا۔ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو گئے تو اللہ تو ایسے فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوگا۔

یہ آیات غزوۂ تبوک کے سلسلہ میں ان منافقین کے بارہ میں نازل ہوئی تھیں جو غزوہ میں شریک نہیں ہوئے تھے اور غزوۂ تبوک سے واپسی پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا کھا کر ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ سچے مسلمان ہیں اور غزوہ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ کچھ معقول عذر تھے۔ جن کی وجہ سے وہ شریک نہ ہو سکے تھے۔ بہرحال یہ لوگ ظاہر میں مسلمان ہی تھے اور اپنے سچے مسلمان ہونے کے مدعی تھے ان کی جھوٹی قسموں پر ان کو عذاب جہنم کی وعید فرمائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا ان سے راضی نہیں ہوگا۔

نیز سورۂ مجادلہ میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ٥

(۵۸/۱۴)

ترجمہ: آپ نے (اے پیغمبر اسلام!) ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ان سے دوستی گانٹھتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہیں۔ نہ وہ تم میں سے ہیں نہ ان میں سے ہیں اور وہ جھوٹی قسمیں جانتے بوجھتے کھاتے ہیں۔

نیز سورۂ قلم میں ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۔

ترجمہ: اور اے پیغمبر اسلام! آپ ہر ذلیل قسمیں کھاجانے والوں کی بات کا اعتبار نہ کیجئے۔

نیز سورۂ آل عمران میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۔

(۳/۷۷)

ترجمہ: یقیناً جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قسموں کے عوض معمولی سا مفاد اختیار کر لیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

ان کے علاوہ آیات ۵۸/۱۶ ، ۶۳/۲ اور ۱۶/۹۴ میں بھی جھوٹی قسمیں کھانے پر عذاب الٰہی کی وعید آئی ہے۔

یمین غموس (یعنی ماضی کے متعلق جھوٹی قسم) شدید ترین گناہ بلکہ حرام ہے۔ حنفیہ کے ہاں اس کی معافی توبہ اور استغفار ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔

امام شافعیؒ کا ارشاد ہے کہ اس میں بھی کفارہ واجب ہے۔

قرآن کریم نے اس طرح کی قسموں کے لئے کسی کفارہ کا ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ اپنی ناراضامندی اور عذاب جہنم کی وعید ہی فرمائی ہے۔ اس

لئے ہمارے نزدیک حنفیہ کا مسلک قرآن سے قریب تر ہے۔ اس قسم کی قسموں میں کفارہ کا قائل ہونا دراصل جرم کی شدت کو کم کرنا اور لوگوں کو جھوٹی قسموں پر جرأت دلانے کے مرادف ہے۔ لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ جھوٹی قسم کھالو، کفارہ دے کر معافی مل جائے گی اور ہم اس کے نتائج سے چھوٹ جائیں گے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مذکورہ بالا آیات جو ہم نے پیش کی ہیں وہ اس جرم کے مذموم بلکہ خدا کے نزدیک مبغوض ہونے کا شدت سے اظہار کر رہی ہیں جو چند مسکینوں کو کھانا کھلا دینے سے معاف نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

یمین لغو دوسری قسم یمین لغو کہلاتی ہے۔ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ یمین لغو وہ قسم کہلاتی ہے جو بلا قصد وارادہ کسی سے تکیۂ کلام کے طور پر صادر ہو جائے۔ اور جس سے قسم کھانے کی نیت نہ ہو۔ جیسا کہ عربوں میں لَا وَاللّٰہِ اور بَلٰی وَاللّٰہِ بات بات میں بول دینے کا رواج تھا۔ اس سے ان کی نیت قسم کھانے کی نہیں ہوتی تھی۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ یمین لغو اسے کہتے ہیں کہ آدمی ماضی کے متعلق غلط معلومات کی بنا پر جھوٹی قسم کھالیتا ہے۔ لیکن وہ اپنی معلومات اور واقفیت کی بنا پر اپنے نزدیک سچی قسم ہی کھاتا ہے۔ ایسی قسموں پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ان پر کوئی کفارہ واجب ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ (۵/۸۹)

ترجمہ: اللہ تم سے تمہاری لغو قسموں کے متعلق کوئی مؤاخذہ نہیں فرمائے گا۔ لیکن ان قسموں پر ضرور مؤاخذہ فرمائے گا۔ جو تم نے ارادۃً منعقد کی ہوں۔

آیتِ کریمہ سے امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے کیونکہ جو قسم ماضی کے متعلق غلط معلومات کی بناء پر صحیح سمجھتے ہوئے کھائی جاتی ہے جو فی الواقعہ غلط ہوتی ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ارادۃً منعقد نہیں کی گئی تھی۔ وہ فی الحقیقت منعقد تو ارادۃً ہی ہوتی ہے لیکن اس کا منشاء ارادۃً جھوٹ بولنا نہیں ہوتا بلکہ لاعلمی کی بناء پر وہ جھوٹی قسم کھا لیتا ہے۔ یہ ایک قسم کی غلطی اور خطاء ہے جس پر مؤاخذہ نہیں ہو گا۔

سورۂ احزاب میں ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵﴾

ترجمہ: جو باتیں تم سے غلطی سے سرزد ہو جائیں اُن میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ البتہ ان میں گناہ ہے جو تمہارے دلوں نے ارادۃً کی ہوں۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

ان قسموں کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی قِسم کی قسموں کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی ان پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں طرح کی قسموں کو یمینِ لغو شمار کیا جا سکتا ہے۔

یمین منعقدہ | یمین منعقدہ اس قسم کو کہتے ہیں جو آدمی مستقبل کے متعلق قسم کھا کر کہے کہ میں فلاں کام ضرور

کروں گا۔ یا فلاں کام ہرگز نہیں کروں گا۔ اس قسم کی قسم کھا لینے کے بعد اگر کوئی شخص اپنی قسم کے خلاف عمل کرے یعنی قسم کو توڑ دے جسے اصطلاح میں حنث یعنی حانث ہونا کہتے ہیں تو ایسے شخص پر کفارہ واجب ہوگا۔ ہم کسی موقعہ پر پہلے بتا چکے ہیں کہ قسم کھانے والا آدمی جس ہستی کی قسم کھاتا ہے اسے اپنی شہادت اور ضمانت میں پیش کرتا ہے۔ اگر ماضی کے متعلق قسم کھائی ہے تو وہ اس ہستی کو اپنی شہادت میں پیش کرتا ہے اور اگر مستقبل کے متعلق قسم کھائی ہے تو وہ اس ہستی کو اپنی ضمانت میں پیش کرتا ہے۔ یہ انتہائی جسارت اور گستاخی کی بات ہے کہ کسی جھوٹی بات پر خدا کو شاہد اور ضامن بنایا جائے یہی وجہ ہے کہ مستقبل کے متعلق جو قسم کھائی گئی ہے اگر وہ ناجائز نہیں ہے تو انسان کا فرض ہے کہ اسے پورا کرے سورۂ نحل میں ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (۱۶ / ۹۱)

ترجمہ:۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کیا کرو جب تم عہد کر لو اور قسموں کو انہیں مؤکد کر لینے کے بعد توڑا نہ کرو۔ حالانکہ تم اپنے اوپر اللہ کو ضامن بنا چکے ہو۔ یقیناً جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

اس میں قسم کھا کر اسے توڑنے کی ممانعت فرمانے کے ساتھ ساتھ اس ممانعت کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے کہ تم نے اللہ کی قسم کھا کر اللہ کو اپنے عہد پر ضامن بنا دیا ہے تو بڑے ہی شرم اور افسوس کا مقام ہے

کہ اللہ کو ضامن بنا لینے کے بعد بھی تم اس عہد کا پاس نہ کرو۔ یہ شدید جرم ہے۔ اسی لئے اس کا کفارہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔ کفارہ کے سلسلہ میں وہی سورۂ مائدہ کی آیت کریمہ ہے جس کا ایک حصہ پہلے گذر چکا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (۵/۸۹)

ترجمہ:- اللہ تمہاری لغو قسموں کے بارہ میں تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں فرمائے گا لیکن جو قسمیں تم نے پختہ ارادہ سے منعقد کی ہوں گی ان کا مؤاخذہ (ضرور) کرے گا۔ تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اوسط درجہ کے کھانے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا ان کو کپڑے پہنا دینا یا ایک غلام آزاد کر دینا ہے۔ پھر جو تم میں سے ان میں سے کسی کو نہ پا سکے (یعنی استطاعت نہ رکھے) تو اسے تین دن کے روزے رکھنے ہوں گے۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم نے قسم کھائی ہو (اور اسے توڑ دیا ہو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو (قسموں کی پابندی کیا کرو) اسی انداز سے اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم اس کا شکر کرو۔

اس آیت کریمہ میں تفصیل کے ساتھ کفارہ کی چار صورتیں بیان

فرما دی گئی ہیں۔ اگر قسم کھا کر آدمی اسے توڑ دے تو اِسے دس مسکینوں کو (جیسا کہ لوگ اپنے گھروں میں کھاتے ہیں) کھانا کھلا دے۔ یا اوسط درجہ کے اُنہیں کپڑے پہنا دے۔ کپڑے بھی پورے ہونے چاہئیں جیسا کہ اپنے معاشرہ میں رواج ہو مثلاً کرتہ پاجامہ، قمیص شلوار یا کرتہ اور لنگی، یا قمیص پتلون وغیرہ۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کر دے۔ وہ غلام ہو یا باندی ہو، مسلمان ہو یا کافر ہو، بالغ ہو یا نابالغ ہو، لیکن معذور اور اپاہج نہ ہونا چاہیئے۔

(ہدایہ ص ۴۷۹/۲ و حاشیہ)

ناجائز قسم قرآنی تعلیمات کی رو سے اگر کِسی شخص نے کوئی ایسی قسم کھالی ہے جس پر عمل کرنے سے وہ گنہگار ہوگا۔ مثلاً یہ قسم کھالی کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا۔ یا اپنے والد سے نہیں بولوں گا یا فلاں آدمی کو ضرور قتل کروں گا۔ یا کِسی حلال چیز کو استعمال نہ کرنے پر قسم کھالی کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔ چاول نہیں کھاؤں گا۔ یعنی کِسی بھی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینا بھی گناہ ہے۔ تو ایسی صورت میں اسے قسم توڑ دینا ضروری ہے۔ وہ قسم کو توڑ کر کفارہ دیدے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (۶۶/۲)

ترجمہ: اللہ نے تم پر اپنی (ناجائز) قسموں کو توڑ دینا فرض قرار دیا ہے اور اللہ ہی تمہارا مالک ہے اور وہ خوب جاننے والا حکمت

والا ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ نحل میں ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۶)

ترجمہ: اور (دیکھو) ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جو جھوٹی بات آجائے، بے دھڑک نکال دو اور اپنے جی سے ٹھہرا کر حکم لگا دو کہ یہ چیز حلال ہے، یہ چیز حرام ہے۔ اس طرح پر حکم لگانا اللہ پر افترا پردازی کرنا ہے۔ اور یاد رکھو جو لوگ اللہ پر افترا پردازیاں کرتے ہیں وہ کبھی فلاح پانے والے نہیں۔

البتہ کسی مصلحت کی وجہ سے یا کسی کی خوشنودی کی خاطر کسی جائز چیز کا استعمال چھوڑ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ اس چیز کو حرام نہ سمجھتا ہو۔ عقیدۃً وہ اسے حلال سمجھتا ہو لیکن مصلحۃً اسے استعمال نہ کرتا ہو۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کی ناپسندیدگی کی بنیاد پر کسی چیز سے اپنے آپ کو باز رکھا تھا۔ آپ کا یہ عمل ناجائز نہیں تھا۔ کیونکہ آپ نے اس کو حرام نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف اس سے اجتناب کیا تھا۔ لیکن چونکہ آپ کا اسوۂ حسنہ پوری امت کے لئے نمونہ بن جاتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا چنانچہ ارشاد ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۶۶/۱)

ترجمہ:- اے پیغمبر اسلام! جو چیزیں اللہ نے آپ کے لئے حلال کی ہیں آپ ان سے کیوں رکتے ہیں، آپ اپنی ازواج کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

ایک حلال چیز کو اس طرح پر چھوڑ دینا عملی طور پر اس چیز کے ساتھ بظاہر حرام جیسا معاملہ ہی کرنا ہے جو ایک جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان نہیں اس لئے اس سے بھی ممانعت فرما دی گئی اور لِمَ تُحَرِّمُ کے لفظ سے اسے تعبیر فرما دیا گیا کہ بظاہر آپ اس چیز کے ساتھ حرام جیسی چیز کا ہی معاملہ فرما رہے ہیں۔

"عملیات" اور پرہیز تصوف کے بعض سلاسل میں نیز تعویذ گنڈوں کے سلسلہ میں بعض عامل حضرات جو اس طرح کی پابندی کرتے ہیں یا کراتے ہیں کہ گوشت نہ کھانا، مچھلی نہ کھانا، انڈا نہ کھانا یہ بھی اسی ضمن میں آجاتا ہے اور اس قسم کی پابندیاں قرآن کے خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ تمام پرہیز دین سمجھ کر کئے جاتے ہیں یہ بھی حلال چیزوں کے ساتھ حرام چیزوں جیسا معاملہ کرنا ہے اور ہمارے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ البتہ بیمار لوگ جنہیں اطباء بعض چیزوں کا پرہیز بتا دیتے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ تو اُن چیزوں سے جو بعض امراض میں ممنوع ہوتی ہیں پرہیز کے ضمن میں آتی ہیں جن کا دنیوی مصلحت سے تعلق ہے دین و مذہب سے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق چھٹا افسانہ

(تحریم)

(الف) حضرت ماریہ قبطیہؓ کی کہانی

(ب) شہد کی کہانی

(ج) حضرت عمرؓ سے حضرت ابن عباس کی روایت

(د) موہوبات اور تحریم

مذکورہ بالا آیات ہمارے محدثین و مفسرین کے لئے دماغی ورزش کا بہترین سامان ثابت ہوئی ہیں حالانکہ ہمارے نزدیک اس میں اتنی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ قیامت کے دن ہم سے ظاہر ہے کہ ہمارے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ ہم سے یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کس چیز سے باز رہنے کا عہد کر لیا تھا یا کس چیز کے متعلق آپ نے قسم کھالی تھی کہ آپ اس کو استعمال نہیں فرمائیں گے۔ ہم سے ان آیات کا اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم کسی حلال چیز کے متعلق ویسی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ میں فلاں چیز استعمال نہیں کروں گا اور اس طرح اپنے اوپر اس چیز کو حرام نہ کر لوں کہ یہ اب قرآن کی رو سے ممنوع ہے۔ اور اب اس کی اجازت نہیں ہے اور بس!

لیکن بہرحال ہمارے محدثین اور مفسرین کے ہاں یہ بہت بڑا موضوع بحث بن گیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر کونسی چیز حرام فرمالی تھی۔ یا وہ کونسی چیز تھی جس کے استعمال سے آپ رک گئے تھے اور آپ نے اس کو استعمال نہ فرمانے کا عہد کر لیا تھا یا قسم

کھالی تھی۔ روایات کا بیان اس سلسلہ میں بہت ہی پریشان کن حد تک مختلف ہے۔

روایات کے اختلافات کی وجہ سے چند سوالات

روایات کے ان اختلافات کی وجہ سے چند سوالات مسلمانوں کے ذہن کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اول تو یہی ہے کہ آپ نے کس چیز کو استعمال نہ فرمانے کا عزم فرمایا تھا؟ دوم یہ کہ سورۂ تحریم کی آیات میں مظاہرہ کرنے والی دو ازواج مطہرات کون تھیں؟ سوم یہ کہ وہ کونسی راز کی بات تھی جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجۂ محترمہ سے فرمائی تھی جو انہوں نے ظاہر کر دی اور جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اُنہیں تنبیہہ فرمائی۔ عام روایات سے جو بخاری اور مسلم میں نقل ہوئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ آپ نے ازواج مطہرات کے پاس ایک ماہ تک نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ ہم نے زیر بحث سلسلہ کی بخاری اور مسلم کی حدیثوں کو ضرورۃً یکجا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ پوری بات سامنے آجائے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلی روایت کی کہانی

بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضؓ نے بیان فرمایا کہ مجھے ایک سال کا عرصہ اسی میں گذر گیا کہ ایک آیت کے متعلق میں حضرت عمر رضؓ سے پوچھوں مگر ان کی ہیبت اور رعب کی وجہ سے میں پوچھ نہ سکا۔ حتیٰ کہ وہ حج کے لئے تشریف لے گئے اور میں بھی ان کے ساتھ حج کے لئے گیا۔ واپس آتے ہوئے ہم (مدینہ کے) راستہ پر تھے کہ حضرت

عمرؓ درختوں کے جھنڈ کی طرف قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے ان کے فارغ ہونے تک میں کھڑا رہا۔ پھر میں حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ میں نے کہا، "اے امیر المؤمنین! وہ کونسی دو ازواج مطہرات تھیں۔ جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جتھہ بندی کی تھی؟" تو آپ نے فرمایا۔

"وہ دونوں عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں۔"

میں نے کہا کہ میں ایک سال سے اس بات کو آپ سے پوچھنا چاہ رہا ہوں مگر آپ کے رعب کی وجہ سے نہ پوچھ سکا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: "ایسا نہ کیا کرو۔ جب تم سمجھو کہ میرے پاس کسی امر کے متعلق کچھ معلومات ہیں تو مجھ سے پوچھ لیا کرو، اگر مجھے کوئی علم ہوگا تو میں تمہیں بتا دوں گا۔

پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بخدا جاہلیت میں ہم لوگ عورتوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے۔ حتیٰ کہ خدا نے ان کے بارہ میں جو کچھ نازل فرمانا تھا وہ نازل فرما دیا اور ان کے حصے جو کچھ مقرر فرمانے تھے وہ مقرر فرما دیئے (ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ) ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ اپنی بیوی پر چلائے۔ بیوی نے انہیں سخت جواب دیا۔ حضرت عمرؓ کو بیوی کا اس طرح بات کرنا ناگوار ہوا۔ بیوی نے کہا کہ "تم کو میری طرف سے جواب کیوں ناگوار گذرا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی جواب دیدیتی ہیں اور بعض ان میں سے دن بھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بات نہیں کرتیں" حضرت عمرؓ یہ سن کر ڈر گئے۔ انہوں نے کہا "جس نے ایسا کیا وہ سخت خسارہ

میں ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنے کپڑے پہنے اور حضرت حفصہؓ کے پاس گئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔

"اے حفصہؓ کیا تم میں سے کوئی دن دن بھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ناراض رکھتی ہے؟"

حضرت حفصہؓ نے کہا۔ "ہاں"

حضرت عمرؓ نے کہا "تو وہ خسارہ میں رہے گی اور نامراد ہو گی۔ کیا اسے یہ ڈر نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے اللہ ناراض ہو جائے گا۔ اور وہ ہلاک ہو جائے گی۔ تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بات نہ کیا کرو۔ نہ کسی بات میں الٹ کر جواب دیا کرو نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ترکِ کلام کیا کرو، جو کچھ تمہیں ضرورت ہوا کرے مجھ سے مانگ لیا کرو اور دیکھو تم کسی فریب میں نہ آجانا کیونکہ تمہاری پڑوسن یعنی عائشہؓ تم سے زیادہ حسین اور تم سے زیادہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہیں۔" حضرت حفصہؓ کو نصیحت کرنے کے بعد حضرت عمرؓ حضرت ام سلمہؓ کے پاس گئے۔ وہ ان کی رشتہ دار بھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں ان سے گفتگو کی۔

حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا۔ عمر! تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے ہو اور اب یہ چاہتے ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج کے معاملہ میں بھی دخل دو۔" حضرت عمرؓ کو ان کی اس بات سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ان کو نصیحت نہ کر سکے اور واپس چلے آئے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ازواج مطہرات نے جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خرچ کا مطالبہ کیا آپ نے اس مطالبہ کو ناپسند فرمایا

اور خفگی کا اظہار کیا۔ اس وقت آپ کے دروازہ پہ بہت سے لوگ تھے لیکن کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آئے۔ ان کو اجازت مل گئی وہ اندر چلے گئے۔ پھر حضرت عمرؓ آئے۔ ان کو بھی اجازت مل گئی۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے گرد آپ کی بیبیاں غمگین اور خاموش بیٹھی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے سوچا، میں کوئی ایسی بات کہوں کہ آپ مسکرا دیں اُنہوں نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کاش آپ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) کو دیکھتے کہ اگر وہ مجھ سے خرچ مانگتی تو میں کھڑے ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیتا۔" یہ سُن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے پھر فرمایا۔

"یہ سب میرے گرد بیٹھی ہیں اور مجھ سے خرچ مانگ رہی ہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ اُٹھے اور حضرت عائشہؓ کا گلا گھونٹنے لگے۔ حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کا گلا گھونٹنے لگے۔ وہ دونوں کہنے لگیں۔

"ہم وہ چیز آپ سے کبھی نہ مانگیں گی جو آپ کے پاس نہ ہو۔ (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے جانے کے بعد) ازواج مطہرات کے اس مطالبہ پر ناراض ہو کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی۔ (بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالینے کو ایلاء کہتے ہیں۔ قرآن نے ایلاء کے لئے چار ماہ کی مدت مقرر کی ہے)

چونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں موچ آگئی تھی لہٰذا آپ ایک بالاخانے میں فروکش ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کی اس قسم کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ مدینہ میں بنوامیہ ابن زید کے محلہ میں رہتے تھے۔ ایک انصاری ان کے پڑوسی تھے حضرت عمرؓ اور وہ انصاریؓ باری باری سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن حضرت عمرؓ آتے اور ایک دن وہ انصاری آتے۔ جب حضرت عمرؓ آتے تو اس دن کی تمام خبریں اور احکام وغیرہ انصاری صحابی کو سنایا کرتے اور جس دن وہ آتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔

ان دنوں میں مدینہ منورہ میں اکثر اس بات کا چرچا رہتا تھا کہ غسّان (امیر شام) مسلمانوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ کے پڑوسی انصاری اپنی باری کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ رات کو جب وہ لوٹ کر آئے تو حضرت عمرؓ کے دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا اور کہا "کیا وہ سو رہے ہیں؟" حضرت عمرؓ (ان کی اس بات سے) ڈر گئے۔ باہر نکلے تو انصاریؓ نے کہا "ایک بڑا حادثہ ہوگیا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "کیا غسّان آگیا؟" انہوں نے کہا "اس سے بھی بڑا حادثہ ہوگیا"۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "حفصہؓ نقصان میں رہی اور نامراد ہوگئی۔ میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ عنقریب ایسا ہو جائے گا"۔

صبح کو حضرت عمرؓ کپڑے وغیرہ پہن کر گھر سے روانہ ہوئے۔ اور فجر کی نماز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی نماز کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالاخانہ میں تشریف لے گئے اور اس میں تنہا

بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ حجروں کی طرف آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر گھر میں رونا ہو رہا ہے اور ہر بیوی کے گھر والے اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے کہ جبتک پردہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کے گھر گئے اور ان سے کہا۔

"اے صدیق کی بیٹی! تمہارا یہ کیا حال ہو گیا ہے کہ تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے لگی ہو؟" حضرت عائشہؓ نے فرمایا تم کو مجھ سے اور مجھ کو تم سے کیا مطلب؟ تم اپنی گٹھڑی (یعنی اپنی بیٹی) کی خبر لو" وہاں سے اُٹھ کر حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کے پاس گئے۔ وہ رو رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔

"تم کیوں رو رہی ہو؟" کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ اللہ کی قسم تم جانتی ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم کو زیادہ نہیں چاہتے اور میں نہ ہوتا تو ابھی تک تمہیں طلاق دے چکے ہوتے۔ اچھا بتاؤ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہیں طلاق دیدی ہے؟ حضرت حفصہؓ نے کہا: "مجھے معلوم نہیں" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس وقت کہاں ہیں؟" حضرت حفصہؓ نے کہا۔ آپ اپنے بالاخانہ میں ہیں۔ حضرت عمرؓ وہاں سے نکل کر ممبر کے پاس آئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ رو رہے ہیں۔ کچھ کنکریاں الٹ پلٹ کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی۔ حضرت عمرؓ کچھ دیر ان لوگوں کے پاس بیٹھے پھر ان کی بیچینی نے ان پر غلبہ کیا تو انہوں نے سوچا کہ اس معاملہ

کی تحقیق کریں۔ وہ بالاخانہ پر چڑھے۔ بالاخانہ کی چوکھٹ پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حبشی غلام جن کا نام رباحؓ تھا بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا "میرے لئے اجازت لو" وہ اندر گئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آ گئے۔ اُنہوں نے کہا۔

"میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا" حضرت عمرؓ وہاں سے واپس آ گئے۔ اور ان لوگوں کے پاس بیٹھ گئے جو ممبر کے پاس بیٹھے تھے۔ ان کی بے چینی نے ان پر پھر غلبہ کیا۔ وہ پھر گئے۔ غلام سے کہا "میرے لئے اجازت طلب کرو" رباحؓ پھر اندر گئے اور واپس آکر پھر وہی جواب دیا۔ حضرت عمرؓ پھر ممبر کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ان کی بے چینی نے پھر غلبہ کیا۔ وہ پھر بالاخانے پر گئے۔ رباحؓ سے پھر اجازت مانگنے کیلئے کہا وہ اندر گئے اور پھر باہر آکر وہی جواب دیا۔

حضرت عمرؓ نے ذرا بلند آواز سے کہا کہ "شاید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہ کے لئے (سفارش کرنے) آیا ہوں اللہ کی قسم اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کی گردن مارنے کا حکم دیں تو میں اس کی گردن مار دوں۔ یہ کہہ کر وہ واپس ہوئے ہی تھے کہ یکایک غلام نے آواز دی غلام نے کہا "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اجازت دیدی۔ حضرت عمرؓ اندر گئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہ بند اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اس تہہ بند کے علاوہ آپ کے پاس کوئی اور کپڑا نہیں تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی

پر لیٹے ہوئے تھے۔ چٹائی پر کوئی بستر وغیرہ نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر چٹائی کے نشان پڑ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سلام کیا اور سلام کے بعد کھڑے ہی کھڑے عرض کیا۔ کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا اور فرمایا۔

"نہیں، میں نے ایک مہینہ کے لئے ایلاء کیا ہے"

حضرت عمرؓ نے کہا "اللہ اکبر" پھر کھڑے ہی کھڑے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ میں کچھ دل بہلانے کی باتیں کروں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "ہم قریشی مرد عورتوں پر غالب رہا کرتے تھے۔ پھر ایسے لوگوں کے پاس آئے کہ ان کی عورتیں ان پر غالب ہیں"۔ یہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔

حضرت عمرؓ نے کہا "آپ دیکھئے میں حفصہؓ کے پاس گیا تھا اور میں نے ان سے کہا تھا کہ تم کسی گھمنڈ میں نہ رہنا۔ تمہاری پڑوسن یعنی عائشہؓ تم سے زیادہ حسین اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تم سے زیادہ محبوب ہیں"۔ یہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پھر مسکرائے۔

پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ام سلمہؓ کا واقعہ سنایا۔ اس کو سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پھر مسکرائے۔

جب حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مسکراتے دیکھا تو بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی نظر اٹھا کر آپؐ کے کمرہ کا جائزہ لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جو نظر کو روکتی سوائے تین کھالوں کے اور ایک صاع کے قریب

جو اور کچھ سَلَم نامی درخت کے پتوں کے جو کمرہ کے ایک کونے میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ عُسرت دیکھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیوں روتے ہو؟" حضرت عمرؓ نے کہا "کیسے نہ روؤں؟" آپ اپنی اُمت کے لئے فراخی کی دعا کیجئے۔ آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ آپ کی کل کائنات ہے! چٹائی کے نشان بازو پر پڑ گئے ہیں۔ یہ فارس اور روم کے لوگ ہیں کہ پھلوں اور نہروں میں عیش کر رہے ہیں۔ ان کو خوب وسعت اور فراخی دی گئی ہے۔ دنیا کی کونسی نعمت ہے جو انہیں نہ ملی ہو۔ حالانکہ وہ (خالص) اللہ کی پرستش نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ یہ سن کر سیدھے بیٹھ گئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابن خطابؓ! کیا تمہیں اس بات میں کچھ شک ہے کہ انہیں ان کے اعمال کی جزا دنیوی زندگی میں دیدی گئی ہے۔ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ ان کے لئے دنیا ہو اور تمہارے لئے آخرت؟"

حضرت عمرؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول میرے لئے استغفار کیجئے" یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔

"آپ کو اپنی بیویوں کے متعلق پریشانی کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ انہیں طلاق بھی دیدیں تو اللہ، اس کے فرشتے، میں اور ابو بکر اور تمام مسلمین آپ کے ساتھ ہیں۔ (یا رسول اللہ) مسجد میں لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے۔ کیا میں انہیں مطلع کر دوں کہ آپ نے طلاق نہیں دی؟"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تم چاہو تو مطلع کر دو۔"

حضرت عمرؓ کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غصہ بالکل زائل ہو گیا۔ آپ مسکرائے اور مسکراتے وقت آپ اتنے اچھے معلوم ہوتے تھے کہ اتنے اچھے دوسرے لوگ مسکراتے وقت معلوم نہیں ہوتے۔

حضرت عمرؓ واپس آگئے اور مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ الآیۃ (۴/۸۳)

ترجمہ: جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا خوف کی آتی ہے تو یہ اسے مشہور کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ نبی اور سرداروں کے پاس پہنچاتے تو وہ اس کی تحقیق کر لیتے۔ یہ تو تم پر اللہ کا فضل ہو گیا ورنہ سوائے چند کے سب لوگ شیطان کے تابع ہو جاتے ـــــــــــــــ

پھر سب سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے پاس گئے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا۔

"آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ ایک مہینہ تک ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔ میں نے یہ دن گن گن کر کاٹے ہیں۔ ابھی انتیس ۲۹ دن ہی ہوئے ہیں۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مہینہ انتیس ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے اور یہ مہینہ انتیس ۲۹ دن ہی کا

ہے۔ اسی اثنا ر میں آیۂ تخییر نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ازداج مطہرات کو اختیار دیا کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اختیار کرلیں یا دنیا کو الخ

(صحیح بخاری کتاب المظالم باب الغرفہ عن عمرؓ وکتاب النکاح باب موعظۃ الرجل ابنتہ، و باب ہجرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم نسائہ عن ابن عباسؓ و صحیح مسلم کتاب الطلاق باب بیان ان تخییر امرأتہ عن عائشہؓ و باب الایلار عن عائشہؓ و عمرؓ) ....

(خط کشیدہ الفاظ صرف صحیح مسلم میں کتاب الطلاق میں دو جگہ ہے)۔

ان تمام روایات سے جو ہم نے یک جا جمع کردی ہیں صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے ایک ماہ تک اپنی ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ اور اس کی وجہ ازواج مطہرات کا یہ مطالبہ تھا کہ ان کے نفقات میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ اب وہ عسرت اور تنگدستی باقی نہیں رہی جو بالکل ابتدار اسلام میں تھی۔

اب ایک دوسری کہانی سنیئے

عبید ابن عمیر ہی کی سند سے امام بخاری نے کتاب الطلاق باب لم تحرم ما احل اللہ لک میں حضرت عائشہؓ سے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم زینب بنت جحش کے پاس ٹھہرا کرتے ______ اور ان کے پاس شہد پیا کرتے تھے تو میں نے اور حفصہؓ نے اتفاق کیا کہ وہاں سے جس کے پاس آنحضرتؐ تشریف لائیں تو وہ یہ کہے کہ آپ کے منہہ سے مغافیر کی بو آرہی ہے۔

(جنگلی پھول ہوتے ہیں جن کی بو اچھی نہیں ہوتی) کیا آپ نے مغافیر کھائے ہیں. چنانچہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان میں سے جب ایک کے پاس گئے تو اس نے یہی کہا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں تو میں نے تو زینب بنت جحش رض کے پاس شہد پیا ہے۔ اور آئندہ کبھی نہیں پیوں گا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یَاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ سے اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰہِ تک عائشہ رض اور حفصہ رض کے متعلق اور اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ سے مراد یہ راز تھا کہ میں آئندہ کبھی شہد نہیں پیوں گا۔

پھر اس کے ساتھ ہی اسی باب میں ایک دوسری روایت بھی ہشام ابن عروہ عن ابیہ کی سند سے بیان کی گئی ہے کہ حضرت عائشہ رض نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم شہد اور حلوا، بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ اور عصر کی نماز کے بعد آپ ازواج مطہرات کے ہاں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن حفصہ رض بنت عمر رض کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ وہاں معمول سے زیادہ ٹھہرے۔ مجھے رشک آیا میں نے معلومات حاصل کیں تو مجھے بتایا گیا کہ حضرت حفصہ رض کے خاندان میں سے کسی نے انہیں شہد کی ایک کپی تحفہ میں دی ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شہد پلایا تھا۔ میں نے کہا کہ بخدا میں ضرور کوئی تدبیر کروں گی۔ چنانچہ میں نے سودہ رض بنت زمعہ سے کہا کہ آنحضرت جب تمہارے قریب آئیں تو ان سے کہنا کہ آپ نے مغافیر کھائے ہیں؟ تو آپ فرمائیں گے کہ "نہیں" تو تم کہنا کہ پھر یہ بو کیسی آرہی ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ مجھے تو حفصہ رض نے شہد کا شربت پلایا ہے تو تم کہنا کہ

شہد کی مکھی نے عُرفُط کے پھولوں کو چوسا ہو گا۔ اور میں بھی یہی کہوں گی اور اے صفیہؓ تم بھی یہی کہنا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے بیان کیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دروازہ پر قدم ہی رکھا تھا کہ میں نے پکار کر وہ کچھ کہہ دینا چاہا جو کچھ تم نے مجھے حکم دیا تھا۔ کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ چنانچہ جب حضور حضرت سودہؓ کے قریب آئے تو سودہؓ نے کہا اے رسول اللہ آپ نے مغافیر کھائے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں تو" سودہؓ نے کہا کہ "پھر یہ بو کیسی ہے جو مجھے آپ کی طرف سے آرہی ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ "مجھے تو حفصہؓ نے شہد کا شربت پلایا ہے۔" انہوں نے کہا کہ "شہد کی مکھیوں نے عرفط کے پھول چوسے ہوں گے۔" پھر جب آنحضرتؐ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے بھی یہی کہا۔ پھر جب آپ حضرت صفیہؓ کے ہاں گئے تو انہوں نے بھی یہی کہا۔ اگلے دن پھر جب حضرت حفصہؓ کے ہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ "شہد کا شربت پیش کروں۔" تو آپ نے فرمایا "مجھے اس کی ضرورت نہیں" عائشہؓ کہتی ہیں کہ سودہؓ کہتی تھیں ہم نے آپ کو شہد سے محروم کر دیا تو میں کہہ دیتی تھی کہ خاموش رہو۔

صحیح بخاری میں ایک ہی باب میں یہ دونوں حدیثیں موجود ہیں۔ ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ شہد آپؐ نے حضرت زینب بنت جحشؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا اور دوسری حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ شہد آپ نے حضرت حفصہؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا۔

پہلی حدیث میں سازش کرنے والی خواتین حضرت عائشہؓ اور

حفصہؓ ہیں اور دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہؓ ہیں۔ اب تیسری حدیث بھی دیکھیئے۔ علامہ حافظ قسطلانی شرح بخاری میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس میں اختلاف ہے کہ شہد آپ نے کس کے ہاں نوش فرمایا تھا چنانچہ عبید ابن عمیر کی جو حدیث پہلے گذری ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینبؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا مگر خود مؤلف (امام بخاری) ہی کے ہاں ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ کی سند سے باب الطلاق میں دوسری حدیث یہ بھی ہے کہ شہد حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا۔

اور ابن مردویہ کے ہاں ابن ابی ملیکہ عن ابن عباسؓ کی سند سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ شہد کا نوش فرمانا حضرت سودہؓ کے ہاں ہوا تھا۔ اور گٹھ جوڑ کرنے والی ازواج حضرت عائشہ اور حفصہؓ تھیں۔ جیسا کہ عبید ابن عمیر کی روایت میں بیان ہوا ہے۔ چونکہ اس میں روایتیں مختلف ہیں کہ شہد کس کے ہاں پیا تھا۔ لہٰذا تعدد واقعات پر محمول کیا جانا چاہیئے۔ (قسطلانی شرح بخاری صفحہ ۴۳۸-۴۳۹ ج ۷)

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری شرح بخاری میں بعینہٖ یہی کچھ فرمایا ہے۔ (دیکھیئے حاشیہ بخاری صفحہ ۷۹۳ ج ۲)

اس کے بعد ایک تیسری کہانی سنیئے

علامہ حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں۔

" اس سورت کی ابتدائی آیتوں کے شانِ نزول میں مفسرین کے

اقوال یہ ہیں۔

بعض تو کہتے ہیں کہ یہ حضرت ماریہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اُنہیں حضورؐ نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ نسائی میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے کہنے سننے سے ایسا ہوا تھا کہ ایک لونڈی کی نسبت آپ نے یہ فرمایا تھا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ ابن جریر میں ہے کہ ام ابراہیم کے ساتھ آپ نے اپنی کسی بیوی صاحبہ کے گھر میں بات چیت کی، جس پر اُنہوں نے کہا۔

"یارسول اللہ! میرے گھر میں، اور میرے بستر پر۔ چنانچہ آپ نے اسے اپنے اوپر حرام کر لیا۔ تو اُنہوں نے کہا۔" یارسول اللہ! حلال آپ پر حرام کیسے ہو جائے گا؟" تو آپ نے قسم کھائی کہ اب ان سے اس قسم کی بات چیت نہ کروں گا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔

ابن جریر میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ "یہ دونوں عورتیں کون تھیں؟ فرمایا" عائشہؓ اور حفصہؓ۔ اور ابتدار قصہ ام ابراہیم قبطیہؓ کے بارہ میں ہوئی۔ حضرت حفصہؓ کے گھر میں ان کی باری والے دن حضورؐ ان سے مل لئے تھے۔ جس پر حضرت حفصہؓ کو رنج ہوا کہ میری باری کے دن، میرے گھر اور میرے بستر پر؟ حضورؐ نے اُنہیں رضامند کرنے اور منانے کے لئے کہدیا کہ۔

"میں اسے اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، اب تم اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

لیکن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے واقعہ کہدیا۔ اللہ نے

اس کی اطلاع اپنے نبی کو دی اور یہ کل آیتیں نازل فرمائیں۔ آپؐ نے کفارہ دے کر اپنی قسم توڑ دی اور اس لونڈی سے ملے جلے۔

(تفسیر ابن کثیر ص۹۴ پارہ قد سمع اللہ، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

نیز حافظ ابن کثیرؒ ہی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو بات حضورؐ نے چپکے سے اپنی بیوی صاحبہ سے کہی تھی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت حفصہؓ کے گھر میں آپ تھے، وہ جب تشریف لائیں اور حضرت ماریہؓ سے آپ کو مشغول پایا تو آپ نے انہیں فرمایا۔ تم عائشہؓ کو خبر نہ کرنا۔ میں تمہیں ایک بشارت سناتا ہوں، میرے انتقال کے بعد میری خلافت پر (حضرت) ابو بکرؓ کے بعد تمہارے والد آئیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو خبر کر دی۔ پس حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا، اس کی خبر آپ کو کس نے پہنچائی؟ آپ نے فرمایا۔ مجھے علیم وخبیر خدا نے خبر پہنچائی۔ صدیقہؓ نے کہا، میں آپ کی طرف نہ دیکھوں گی جب تک آپ ماریہؓ کو اپنے اوپر حرام نہ کر لیں۔ آپ نے کر لی۔"

(تفسیر ابن کثیر ص۹۲ پارہ ۲۸ قد سمع اللہ)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی ازالۃ الخفاء میں مختلف سندوں سے یہی نقل فرمایا ہے۔

نیز تفسیر قمی میں بھی اس آیت کی یہی تفسیر نقل کی گئی ہے۔ (تفصیل اگلے عنوان "پیغمبر کا راز" میں آرہی ہے)۔

اس کے بعد ایک چوتھی کہانی سنیئے

علامہ حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ۔

"ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ اس عورت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے اپنا نفس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کیا تھا۔ لیکن یہ غریب ہے۔ (تفسیر ابن کثیر صہ ۹۵ پارہ ۲۸)

دوسرے مقام پر اس کی تفصیل دیتے ہوئے علامہ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

"مسند احمد میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک عورت آئیں اور کہا "میں اپنا نفس آپ کے لئے ہبہ کرتی ہوں" پھر وہ دیر تک کھڑی رہی۔ تو ایک صحابی نے کھڑے ہو کر کہا "یا رسول اللہ! صلے اللہ علیہ وسلم اگر آپ ان سے نکاح کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو میرے نکاح میں دیدیجیئے" آپؐ نے فرمایا۔ تمہارے پاس کچھ ہے بھی جو انہیں مہر میں دو؟ انہوں نے جواب دیا کہ "اس تہبند کے سوا اور کچھ نہیں" تو آپؐ نے فرمایا "یہ اگر تم انہیں دیدو گے تو خود بغیر تہبند کے رہ جاؤ گے" کچھ اور تلاش کرو "اس نے کہا" میں اور کچھ نہیں پاتا۔ آپ نے فرمایا۔ تلاش تو کرو، گو لوہے کی انگوٹھی ہی مل جائے" انہوں نے ہر چند دیکھ بھال کی لیکن کچھ بھی نہ پایا۔ آپ نے فرمایا" قرآن کی کچھ سورتیں بھی تمہیں یاد ہیں؟" اس نے کہا "ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں" آپ نے فرمایا "بس تو انہی سورتوں پر میں نے انہیں تمہارے نکاح

میں دیدیا۔" یہ حدیث بخاری اور مسلم میں بھی ہے۔

حضرت انسؓ جب یہ واقعہ بیان کرنے لگے تو ان کی صاحبزادی بھی سن رہی تھیں۔ کہنے لگیں "اس عورت میں بہت ہی کم حیا تھی" تو حضرت انسؓ نے فرمایا "تم سے وہ بہتر تھیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی رغبت کر رہی تھیں۔ اور آپ پر اپنا نفس پیش کر رہی تھیں۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اپنے نفس کو ہبہ کرنے والی بی بی صاحبہ حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ اور روایت میں ہے کہ یہ قبیلۂ بنی سُلیم میں سے تھیں۔ اور روایت میں ہے کہ یہ بڑی نیک بخت خاتون تھیں۔ ممکن ہے ام سلیم ہی حضرت خولہ ہوں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی دوسری عورت ہوں۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں ان عورتوں پر غیرت کیا کرتی تھی جو اپنا نفس حضورؐ کو ہبہ کر دیتی تھیں اور مجھے بڑا تعجب معلوم ہوتا تھا کہ عورتیں اپنا نفس ہبہ کرتی ہیں۔ جب یہ آیت اُتری کہ۔

تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ

ترجمہ:۔ تو ان میں سے جسے چاہے موقوف رکھ اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دیدے اور جن سے تو نے یکسوئی اختیار کر لی ہے انہیں بھی اگر تم لے آؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں۔

تو میں نے کہا۔ بس تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر خوب وسعت و کشادگی

کر دی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کوئی ایسی عورت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ تھی جس نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا ہو۔ حضرت یونس ابن بکیر فرماتے ہیں کہ گو آپ کے لئے یہ مباح تھا کہ جو عورت اپنے تئیں آپ کو سونپ دے آپ اسے اپنے گھر میں رکھ لیں۔ لیکن آپ نے ایسا کیا نہیں کیونکہ یہ امر آپ کی مرضی پر رکھا گیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۲۱ پارہ ۲۲ سورۂ احزاب)

یہ دونوں روایتیں جن میں کسی خاتون کا اپنے نفس کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے ہبہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ انہی الفاظ کے ساتھ۔ بخاری صفحہ ۷۶۶ ج ۲ (مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب) پر موجود ہیں۔ حیرت ہے کہ جو تفسیری روایات مسند احمد، بخاری اور مسلم اور دیگر صحاح کی کتابوں میں موجود ہیں اُنہیں حافظ ابن کثیرؒ نے غریب کیسے فرما دیا۔

بہر حال اس ساری تفصیل سے ہمارے سامنے یہ مختلف تفسیریں آتی ہیں۔ یعنی حضورؐ نے اپنے اوپر کیا چیز حرام کرلی تھی اس کے متعلق یہ چار تفسیریں ہیں۔

(۱) آپ نے ایک ماہ کے لئے اپنی ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔

(۲) آپ نے شہد استعمال نہ فرمانے کی قسم کھالی تھی۔

(۳) آپ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ کے پاس نہ جانے کا عہد فرمالیا تھا۔

(۴) کسی عورت یا متعدد عورتوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہا تھا۔

لیکن چونکہ ازواج مطہرات کو یہ بات ناپسند تھی اس لئے آپ نے خود کو اس سے باز رکھا اور کسی ایسی عورت کو قبول نہیں فرمایا۔

راز — یعنی یہ بات کہ آپ نے اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک سے کیا راز کی بات فرمائی تھی جسے ان زوجۂ محترمہ نے دوسری زوجۂ محترمہ پر ظاہر کر دیا تھا۔ اس کے متعلق بھی روایات سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے۔ وہ یہ ہے کہ۔

(۱) آپ نے کسی زوجۂ محترمہ کو منع فرمایا تھا کہ شہد کو اپنے اوپر حرام کرنے کی بات حضرت زینبؓ کو نہ بتائیں اور یہ ممانعت آپ نے حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو فرمائی تھی۔

(۲) حضرت ماریہ قبطیہؓ کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی بات آپ نے حضرت حفصہؓ کو بتائی تھی اور انہیں منع فرما دیا تھا کہ وہ یہ بات حضرت عائشہؓ کو نہ بتائیں۔

(۳) حضرت حفصہؓ کو آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کی یکے بعد دیگرے بشارت دی تھی اور اس راز کو مخفی رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی لیکن حضرت حفصہؓ نے یہ بات حضرت عائشہؓ کو بتا دی۔

مظاہرہ کرنے والی کون تھیں — تیسری چیز یعنی یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف گٹھ جوڑ اور ایکا کرنے والی خواتین کون کون تھیں: اس کے متعلق بھی روایات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے

(۱) وہ دونوں خواتین حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ تھیں۔

وہ دو خواتین نہیں بلکہ تین خواتین تھیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہؓ۔ (یعنی اس روایت میں حضرت حفصہؓ شامل نہیں ہیں۔)

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ یہ روایات جو ہم نے پیش کی ہیں وہ زیادہ تر بخاری، مسلم اور دیگر کتب حدیث سے مأخوذ ہیں جن پر مسلمانوں کو عرصۂ دراز سے انتہائی اعتماد چلا آ رہا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ جو حدیث کسی معتبر کتاب میں آگئی ہو وہ ہر حال میں قابلِ اعتماد بھی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ان محدثین نے اپنی حد تک انتہائی کاوش اور تحقیق و تنقید سے کام لیا ہے لیکن تفسیری روایات خصوصًا سیرت سے متعلق تاریخی روایات کی کما حقہٗ چھان پھٹک اور تنقید و تحقیق نہیں ہو سکی اور پھر ہمارے محدثین حضرات بہر حال انسان ہی تھے۔ ان کی کوششیں اور کاوشیں مقام انسانیت سے آگے نہیں جا سکیں۔ بھول چوک ہر انسان سے ہوتی ہے خصوصًا ایسے حالات میں جبکہ ان کو ایسے ایسے راویانِ حدیث سے سابقہ رہا ہو جن کے ہاں تقیہ جزو ایمان رہا ہے اور انہوں نے یہ ظاہر ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا کچھ راویوں کے ظاہری زہد و تقویٰ اور تقدس و تقشف سے اگر انہوں نے دھوکہ کھالیا تو وہ اس میں معذور تھے علاوہ ازیں قدیم زمانہ میں کتابیں قلمی لکھی جاتی تھیں۔ اگر کچھ دشمنوں نے بعد میں ان کی کتابوں میں اپنے مفید مطلب اضافے کر دیئے ہوں تو اس میں ان کا کیا قصور ہے۔

اس کے بعد اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم

میں تحریم، مظاہرہ اور تخییر تینوں واقعات سورۂ تحریم میں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی واقعہ کی مسلسل کڑیاں ہیں۔ لیکن روایات کو ہمارے محدثین نے قطع و برید کر کے مختلف ابواب کی مناسبت سے اس طرح پیش کیا ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ یہ مختلف واقعات ہیں جو مختلف زمانوں میں پیش آئے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی سیرت النبی میں لکھتے ہیں کہ۔

"ایلاء، تخییر، مظاہرۂ ازواج مطہرات۔ یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں میں پیش آئے ہیں۔ اور ان سے ایک ظاہر بیں یہ دھوکہ کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے ساتھ ہمیشہ ناگواری سے بسر کرتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ صحیح بخاری کتاب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ) میں حضرت ابن عباسؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواج مطہرات سے انعزال (یکسوئی) افشائے راز، آیت تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔"

حافظ ابن حجرؒ انعزال (یکسوئی) کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق، کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے کہ آپ نے اس وقت

تک ایسا نہیں کیا ہو گا۔ جبتک ازواج مطہرات سے اس
قسم کی حرکتیں متعدد دبار ظہور پذیر نہ ہوئیں۔
(سیرت النبی صہ ٤٧٥-٥٧٤ / ١ ج)

یہ تو علامہ شبلیؒ کی رائے ہے۔ ہمارے خیال میں یہ متعدد واقعات بھی نہیں۔ بلکہ ان میں سے صرف کوئی ایک ہی واقعہ ہوا ہو گا۔ کیونکہ متعدد واقعات کو ماننے سے لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے صاف اور صریح حکم کی خلاف ورزی بار بار فرماتے رہے۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔ قرآن کریم کا یہ حکم کہ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (٦٦ / ١)

ترجمہ: اے نبی! جو چیزیں اللہ نے آپ کے لئے حلال کی ہیں آپ اُنہیں کیوں حرام کرتے ہیں آپ اپنی ازواج کی خوشنودیاں چاہتے ہیں؟ اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

کسی ایک واقعہ میں نازل ہونے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سے اس کے خلاف دوبارہ اور سہ بارہ اس کا اعادہ ہوا ہو۔ حضرت عمرؓ کی تفصیلی روایت کے مطابق ازواج مطہرات کو اپنے لئے ایک مہینہ تک حرام کر لینے کے بعد یہ ممانعت نازل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد شہد کو اپنے لئے حرام کر لینے یا حضرت ماریہ قبطیہؓ کو اپنے لئے حرام کر لینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے تو لازم آتا ہے کہ آپ خدانخواستہ بار بار اس حکم الٰہی کی خلاف ورزی فرماتے رہے جو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ لامحالہ ان تینوں باتوں میں کوئی ایک بات ہی صحیح

ہوسکتی ہے۔ یا تو اس آیت کریمہ کا نزول ازواج مطہرات سے انعزال (یکسوئی) کے بعد ہوا ہوگا۔ یا شہد کا استعمال چھوڑ دینے کے بعد یا حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ترک تعلق کے بعد، کسی ایک واقعہ کے بعد جب یہ آیت نازل ہو گئی تو پھر دوسرے دو واقعات پیش نہیں آسکتے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ آپ نے خدا کی نافرمانی اور عدول حکمی کا ارتکاب بار بار فرمایا اور یہ ناممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ تینوں واقعات میں سے کوئی ایک واقعہ پیش آیا تو حق تعالیٰ خاموش رہے پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو حق تعالیٰ پھر بھی خاموش رہے۔ البتہ جب تیسرا واقعہ پیش آگیا تو حق تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی۔ لہٰذا یہ تنبیہ تیسرے آخری واقعہ کے بعد نازل ہوئی تھی اس لئے بار بار عدول حکمی کا صدور لازم نہیں آیا مگر ہمیں اس توجیہہ کو قبول کرنے میں تأمل ہے کیونکہ یہ عقیدۂ عصمتِ انبیاء کے خلاف ہے۔

اہل سنت اجتہادی غلطی کے امکان کو اس شرط کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ غلطی کے صدور کے بعد فوراً حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی تصحیح ہو جاتی ہے اور نبی کو بتا دیا جاتا ہے کہ یہ بات آپ سے غلط صادر ہوئی ہے۔ لہٰذا دوبارہ اسی غلطی کا امکان نہیں ہوسکتا۔ اور ان متعدد واقعات کو یکے بعد دیگرے تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ پہلی اور دوسری غلطی پر خاموش رہے اور کوئی تصحیح نہیں فرمائی اور آپ سے بار بار ایسی غلطی کا صدور ہوتا رہا۔ یہ نقطۂ نظر اہلسنت کے عقیدۂ عصمت کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم متعدد واقعات

کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللہُ لَکَ ج

کسی ایک ہی واقعہ کے بارے میں نازل ہوا ہے اور باقی دو واقعات غلط اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات پر صریحاً بہتان ہیں۔ اس کے بعد آئیے یہ بھی وضاحت کرتے چلیں کہ اس کا امکان بھی نہیں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ تینوں واقعات بیک وقت پیش آئے ہوں اور آپ نے تحریم کا یہ عمل ایک ہی وقت میں کیا ہو۔ کیونکہ واقعات کی جس انداز سے تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ صراحۃً ان واقعات کو مختلف اوقات میں ثابت کر رہی ہیں۔

(۱) ازواج مطہرات سب جمع ہو کر آپ کے گرد بیٹھی ہوئی ہیں اور خرچ مانگ رہی ہیں۔ ابو بکر صدیقؓ حضرت عائشہؓ کا اور عمرؓ ابن الخطابؓ حضرت حفصہؓ کا گلا گھونٹتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتی ہیں کہ آئندہ سے وہ ایسی کوئی چیز آپ سے نہیں مانگیں گی جو آپ کے پاس نہ ہو۔ لیکن دوسری ازواج مطہرات نے ایسا نہیں کیا اور وہ اپنے مطالبہ پر قائم رہیں (جیسا کہ روایت ابن عباسؓ میں حضرت ام سلمہؓ وغیرہ کے طرز عمل سے ظاہر ہے) تو آپ نے ایک ماہ تک ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی اور ایک بالاخانہ میں تنہا جا کر بیٹھ رہے اور ایک مہینہ تک ازواج مطہرات کے پاس نہیں گئے۔

(۲) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم (مختلف روایات کے مطابق حضرت زینبؓ بنت جحش یا حضرت حفصہؓ یا حضرت سودہؓ کے ہاں شہد کا شربت

پیا کرتے تھے اور زیادہ دیر تک رکتے تھے اس پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے یا حضرت سودہؓ و حضرت صفیہؓ نے (یہاں بھی مختلف روایات میں مختلف نام ہیں) مغافیر کی بو کا چکر چلایا اور آپ نے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی۔

(۳) آپؐ حضرت حفصہؓ کے مکان پر ان کی باری کے دن ان کے بستر پر حضرت ماریہ قبطیہؓ سے ہم بستر ہوئے اور حضرت حفصہؓ کو ناگوار ی ہوئی۔ انہوں نے رو رو کر آپ سے شکوہ کیا۔ اس پر آپ نے حضرت ماریہ قبطیہؓ کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ یہ تینوں واقعات پوری تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں۔ کیا کوئی شخص اس کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ یہ تینوں واقعات ایک ہی دن اور ایک ہی وقت کے ہیں اور آپ ان تینوں چیزوں کو بیک وقت ایک ہی دن اپنے اوپر حرام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اشکالات اپنی جگہ پر قائم ہیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔

اب آئیے اس پر بھی غور کر لیں کہ ان تینوں واقعات میں سے کونسا واقعہ روایت و درایت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے کہ اسے صحیح قرار دیا جائے اور کونسے واقعات روایت و درایت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے کہ اُنہیں غلط، جھوٹ اور بہتان قرار دیا جائے۔

قصہ ماریہؓ پر تنقید

سب سے پہلے حضرت ماریہ قبطیہؓ کے واقعہ کو لیجئے۔ یہ واقعہ صحاح ستہ میں سے سوائے نسائی کے اور کسی کتاب میں بیان نہیں ہوا۔ تمام ایسی ہی کتابوں میں نقل ہوا ہے جن میں ہر طرح کی رطب و یابس

روایات جمع کر دی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے جبتک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو وہ لائق التفات بھی نہیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں۔

"اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے ہاں قسم کھائی کہ وہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند ہیثم (ابن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

"اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت ماریہ کے ساتھ ہم بستر دیکھا اس پر انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معاتب کیا۔ ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے۔ ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افتراء اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۹ صفحہ ۵۴۸ میں لکھتے ہیں۔ اور آیت کی شان نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے۔ ماریہؓ کے

قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے۔ نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقہ سے مروی نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان میں سے ایک طریقہ کی توثیق کی ہے یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق ہیں (فتح الباری سورۂ تحریم) لیکن اول تو اس روایت میں ماریہ قبطیہؓ کا نام مطلق نہیں ہے۔ صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے اس کے علاوہ مسروق تابعی ہیں۔ یعنی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ اس لئے یہ روایت اصولِ حدیث کی رو سے منقطع ہے یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچا۔ اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے۔ لیکن اس طریقہ کے ایک اور راوی عبد الملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دارقطنی میں لکھا ہے کہ سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ماریہؓ کی روایت صحاح ستہ کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔

امام نوویؒ نے جو ائمۂ محدثین میں سے ہیں۔ صاف تصریح کی ہے کہ ماریہؓ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ اور ابن کثیرؒ نے جن طریقوں کو صحیح کہا ہے ان میں سے ایک منقطع اور دوسری کا راوی کثیر الخطا ہے۔ ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا

ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔

(سیرت النبی صفحہ ۵۷۹-۵۸۰ جلد ۱ مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ اُردو بازار لاہور)

علامہ شبلی نعمانی نے امام نوویؒ کا حوالہ دیا ہے کہ اُنہوں نے ماریہ قبطیہؓ والی روایات کو ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ لیکن یہ صرف امام نوویؒ ہی کی رائے نہیں ہے بلکہ امام نوویؒ نے قاضی عیاضؒ اور نسائیؒ سے بھی ایسا ہی نقل فرمایا ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں۔

"قاضی (عیاضؒ) نے فرمایا ہے کہ مسلم نے حجاج عن ابن جریج کی حدیث میں یہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے جس زوجہ محترمہ کے ہاں شہد پیا تھا وہ حضرت زینبؓ تھیں اور دو مظاہرہ کرنے والی خواتین عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں۔ ایسا ہی عمر ابن الخطاب اور ابن عباسؓ کی حدیث میں بھی آیا ہے کہ دونوں مظاہرہ کرنے والی خواتین عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں۔ اور مسلم نے بھی ابو اسامہ عن ہشام کی روایت میں یہ بیان کیا ہے کہ آپ نے جن زوجہ محترمہ کے ہاں شہد پیا تھا وہ حضرت حفصہؓ تھیں، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرہ عائشہؓ، سودہؓ اور صفیہؓ نے کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ نسائیؒ نے کہا ہے کہ حجاج کی حدیث کی سند صحیح ہے اور نہایت عمدہ ہے۔ اصیلی نے کہا ہے کہ حجاج کی حدیث زیادہ صحیح ہے اور کتاب اللہ سے قریب تر ہے اور فائدہ کے اعتبار سے زیادہ مکمل ہے۔ یعنی حق تعالیٰ

کے ارشاد وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ سے معلوم ہوتا ہے
کہ مظاہرہ کرنے والی دو خواتین ہیں، تین نہیں ہیں اور
وہ عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں جیسا کہ انہوں نے بتایا ہے اور
جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اعتراف فرمایا ہے۔ راوی پر
دوسری روایت میں نام الٹ پلٹ ہو گئے ہیں۔ لہذا
صحیح بات یہی ہے کہ آیت کا سبب نزول شہد ہی کا قصہ
ہے، ماریہؓ کا قصہ نہیں ہے جو صحیحین کے علاوہ دیگر کتب
میں بیان کیا گیا ہے۔ ماریہؓ کا قصہ کسی صحیح طریقہ سے
منقول نہیں ہے نسائی نے کہا ہے کہ عائشہؓ کی حدیث
کی سند جو شہد کے بارہ میں ہے وہ انتہائی عمدہ اور صحیح
ہے۔ (قاضی کی بات یہاں ختم ہو جاتی ہے)

(نووی شرح مسلم ص ج ۱)

(تعجب ہے کہ نسائی اس کے باوجود اپنی سنن میں کنیز والی
روایت بھی بیان کرتے ہیں۔)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کئی دیگر محدثین سے بھی ایسا ہی
نقل کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اکابر اہل علم نے ان دونوں قصوں میں سے اسی دوسرے
قصے کو صحیح قرار دیا ہے اور پہلے قصہ (ماریہ قبطیہؓ کے قصہ)
کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ شہد کے
معاملہ میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نہایت صحیح ہے اور
حضرت ماریہؓ کو حرام کر لینے کا قصہ کسی عمدہ طریقہ سے

نقل نہیں ہوا ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ماریہؓ کے معاملہ میں نہیں بلکہ شہد کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ قاضی ابو بکر ابن العربی بھی شہد ہی کے قصے کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہی رائے امام نوویؒ اور حافظ بدرالدین عینی کی ہے۔ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ شہد کی تحریم کا قصہ صحیحین میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا تھا اس لئے یہی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں صحیح بات یہی ہے کہ یہ آیت شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینے کے بارہ میں نازل ہوئی ہے۔

(تفہیم القرآن ابوالاعلیٰ مودودی جلد ششم صـ۱۷ ناشر ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۷۲ء)

آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ اکابر محدثین نے ماریہ قبطیہؓ سے متعلق تمام روایات کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں شہد سے متعلق روایات کو زیادہ صحیح اور عمدہ قرار دیا ہے۔ لیکن بات مقابلہ کی ہے یعنی ماریہ قبطیہؓ والی روایات کے مقابلہ میں شہد والی روایات نسبتاً زیادہ صحیح ہیں۔ شہد والی روایات کو بذاتہ صحیح نہیں کہا گیا ہے بلکہ شہد والی روایات کو ماریہ قبطیہؓ کی روایات کے مقابلہ میں صحیح تر کہا گیا ہے۔ اور جب کسی روایت کو دوسری روایت کے مقابلہ میں صحیح تر کہا جائے تو اس سے روایت کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔

(دیکھئے القواعد فی علوم الحدیث للعلامہ شیخ الاسلام ظفر احمد العثمانی

صفحہ ۹۱-۹۲ مطبوعہ حلب)

ورنہ شہد والی روایات فی نفسہٖ کیسی ہیں اس کے متعلق اکابر محدثین نے کوئی فیصلہ نہیں دیا ہے۔ بہر حال ماریہ قبطیہؓ والی روایات تو ختم ہوئیں اب ہم دوسری روایات جو شہد سے متعلق ہیں ان سے بحث کرتے ہیں۔

شہد کے قصے پر تنقید

شہد سے متعلق روایات ہم بیان کر چکے ہیں اور وہیں ساتھ کے ساتھ یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ روایات میں اضطراب ہے۔ کسی روایت میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے شہد حضرت زینبؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا کسی میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے شہد حضرت حفصہؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا۔ اور کسی روایت میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے شہد حضرت سودہؓ کے ہاں نوش فرمایا تھا۔ مضطرب حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ لہٰذا ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر حل القرآن میں لکھتے ہیں۔

"جاننا چاہیئے کہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر کس چیز کو حرام کیا تھا اور کیوں حرام کیا تھا اور نہ یہ کہ آپ نے کس بیوی سے کیا خفیہ بات کہی تھی اور اُنہوں نے اس کو کس سے بیان کیا تھا اور نہ یہ کہ اِن تتوبا کی مخاطب کونسی دو بیبیاں تھیں اور وہ کس طور پر آپس میں ایک دوسری کی مدد کرتی تھیں اور نہ

خود جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات
کو کسی سے بیان کیا اور نہ خود بیویوں نے اس قصہ کو کسی
سے بیان کیا بجز حضرت عائشہؓ کے۔ بلکہ دوسرے لوگوں
سے اس بات میں مختلف روایتیں منقول ہیں جن کا مأخذ
معلوم نہیں کہ ان کو یہ واقعہ جس کے اخفار کا اس قدر
اہتمام کیا گیا تھا اور جس کے اظہار پر بیویوں کو تنبیہ کی
گئی کس طرح معلوم ہوا۔ رہی حضرت عائشہؓ کی روایتیں
سو وہ بھی اس باب میں بہت مضطرب ہیں اور معلوم
ہوتا ہے کہ راوی واقعہ کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔ اس لئے
روایات سے بھی پوری حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ پس
آیات پر مجمل طور پر ایمان رکھنا کافی ہے۔

(تفسیر حل القرآن پارہ ۲۸ صـ۴۲ مطبوعہ دیوبند انڈیا)

(۲) ہمیں علامہ قسطلانیؒ (شرح بخاری) کے اس ارشاد سے قطعًا
اتفاق نہیں ہے کہ۔

"چونکہ صاحبۃ العسل (شہد پلانے والی زوجۂ محترمہ) کے بارہ
میں روایات میں اختلاف ہے۔ لہٰذا روایات کو تعدد پر محمول
کیا جائے گا۔" (قسطلانی صـ۴۳۹ـ)

غالبًا علامہ قسطلانیؒ نے سرسری طور پر روایت کو دیکھ کر یہ فیصلہ
فرما دیا ہے اور اس کے مضمرات پر قطعًا غور نہیں فرمایا۔ کیونکہ تعدد
پر محمول کرنے سے لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ آنحضرت صلے اللہ
علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات انتہائی غبی اور سادہ لوح تھیں

کہ وہ بار بار ایک ہی سازش کرتی تھیں اور ہر بار آپ بھی ان کی سازش کا شکار ہو جاتے تھے اور قسم کھا بیٹھتے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون نیز یہ بھی کہ ایک مرتبہ تحریم سے ممانعت فرمادینے کے باوجود کم ازکم دو مرتبہ مزید آپ سے حکم خداوندی کے خلاف سرزد ہوا۔

(۳) ویسے بھی اگر آپ غور فرمائیں تو شہد پینا یا شہد نہ پینا کوئی اتنا اہم واقعہ نہیں ہے جس پر حق تعالیٰ کی جانب سے ایک طرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ فرمائی جائے اور دوسری طرف ازواج مطہرات کو سخت ترین الفاظ میں تنبیہ فرمائی جائے کہ۔

"یا تو تم دونوں توبہ کرلو، پس بے شک (عام مفسرین کے مطابق) تمہارے دل کجی کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ ورنہ اللہ، جبریلؑ، تمام فرشتے اور تمام نیک مسلمان نبی کی مدد کرنے کے لئے موجود ہیں۔"

یہ کونسی ایسی اہم بات تھی جس کے لئے خدا، جبریلؑ اور ملاء اعلیٰ کے سارے فرشتے اور ملأ اسفل کے تمام نیک بندے پرے باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔

(۴) نیز ازواج مطہرات کے متعلق یہ غلط تأثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس قدر سازشی اور ایک دوسری سے حسد کرنے والی اور جلنے والی تھیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم چند منٹ کسی کے ہاں زیادہ ٹھہر جاتے تھے تو جلاپے میں جل بھن جاتی تھیں اور اس قسم کی جاہلانہ سازشیں کرنے لگتی تھیں حالانکہ حق تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝ (۳۳/۳۳)

ترجمہ: اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو تم سے ہر طرح کی بُرائی اور ناپاکی دور کردے اور تمھیں خوب خوب پاک کردے۔

اگر ازواج مطہرات ۹ھ تک اس قدر پست اخلاق اور دوں ہمت تھیں تو خدا نے اُنہیں کیا پاک فرمایا اور ان سے کون سا رِجس دُور کیا۔

(۵) حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر اس قدر پروانہ وار عاشق تھیں کہ اگر آپ ذرا سی دیر کسی دوسری بیوی کے پاس ٹھہر گئے تو جلاپے کا شکار ہو گئیں اور دوسری طرف یہ جانتے ہوئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو حلوا اور شہد بہت پسند ہے۔ شہد نوشی کے خلاف سازش بھی کرتی ہیں اور پھر آپسمیں مخول بھی کرتی ہیں کہ ہم نے بیچارے رسول اللہ کو شہد سے محروم کردیا تو دوسری کہتی ہیں کہ چپ رہو (کہیں رسول اللہ ہماری سازش کو سمجھ نہ جائیں)

(۶) ہمارے بلند پایہ محققین نے لکھا ہے کہ یہ قطعاً کوئی سازش نہیں تھی بلکہ اس شہد میں واقعی مغافیر کی بو ہوگی۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ وغیرہ نے کوئی غلط بات نہیں کہی تھی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نہایت نظیف الطبع تھے آپ کو کسی قسم کی بُو باس قطعاً گوارہ نہیں تھی اس لئے جب آپ کو بتایا گیا تو آپ نے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت زینبؓ کے ہاں شہد پینے کے بعد کسی دوسری، تیسری، اور چوتھی زوجہ محترمہ کے ہاں پہنچنے میں دس منٹ بیس منٹ اور تیس منٹ

تو لگے ہی ہوں گے۔ وہ شہد اب پیٹ میں تھا۔ منہہ سے گذرے ہوئے اسے دس منٹ، بیس، تیس منٹ تو گذر ہی چکے تھے لیکن اتنے وقفہ کے بعد بھی منہہ سے بو آ رہی تھی اور ازواج مطہرات اسے محسوس کر رہی تھیں جبکہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نظیف الطبع بھی نہیں تھیں۔ لیکن جب اس شہد کے شربت کا پیالہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے لایا گیا اور آپ نے اُسے ہونٹوں سے لگایا تو باوجودیکہ آپ انتہائی نظیف الطبع تھے آپ کو اس کی بو باس قطعاً نہیں آئی اور آپ اسے غٹ غٹ پی گئے۔ یاد رکھیئے جس چیز کی بو آدھے گھنٹہ کے بعد بھی منہہ سے اس شدت سے آ رہی ہو کہ پاس بیٹھنے والا اسے محسوس کر سکے وہ معمولی بو والی چیز نہیں ہو سکتی اسے انتہائی بودار چیز ہونا چاہیئے جسے پینا ہر آدمی کے لئے مشکل ہو گا۔ اور کوئی بہت نظیف الطبع آدمی ہو گا تو اسے توقے ہو جانی چاہیئے۔ چہ جائیکہ وہ اسے محسوس بھی نہ کر سکے۔ اگر کوئی شخص ایسی چیز کی بو کو محسوس ہی نہ کر سکے تو اسے نظیف الطبع قرار دینا ایک مبالغہ ہی ہو سکتا ہے۔

بہر حال ان وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

روایت ابن عباسؓ کی حقیقت

اس کے بعد آئیے اس کہانی کو بھی دیکھتے چلیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو راوی بنا کر حضرت عمرؓ سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کی گئی ہے۔

(۱) اس روایت میں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ

فرماتے ہیں کہ میں ایک سال تک اسی انتظار میں رہا کہ حضرت عمرؓ سے معلوم کروں لیکن ان کے رعب کی وجہ سے پوچھ نہیں سکا تا آنکہ حضرت عمرؓ حج کے لئے تشریف لے گئے اور میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ سفر حج سے واپسی میں وہ اثنائے راہ میں قضائے حاجت کے لئے گئے اور میں بھی ان کے ساتھ نکل کھڑا ہوا جب قضائے حاجت کے بعد میں انہیں وضو کرانے لگا تو موقعہ دیکھ کر میں نے سوال کر لیا۔ اس تمام تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کے متعلق عام صحابہؓ کو معلومات نہیں تھیں ورنہ ۱۳ھ میں ہزارہا صحابہ موجود تھے وہ کسی دوسرے صحابیؓ سے بھی پوچھ سکتے تھے۔ ایک سال تک وہ انتظار کرتے رہے کہ موقعہ ملے تو حضرت عمرؓ سے پوچھوں مگر ان کے رعب کی وجہ سے ان سے پوچھ نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ خود ان کے والد ماجد، والدہ ماجدہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا اور چچی سے زیادہ آپؐ کے گھریلو واقعات سے اور کون واقف ہو سکتا تھا۔ لیکن انہیں بھی ان واقعات کی کوئی خبر نہیں تھی۔ خود حضرت ابن عباسؓ کی سگی خالہ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو بھی معلوم نہیں تھا۔ جن کے گھر میں حضرت ابن عباسؓ جا کر سویا کرتے تھے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کے رات کے مشاغل کا مطالعہ کریں اور اپنے والد حضرت عباسؓ کو رپورٹ دیں اور جو یقیناً اس اجتماع میں بھی موجود تھیں جس کا حضرت عمرؓ نے ذکر فرمایا ہے کہ۔

"حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کے گرد آپ کی بیبیاں غمگین اور خاموش

بیٹھی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ میں کوئی ایسی بات کہوں کہ آپ مسکرا دیں۔ اُنہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کاش آپ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) کو دیکھتے کہ اگر وہ مجھ سے خرچ مانگتی تو میں کھڑے ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے پھر فرمایا۔ یہ سب میرے گرد بیٹھی ہیں اور مجھ سے خرچ مانگ رہی ہیں۔ بہر حال ایک طرف تو یہ تأثر دیا جا رہا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سوا کسی اور صحابی کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ صرف حضرت عمرؓ ہی اس بات کو جانتے تھے اور پورا ایک سال ان سے بات کو معلوم کرنے میں لگا۔ لیکن دوسرے ہی سانس میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ۔

"ازواج مطہرات نے جمع ہو کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خرچ کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اس مطالبہ کو ناپسند فرمایا اور خفگی کا اظہار کیا۔ اس وقت آپ کے دروازے پر بہت سے لوگ تھے لیکن کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔"

اس کے بعد یہ بھی کہ۔

"حضرت عمرؓ حجروں کی طرف آئے تو کیا دیکھتے ہیں ہر گھر میں رونا ہو رہا ہے۔ اور ہر بیوی کے گھر والے اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔"

پھر آگے یہ بھی کہ۔

"حضرت عمرؓ وہاں سے نکل کر ممبر کے پاس آئے۔ کیا دیکھتے

ہیں کہ کچھ لوگ رو رہے ہیں۔ کنکریاں الٹ پلٹ کر رہے ہیں
کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق
دیدی۔"

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات کوئی پوشیدہ بات نہیں تھی جو صرف حضرت عمرؓ ہی کو معلوم ہو بلکہ مدینہ منورہ میں سارے صحابہ اسے جانتے تھے۔ ایک تو یہ حیرتناک تضاد ہے۔

(۲) اس کے بعد بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ۔ میں نے کہا۔

"اے امیرالمومنین وہ کونسی دو ازواج مطہرات ہیں جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جتھہ بندی کی تھی؟ تو آپ نے فرمایا "وہ دونوں عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں"۔ لیکن جب حضرت عمرؓ تفصیلات بیان کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ۔

"حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور حضرت عائشہؓ کا گلا گھونٹنے لگے۔ حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کا گلا گھونٹنے لگے۔ وہ دونوں کہنے لگیں "ہم وہ چیز آپ سے کبھی نہ مانگیں گے جو آپ کے پاس نہ ہو"۔ اور یہ بھی کہ۔

"حضرت حفصہؓ کو نصیحت کرنے کے بعد حضرت عمرؓ حضرت ام سلمہؓ کے پاس گئے۔ وہ ان کی رشتہ دار بھی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں ان سے گفتگو کی۔ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا "عمرؓ! تم ہر معاملہ میں دخل دیتے ہو اور اب یہ چاہتے ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج کے معاملہ میں بھی دخل دو"۔ حضرت عمرؓ کو ان کی اس بات سے

اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ ان کو نصیحت نہ کر سکے اور واپس
چلے آئے۔"

سوچنے کی بات ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ اپنے اپنے والد کے تنبیہ کرنے پر جب اپنی بات سے رجوع کر چکیں اور وعدہ فرما چکی ہیں کہ۔

"ہم وہ چیز آپؐ سے کبھی نہ مانگیں گے جو آپؐ کے پاس نہ ہو۔"

تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جتھہ بندی کرنے والیاں یہ دونوں کیسے ہو سکتی ہیں۔ جتھہ بندی کرنے والیوں میں اگر حضرت ام سلمہؓ اور زینبؓ کا نام لیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ کتاب الہبۃ، صحیح بخاری میں یہ روایت حضرت عائشہؓ سے موجود ہے کہ ازواج مطہرات میں دو پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی میں حضرت عائشہؓ حضرت سودہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ تھیں اور دوسری پارٹی میں حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت ام سلمہؓ اور باقی ازواج مطہرات تھیں۔ تو مظاہرہ کرنے والی حضرت ام سلمہؓ (جنہوں نے اس مظاہرہ کے سلسلہ میں نصیحت کرنے والے حضرت عمرؓ کو بھی ڈانٹ دیا) اور ان کی پارٹی کی کوئی دوسری خاتون ہونی چاہئیں۔ (دیکھئے قسطلانی شرح بخاری صـ ۴۳۸-۴۳۹ ج ۲) بہر حال یہ ایک دوسرا لاینحل تضاد ہے۔

(۳) تیسرا اہم تضاد اس حدیث میں یہ ہے کہ واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے حضرت عمرؓ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ۔

"ان دنوں مدینہ منورہ میں اکثر اس بات کا چرچا رہتا تھا کہ غسان (امیر شام) مسلمانوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت عمرؓ کے پڑوسی انصاری اپنی باری کے

دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ رات کو جب
وہ لوٹ کر آئے تو حضرت عمرؓ کے دروازہ کو زور سے کھٹکھٹایا
اور کہا "کیا وہ سو رہے ہیں؟" حضرت عمرؓ ان کی اس بات
سے) ڈر گئے۔ باہر نکلے تو انصاری نے کہا "ایک بڑا حادثہ
ہوگیا" حضرت عمرؓ نے کہا "کیا غسان آگیا؟" انھوں نے کہا
"اس سے بھی بڑا حادثہ ہوگیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
اپنی بیویوں کو طلاق دیدی۔"

اس سے ظاہر ہے کہ مفروضۂ ایلاء کا یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔ کیونکہ غسان کے حملہ کا اندیشہ ۹ھ ہی میں تھا۔ لیکن اس سے آگے ہے۔

"صبح کو حضرت عمرؓ کپڑے وغیرہ پہن کر گھر سے روانہ ہوئے
فجر کی نماز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی۔
نماز کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالاخانہ میں تشریف
لے گئے اور اس میں تنہا بیٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ حجروں کی
طرف آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر گھر میں رونا ہو رہا ہے اور
ہر بیوی کے گھر والے اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اس
زمانہ کی بات ہے کہ پردہ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔"

واضح رہے کہ پردہ کے احکام حضرت زینبؓ بنت جحش سے آپ کی شادی ہو جانے کے بعد جب آپ نے ولیمہ فرمایا تھا تو عین ولیمہ ہی میں نازل ہوئے تھے اور حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ کا نکاح ۵ھ میں ہوا تھا۔ اگر یہ پردہ کے احکام نازل ہونے سے بھی پہلے کی بات ہے تو کم از کم ۴ھ یا زیادہ سے زیادہ خود ۵ھ کا یہ واقعہ ہو سکتا

ہے۔ رات کو انصاری پڑوسی اسی واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دیتا ہے تو اس وقت ۹ھ ہوتا ہے اور جب صبح کو کپڑے پہن کر وہ واقعہ کی تحقیق کے لئے مسجد نبوی میں تشریف لاتے ہیں تو اچانک وہ ۵ھ ہو جاتا ہے۔ کیا زمین اُلٹی گھومنے لگی تھی اور وہ بھی اس قدر تیزی سے کہ عشاء اور فجر کی نماز میں پورے گذشتہ چار سال بیت گئے۔

"بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی سیرت النبی جلد اول کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ ۵ھ کا واقعہ ہے اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں مذکور ہوا ہے (یہ صحیحین کی روایتیں ہیں) کہ یہ نزول حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن آگے چل کر حضرت عمرؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس واقعہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی۔ غسان کا حملہ ۹ھ میں ہونے والا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ اور محدث دمیاطیؒ نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل ۹ھ کا واقعہ ہے۔"

(دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۵۰) بحوالہ سیرت النبی جلد اوّل ص ۵۶۵ مطبوعہ ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور۔

یہ ایسا تضاد ہے جو ان روایات کی قدر و قیمت کو بالکل ہی ختم کر کے رکھدیتا ہے۔ دونوں جگہ خود حضرت عمرؓ ہی واقعہ کو بیان

کر رہے ہیں۔ انصاری پڑوسی بھی ان ہی کے پاس آتا ہے اور غسانی حملہ کا اندیشہ بھی خود انہی کو ہوتا ہے اور اگلی صبح کو تحقیق حال کیلئے بھی وہی تشریف لا رہے ہیں اور چوں کہ حضورؐ تو بالا خانہ میں فروکش ہو گئے تھے اس لئے ازواج مطہرات کے حجروں کا چکر بھی وہی لگا رہے ہیں۔

(۴) اس کے بعد ایک چوتھا تضاد بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کی زبانی کہلوا رہے ہیں کہ۔

"حضرت عمرؓ واپس آ گئے اور مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی۔"

اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ الآیۃ (۴/۸۳)

ترجمہ: جب ان کے پاس کوئی خبر امن یا خوف کی آتی ہے تو یہ اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ نبی اور سرداروں کے پاس پہنچاتے تو وہ اس کی تحقیق کر لیتے۔ یہ تو تم پر اللہ کا فضل ہو گیا ورنہ سوائے چند کے سب لوگ شیطان کے تابع ہو جاتے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ کچھ عام لوگوں نے جن کے ساتھ منافقین کا گروہ بھی شامل تھا۔ اس واقعہ کی کافی تشہیر کر دی تھی اور عوام میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دیدی ہے۔ غرضیکہ مدینہ منورہ میں اس واقعہ کو کافی پھیلایا گیا تھا۔ جب ہی تو حق تعالیٰ کو مذکورہ بالا آیات نازل فرمانا پڑیں۔

حالانکہ اس سے پہلے حضرت ابن عباسؓ یہ تاثر دے چکے ہیں کہ اس واقعہ کو حضرت عمرؓ کے سوا شاید کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ اور وہ ایک سال تک یہ انتظار ہی کرتے رہے کہ کب موقعہ ملے اور میں حضرت عمرؓ سے پوچھوں۔ بڑی مشکل سے سفر حج سے واپسی میں انہیں موقعہ مل سکا تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا۔

واضح رہے کہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ واقعہ اس حدیث کے مطابق ۹ھ کا ہے اور اکابر محدثین اور مؤرخین نے اسے ۹ھ کا واقعہ ہی قرار دیا ہے اور ۹ھ میں حضرت ابن عباسؓ دودھ پیتے بچے نہیں تھے۔ بخاری کتاب المناسک باب من قدم ضعفۃ اہلہ بلیل میں یہ تصریح موجود ہے کہ۔

"جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حج کیا (یعنی ۱۰ھ میں) تو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ قریب البلوغ تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی مستورات و ضعفاء کے ساتھ رات ہی کو مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دیا تھا۔"

نیز صحیح بخاری کتاب العلم باب السمر فی العلم میں ہے کہ۔

"ایک رات کا ذکر ہے کہ حضرت عبداللہؓ حضرت میمونہؓ کے ہاں تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز پڑھ کر تشریف لائے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے چار رکعتیں پڑھیں پھر سو گئے پھر آپ اٹھے اور فرمایا۔ کیا بچہ سو رہا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ اٹھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ

وسلم کے بائیں جانب کھڑے ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے انہیں اپنی داہنی طرف کر لیا پھر پانچ رکعتیں
پڑھیں۔ پھر جب صبح ہوئی تو آپ نے دو رکعتیں پڑھیں
اور پھر باہر تشریف لے گئے۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ۹ھ میں کافی باشعور ہو چکے تھے اور قریب البلوغ تھے اور اپنی سگی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے ہاں جا کر بھی سویا کرتے تھے۔ تاکہ دیکھ سکیں کہ رات کو آپؐ کے مشاغل کیا ہوتے ہیں تاکہ اپنے والد حضرت عباسؓ کو بتا سکیں کیونکہ وہ انہیں اسی مقصد سے بھیجتے تھے۔ ان حالات میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ سمجھدار نہیں تھے یا وہ ان امور کی سمجھ نہیں رکھتے تھے۔ تو جو چیز پورے مدینہ منورہ میں پھیلا دی گئی تھی اس کا حضرت ابن عباسؓ سے پوشیدہ رہنا ہی حیرتناک ہے۔ چہ جائیکہ اس بات کا اس قدر پوشیدہ رہنا کہ وہ اسے حضرت عمرؓ کے سوا اور کسی صحابی حتیٰ کہ خود اپنے والد، اپنی والدہ حتیٰ کہ اپنی سگی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ تک سے بھی معلوم نہ کر سکیں یہ تو انتہائی حیرتناک ہے۔

(۵) پھر اس حدیث میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کا جو کردار پیش کیا گیا ہے سے بھی مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ۔

"حضرت عمرؓ نے سوچا میں ایسی کوئی بات کہوں کہ آپ
مسکرا دیں۔ انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! صلے اللہ علیہ وسلم

کاش آپ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) کو دیکھتے کہ اگر وہ مجھ سے خرچ مانگتی تو میں کھڑے ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیتا۔" یہ سن کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ پھر فرمایا "یہ سب میرے گرد بیٹھی ہیں اور مجھ سے خرچ مانگ رہی ہیں۔" حضرت ابو بکرؓ اٹھے اور حضرت عائشہؓ کا گلا گھونٹنے لگے۔ حضرت عمرؓ، حضرت حفصہؓ کا گلا گھونٹنے لگے۔ وہ دونوں کہنے لگیں "ہم آپ سے وہ چیز کبھی نہ مانگیں گے جو آپ کے پاس نہ ہو۔"

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان دونوں حضرات کا یہ عمل علاوہ غیر شائستہ ہونے کے۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

(۴۹/۱)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش دستی نہ کرو۔

کے بھی صریحاً خلاف ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اپنی اپنی بیٹیوں کا گلا گھونٹنا جبکہ آپ نے ان کو ایسا کوئی حکم بھی نہیں دیا تھا۔ حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہے جو ان دونوں حضرات سے انتہائی بعید ہے۔ اور اگر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی طرف سے اس قدر زیادتی تسلیم کر لی جائے کہ ان کے گلے گھونٹے جانے کا جواز نکالا جا سکے تو وہ ان امہات المؤمنین کی شان سے بعید تر ہے جبکہ حق تعالےٰ

کا ان کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا ۝ (۳۳/۳۳)

ترجمہ: اے رسول کی گھر والیو! اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے ہر برائی اور گندگی کو دُور کر دے۔ اور تمہیں خوب خوب پاک کر دے۔

بہر حال حضرات شیخین رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق اس روایت نے جو تاثر پیدا کرنا چاہا ہے۔ وہ قطعاً نامناسب ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ کا یہ عمل۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ (۳۳/۶)

ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے لئے ان کے اپنے نفسوں سے بھی زیادہ قریب تر ہیں اور نبی کی ازواج مطہرات ان کی مائیں ہیں۔
کے بھی خلاف ہے۔

مانا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ ان دونوں حضرات کی بیٹیاں تھیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے تمام مؤمنوں کی مائیں بھی تو تھیں جن میں یہ دونوں حضرات بھی آجاتے ہیں۔

(۶) اس کے بعد پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نہایت بدمزاج اور غیر مہذب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جب یہ بتایا گیا کہ۔

"حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ کے گھر گئے اور ان سے کہا۔

"اے صدیق کی بیٹی! تمہارا یہ کیا حال ہو گیا ہے۔ کہ تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذاء دینے لگی ہو؟" حضرت عائشہؓ نے فرمایا "تم کو مجھ سے اور مجھ کو تم سے کیا مطلب؟ تم اپنی گٹھڑی (یعنی اپنی بیٹی) کی خبر لو"

غور تو فرمائیے۔ امہات المؤمنین کی گفتگو کا یہ انداز کچھ بھی معقول ہے۔ حضرت عائشہؓ کو معلوم تھا کہ حضرت عمرؓ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کس قدر تقرب حاصل تھا۔ وہ حضرت صدیق اکبرؓ (باپ) کے بھی عزیز ترین دوستوں میں سے تھے۔ شوہر اور باپ کے ایک دوست سے شریف گھرانوں کی لڑکیاں آج بھی اس انداز سے گفتگو نہیں کرتیں۔ چہ جائیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن تربیت میں پروان چڑھنے والی ازواج مطہرات کے متعلق اس قسم کا تاثر پیدا کیا جائے۔

اس حدیث کے راوی ہمارے مشہور امام حدیث محمد بن مسلم ابن شہاب زہری ہیں جن کے متعلق میں بار بار متنبہ کرتا آرہا ہوں کہ یہ حضرت مسلک کے اعتبار سے شیعہ ہیں۔ ان کے متعلق تفصیلی بحث میں واقعۂ افک پر بحث کرتے ہوئے کروں گا۔ اس روایت کے راوی ابن شہاب زہری کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی ہیں۔ چنانچہ یہ قصہ کتب احادیث میں پانچ طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ لیکن ہر ایک طریق میں تمام کے تمام ایرانی آزاد کردہ غلام ہیں جو اس کو روایت کرتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ ایرانی غلاموں کو حضرت عمرؓ،

حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ہی ان کی قدیم ترین سلطنت پارہ پارہ ہوئی تھی۔

حضرت مولانا تمنا عمادی مرحوم نے اپنے مقالہ "ایلاء النبیؐ" میں جو شائع ہو چکا ہے ہر سند کے راویوں پر تفصیلی بحث کر کے ان کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔ لہٰذا اس پر مزید کسی بحث کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے میں ان تفصیلات کو نظر انداز کرتا ہوں۔

مذکورہ بالا وجوہات سے میرا خیال ہے کہ یہ توجیہہ بھی قابل قبول نہیں ہے کہ آپ نے ایلاء فرمایا تھا اور ایک ماہ کے لئے ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔ اور یہ کہ اسی بناء پر آیت لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ نازل ہوئی تھی۔

موہوبات اور تحریم

اب اس کے بعد لے دے کر آخری بات باقی رہ جاتی ہے جسے ہم نے پانچویں کہانی کے عنوان سے پیش کیا ہے، وہیں ہم نے تفصیل سے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اپنے آپ کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے والی خاتون حضرت خولہؓ بنت حکیم تھیں۔ یہ حضرت خولہؓ تاریخ اسلام کی ایک نہایت اُولوالعزم جری، بہادر اور جنگجو خاتون تھیں جنہوں نے شام کے محاذ پر حضرت خالدؓ ابن الولید اور حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح کی کمان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ایک عورت کا برسرِ عام بھری محفل میں اس طرح اپنا نفس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کرنا بڑی جراُت ایمانی اور عشقِ رسول کا ثبوت ہے۔ ہم وہاں ہی یہ بھی بتا چکے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا کہ میں ان عورتوں

پر غیرت کیا کرتی تھی جو اپنا نفس حضورؐ کو ہبہ کردیتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا یہ بیان خود اپنی ہی ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ تقریباً تمام ازواج مطہرات کا یہی حال ہو گا۔ کیونکہ یہ بات نسوانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرت انسؓ نے جب یہ حدیث بیان کی تو ان کی صاحبزادی نے یہ فرمایا تھا کہ۔

"اس عورت میں بہت ہی کم حیا تھی"

اس سے ظاہر ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت بھی لوگوں نے اسی طرح سوچا ہو گا۔ کیونکہ حضرت انسؓ کی صاحبزادی نے یقیناً نسوانی بلکہ انسانی فطرت کی ترجمانی کی ہے۔ عام طور پر لوگوں کے سوچنے کا انداز یہی ہوا کرتا ہے۔ اس سے حضرت خولہؓ بنت الحکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عظمت شان اور ان کے جذبۂ قربانی اور عشق رسول کا ثبوت ملتا ہے۔ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ اجازت مرحمت فرمائی ہوئی تھی۔

وَامْرَأَةً مُّؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط (۳۳-۵)

ترجمہ: اور ہم نے نبی کے لئے اس مؤمن عورت کو بھی حلال کر دیا ہے جو اپنا نفس نبی کے لئے ہبہ کردے بشرطیکہ نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے یہ اجازت (مشروط طور پر) اے پیغمبر خالص آپ کے لئے ہے دوسرے مؤمن لوگوں کے لئے نہیں ہے۔

بہر حال آپ کو اس کی اجازت دی گئی تھی کہ اگر کوئی مؤمن عورت (کتابیہ نہیں) اپنا نفس آپ کو ہبہ کردے اور آپ کسی مصلحت کے

تحت اس سے نکاح فرمانا چاہیں تو اس سے نکاح فرما سکتے ہیں۔ مؤمن ہونے کی یہ پابندی صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھی۔ ورنہ عام مسلمانوں کے لئے اگر کوئی عورت اپنا نفس کسی کو ہبہ کرنا چاہے تو اس سے ہر مسلمان نکاح کر سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ عورت مؤمن بھی ہو۔ بلکہ اگر وہ اہل کتاب میں سے بھی ہو تو عام مسلمان اس سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مؤمنہ ہونا شرط تھا آپؐ کسی کتابیہ سے نکاح نہیں فرما سکتے تھے۔

قرآن کریم میں جابجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر اُمت کو ہدایات دی گئی ہیں۔ یعنی جو احکام دیئے گئے ہیں وہ پوری اُمت کے لئے ہیں۔ لیکن مخاطب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے مگر وہاں کوئی نہ کوئی قرینہ ضرور ایسا رکھا گیا ہے جس سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ حکم پوری اُمت کے لئے ہے صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً سورۂ طلاق میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ

(٦٦/٢)

ترجمہ :۔ اے پیغمبر اسلام! جب تم عورتوں کو طلاق دیا کرو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دیا کرو۔

یہاں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا۔ اور آپ فرد واحد ہیں مگر اس کے بعد بجائے واحد حاضر کے جمع حاضر کا صیغہ لا کر بتا دیا گیا ہے کہ یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ پوری ملت کو

ہے۔ نیز خود اس آیت زیر بحث کے ساتھ ہی اگلی آیت دیکھیئے۔ اس میں بھی جمع حاضر کا صیغہ لایا گیا ہے۔ یعنی۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ط (۲/۲۸)

ترجمہ:۔ خدا نے تم پر اپنی قسموں کا توڑ دینا فرض کر دیا ہے۔

اب اس کے بعد غور فرمائیے کہ اپنی بیویوں کے پاس جانا، شہد پینا۔ اپنی کسی خاص بیوی کے پاس جانا پوری اُمت کے لئے حلال ہے صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے حلال نہیں تھا۔ لیکن آیت زیر بحث میں صرف حضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ اُن توجیہات کی بناء پر جو بیان کی گئی ہیں موقع ومحل کا تقاضا یہ تھا کہ سب کے لئے مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ فرمایا جاتا۔ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ سے اس طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے مخصوص تھی پوری اُمت کے لئے عام نہیں تھی جو صرف وہی صورت ہے جو ہم نے بیان کی ہے یعنی اپنا نفس ہبہ کرنے والی عورت کو اپنے نکاح میں قبول کر لینا بشرطیکہ وہ مؤمن ہو کتابیہ نہ ہو اس کی تصریح خود قرآن کریم خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ سے پہلے ہی کر چکا ہے لہٰذا اس آیت میں مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ میں لَكَ کا لفظ بالکل برمحل اور موقعہ کے مناسب ہے۔ اس کے بعد تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ سے اس کی مزید تائید ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی عام بات نہیں ہے بلکہ ایک خاص بات ہے جو خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی سے اپنی ازواج مطہرات کی خوشنودی کی خاطر سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس اگر ان توجیہات

کو تسلیم کیا جائے جو ہمارے مفسرین نے کی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ کے بجائے مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ان میں ایسی ایک چیز بھی نہیں ہے جو صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے حلال ہو۔ ان کے حلال ہونے میں ساری اُمت آپ کے ساتھ شریک ہے۔ اس خاص معاملہ میں غالباً آپ کو اس لئے تنبیہہ فرمائی گئی کہ حضرت خولہ بنت الحکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک بلند مرتبت خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑی جرأت اور قربانی کا ثبوت دیا تھا اور شاید آپ کے قبول نہ فرمانے سے اُن کی دل شکنی ہوئی ہو گی۔ یہ ایسا ہی واقعہ ہے جیسے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۝ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۝ (۸۰-۲-۱)

ترجمہ :- پیغمبر چیں بجبیں ہوئے اور منہ موڑ لیا کہ ان کے پاس ایک نابینا آ گیا تھا۔

وہاں بھی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی کی دل شکنی کی وجہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تنبیہہ فرمائی گئی تھی۔ اسی طرح آیتِ زیر بحث میں بھی حضرت خولہ رضی کی دل شکنی کی بناء پر آپ کو تنبیہہ فرما دی گئی۔

ہم نے یہاں حضرت خولہ بنت الحکیم کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی پیشکش کو شرف قبول عطا نہیں فرمایا بلکہ ان کا نکاح کسی صحابی سے فرما دیا جیسے قرآن کریم یاد تھا لیکن حضرت ابن عباس رضی نے کسی خاص عورت کا نام نہیں لیا ہے بلکہ یہ بتایا ہے کہ آیت لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ۔ اس عورت (غیر متعین) کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس نے اپنا نفس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو

ہبہ کر دیا تھا۔ (ابن کثیر ص۹۵ پارہ ۲۸)

آخر میں ابن کثیرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ۔

"مقصد یہ ہے کہ وہ عورتیں جنہوں نے اپنے نفس کا اختیار آپ کو دیا تھا وہ بہت سی ہیں چنانچہ صحیح بخاری شریف میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں ان عورتوں پر غیرت کیا کرتی تھی جو اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیتی تھیں الخ"

(ابن کثیر ص۲۱ پارہ ۲۲)

چنانچہ اس سے پہلے وہ ان ازواج مطہرات کے نام بھی گنا چکے ہیں جنہوں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

"میمونہ بنت حارثؓ بھی وہ ہیں جنہوں نے اپنا نفس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا اور حضرت زینبؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن کی کنیت ام المساکین تھی اور ایک عورت بنو ابی بکر بن کلاب سے۔ یہ وہی ہے جس نے بعد میں دنیا کو اختیار کیا تھا اور بنو جون میں سے ایک عورت جس نے پناہ طلب کی تھی۔ اور ایک عورت اسدیہ جن کا نام زینب بنت جحشؓ رضی اللہ عنہا ہے یہ سب وہ ہیں جنہوں نے خود کو ہبہ کیا تھا۔ دو کنیزیں بھی یعنی صفیہؓ بنت حیی بن اخطب اور جویریہؓ بنت حارث بن عمرو ابن مصطلق خزاعیہ بھی موہوبات میں سے ہیں۔"

(ابن کثیر ص۲۰-۲۱ پارہ ۲۲)

نیز سیرت ابن ہشام میں بھی چند نام گنوائے گئے ہیں۔ ابن ہشام فرماتے ہیں کہ۔

"میمونہ بنت الحارثؓ موہوبات میں سے ہیں ان کی شادی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے حضرت عباسؓ نے کرائی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو مہر میں چار سو درہم بھی حضرت عباسؓ نے ہی ادا کیئے۔ یہ بھی روایت ہے کہ جن خاتون نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا تھا وہ حضرت زینب بنت جحشؓ تھیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ ام شریکؓ تھیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ بنو سامہ کی کوئی اور خاتون تھیں"

(سیرت ابن ہشام صـ۱۸۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت غالباً حضرت خولہؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، مگر چوں کہ حضورؐ ان کا نکاح ایک مسلمان سے کرا چکے تھے اس لئے اب ان کا قبول کرنا تو ممکن نہ تھا مگر ان کے بعد جس خاتون نے خود کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا وہ حضرت زینبؓ تھیں، اور حضورؐ نے ان کی مجبوری و معذوری کو دیکھ کر اس حکم کے تحت قبول فرما لیا۔ لہٰذا شہد والی روایات کا اتنا بیان صحیح ہو سکتا ہے کہ آیت حضرت زینبؓ سے متعلق ہے لیکن اس کی تفصیل میں شاید ان سے وہم ہو گیا ہو کہ نکاح کے بجائے شہد پینے کا واقعہ بیان کر گئے ہوں حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قربانیاں اور فداکاریاں بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ وہ قریشی خاندان کی اونچے گھرانے کی خاتون ہیں۔ ان کی قطعاً مرضی نہیں تھی لیکن محض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعمیل ارشاد میں اُنہوں نے حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ سے شادی فرمالینا منظور کیا تھا۔ کیونکہ حضرت زیدؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم

کے منہ بولے بیٹے سہی مگر تھے تو وہ ایک آزاد کردہ غلام ہی۔ لیکن حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کا نباہ نہیں ہو سکا۔ اور وہ ان سے تعلقات زن و شوئی قائم نہیں کر سکے۔ یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ قصور کس کا تھا۔ وہ یہی سمجھتی ہوں گی کہ حضرت زیدؓ کا قصور ہے۔ لیکن انہوں نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ حتی الامکان حضرت زیدؓ کے ساتھ طویل عرصہ تک گذارہ فرمایا۔ اس طویل عرصہ میں انہیں بدنام بھی ہونا پڑا۔ ان کی سخت کلامی اور بدزبانی کے چرچے بھی ہوئے۔ کچھ لوگوں نے انہیں بانجھ اور اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بھی قرار دیا لیکن انہوں نے ان تمام باتوں کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا۔ تقریباً چار پانچ سال تک حضرت زیدؓ سے طلاق ہو جانے کے بعد بیوگی کی زندگی بھی برداشت کی۔ بالآخر انہوں نے اپنا نفس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کرنا چاہا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی مسلمان معاشرہ کے سربراہ تھے۔ اور آپ کا یہ اعلان بھی تھا کہ جیسا کہ بخاری میں ہے کہ۔

اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَتَرَكَ دَیْنًا فَعَلَیَّ قَضَاؤُهٗ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهٖ ۔

ترجمہ: میں مسلمانوں سے ان کے اپنے نفسوں سے بھی قریب تر ہوں تو جو مسلمانوں میں سے مرجائے اور اس پر قرض ہو تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے اور جو مال وہ چھوڑ جائے وہ اس کے ورثہ کا ہے۔

اور۔

مَنْ تَرَكَ كَلًّا اَوْ ضِیَاعًا فَاِلَیَّ

ترجمہ: جو کوئی قرض وغیرہ کا بوجھ یا چھوٹے چھوٹے بچے جن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو چھوڑ جائے تو ان کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔

(صحیح بخاری ص ۸۰۹ ج ۲)

نیز آپ کا یہ اعلان بھی تھا۔

اَنَا وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ۔

ترجمہ: میں اس کا ولی ہوں جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

لہٰذا حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کے دامنِ رحمت میں پناہ لینی چاہی اور اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس پیشکش کو قبول کرنے میں تامل فرمایا ہوگا۔ کیونکہ ہر شریف الطبع انسان ایک ایسی چیز کو اپنے قبضہ میں لینے سے طبعی کراہت محسوس کرتا ہے جو اس سے پہلے اس کے بچوں کی رہی ہو۔ حضرت زیدؓ بھی آپ کے بچے اور بمنزلہ اولاد ہی کے تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو متنبہ فرمایا کہ حضرت زینبؓ کی قربانیاں اس قابل ہیں کہ ان کی اس درخواست کو شرف پذیرائی عطا فرمایا جائے۔ جو عورتیں اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دیتی ہیں۔ ہم نے ان سے نکاح کر لینے کی آپ کو اجازت دے رکھی ہے۔ آپ اس چیز سے کیوں باز رہتے ہیں جو حق تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حضرت ابو رزینؓ کی روایت کے مطابق جسے ہم موہوبات کے سلسلہ میں پانچویں عنوان کے تحت احکام القرآن (لابی بکر جصاص رازی) سے نقل کر چکے ہیں وہ ملتوی کردہ ازواج مطہرات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانۂ رسالت

میں پناہ گزیں تھیں۔ یہ ہیں حضرت میمونہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن ان میں سے حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تو وہ ہیں جو ان ملتوی فرمودہ ازواج میں کافی بعد میں شامل ہوئی ہیں ورنہ ابتداءً وہ ان ازواج مطہراتؓ (یعنی حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ) کے ساتھ شامل تھیں جن کی باری کے دن مقرر تھے۔ حضرت سودہؓ کے علاوہ ملتوی شدہ باقی ازواج مطہرات کی ترتیب یہ ہے۔ حضرت زینب بنت جحشؓ جن سے نکاح ۵ھ میں ہوا، حضرت جویریہؓ جن سے نکاح ۵ھ میں میں ہوا۔ لیکن حضرت زینبؓ کے بعد ہوا۔ حضرت ام حبیبہؓ جن سے نکاح ۷ھ میں ہوا۔ حضرت صفیہؓ جن سے نکاح ۷ھ میں ہوا۔ بہرحال ان ازواج مطہرات میں جن کے باری کے ایام مقرر نہیں تھے اور جو موہوبات میں شامل تھیں حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نمبر پہلا ہے۔ باقی ازواج مطہرات اِن کے بعد ہی آئی ہیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی کبر سنی اور ضعیفی کی بنا پر جب باری سے معذرت فرمائی اور وہ اُن ازواج مطہرات میں شامل ہو گئیں جو ملتوی فرمودہ تھیں تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ بنت خزیمہ ام المساکین کو جو موہوبات میں سے تھیں اور ان کی وفات کے بعد (جو نکاح کے بہت تھوڑے عرصہ کے بعد پیش آگئی تھی) حضرت زینبؓ بنت جحش کو ان ازواج مطہرات میں داخل فرمالیا جن کے باری کے دن مقرر تھے۔ اس طرح وہ ازواج مطہرات ہمیشہ صرف چار ہی رہیں جن کے باری کے ایام مقرر تھے۔ یعنی پہلے حضرت سودہؓ، حضرت

عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ تھیں پھر جب حضرت سودہؓ نے اپنی معذوریوں کے تحت ان مخصوص چار ازواج کے بجائے باقی ازواج کے ساتھ رہنا چاہا تو ان کی جگہ حضرت زینبؓ (ام المساکین) کو چوتھا مقام ملا جب چند ماہ بعد ہی ان کا بھی انتقال ہوگیا تو پھر ان کی جگہ حضرت زینبؓ بنت جحش کو یہ مقام ملا۔ غرض حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ ازواج مطہرات جن کی باری مقرر تھی ہمیشہ صرف چار ہی رہیں۔

اس توجیہہ کے ماتحت آپ غور فرمائیے کہ اس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ اطہر کے خلاف اور نہ ازواج مطہرات کے خلاف کوئی قابل اعتراض بات لازم آتی ہے۔ اور نہ کسی اخلاقی گراوٹ کا ثبوت ملتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نہایت امن و عافیت کے ساتھ زندگی بسر فرماتے تھے نہ آپ کو ان سے کوئی شکایت تھی اور نہ ازواج مطہرات کو۔ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ایلاء کی روایات کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کسی طرح بھی پسندیدہ اور مثالی نمونہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اگر شہد یا حضرت ماریہ قبطیہؓ کی روایات کو تسلیم کیا جائے تو ازواج مطہرات کی باہمی رقابت اور جلاپے کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ بھی کسی طرح پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اپنا نفس ہبہ کرنے والی خواتین کی روایات کو اگر تسلیم کیا جائے تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی۔ بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ازواج مطہرات کی دلجوئی اور رعایت کا وہ منظر سامنے آتا ہے جو ہر اعتبار سے مثالی کہا جا سکتا ہے۔

کہ آپ ان خواتین کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے جو اپنا نفس آپ کو ہبہ کرتی تھیں۔ ساتھ ہی ان خلاف واقعہ اتہامات کی تردید بھی ہو جاتی ہے جو دشمنانِ اسلام کی طرف سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف آئے دن عائد کئے جاتے ہیں کہ معاذ اللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک جنسی مریض تھے اور عیش پسندی آپ کا مشغلہ تھا۔ مندرجہ بالا وجوہات سے ہمارے نزدیک یہی آخری روایت قابلِ ترجیح ہے۔ اس توجیہ کی بناء پر لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ کا ترجمہ یہ نہیں ہوگا کہ آپ ان چیزوں کو کیوں حرام کئے لیتے ہیں جو اللہ نے آپ کے لئے حلال فرمائی ہیں بلکہ یوں ہوگا کہ آپ ان چیزوں سے کیوں رکتے ہیں جو آپ کے لئے حق تعالےٰ نے حلال فرمائی ہیں۔ چونکہ آپ کا ان چیزوں سے رکنا اور ان سے احتراز برتنا بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ آپ ان چیزوں کو ناجائز خیال فرماتے ہیں۔ اس لئے اس عمل (یعنی باز رہنے) کو تُحَرِّمُ سے تعبیر فرمادیا گیا ہے اور عربی محاورات کی رو سے اس کی گنجائش موجود ہے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اسلام! آپ ایسی مومن عورتوں سے شادی کر لینے سے کیوں کتراتے ہیں جو اپنا نفس آپ کو ہبہ کرنا چاہتی ہیں۔ کیا آپ اپنی ازواج کی مرضی اور خواہش کے ماتحت ان کے اس ایثار اور قربانی کے جذبات کو رد فرمارہے ہیں؟ آپ ایسا نہ کیجئے ہم نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنے کی آپ کو اجازت دے رکھی ہے کیونکہ اشاعتِ اسلام اور خواتین اسلام کی تعلیم و تربیت کی خاطر اس کی ضرورت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی سے متعلق ساتواں افسانہ

پیغمبرؐ کا راز

(الف) خلافتِ شیخین کی پیشین گوئی

(ب) مظاہرہ کرنے والے لوگ

(ج) عَسٰی رَبُّہٗ اِنْ طَلَّقَکُنَّ

(د) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ

پیغمبر کا راز

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ۝ (۳/۶۶)

ترجمہ: اور یاد کرو جب نبی نے اپنی کسی بیوی کو کوئی راز کی بات بتائی تو اس نے وہ راز افشا کر دیا اور اللہ نے نبی کو اس کی خبر دیدی تو نبی نے کچھ بات جتلا دی اور کچھ سے چشم پوشی فرمائی۔ تو جب نبی نے بیوی کو اس کی خبر دی تو وہ کہنے لگیں "آپ کو یہ بات کس نے بتائی" تو نبی نے کہا "مجھے خدائے علیم و خبیر نے بتایا ہے"

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات اپنی کسی زوجہ محترمہ کو بتائی تھی جو ان کے منہہ سے نکل گئی اور وہ راز کو راز نہ رکھ سکیں۔ اس پر آپ نے ان زوجہ محترمہ سے اس کی باز پرس فرمائی اور انہیں جتا دیا کہ تم نے یہ راز ظاہر کر دیا

ہے۔ الخ

یہی وہ معاملہ ہے جو ہمارے راویوں کے ہاں بڑی جولانیٔ طبع کا باعث بن گیا ہے۔ قرآن کریم نے نہ تو یہ بتایا کہ وہ راز کی بات کیا تھی۔ اور نہ یہ بتایا کہ وہ زوجۂ محترمہ کونسی تھیں جن سے افشائے راز کی غلطی سرزد ہوئی۔ لیکن ہمارے راویانِ حدیث نے بڑی کوششوں سے ان زوجۂ محترمہ کا نام متعین کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے جن سے افشار راز کی لغزش سرزد ہو گئی تھی اور اس راز سے بھی پردہ اٹھانے کی ناکام کوشش فرمائی ہے کہ وہ راز کیا تھا جسے اس قدر چھپانے کی کوشش فرمائی گئی کہ نہ حق تعالیٰ نے اس سے پردہ اُٹھایا نہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بتایا۔

اس سلسلہ میں افسانۂ تحریم کے ضمن میں ہم یہ دو قول نقل کر چکے ہیں کہ بعض روایات کی رو سے وہ راز کی بات یہ تھی کہ۔

(۱) شہد استعمال نہ فرمانے کی جو آپ نے قسم کھالی تھی۔ اس کے متعلق آپ نے منع فرما دیا تھا کہ یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے۔ اور

(۲) یہ کہ آپ نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھالی تھی کہ میں اب حضرت ماریہ قبطیہؓ کے پاس نہیں جاؤں گا اور آپ نے حضرت حفصہؓ سے کہا تھا کہ یہ بات حضرت عائشہؓ کو نہ بتانا۔ یہی وہ راز کی بات تھی لیکن "تحریم" کے سلسلہ ہی میں ہم نے ان دونوں اقوال کے ضعف پر تفصیل سے روشنی ڈالدی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک تیسری روایت بھی ہے جسے ہم اب تفصیل سے پیش کر رہے ہیں۔

علامہ حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو بات حضورؐ نے چپکے سے اپنی ایک بیوی صاحبہ سے کہی تھی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت حفصہؓ کے گھر میں آپ تھے۔ وہ جب تشریف لائیں اور حضرت ماریہ قبطیہؓ سے آپ کو مشغول پایا۔ تو آپ نے انہیں فرمایا۔

"تم حضرت عائشہ کو خبر نہ کرنا۔ میں تمہیں ایک بشارت سناتا ہوں۔ میرے انتقال کے بعد میری خلافت پر (حضرت) ابوبکر کے بعد تمہارے والد آئیں گے۔"

حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو خبر کردی۔ پس حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ "اس کی خبر آپ کو کس نے پہنچائی؟" آپ نے کہا۔ "مجھے علیم وخبیر خدا نے خبر پہنچائی"۔ عائشہؓ صدیقہ نے کہا۔ "(اس کے باوجود) میں آپ کی طرف نہ دیکھوں گی جب تک آپ ماریہؓ کو اپنے اوپر حرام نہ کرلیں۔ چنانچہ آپ نے حرام کرلی۔ اس پر آیت یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ ٥ نازل ہوئی (طبرانی) (تفسیر ابن کثیر پارہ ۲۸ صفحہ ۹۵ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

مشہور شیعہ مفسر مولوی مقبول صاحب اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں کہ۔

"تفسیر قمی میں ہے کہ سبب نزول اس سورت کا یہ ہوا کہ جناب رسولِ خدا ایک دن حفصہؓ کے گھر میں تھے اور ماریہ قبطیہؓ

آپ کی خدمت کر رہی تھیں۔ اور حفصہؓ کسی کام کو گئی ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے ماریہؓ سے ہمبستری کی۔ حفصہؓ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت جھنجھلائی اور جناب رسول خدا سے رو رو کر کہا کہ یا رسول اللہ! میرے ہی دن میں، میرے ہی گھر میں اور میرے ہی بستر پر؟ آنحضرتؐ کو حیا آئی اور اس سے فرمایا "بس کر بس کر، میں ماریہ کو آئندہ سے اپنے نفس پر حرام کرتا ہوں۔ اس سے اس کے بعد کبھی ہمبستری نہ کروں گا۔ تجھ سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ اگر تو نے اس سے کسی کو آگاہ کر دیا تو تجھ پر اللہ کی بھی لعنت ہوگی اور کل فرشتوں کی بھی اور کل آدمیوں کی بھی" حفصہؓ نے کہا "بہت اچھا فرمائیے۔" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میرے بعد ابو بکرؓ خلیفہ بن بیٹھے گا۔ اور اس کے بعد تیرا باوا" حفصہؓ نے کہا "مَنْ اَنْبَأَكَ هٰذَا (آپ کو اس کی کس نے خبر دی) آپ نے فرمایا "نَبَّأَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ" (مجھے خدائے علیم و خبیر نے خبر دی)۔

(حاشیہ قرآن مترجم مولوی مقبول، مطبوعہ ہند)

مولوی مقبول نے جس تفسیر قمیؔ کا حوالہ دیا ہے۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے۔ قمیؔ اپنی تفسیر مطبوعہ ایران ص۳۵۴ میں لکھتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا۔

"اِنَّ اَبَا بَكْرٍ يَلِي الْخِلَافَةَ بَعْدِيْ ثُمَّ مِنْ بَعْدِهٖ اَبُوْكِ فَقَالَتْ مَنْ اَخْبَرَكَ بِهٰذَا قَالَ۔ اَللّٰهُ اَخْبَرَنِيْ۔

ترجمہ: یقیناً ابوبکرؓ میرے بعد والی خلافت ہوں گے پھر ان کے بعد تمہارے والد۔ حفصہؓ نے پوچھا۔ آپ کو یہ خبر کس نے دی؟ آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے اس کی خبر دی ہے۔ ؎

یہ روایت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی مختلف سندوں سے ازالۃ الخفاء میں نقل فرمائی ہے چنانچہ مقصد اول ص۳ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ کہتے تھے کہ خدا کی قسم ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کا ذکر اللہ کی کتاب میں ہے۔ دیکھو اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا وہ بات یہ تھی کہ آپ نے حضرت حفصہؓ سے فرمایا کہ تمہارے والد اور عائشہؓ کے والد میرے بعد خلیفہ ہوں گے۔ خبردار اس کو کسی سے بیان نہ کرنا اس حدیث کی تخریج واحدی نے کی ہے۔ اس کی سندیں متعدد ہیں جن میں سے بعض ریاض النضرۃ میں مذکور ہیں۔"

؎ مولوی مقبول احمد نے اپنے ترجمۂ قرآن ص۹۲ میں اس روایت کو نقل کیا ہے مگر ان کی دیانت ملاحظہ فرمائیے کہ ان ابابکر یلی الخلافۃ بعدی ثم من بعدہ ابوک کا ترجمہ "میرے بعد ابوبکرؓ خلیفہ بن بیٹھے گا اور اسکے بعد تیرا باوا" کیا ہے۔ کتنی بڑی خیانت ہے۔ اللہ اکبر۔ نیز اس پر بھی غور فرمائیے کہ یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ انبیاء اور ائمہ معصوم ہوتے ہیں ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی، مولوی صاحب موصوف حضرت ماریہ قبطیہؓ والی روایت کس طرح چٹخارے لے کر بیان کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ علمائے اہل سنت نے متفقہ طور پر اس روایت کو رد کر دیا ہے۔

پھر ازالۃ الخفاء ہی میں صفحہ ۲۴۹ پر شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"حضرت عائشہؓ سے وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا کی تفسیر میں منقول ہے کہ وہ راز یہ تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "ابو بکرؓ میرے بعد میرے خلیفہ ہوں گے" اور علیؓ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ دونوں کہتے تھے کہ اللہ کی قسم ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافت قرآن میں مذکور ہے یعنی وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا میں کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حفصہؓ سے فرمایا تھا کہ تمہارے والد اور عائشہؓ کے والد میرے بعد لوگوں کے والی ہوں گے۔ خبردار اس کو کسی سے بیان نہ کرنا۔"

ز صاحب واقعی روایت

اور میمون بن مہرانؒ۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا کی تفسیر میں منقول ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ابو بکرؓ میرے بعد خلیفہ ہوں گے اور حبیب بن ابی ثابت سے وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا کی تفسیر میں منقول ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو خبر دی تھی کہ تمہارے والد میرے بعد خلیفہ ہوں گے اور ان کے بعد حفصہؓ کے والد۔ اور ضحاک سے وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا کی تفسیر میں منقول ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ سے فرمایا کہ میرے بعد ابو بکرؓ خلیفہ ہوں گے اور ابو بکرؓ کے بعد عمرؓ ہوں گے۔ اور مجاہد سے عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ

کی تفسیر میں منقول ہے کہ جس بات پر آپ نے بازپرس کی وہ ماریہ کا معاملہ تھا اور جس بات سے آپ نے چشم پوشی کی وہ یہ تھی کہ اے حفصہؓ تمہارے والد اور عائشہؓ کے والد میرے بعد لوگوں کے والی ہوں گے۔ یہ چشم پوشی اس لئے کی کہ یہ بات زیادہ مشہور نہ ہو۔ انتہی۔

یہ تفسیر چونکہ اہل سنت اور اہل تشیع کے کتابوں میں متفقہ طور پر بیان کی گئی ہے۔ اس لئے اسے سرسری طور پر نظر انداز کر دینا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں حضرات شیخین کی خلافت کے متعلق پیشین گوئی کا تعلق چونکہ پوری امت مسلمہ سے تھا۔ کوئی ذاتی یا انفرادی واقعہ نہیں تھا اس لئے اس کے خلاف پوری اُمت میں ایک طوفان برپا کیا جا سکتا تھا۔ معلوم ہے کہ عرب صدیوں سے قبائلی نظام کے خوگر چلے آتے تھے۔ اسلام نے قبائلی عصبیتوں کو ختم کرنے کی زبردست کوششیں کیں مگر نو مسلموں میں اس کے اثرات ابھی تک کچھ کچھ باقی تھے۔ منافقین و کفار کو عربوں کی اس کمزوری کا اچھی طرح علم تھا اور وہ ہر موقعہ پر لوگوں کی اسی دکھتی رگ کو چھیڑتے تھے اور بار بار اُنہوں نے مسلمانوں کو اسی قبائلی عصبیت کے نام پر بھڑکانے اور ایک دوسرے سے بھڑانے کی کوشش کی ہے جس کا تذکرہ سیرت کی ہر کتاب میں ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی اُنہوں نے یقیناً افتراق و اختلاف کے بیج بوئے ہوں گے۔ مدینہ منورہ کے انصار میں اوس و خزرج کی مخاصمت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ پھر اقتدار و اختیار کے سلسلہ میں انصار اور مہاجرین میں اختلافات پیدا کرنا کون سا مشکل کام تھا۔ اور روایات کے بقول تو حضورؐ کی وفات

کے بعد ہی دشمنانِ اسلام اس میں کامیاب بھی ہوئے جس کا مظہر سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ یا افسانہ بتایا جاتا ہے. خود مہاجرین میں سے بھی بنو ہاشم اور دوسرے قبیلوں کو بھڑکا دینا بڑا آسان کام تھا. آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم میں سے تھے. لہٰذا بنو ہاشم اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اقتدار واختیار کا خواب دیکھ رہے ہوں تو کوئی تعجب نہیں جبکہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بنو ہاشم میں سے نہیں تھے۔

بخاری کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری دنوں میں حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ پر زور دیا تھا کہ چل کر آنحضرتؐ سے پوچھ لیں کہ آپ کے بعد اقتدار واختیار کا مالک کون ہو گا. حضرت علیؓ نے اِس مشورہ کو نہیں مانا تھا. لیکن اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی تھی کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے حق سے انکار فرما دیا تو اُمت ہمیں کبھی بھی اقتدار نہیں دے گی. اس بخاری اور مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر بنی ہاشم کے دل میں یہ تمنا انگڑائیاں لے رہی تھی. وفات نبوی کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسی چیز کو مذہبی رنگ دے کر ابن سبا نے وہ خوفناک سازش تیار کی جس کے نتیجے میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت عمل میں آئی۔

بہر حال یہ بالکل ممکن ہے کہ کفار و منافقین نے جو کھیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پچیس سال بعد کھیلا اسے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں کھیلنے کی سعی نا مشکور کی ہو. قرآن کریم کی آیات کا اندازِ بیان

خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی ذاتی یا انفرادی بات نہیں تھی۔ بلکہ یقیناً ایک اجتماعی چیز تھی جس کا تعلق پوری اُمتِ مسلمہ سے تھا اس لئے ہم اسی تفسیر کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں۔ (تفصیل آگے آتی ہے)

جیسا کہ معلوم ہے، مدینہ منورہ میں منافقین کی طرف سے اس قسم کی سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ منافقین کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی مؤرخین نے ان کی تعداد لگ بھگ (۴۰۰) بتائی ہے۔ انہی منافقین میں ایک عورت اُمِّ جَلْدَحْ کا نام بھی آتا ہے جو بظاہر نیک پارسا بی بی کے روپ میں ریشہ دوانیاں کرتی تھی۔

۱۱
حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اسی منافقہ کے حال میں لکھا ہے۔

"کَانَتْ تُحَرِّشُ بَیْنَ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ"

ترجمہ: یعنی وہ ازواج مطہرات کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا کرتی تھی۔

ایسے لوگ جیسا کہ ظاہر ہے ہر ایک کے خیر خواہ اور دوست بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے پیٹ میں وہ گھسی ہوئی ہوگی اور ہر ایک اسے اپنی خیر خواہ اور محب سہیلی سمجھتی ہوں گی۔ لہٰذا منافقین و منافقات کے زیر اثر کسی سازش کی کوشش ہوئی ہو تو کچھ بعید نہیں۔

صَغَتْ کے معنیٰ

اس کے بعد اگلی آیت ہے۔

اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَهِیْرٌ ۝ (۶۶/۴)

ترجمہ: اگر تم دونوں اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ تو تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں۔ اور اگر تم دونوں نبی کے خلاف ایکا کرلو تو اللہ اپنے نبی کا مددگار ہے اور جبرئیل اور تمام نیک مؤمنین اور فرشتے اس کے بعد آپ کے حامی ہیں۔

اس آیت کریمہ پر بحث کرنے سے پہلے ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں ہمارے مفسرین نے چند غلطیاں کی ہیں۔ ان کے خیال میں آیت کا ترجمہ یوں ہے۔

"اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو (تو یہ نہایت ضروری ہے) کیونکہ تمہارے دل کج ہو گئے ہیں۔ اور اگر اس پر ایکا کرلو تو خدا اس کا (پیغمبر کا) مددگار ہے۔"

خط زدہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے۔ اور اس کی جزاء محاورۂ عرب کے مطابق محذوف ہے۔ ہم نے وہ جزائے محذوف لَا بَأْسَ (کوئی ایسی مشکل بات نہیں) قرار دی ہے۔ عام مفسرین کے مطابق وہ فَهُوَ وَاجِبٌ (تو وہ ضروری ہے) ہو گی۔ کلام عرب پر جن کو عبور ہے وہ یہ تسلیم کریں گے کہ ان کے بعد جب جزاء محذوف ہوتی ہے اور اس کے بعد فَقَدْ کے ساتھ اس جزاء کی علت بیان کر دی جاتی ہے تو ہمیشہ لَا بَاسَ (کچھ مضائقہ نہیں) لَا حَرَجَ (کچھ حرج نہیں) لَا ضَيْرَ (کچھ نقصان نہیں) فَهُوَ هَيِّنٌ (یہ تو معمولی بات ہے) وغیرہ الفاظ بطور جزاء کے مراد ہوتے ہیں۔ اشعار عرب میں اور خود قرآن کریم میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ [1]

---

[1] ان آیات پر غور فرمائیے وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (۳/۱۹)

بقیہ برصفحہ آئندہ

صَغَتْ کا ترجمہ زَاغَتْ (یعنی کج ہونا) بھی صحیح نہیں۔ اردو میں دو مفہوم ہیں۔ کسی چیز سے ہٹنا اور کسی چیز کی طرف جھکنا اور مائل ہونا۔ عربی میں صَغَتْ کا لفظ دوسرے مفہوم میں آتا ہے۔ قرآن کریم ہی میں دوسری جگہ یہ لفظ یوں آیا ہے۔

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (٦/١١٣)

ترجمہ: تاکہ جو لوگ ایمان نہیں لائے ان کے دل اس کی طرف جھکیں اور اس کی خواہش کریں۔

پہلے معنیٰ میں اِنْحَرَفَ، اِدَّعٰى، زَاغَ اور حَادَ کے الفاظ آتے ہیں۔ مائل ہونے اور جھکنے کے معنے میں نَاءَ، تَابَ، اِلْتَفَتَ اور تَوَجَّهَ نیز صَغٰى کے الفاظ آتے ہیں۔ البتہ مَالَ، شَغَلَ، عَدَلَ اور رَجَعَ کے الفاظ صلہ کے فرق کے ساتھ دونوں معنوں میں آجاتے ہیں۔ (دیکھیئے لسان العرب، قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں صَغَتْ کے وہ معنے جو عام مفسرین نے کئے ہیں وہ قِيْلَ کے لفظ کے ساتھ بیان کئے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کے نزدیک وہ معنی

اگر وہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا گیا ہے۔ (٢) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (٩/٤٠) اگر تم پیغمبر کی مدد نہیں کرتے تو کوئی نقصان نہیں کہ خدا اس کا مددگار ہے (٣) وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (٨/٣٨) اگر وہ پھر ایسا کریں تو کوئی حرج نہیں کہ گذشتہ امتوں کا قانون گذر چکا ہے۔ (٤) فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (٦/٨٩) اگر یہ اس کے منکر ہیں تو کوئی پروا نہیں کہ ہم نے ایسے لوگ مقرر کئے ہیں جو اس کو مانتے ہیں۔ (انکار نہیں کرتے)۔

مرجوح ہیں) [1]

مظاہرہ تیسری بات جسے ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے یہ ہے کہ اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا وَاِنْ تَظٰھَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰہُ الآیۃ (۶۶/۴) کا مخاطب عام طور پہ دو ازواج مطہرات یعنی حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو قرار دیا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم نے کہیں ان دو ازواج مطہرات کا نام نہیں لیا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کہیں ثابت نہیں کہ آپ نے اس آیت کا مخاطب ان دو ازواج مطہرات کو قرار دیا ہو۔ صرف حضرت ابن عباسؓ سے حضرت عمرؓ کی ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا کرنے والی یہ دو خواتین تھیں (یہ وہی روایت ہے جس پر ہم مفصل تنقید کر چکے ہیں اور اس کے تضادات سامنے لا چکے ہیں، دیکھئے "افسانۂ تحریم" والا مضمون) اس نقطۂ نظر والے حضرات اس کے ثبوت میں اس سے پچھلی آیت پیش کرتے ہیں یعنی

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ الآیۃ۔ (۶۶/۳)

ترجمہ: اور یاد کرو جب نبی نے اپنی کسی زوجۂ مطہرہ سے کوئی راز

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی نے سورۂ تحریم کی تفسیر میں صغوا کے لفظ کی بہت عمدہ تحقیق فرمائی ہے۔ جس کو زیادہ تفصیل اور تحقیق مقصود ہو وہ اصل کتاب کی طرف رجوع کرے۔ مولانا فراہی کی تحقیق کا خلاصہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی اپنی کتاب "سیرت عائشہؓ" میں دیدیا ہے۔

کی بات کہی. توجب ان زوجۂ مطہرہ نے اس کو افشار کر دیا اور خدا نے نبی پر اس افشار کو ظاہر کر دیا تو نبی نے بعض باتیں اُنہیں جتلا دیں اور بعض کو ٹال گئے۔

اور کہتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کو کچھ راز کی باتیں بتائیں تھیں انہوں نے وہ حضرت عائشہؓ کو بتا دیں. اس افشائے راز پر تنبیہہ فرمائی گئی اور فرمایا گیا کہ وہ دونوں توبہ کرلیں اور اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا کریں گی تو اللہ اپنے نبی کا مددگار ہے الخ۔

راز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان تین باتوں میں سے کوئی بات تھی۔

(۱) میں آئندہ شہد نہیں کھاؤں گا۔

(۲) میں آئندہ ماریہ قبطیہؓ کے پاس نہیں جاؤں گا۔

(۳) میرے بعد علی الترتیب ابو بکر صدیقؓ اور عمرؓ خلیفہ ہوں گے۔

یہ تین باتیں اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں. قطع نظر اس کے کہ ان باتوں میں سے پہلی دو باتیں اس قدر اہم ہرگز نہیں ہیں کہ ان کے لئے حق تعالیٰ کو جبریلؑ کو اور ملأ اعلیٰ کے تمام فرشتوں کو نبی کی اعانت کے لئے طلب کیا جائے. کسی ناگوار چیز کو کھانے سے احتراز کرنا یا کسی بیوی کے پاس نہ جانے کا عزم کر لینا ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی قیامت ٹوٹ پڑے۔

مثلاً عرب کے لوگ عام طور پر سوسمار (گوہ) کھاتے تھے لیکن سوسمار کا کھانا مغافیر کے شہد کی طرح آپؐ کو گوارہ نہیں تھا. آپؐ نے

اس کو کبھی نہیں چھپایا بلکہ ایک بیوی کے پاس نہ جانے کا عہد تو یہ بھی کوئی چھپانے کی بات نہیں تھی۔ قرآن کریم تو تمام ازواج مطہرات کو کچھ ساز و سامان دیکر (اگر وہ دُنیا کی خواہشمند ہوں) خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینے کا اعلان کر رہا ہے۔ تو محض کسی ایک زوجۂ محترمہ کے پاس نہ جانے کا عہد کر لینا تو بہر حال اس سے بہت کم ہے ہمیں علامہ شبلی نعمانیؒ کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ۔

"روایتوں سے مظاہرہ کا سبب جو معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ میں توسیع چاہتیں تھیں اور اگر ماریہ قبطیہؓ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں۔ لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پُر خطر ہو سکتی ہے جس کی مدافعت کے لئے ملأ اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو۔ اس بناء پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا۔"

(سیرت النبی ص ۵۷۵ ج ۱)

پھر اس کی بھی کیا دلیل ہے کہ کسی زوجۂ محترمہ نے وہ راز کی بات دوسری زوجۂ محترمہ ہی کو بتائی تھی۔ قرآن کی آیت میں ایسا کوئی

اشارہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں تو صرف یہ ہے کہ "ایک زوجۂ مطہرہ نے یہ راز کی بات کسی کو بتادی" وہ کون تھا اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا (ہم آگے اس پر مزید بحث کریں گے)

رہ گئی حضرت ابن عباسؓ کی حضرت عمرؓ سے روایت تو ہم اپنے مضمون "افسانۂ تحریم" میں تفصیل کے ساتھ اس پہ کلام کر چکے ہیں اور وہیں ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ اگر اس روایت کو صحیح مان لیا جائے تو اس کی رو سے اصل مجرم حضرت ام سلمہؓ اور ان کی مؤید حضرت زینب بنت جحشؓ) معلوم ہوتی ہیں نہ کہ حضرت عائشہؓ و حفصہؓ کیونکہ اپنے والدین صدیق اکبرؓ و فاروق اعظمؓ کی تنبیہہ کے بعد یہ دونوں تو سدھر گئی تھیں البتہ حضرت ام سلمہؓ اور ان کی جماعت حضورؐ سے اپنے مطالبہ پر اڑی رہی تھی۔

بہر حال وہ روایت قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اسے ثبوت میں پیش کیا جائے۔ یہ مفروضہ اس لئے بھی غلط ہے کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم بھی کرلیں تو ہمیں بتایا جائے کہ حضرت حفصہؓ نے تو افشائے راز فرمایا تھا اس لئے ان سے تو ایک غلطی سرزد ہوگئی ان کو اگر توبہ کرنے کا حکم دیا جاتا تو بجا اور درست تھا لیکن حضرت عائشہؓ نے کیا قصور کیا تھا۔ انہیں تو حضرت حفصہؓ نے ایک راز بتایا اور انہوں نے سن لیا۔ جب کوئی سنائے گا تو دوسرا آدمی ظاہر ہے کہ سنے گا ہی اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ لہٰذا توبہ کرنے کا مخاطب ان کو کیوں بنایا گیا اور ایکا کرنے والی وہ کیسے ہوگئیں پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ حضرت حفصہؓ نے اگر حضرت عائشہؓ کو

وہ راز کی بات بتادی تھی تو کیا قیامت آگئی تھی۔ راز تو پھر بھی گھر کے گھر ہی میں رہا۔ اس کا اتنا بڑا مقدمہ کیوں بنایا گیا کہ خدا، جبریلؑ اور ملاءِ اعلیٰ کے تمام فرشتے اور روئے زمین کے تمام نیک مؤمن بندے اعانت کے لئے طلب کر لئے گئے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ قرآن کے اپنے الفاظ کے بھی خلاف ہے۔ دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ ایکا کرنے والی حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ ہیں اور انہی کے دل (خدانخواستہ) کج ہو گئے تھے اور انہی کو کہا جا رہا ہے کہ وہ توبہ کر لیں تو بہتر ہے اور اگر وہ نبی کے خلاف ایکا کریں گی تو خدا اپنے نبی کا مددگار رہے۔ الخ

حالانکہ آیت میں قُلُوْبُکُمَا کا لفظ آ رہا ہے۔ قُلُوْبٌ، قَلْبٌ کی جمع ہے۔ جمع کا صیغہ کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے تو کیا حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے دو دو دل تھے کہ قُلُوْبُکُمَا فرمایا گیا؟ قانون کے اعتبار سے قَلْبَاکُمَا فرمانا چاہیئے تھا۔ دو عورتوں کے تو دو ہی دل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ تین یا تین سے زائد دل حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے دل تو نہیں ہو سکتے اور نہ اس کی مخاطب یہ عظیم القدر خواتین ہو سکتی ہیں۔ لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ اس آیت کی مخاطب کوئی سی دو جماعتیں ہیں کیوں کہ ان دو جماعتوں کے دل بلا شبہ دو نہیں دو سے زیادہ ہوں گے لہٰذا ان کو قُلُوْبُکُمَا فرمانا صحیح ہوگا۔ؑ

کفار و منافقین

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مدینہ منورہ میں منافقین کی سرگرمیاں برابر جاری تھیں اور وہ کوئی نہ کوئی نئے سے نیا فتنہ کھڑا کرتے رہتے تھے ان کی تعداد بھی کم نہیں

ع ہماری ناقص تلاش کے مطابق قرآن کریم میں جہاں کہیں جمع کی اضافت تثنیہ کی طرف کی گئی ہے وہ دو جماعتوں کے متعلق ہی ہے جس کی ایک مثال اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا (۵/۳۸) ہے کہ یہاں الف ولام استغراق کا ہونے

تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں ان کی تعداد تقریباً
چار سو بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک فتنہ پرداز عورت ام جُلاح
کا نام اصابہ میں پایا جاتا ہے۔ کسی زوجہ محترمہ نے کسی منافقہ کو
اپنا بہی خواہ اور مخلص ساتھن اور سہیلی سمجھ کر راز کی بات فرمادی
تھی۔ وہ لے اڑی اور منافقین کی ٹولی نے اس کی بنیاد پر
کوئی زبردست سازش تیار کرلی۔ بنا بریں مفسرین کی ان تینوں
روایات (شہد، ماریہ قبطیہؓ اور خلافت شیخین) میں سے تیسری
روایت کہ آپؐ نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر صدیقؓ
ہوں گے ان کے بعد عمر فاروقؓ خلیفہ ہوں گے۔ زیادہ قرین قیاس
معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق پوری ملت سے تھا اور منافقین
اس کی بنیاد پر بنو ہاشم یا انصار کو بھڑکا سکتے تھے۔ اور اس طرح ایک
فتنہ کھڑا کر سکتے تھے لہٰذا اس راز کے افشاء کو قرآن کریم نے بھی
اہمیت دی اور اس کے بعد چونکہ منافقین نے واقعی ایک زبردست
سازش تیار کرلی تھی اور مسلمانوں کے مابین زبردست تفرقہ اور
اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لہٰذا مدینہ منورہ کے اندر
مضافات کے کفار و منافقین کو یہ آخری الٹی میٹم دیا گیا کہ یا تو تم
آئندہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ، توبہ کرلو، یعنی سچے دل
سے ایمان لے آؤ اور اپنی کفر و نفاق کی زندگی کو خیر باد کہہ دو
ورنہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ، جبرئیلؑ، تمام نیک مؤمن بندے اور
پھر ملاء اعلیٰ کے تمام فرشتے حق تعالیٰ کے نبی کی اعانت کے لئے موجود
ہیں۔ آؤ اور جنگ کر کے دیکھ لو۔ چونکہ کفار و منافقین اپنی سازش

کی انتہائی ناکامی سے خفیف و شرمندہ ہونے کے علاوہ آئندہ کے لئے کچھ مایوس بھی ہو چلے تھے کہ اور کچھ نہیں تو خدا نے ہی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا اس لئے توی توقع تھی کہ اب وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں اور کفر و نفاق کو چھوڑ کر اسلام کو مخلصانہ طور پر قبول کر لیں اس لئے فرمایا گیا کہ۔

اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ

ترجمہ :۔ اگر تم دونوں اے کفار و منافقین! اللہ کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل تو (اپنی ناکامی کی بنا پر) اس طرف مائل ہو چکے ہیں۔ کیونکہ بار بار مشاہدہ کر چکے ہو کہ اسلام کے خلاف تمہاری کوئی بھی سازش کامیاب نہیں ہوتی اور تم آئندہ کے لئے مایوس ہو چکے ہو اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ سے مراد خلوص دل سے ایمان قبول کر لینا ہے۔ بہر حال اس آیت کریمہ کے مخاطب یہی سازشی لوگ ہیں، یعنی کفار و منافقین نہ کہ معاذ اللہ حضرت عائشہ رض و حضرت حفصہ رض یا حضرت ام سلمہ رض و حضرت زینب رض وغیرہ۔ اسی سلسلہ میں ایک اور آیت کریمہ کا بھی جو حوالہ دیا گیا ہے (جیسا کہ روایت ابن عباس رض میں ہے) کہ وہ بھی اسی موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ یعنی سورۂ نساء کی یہ آیت۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ($\frac{4}{83}$)

ترجمہ :۔ اور جب ان کے پاس کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے

تو وہ اسے مشہور کرتے اور پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس بات کو رسول، اور اپنے میں سے ذمہ دار لوگوں کی طرف لوٹا دیتے تو وہ لوگ جو اسے استنباط کر سکتے ہیں اس کی اصلیت تک پہنچ جاتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند لوگوں کے علاوہ تم سب شیطان کے متبع بن جاتے۔

اگر یہ آیت بھی جیسا کہ کہا گیا ہے اسی موقعہ پر نازل ہوئی تھی تو یہ خود اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ بڑی خطرناک اجتماعی سازش تھی۔ جو کفار و منافقین ہی تیار کر سکتے تھے اور جسے انہوں نے خوب زور و شور سے پھیلایا تھا اور بہت سے مسلمان اس سازش کا شکار ہو گئے ہوتے اگر حق تعالیٰ نے بروقت اس کا بھانڈا نہ پھوڑ دیا ہوتا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا بروقت تدارک نہ فرما لیا ہوتا بہر حال یہ ایک فتنۂ عظیمہ تھا جس کا جال منافقین و کفار نے مدینہ منورہ میں پھیلایا تھا۔

چنانچہ سورۂ تحریم میں ہی مسلمانوں کو نصیحت فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی آل اولاد کو جہنم کا ایندھن نہ بنائیں پھر کفار کو جھوٹی معذرتیں پیش کرنے کی ممانعت اور اہل اسلام کو سچے دل سے توبہ کرنے کی ہدایت فرمانے کے بعد یہ آیت آ رہی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○ (۶۶/۹)

ترجمہ: اے نبی! آپ کفار و منافقین سے جہاد فرمائیے اور ان پر سختی کیجئے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُری لوٹنے کی جگہ ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں مدینہ منورہ اور اس کے مضافات میں جو

جو کفار و منافقین آبا دتھے۔ ان کے بارے میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ واضح اور دو ٹوک ہدایت دے دی گئی کہ اب ان کے ساتھ قطعاً کوئی رعایت نہ برتی جائے بلکہ سختی کا معاملہ کیا جائے اور ان سے کھلم کھلا جنگ کی جائے۔ ہمارے خیال میں یہی وہ دو جماعتیں ہیں جن کو یہ آخری الٹی میٹم دیا گیا ہے کہ۔

اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝ (۶۶/۴)

ترجمہ :- پس اگر تم (دونوں گروہ) اللہ کی طرف رجوع کرو (اور صدق دل سے ایمان لے آؤ تو کوئی مشکل نہیں) کیونکہ تمہارے دل تو (اپنی ناکامی کی بنا پر) پہلے ہی اس کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ (کیونکہ تم دیکھ چکے ہو کہ تم ہزار کوششوں کے باوجود اسلام کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے) اور اگر تم پھر بھی نبی کے خلاف ایکا کرو تو (یاد رکھو) خدا اپنے نبی کا مددگار ہے نیز جبرئیل اور تمام نیک مؤمن بندے اور تمام ملائکہ اس کے مددگار ہیں۔

یہی وہ دونوں جماعتیں ہیں جن کو اس آیت کریمہ کے ذریعے یہ آخری الٹی میٹم دیدیا گیا ہے۔ چونکہ ان کی سازش جو انہوں نے بڑی کوششوں سے تیار کی تھی وہ بری طرح ناکام ہو چکی تھی اس لئے اب ان کا نادم و شرمسار ہونا اور یہ سمجھ لینا کہ ہم اسلام کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ایک فطری امر تھا۔ اسی ندامت و شرمساری اور آئندہ کے لئے قطعی مایوسی کی وجہ سے ان کو کہا گیا ہے کہ اگر تم اب بھی خدا کی طرف رجوع کر لو یعنی صدق دل سے ایمان لے آؤ تو یہ

تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تمہارے دل تو اس کا اعتراف کر چکے ہیں کہ تم اسلام کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کو اس آخری الٹی میٹم میں بتا دیا گیا ہے کہ اگر تم اب بھی باز نہ آئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا کرتے رہے تو خدا، جبرئیل، امت مسلمہ کے تمام نیک اور صالح مومن بندے اور ملاء اعلیٰ کے تمام فرشتے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پشت پناہ ہیں۔ تم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے اور جس طرح اب تک ہر سازش میں ناکام رہے ہو اسی طرح آئندہ بھی ہمیشہ ناکام و نامراد ہی رہو گے۔

مشرکین مکہ کی طرح

غرض یہ کہ جس طرح مشرکین مکہ کو سورۂ برأت کی ابتدائی آیات کے ذریعے آخری الٹی میٹم دیا گیا، اسی طرح سورۂ تحریم کی ان آیات سے مدینہ منورہ اور اس کے مضافات میں بسنے والے منافقین و کفار کو الٹی میٹم دیا گیا دونوں سورتوں کے نزول کا زمانہ بھی قریب ایک ہی ہے۔

سورۂ توبہ کا نزول ۹ھ میں ہوا ہے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زیر نگرانی و زیر قیادت حضرت علیؓ سے ۹ھ میں حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں اس کا اعلان کرا دیا گیا تھا اور سورۂ تحریم کا نزول بھی ۹ھ ہی کا ہے۔ کیونکہ تمام مفسرین و مؤرخین نے سورۂ تحریم کے ان واقعات کا وقوع ۹ھ ہی میں بتایا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ پہلی آیت (۲۸/۶۶) میں دو ازواج مطہراتؓ کا ذکر آیا ہے۔ ایک تو وہ جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے

کوئی راز کی بات فرمائی تھی اور دوسری وہ زوجۂ محترمہ جن پر پہلی زوجۂ محترمہ نے راز کا افشار فرمایا تھا۔ اس کے بعد آیت (۶۶/۴) میں اِنۡ تَتُوۡبَا اور اِنۡ تَظٰهَرَا دونوں تثنیہ ہی کے صیغے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں فعلوں کی مخاطب وہی دونوں ازواج مطہرات ہونی چاہئیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں آچکا ہے۔ تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ ایسا سوچنے والوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ان کی پیش کردہ آیت (۶۶/۳) میں دو ازواج مطہرات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک زوجۂ مطہرہ کا تذکرہ ہے جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات فرمائی تھی اور جنہوں نے اس راز کا افشار فرمادیا تھا۔ انہوں نے وہ راز کی بات کسی زوجۂ مطہرہ کو بتائی تھی یا اپنی کسی سہیلی کو بتائی تھی یا دس پانچ سہیلیوں کو بتائی تھی۔ قرآن کریم نے اس کی کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کسی ایسی سہیلی کو بتائی تھی جو ازواج مطہرات میں سے نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ بات خوب پھیل گئی۔ کیونکہ جیسا ہم نے پہلے کہا ہے اگر یہ راز کسی زوجۂ مطہرہ کے سامنے ہی آیا ہوتا تو بات بہر حال گھر میں رہتی اور کوئی خطرہ پیدا نہ ہوتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ آیت (۶۶/۳) میں چونکہ دو ازواج مطہرات کا ذکر تھا اس لئے آیت (۶۶/۴) میں بھی وہی دونوں ازواج مطہرات مراد ہونی چاہئیں ایک قسم کی زبردستی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت (۶۶/۴) میں اِنۡ تَتُوۡبَا اور اِنۡ تَظٰهَرَ دونوں تثنیہ کے صیغے ہیں۔ مضارع حاضر کے تثنیہ کے صیغے، مذکر اور

مؤنث دونوں تفعَلَانِ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ ہم تَتُوْبَا اور تَظٰهَرَا کو مؤنث کے صیغے ہی تسلیم کریں بلکہ مؤنث کے صیغے ماننے میں تَظٰهَرَا میں مضارع حاضر کی ایک تاء محذوف ماننی پڑتی ہے کیونکہ اسے اصل میں تَتَظٰهَرَا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اگر یہ مذکر کے صیغے تسلیم کئے جائیں تو ہمیں ایک تاء کو محذوف ماننا نہیں پڑتا۔ اِنْ تَتُوْبَا تثنیہ مذکر حاضر مضارع کا صیغہ ہے۔ یعنی اگر تم دونوں مرد توبہ کر لو تو واقعہ یہ ہے کہ تمہارے دل اس کی طرف (مسلسل ناکامیوں کے بعد) مائل ہو چکے ہیں۔ اور اِنْ تَظَاهَرَا قطعاً ماضی مذکر غائب تثنیہ کا صیغہ ہے۔ لہٰذا اس سے مراد حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ مراد ہو ہی نہیں سکتیں۔ یہ باب تفاعل سے تثنیہ مذکر غائب ماضی کا صیغہ ہے اور اِنْ شرطیہ کی وجہ سے مضارع کے معنے دے رہا ہے۔ اگر یہ مؤنث کا صیغہ ہوتا اور دو عورتیں اس سے مراد ہوتیں تو اِنْ تَظٰهَرَا کے بجائے اِنْ تَظَاهَرَتَا ہونا چاہیئے تھا۔ آیت کریمہ میں دونوں صیغے مذکر کے ہیں اور معنے یہ ہیں کہ اگر تم دونوں مرد توبہ کر لو تو فبہا اور اگر وہ رسول کے خلاف جتھا بندی کریں گے تو خدا اور جبریل اور صالح مؤمنین اور تمام ملائکہ رسول کے مددگار ہیں۔ ایک ہی چیز کو مخاطب کے صیغے سے تعبیر کرنا اور اسی کو غائب کے صیغہ سے تعبیر کر دینا محاورات عرب میں عام ہے۔ اسے بلاغت میں "اِلتفات" کہتے ہیں۔ قرآن کریم سے بھی اس کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ دونوں مؤنث کے صیغے ہیں۔ اسی طرح یہ کہنا کہ پچھلی آیت میں چوں کہ دو عورتوں کا ذکر آیا تھا۔ لہٰذا یہاں بھی وہی دو عورتیں مراد

ہوں گی ایک قسم کی زبردستی ہے جیسا کہ ہم عرض کر چکے۔

اس واضح استدلال کے بعد اگر کچھ دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ اِنْ تَتُوْبَا اور اِنْ تَظٰهَرَا مؤنث کے صیغے ہی ہیں تو ہم نے جو تفسیر بیان کی ہے اس کے مطابق ان کو مؤنث کے صیغے تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کا مخاطب دو جماعتوں کو قرار دیا جانا چاہیئے یعنی کفار اور منافقین کے گروہ کو۔ اور جماعت کے لئے مؤنث ہی کے صیغے ہونے چاہیئیں تھے۔

رہ گئی یہ بات کہ اس تفسیر کے مطابق دونوں آیتیں غیر مربوط ہو جاتی ہیں۔ آیت (۶۶/۳) میں ایک بات بیان کی گئی ہے کہ یاد کرو جب نبیؐ نے اپنی کسی زوجۂ مطہرہ سے کوئی راز کی بات کہی اور انہوں نے اسے افشاء کر دیا الخ

اور دوسری آیت میں بالکل ہی دوسری بات شروع ہو گئی کہ اگر تم دونوں جماعتیں توبہ کر لیتی ہو تو فبہا اور اگر تم نبی کے خلاف ایکا کرتی ہو تو خدا اپنے نبی کا مددگار ہے اور جبرئیل مددگار ہے الخ

تو یہ قرآن کریم کے اندازِ بیان سے ناواقفیت کی دلیل ہے قرآن کریم کی آیات میں عام کتابوں کا سا ربط تلاش کرنا غیر ضروری ہے۔ قرآن کریم اُمت مسلمہ کے لئے ایک ہدایت نامہ اور ضابطۂ حیات ہے جس میں خطبات کی طرح یکے بعد دیگرے ہدایات بیان کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں بیشتر آیات ایسی ہیں کہ اگر ان میں اس طرح کا ربط تلاش کیا جائے تو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

مثلاً سورۂ بقرہ میں دیکھیئے آیت نمبر (۱۵۷) تک سلسلۂ کلام

دُنیوی آزمائشوں کے متعلق چلا آرہا ہے کہ ہم اموال وانفس اور ثمرات میں کمی کرکے تمہاری آزمائش کرتے رہتے ہیں۔

اور اس کے بعد آیت (۱۵۸) میں بالکل ہی نئی بات ارشاد فرمائی جارہی ہے کہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ جو شخص حج یا عمرہ کرے وہ ان کا بھی طواف کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ ہی میں آیت (۱۸۷) تک روزہ کے احکام بیان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اور آیت (۱۸۸) میں باطل طریقے سے لوگوں کے مال ہڑپ کرجانے اور حکام کو رشوتیں دینے کی ممانعت فرمائی جارہی ہے۔

اور آیت (۱۸۹) میں بتایا جارہا ہے کہ چاند کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور یہ کہ اس سے لوگوں کو حج کے اوقات اور دیگر امور کے اوقات معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ ہی میں آیت (۲۳۷) تک طلاق کے مسائل بیان ہوتے چلے آرہے ہیں۔

اور آیت (۲۳۸) میں یکبارگی نمازوں کی حفاظت کا حکم دیدیا گیا ہے اور اس کے بعد صلوٰۃ خوف کے بعض احکام بیان کرکے آیت (۲۳۹) سے پھر طلاق ہی کے احکام آگئے ہیں۔

اسی طرح سورۂ قیامہ کو دیکھیئے کہ شروع سورت سے آیت نمبر (۷۵/۱۵) تک قیامت اور اس کی ہولناکیوں کا بیان آرہا ہے۔

لیکن آیت (۷۵/۱۶) سے ایک بالکل ہی نئی بات شروع ہوگئی ہے کہ اے پیغمبر اسلام جب وحی کا نزول ہو رہا ہو تو آپ جلدی جلدی

اسے پڑھنے کی کوشش نہ کیا کیجئے۔ قرآن کو جمع کرنا، اسے آپ سے پڑھوا دینا، اس کی توضیح کرنا، ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔

اور اس کے بعد کی آیت نمبر (۲۰/۷۵) سے پھر وہی قیامت کی ہولناکیوں کا بیان شروع ہو گیا ہے جو آخر سورت تک جاری ہے۔ غرضیکہ قرآن کریم سے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ ایک بات بیان فرمائی جا رہی ہے اور دفعۃً ایک دوسری ہی بات شروع ہو جاتی ہے جس کا پچھلی بات سے بظاہر کوئی قریبی تعلق نظر نہیں آتا۔

غرض یہ کہ ہماری بیان کردہ تفسیری توجیہہ قرآن مجید کے اندازِ بیان کے خلاف نہیں ہے اور حقیقۃً مربوط ہے کیونکہ آیت (۳/۶۶) میں ایک واقعہ یاد دلایا گیا ہے کہ اس واقعہ کو یاد کرو جبکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زوجۂ مطہرہ سے کوئی راز کی بات ارشاد فرمائی تھی اور ضرورت سے زیادہ حسنِ ظن کی وجہ سے کسی دوسری خاتون کے سامنے وہ بات ان کے منہ سے نکل گئی جس پر دشمنانِ اسلام کفار و منافقین نے ایک خطرناک سازش تیار کر لی اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی سعی نامشکور شروع کر دی چنانچہ ان کفار و منافقین کو آخری اور حتمی الٹی میٹم دیدیا گیا کہ یا تو وہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں اور توبہ کر لیں (یعنی خلوص دل سے ایمان قبول کر لیں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ وہ اپنی سازش کی ناکامی دیکھ چکے اور سمجھ چکے ہیں کہ وہ اسلام کا بال بھی بینکا نہیں کر سکتے۔ اور ان کے دل اپنی ناکامی کے معترف ہو چکے ہیں)۔ لیکن اگر وہ اب بھی باز نہ آئے اور نبی کے خلاف ایکا کرتے رہے تو ان کو آخری مرتبہ یہ الٹی میٹم دیا جاتا ہے کہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

اور یاد رکھیں کہ وہ اسلام کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے کیونکہ خدا، جبرئیل، ملت اسلامیہ کے تمام نیک بندے اور ملاء اعلیٰ کے تمام فرشتے ہمارے اس نبی کے پشت پناہ اور مددگار ہیں۔ لہٰذا وہ پھر اپنی سی ہر سعی کر کے دیکھ لیں۔ وہ کچھ بھی نہیں لگاڑ سکیں گے۔ دونوں آیات قطعی طور پر باہم مربوط ہیں اور دونوں میں کسی قسم کی کوئی بے ربطی نہیں ہے۔ لہٰذا بے ربطی کا جو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے وہ نادرست اور غیر صحیح ہے۔

صرف اتنا ہے کہ درمیان کی ایک کڑی کہ زوجۂ مطہرہ کے اس افشائے راز کے بعد کفار و منافقین نے زبردست سازش ترتیب دی قرآن کریم نے حذف کر دی ہے کیونکہ آیات کے جو مخاطب تھے انہیں تو پوری بات ہی معلوم تھی۔ اور بعد والے اندازِ بیان سے سمجھ سکتے تھے فصیح و بلیغ کلام میں ذرا ذرا سے اجزاء بتانے کے بجائے قاری کی ذہانت پر اعتماد کیا جاتا ہے (ہمارے ہاں غالب کے کلام میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں ویسے بھی یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کتابِ ہدایت ہے تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔

اس کے بعد حضرت عائشہؓ و حفصہؓ کے علاوہ باقی ازواج مطہرات کو تنبیہہ فرمائی جا رہی ہے کہ کفار و منافقین اگر تمہیں اس حوالہ سے بھڑکانا چاہیں کہ اس طرح ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت سے تمہاری پوزیشن کمزور ہو جائے گی اور حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی پوزیشن مضبوط ہو جائے گی اور خدا نہ کرے تم ان کے ورغلائے میں آگئیں تو ہم تمہاری چھٹی بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَکُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَهٗۤ اَزۡوَاجًا خَیۡرًا مِّنۡکُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبۡکَارًا ۝ (۶۶ / ۵)

ترجمہ: اے ازواج مطہرات یہ بالکل ممکن ہے کہ اگر کسی دینی کام میں خلل کی وجہ سے نبیؐ تمہیں طلاق دیدے تو اس کا پروردگار اسے تمہاری جگہ دوسری بیویاں دیدیگا جو تم سے بہتر ہوں، مسلمان، مؤمن، نمازی، توبہ کرنے والیاں، عبادت گذار روزہ دار، بیوہ اور کنواریاں ہوں۔

یعنی یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا امہات المؤمنین ہونے کا اعزاز ہی چھین لیا جائے اور تمہاری جگہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو دوسری بیویاں عطا کر دی جائیں جن کی یہ یہ خصوصیات ہوں (مگر چوں کہ ازواج مطہرات کفار و منافقین کے کسی بہکائے میں نہیں آئیں، نہ وہ اپنی بلند فطرتی کی وجہ سے ان کے بہکائے میں آسکتی تھیں اس لئے ان کی جگہ دوسری ازواجِ مطہرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ اس مشروط دھمکی کا مقصد بھی دراصل کفار و منافقین کو یہ بتانا تھا کہ کسی دینی کام کے مقابلہ میں جب پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں تک کو قربان کر سکتے ہیں تو تمہاری کیا حیثیت ہے؟) پھر چونکہ اس سازش کی وجہ سے کچھ نو مسلم مرد اور عورتیں اپنی ناسمجھی کی وجہ سے منافقین کے جال میں پھنسنے کے قریب ہو گئے تھے اس لئے عام مسلمانوں کو بھی تنبیہہ فرمائی گئی کہ وہ خود تو چوکنا رہا ہی کریں مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے بیوی بچوں کی بھی پوری پوری نگہداشت قائم رکھیں کہ ان میں سے بھی کسی سے کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَاَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا
اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ٥ (۶۶/۶)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں (بیوی بچوں) کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر بنیں گے۔ جس پر بڑے سخت دل اور قوی ہیکل فرشتے مقرر ہیں، جو کچھ اللہ انہیں حکم دیتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ان اصل مجرموں کو پھر خطاب ہے جنہوں نے وہ سازش تیار کر کے مسلمانوں کو آپس میں بھڑانے کی کوشش کی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ط اِنَّمَا تُجْزَوْنَ
مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (۶۶/۷)

ترجمہ: اے جماعت منکرین! اب معذرتیں پیش نہ کرو (کہ ہمارا مقصد تو یہ نہیں تھا، ہم تو یوں چاہتے تھے اور دوں چاہتے تھے) جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس کا تمہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اس کے بعد مسلمانوں سے پھر خطاب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ط عَسٰى
رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لا يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ج
نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ
لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ (۶۶/۸)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی طرف سچے دل سے رجوع

ہو اور توبہ کرو۔ توقع ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے گناہ تم پر سے دور کر دے اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کر دے جن کے پائیں نہریں بہہ رہی ہوں جس دن اللہ اپنے نبی کو اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں اُنہیں رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہوں گے۔ اے اللہ ہمارے لئے ہمارے اس نور کو مکمل کر دے اور ہمیں بخش دے۔ یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس کے بعد نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (٦٦/٩)

ترجمہ :۔ اے نبی اکرم! کفار اور منافقین سے جہاد فرمائیے اور ان پر خوب سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے۔

غور فرمائیے کہ یہ کس قدر جلال و جبروت سے بھری ہوئی آیات ہیں حضرت عائشہؓ و حفصہؓ کے علاوہ باقی تمام ازواج مطہرات کو تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ خلافت شیخین کے معاملہ میں اگر تم نے سوکناپے کا اظہار کیا اور تم منافقین کے ورغلانے میں آگئیں تو ہم تمہارا یہ سارا اعزاز یعنی امہات المؤمنین ہونے کا شرف چھین سکتے ہیں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنے آپ کو اور اپنے سب گھر والوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچاؤ۔ کفار کو تنبیہ کی گئی کہ اب معذرتیں پیش نہ کرو۔ تم ہمیں فریب نہیں دے سکتے مسلمانوں کو دوبارہ تنبیہ کہ خدا کی طرف سچے دل سے رجوع ہو ایسا نہ ہو کہ کفار و منافقین تمہیں خلافتِ شیخین کے سلسلہ

میں قبائلی عصبیت کا شکار بنا دیں اور تم حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ کرنے لگو، اور اگر بعض لوگوں سے کچھ سرزد ہو چکا ہے تو انہیں چاہیئے کہ توبہ کریں، ساتھ ہی یہ جتلا دیا کہ خدا اپنے نبی اور سچے مؤمنوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب کہ کفار اور منافقین کے خلاف جہاد فرمائیے اور ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیجیئے یہ تمام باتیں کس امر کی نشاندہی کر رہی ہیں؟ کیا یہ محض شہد نہ کھانے ماریہ قبطیہؓ کے پاس نہ جانے، ازواج مطہرات کے نفقہ میں اضافہ کرنے نہ کرنے کی سی معمولی باتوں کے خلاف اس قدر زور باندھا جا رہا ہے۔ یہ تمام آیات بتا رہی ہیں کہ یہ کوئی بہت بڑی بات تھی جس کی لپیٹ میں کفار و منافقین کے علاوہ بعض مسلمان بھی آگئے تھے حتیٰ کہ ازواج مطہرات کو بھی اس میں ملوث کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اگر روایات ہی پر مدار رکھا جائے تو یقیناً وہ سنگین بات حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت سے متعلق پیشگوئی ہی ہو سکتی ہے۔ کہ اس کا تعلق پوری ملت سے تھا اور اس کے خلاف بنو ہاشم، انصار اور حضرت عائشہؓ و حفصہؓ کے علاوہ (جن کے والدین کے متعلق یہ پیشگوئی تھی) باقی ازواج مطہرات کو بھڑکا کر مسلمانوں میں تفرقہ کا بیج بویا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عباسؓ اور حضرت فاطمہؓ کو نیز حضرت سعد ابن عبادہؓ اور انصار کے دیگر سرداروں کو بھی بھڑکایا گیا ہو اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار کا بیج بو دیا گیا ہو۔

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی حضرت لوط علیہ السلام کی

اور فرعون کی ازواج اور حضرت مریم علیہا السلام کی مثالیں پیش فرما کر ازواج مطہرات مہاجرین، انصار، بنو ہاشم اور عام مسلمانوں کو پھر تنبیہہ فرمائی جا رہی ہے کہ خدا کے حضور انسان کے اپنے اعمال ہی کام آئیں گے، مختلف نسبتیں کوئی کام نہیں آئیں گی۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ٥ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ٥ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ٥ (۶۶/۱۰-۱۲)

ترجمہ: منکرین کے لئے اللہ نے دو مثالیں نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کی پیش کی ہیں کہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے تحت تھیں۔ لیکن انہوں نے خیانت کی (یعنی نوح اور لوط علیہما السلام کے خلاف کفار کا ساتھ دیا) تو انہیں (نبی کی بیوی ہونے نے) اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچایا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ دوسرے نافرمان داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ اور اللہ نے اہل ایمان کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی۔ جب انہوں نے یہ دعا مانگی کہ اے پروردگار میرے لئے اپنے پاس

جنت میں گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں کے عمل سے نجات عطا فرما۔ اور مریم بنت عمران کی مثال پیش کی ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ چنانچہ ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے ارشادات کی تصدیق کی اور اس کی کتابوں کی بھی تصدیق کی اور بلا شبہ وہ بڑی عبادت گذار تھی۔

ان آیات سے کفار و منافقین کی ان توقعات پر پانی پھیر دیا گیا ہے کہ وہ اگر ازواج مطہرات میں سے کسی کو ورغلا کر یا مسلمان نیک اور صالح بندوں کے گھرانوں میں سے کچھ سادہ لوح خواتین کو اپنے دامِ فریب میں گرفتار بھی کر لیں گے اور اس طرح کسی قسم کا فتنہ پیدا کرنا چاہیں گے تو وہ پھر بھی اسلام کو یا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ علیہما السلام کے زمانہ میں کفار اور منافقین نے ان کی ازواج کو اپنے ساتھ ملا بھی لیا تھا۔ تو انہیں کیا فائدہ ہوا۔ کیا وہ عذاب الٰہی سے بچ گئیں اور کیا وہ منافقین اور کفار عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ وہ سب کے سب مع ان ازواج کے جہنم کا ایندھن ہی بن کر رہے۔ یہی حشر تمہارا بھی ہو گا اور ان عورتوں کا بھی ہو گا جو خدانخواستہ معاذاللہ تمہارے دام فریب کا شکار رہوں گی۔

اس کے برعکس مسلمانوں کے لئے آسیہ زوجۂ فرعون اور حضرت مریم بنت عمران کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جو کفار اور منافقین کے نرغہ میں ہوتے ہوئے نہایت ثابت قدم رہیں اور خدا نے ان کی نیک عملی کے بدلہ میں انہیں دنیا و آخرت میں اعزاز و اکرام سے

نوازا۔

لہٰذا جو مسلمان خواتین تمہارے ورغلانے میں نہیں آئیں گی وہ زوجۂ فرعون اور حضرت مریمؑ کی طرح بلند مرتبے حاصل کریں گی اور جو تمہارے ورغلانے میں آجائیں گی ان کا حشر زوجۂ نوحؑ اور زوجۂ لوط علیہا السلام کی طرح ہوگا۔

ان حقائق کی روشنی میں صاف واضح ہوجاتا ہے کہ۔

(۱) حضور اکرمؐ اپنی ازداج کی خوشنودی چاہتے تھے سخت گیر شخص نہ تھے۔

(۲) لیکن کسی دینی یا ملی مصلحت کے سامنے کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔

(۳) چنانچہ جب خلافتِ شیخینؓ کی پیشین گوئی کی وجہ سے کفار و منافقین نے اسی قسم سازشیں کیں جیسی بعد میں سبائیوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف کیں، اور اس میں سوکناپے کے حوالے سے ازواج مطہرات کو ملوث کرنا چاہا تو بظاہر ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے۔ لیکن درحقیقت کفار و منافقین کو بتانے کے لئے (دیکھیئے سیرۃ النبی علامہ شبلی) یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر بالفرض ازواج مطہرات بھی کسی اہم کام میں رکاوٹ بنیں تو ان کی پرواہ نہیں کی جائے گی کیونکہ اصل چیز دینی و ملی فرائض ہیں، بیویاں ان کاموں میں تعاون کے لئے ہیں نہ کہ ان میں دشواریاں پیدا کرنے کے لئے۔

(۴) مظاہرہ (گٹھ جوڑ) دراصل کفار و منافقین نے حضور اکرمؐ کے

خلاف کیا تھا، نعوذ باللہ حضرت عائشہؓ و حفصہؓ یا حضرت ام سلمہؓ وزینبؓ نے نہیں کیا تھا، نہ (جیسا کہ نفقہ کے حوالے سے کہا جاتا ہے) باقی ازواج مطہرات نے مظاہرہ کیا۔ ازواج مطہرات کے متعلق یہ ہوائیاں کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہیں۔ جسے ہم سچ سمجھ کر تسلیم کئے ہوئے ہیں (اعاذنا اللہ منہ)۔

(۵) ان مظاہرہ کرنے والے کفار و منافقین کو مشرکین مکہ کی طرح آخری الٹی میٹم دیدیا گیا کہ یا سدھر جاؤ یا ختم ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ اب کوئی معذرت قبول نہیں کی جائے گی۔

(۶) ازواج مطہرات اور مسلمانوں کو چوکس رہنے کا حکم دیا گیا کہ وہ ان دشمنوں کے مقاصد سے آگاہ رہیں، ایسا نہ ہو کہ تمہارے درمیان کسی قسم کی غلط فہمی پیدا کر کے دشمن فائدہ اٹھالے۔

(۷) اور اگر کسی نے دشمن کی توقعات پوری کر دیں تو اسے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ پھر اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو ان کفار و منافقین کا ہونا ہے کیونکہ اسلام کی نگاہیں اور اللہ و رسول کے حضور، نسل و نسب، قرابت و تعلق داری کی حکم الٰہی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں، بیوی سے زیادہ کون قریب ہو سکتا ہے مگر جب نوحؑ و لوطؑ کی بیویوں نے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی تو یہ قرابت داری ذرا بھی کام نہ آئی، اس کے برعکس زوجۂ فرعون اور حضرت مریمؑ نے حسب کمزوری و بے چارگی کے باوجود حق کی طرفداری کی تو ہمیشہ کے لئے ان کا نام تاریخ کی پیشانی پر ثبت ہو گیا۔ لہٰذا تمام مسلمان مرد و زن عموماً اور انتہائی قریب ہونے کی وجہ سے ازواج مطہرات خصوصاً ان ارشادات الٰہی اور حقائق

تاریخی سے عبرت حاصل کریں۔ اور کفار و منافقین کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۔

قسم کس کی ہوتی ہے

قسم صرف خدا کی کھائی جاسکتی ہے۔ کسی اور چیز کی قسم کھائی جائے تو وہ قسم نہیں ہوگی۔ خدا کی قسم سے مراد یہ ہے کہ لفظ اللہ یا اللہ کے کسی دوسرے نام مثلاً رحمٰن ورحیم۔ رب۔ رب کعبہ وغیرہ کے ساتھ یا خدا کی کسی ایسی صفت کے ساتھ قسم کھالی جائے جس کے ساتھ عرفاً قسم کھانے کا رواج ہو تو قسم منعقد ہو جائے گی۔ لیکن کسی ایسی صفت کے ساتھ جس کے ساتھ قسم کھانے کا رواج نہ ہو اگر قسم کھالی جائے تو قسم نہیں ہوگی۔ مثلاً اللہ کی عزت وجلال کی قسم کھائی جائے تو قسم ہو جائے گی لیکن اللہ کے علم اور سمع وبصر کی قسم کھائی جائے تو قسم نہیں ہوگی۔ اسی طرح کعبہ کی قسم اور قرآن کی قسم، نبی اکرم کی قسم، کھائی جائے تو قسم نہیں ہوگی قرآن کریم نے لفظ اللہ کے ساتھ ہی قسم کھانے کا ذکر فرمایا ہے۔

مثلاً۔

ثُمَّ جَاءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ ط (۴/۶۲)

ترجمہ: پھر وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آپ کے پاس آئیں گے

اور۔

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ط (۹/۴۲)

ترجمہ: اور وہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہمیں استطاعت ہوتی

تو ہم تمہارے ساتھ ضرور نکلتے ۔

اور۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ (۹/۵۶)

اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔

اور۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ؕ (۹/۶۲)

وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کرلیں۔

اور۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ (۹/۷۴)

ترجمہ: وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے یہ بات نہیں کہی۔ نیز اس سلسلہ کی آیت (۹/۹۵) پہلے ہی گذر چکی ہے۔ ایسے ہی اَقْسَمُوْا کے لفظ کے ساتھ بھی اللہ ہی کا نام آیا ہے۔ مثلاً۔

اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ (۵/۵۳)

ترجمہ: وہ بڑی تاکید کے ساتھ اللہ کی قسمیں کھاتے تھے۔

ایسے ہی آیات نمبر ۶/۱۰۹، ۱۶/۳۸، ۲۴/۵۳، ۲۵/۴۲ میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح سفر میں اگر کسی کو موت آجائے تو اسے مرنے سے پہلے وصیت کر دینے اور دو آدمیوں کو گواہ بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان گواہوں کی شہادت اگر میت کے ورثاء تسلیم نہ کریں تو نماز کے بعد مسجد میں ان گواہوں سے قسم لینے کا حکم ہے اگر ورثاء ان کی شہادت کو نہ مانیں کیونکہ وہ غیر مسلم ہیں یا ورثاء سے ان کو عداوت ہے اور انہیں یقین ہے کہ ہماری حق تلفی کی خاطر انہوں نے یہ بناوٹی

شہادت بنائی ہے تو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان گواہوں کے خلاف قسم اُٹھائیں۔ ان دو قسموں کے سلسلہ میں جو الفاظ سورۂ مائدہ میں تعلیم کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝ (۵/۱۰۶)

ترجمہ: تو وہ دونوں گواہ اللہ کی قسم کھائیں کہ اگر تمہیں شبہ ہے تو (ہم یقین دلاتے ہیں کہ) ہم اس شہادت کے بدلے اس کی کوئی قیمت نہیں لے رہے خواہ وہ ہمارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور ہم اللہ کی شہادت کو چھپا بھی نہیں رہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم گناہگاروں میں سے ہوں گے۔

دوسری طرف میت کے دو قریبی وارث اس طرح قسم کھائیں گے۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۵/۱۰۷)

ترجمہ: وہ دونوں (قریبی وارث) اللہ کی قسم کھائیں کہ یقیناً ہماری شہادت ان دونوں کی شہادت سے زیادہ سچی اور صحیح ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے۔

اسی طرح لعان کی صورت میں جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے شوہر اور بیوی کی جانب سے چار چار شہادتیں ضروری قرار دی گئی ہیں اور ان شہادتوں میں۔

بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۴/۶)

ترجمہ: اللہ کی قسم وہ بالکل سچا ہے۔

اور۔

بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ ○ (۲۴/۸)

ترجمہ: اللہ کی قسم وہ بالکل جھوٹا ہے۔

کے الفاظ بتلائے گئے ہیں۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قسم صرف اللہ کی کھائی جا سکتی ہے۔ لیکن اللہ کا لفظ ضروری نہیں ہے اسلام صرف عربوں کے لئے نہیں آیا ہے۔ ہر زبان میں اللہ کے الگ الگ نام ہیں۔ اسی طرح عربی میں بھی اللہ کے بہت سے نام ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (۷/۱۸۰)

ترجمہ: اور اللہ کے بہت سے اچھے نام ہیں، تم اُسے ان ناموں سے پکار سکتے ہو۔

اسی طرح اللہ کی وہ صفات جن سے قسم کھانے کا رواج ہو وہ اسی میں شامل ہیں۔ لیکن غیر اللہ کی قسمیں نہیں کھائی جا سکتیں۔ اگر کھالی جائیں تو وہ قسم نہیں ہوں گی۔

قسم کے الفاظ عربی زبان وَاللّٰهِ، بِاللّٰهِ، تَاللّٰهِ قسم کے لئے آتے ہیں۔ وَاللّٰه اور بِاللّٰه ہمارے ہاں اُردو میں بھی مستعمل ہیں، ورنہ ہمارے ہاں خود قسم کا لفظ ہی زیادہ تر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً خدا کی قسم، خدا کی عزت و جبروت کی قسم، خدا کی کبریائی کی قسم وغیرہ۔ نیز یہ کہنے سے کہ میں حلف کرتا ہوں میں قسم کھاتا ہوں، یا خدا گواہ ہے، یا میں خدا کی شہادت دیتا ہوں وغیرہ الفاظ سے بھی قسم ہو جاتی ہے۔ خدا کے عہد کی قسم، خدا کے میثاق کی قسم، مجھ پر نذر ہے، میں اللہ کی نذر مانتا ہوں۔ اگر میں ایسا

کروں تو میں مسلمان نہیں۔ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں کافر ہوں میں یہودی ہوں، میں نصرانی ہوں وغیرہ۔ جیسے الفاظ بھی قسم ہی کے الفاظ مانے گئے ہیں۔ بہر حال قسم کے الفاظ کوئی متعین الفاظ نہیں ہیں۔ ہر زبان اور ہر معاشرہ میں جو عنوان قسم کھانے کے لئے استعمال ہوتے ہوں ان کا اعتبار کیا جائے گا۔ اور جو عنوان قسم کے لئے استعمال نہ ہوتے ہوں ان سے قسم نہیں ہوگی۔

قسم کے ساتھ استثناء

اگر کسی شخص نے قسم کھائی لیکن ساتھ ہی بغیر توقف کے انشاء اللہ بھی کہہ دیا یا استثناء کا کوئی اور لفظ کہہ دیا مثلاً خدا کی قسم میں یہ کام ضرور کروں گا۔ لیکن اگر فلاں نے منع کر دیا تو مجبوری ہے۔ یا خدا کی قسم میں یہ کام ضرور کروں گا لیکن اگر خدا نے ہی نہ چاہا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسی صورتوں میں قسم نہیں ہوگی۔

اس سلسلہ میں فقہ کی کتابوں میں بہت سے مسائل اور جزئیات بیان کی گئی ہیں جو براہ راست قرآن کریم سے مستنبط نہیں ہیں۔ سنت، قیاس یا عرف عام پر مبنی ہیں۔ یہ تمام تفاصیل کتب فقہ سے دیکھ لی جائیں۔ یہاں ان کا موقعہ نہیں ہے۔ اس کتاب کے ان حصوں میں ان پر بحث کی جائے گی جن میں سنت اور قیاس وغیرہ سے بحث کی جائے گی۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ